حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے مواعظ کا مجموعہ

مواعظ اشرفیہ

حکیم الامت حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ

مکتبۂ تھانوی دفترِ رسالہ الابقاء
مولوی مسافر خانہ ایم اے جناح روڈ کراچی ۱
فون: ۷۷۷۷۶۲۰، ۷۷۷۰۰۹۴

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ اٰیَۃً

(رواہ البخاری)

سلسلۃ التبلیغ کا

وعظ مسمّٰی بہ

اَلْکَمَال فِی الدِّیْن (لِلنِّسَاء)

منجملہ ارشادات

حکیم الامۃ مجدد الملۃ حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی

رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

محمد عبد المنّان غفرلہٗ

مکتبۂ تھانوی ۔ دفتر الابقاء

مسافر خانہ بندر روڈ / ایم۔ اے جناح روڈ کراچی ۱

ضروری اطلاع:۔ خط وکتابت کرتے وقت یا اپنا پتہ تبدیل کراتے وقت خریداری نمبر ضرور تحریر فرمائیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الوعظ المسمّٰی بہ

الکمال فی الدّین

(للنساء)

این	کہاں ہوا	دہلی بر مکان محمد رفیع صاحب
متٰی	کب ہوا	۲۷ ذی الحجہ سنہ ۱۳۳۴ھ بعد ظہر بروز سہ شنبہ
کم	کتنی دیر ہوا	۲ ½ گھنٹہ
کیف	کیونکر ہوا	بیٹھ کر
لِمَ	کیوں ہوا	مستورات کی درخواست تھی کہ ہم کو بھی اصلاح کا طریق بتایا جائے۔
ماذا	کیا مضمون تھا	عورتوں کیلئے کمال دین حاصل کرنیکا طریقہ اور کاملین کی صحبت کا فیض ان کو کیونکر پہونچ سکتا ہے
من ای شان	کس طبقہ کو زیادہ مفید تھا	طبقۂ اناث کو خصوصاً اور جو لوگ دنیوی مشاغل سے فراغت نہیں پاتے ان سب کو عموماً۔
من ضبط	کس نے ضبط کیا	احقر ظفر احمد تھانوی عفا اللہ عنہ
المستمعون	سامعین کی تخمینی تعداد	مرد تقریباً ۲۰۰ اور مستورات کی تعداد معلوم نہ ہو سکی۔
الاشتات	متفرقات	اس وعظ میں وہی آیت تلاوت کی گئی جو اس سے پہلے وعظ میں تلاوت کی گئی تھی لیکن مضامین اکثر غیر مکرر تھے اور بعض بالکل جدید۔

الحمد للہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ ونشھد ان سیدنا ومولانا محمدا عبدہ ورسولہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ آلہ واصحابہ وبارک وسلم۔ اما بعد فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم ؕ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ؕ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ

وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ ۝ (اے ایمان والو تقویٰ حاصل کرو اور سچوں کے ساتھ ہو جاؤ)

بیان کرنے سے پہلے اتنا کہدینا مناسب ہے کہ اگر مردوں کو آواز کم پہونچے یا مضامین ان کے مناسب کم ہوں تو وہ مجھ کو معذور سمجھیں کیونکہ یہ بیان خاص عورتوں کے لئے ہے۔ اول تو اس بیان سے مقصود وہی ہیں مردوں میں اس سے پہلے بیان ہو چکا ہے۔ دوسرے عورتوں کو مواعظ کے سننے کا بھی موقع کم ملتا ہے اس لئے ضرورت اس کی ہے کہ گاہے گاہے خاص ان کے مناسب مضامین بیان کئے جائیں تاکہ ان کو بھی اپنی اصلاح کا طریقہ معلوم ہو۔ مردوں کو مواعظ کے سننے کا بہت موقع ملتا رہتا ہے دوسرے ان کو وقتاً فوقتاً علماء سے ملنے کا بھی موقع ملتا رہتا ہے اگر مواعظ بھی نہ سنیں تو ضروری باتیں وہ زبانی دریافت کرسکتے ہیں بے چاری مستورات کو اس کا بھی موقع نہیں ملتا اس لئے ان کی اصلاح کے لئے خاص طور پر اہتمام کی ضرورت ہے کہ ایک بیان ایسا ہو جس میں انہی کے مناسب مضامین ذکر کئے جائیں۔ پھر عورتوں کے متعلق بچوں کی بھی تربیت ہے اور یہ قاعدہ ہے کہ بچہ ابتدائے عمر میں جس کے پاس زیادہ رہتا ہے اسی کے اخلاق و اعمال اختیار کرتا ہے اور بچے زیادہ تر ابتدائے عمر میں اپنی ماؤں کے پاس زیادہ رہتے ہیں باپ کے پاس کم رہتے ہیں اس لئے بچوں کی تربیت اسی طرح عمدہ ہوسکتی ہے کہ مستورات کی اصلاح ہو جائے۔ بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ابتدائے عمر میں بچوں کو سمجھ ہی کیا ہوتی ہے جو وہ اچھی یا بری بات سے اثر لیں بچپن میں ان کا تربیت کرنے والا خواہ کیسا ہی ہو سمجھ آنے کے بعد کسی نیک آدمی کے پاس ان کو رکھنے کی ضرورت ہونی چاہیئے سو خوب سمجھ لیجئے کہ یہ خیال غلط ہے بچپن میں جبکہ بچہ دودھ پیتا ہے اس وقت بھی اس کے دماغ میں اخذ کا مادہ ہوتا ہے گو وہ زبان سے کچھ نہ کہہ سکے اور اس کی مثال ایسی ہوتی ہے جیسے فونوگراف کہ تم جو کچھ کہتے ہو وہ سب اس میں جاکر محفوظ و منقش ہو جاتا ہے گو اس وقت آواز نہ نکلے لیکن جس وقت ان نقوش پر سوئی چلے گی وہ سب باتیں اس میں سے بعینہ نکلیں گی۔ یہی حال بچوں کے دماغ کا ہے کہ ابتدائے عمر میں بھی وہ سب باتوں کو اخذ کرکے محفوظ کرلیتا ہے گو اس وقت ان پر عمل نہ کرسکے یا زبان سے ظاہر نہ کرسکے پھر جب اس میں قوتِ عمل و نطق کامل ہو جاتی ہیں تو پہلی باتوں کے آثار اس سے

ظاہر ہونے لگتے ہیں۔ ایک تجربہ کار کا مقولہ ہے کہ بچوں کی اصلاح کا وقت پانچ سال تک ہے۔ اس عرصہ میں جتنے اخلاق اس میں پختہ ہونے ہوتے ہیں پختہ ہوجاتے ہیں۔ اس کے بعد اس میں پھر کوئی عادت پختہ نہیں ہوتی۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہم جس زمانہ کو ناسمجھی کا زمانہ خیال کرتے ہیں وہی وقت بچوں کی اصلاح کا ہے اور بچے اُسی زمانہ میں سب کچھ اخذ کرلیتے ہیں۔

ایک مسماۃ نے بیان کیا کہ بچوں کی اصلاح کا سہل طریقہ یہ ہے کہ سب سے پہلے بچہ کی کامل طور پر تربیت کردی جائے پھر سارے بچے اسی جیسے اٹھیں گے جیسے کام کرتا ہوا اس کو دیکھیں گے اگلے بچے بھی وہی کام کریں گے اور اسی کی عادتیں خصلتیں سیکھ لیں گے غرض بچوں کی تربیت چونکہ زیادہ تر عورتوں کے ہاتھ میں ہے اس لئے ان کی اصلاح سے مردوں کی بھی اصلاح متوقع ہے کیونکہ یہ بچے ایک وقت میں مرد بھی بنیں گے ان وجوہ سے اس وقت کا بیان زیادہ تر مستورات کے لئے مخصوص ہوگا لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ مردوں کے لئے یہ بیان کسی درجہ میں بھی مفید نہ ہوگا کیونکہ اس میں بھی آخر احکام شرعیہ ہی کا بیان ہوگا اور احکام اکثر مردوں اور عورتوں میں مشترک ہی ہیں البتہ طرز بیان میں مردوں کی دلچسپی کا لحاظ نہ کیا جائے گا بلکہ زیادہ تر عورتوں کی دلچسپی کے مضامین ہوں گے سو دلچسپی اگر نہ ہوئی بلا سے نہ ہو یہ مقصود تھوڑا ہی ہے اور جو مشترک نہ ہوتے بھی ایک نفع تو یقیناً سب کو ہے وہ یہ کہ حدیث میں آتا ہے کہ جب کہیں اللہ کا ذکر ہوتا ہے تو فرشتوں کی ایک جماعت وہاں مجتمع ہوجاتی ہے پھر وہ ذاکرین کے اوپر سکینہ نازل کرتے ہیں پھر جب وہ حق تعالیٰ کے پاس جاتے ہیں تو وہاں سوال ہوتا ہے کہ تم نے میرے بندوں کو کس حال میں چھوڑا، وہ عرض کرتے ہیں کہ یا اللہ ہم نے اُن کو آپ کا ذکر کرتے ہوئے چھوڑا حق تعالیٰ سوال فرماتے ہیں کہ کیا انہوں نے ہم کو دیکھا ہے وہ عرض کرتے ہیں کہ نہیں یا اللہ انہوں نے آپ کو دیکھا نہیں اگر دیکھ لیتے تو اس سے بھی زیادہ کوشش کرتے۔ پھر سوال ہوتا ہے کہ وہ ہم سے کیا چاہتے ہیں۔ فرشتے عرض کرتے ہیں کہ وہ آپ سے جنت اور آپ کی رضا کو طلب کرتے ہیں اور آپ کی ناراضی

اور جہنم سے پناہ مانگتے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے کہ گواہ رہو ہم نے ان سب کو بخشدیا۔ اس پر بعض فرشتے کہتے ہیں کہ یا اللہ فلاں شخص تو ذکر کے قصد سے نہ آیا تھا ویسے ہی آکر ان کے پاس بیٹھ گیا تھا۔ ارشاد ہوتا ہے کہ ہم نے اس کو بھی بخش دیا۔ یہ جماعت ایسی نہیں کہ ان کے پاس بیٹھنے والا محروم ہو۔

یہ تو حدیث کا مختصر مضمون ہے اور ظاہر ہے کہ وعظ کی مجلس بھی مجلس ذکر ہے۔ اس میں خدا تعالیٰ کے احکام کا ذکر ہوتا ہے اور یہ بھی ذکر اللہ ہی ہے ذکر اللہ فقط تسبیح و تہلیل وغیرہ میں منحصر نہیں۔ صاحب حصن حصین نے اس مسئلہ پر متنبہ کیا ہے وہ فرماتے ہیں بَلْ کُلُّ مُطِیْعٍ لِلّٰہِ فَھُوَ ذَاکِرٌ کہ ہر شخص جو خدا کی اطاعت میں مشغول ہو وہ ذاکر ہی ہے۔ تو اگر مردوں کو اس بیان سے دلچسپی بھی نہ ہوئی تو یہ نفع کیا تھوڑا ہے کہ وہ جتنی دیر مجلس وعظ میں بیٹھے رہیں گے اتنی دیر تک وہ ملائکہ کی صحبت سے مستفید ہونگے اور ذاکر شمار ہوں گے اور رحمت و مغفرت کے مورد ہوں گے (اس وقت کچھ مستورات کی باتوں کی آواز آئی حضرت حکیم الامت نے فرمایا کہ بھائی اس وقت باتیں نہ کرو بلکہ غور سے ہماری باتوں کو سنو یہ کیا انصاف ہے کہ ہم تو تمہارے لئے اپنا وقت اور دماغ صرف کریں اور تم اس کی بے قدری کرو اور تھوڑی دیر کے لئے بھی تم اپنی باتیں قطع نہ کرو۔ اول تو یہ تہذیب کے بھی خلاف ہے۔ دوسرے شریعت کے بھی خلاف ہے۔ علماء نے لکھا ہے کہ جس طرح خطبۂ جمعہ کا سننا فرض ہے اور اس وقت باتیں کرنا حرام ہے اسی طرح جس مجلس میں بھی احکام شرعیہ بیان ہو رہے ہوں وہاں خاموش رہنا اہل مجلس کے ذمہ لازم ہے باتیں کرنے سے گناہ ہوتا ہے پس جن مستورات کو باتیں کرنا ہوں یہاں سے اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلی جائیں تاکہ گناہ سے بھی محفوظ رہیں اور دوسری سننے والیوں کے سننے میں خلل انداز بھی نہ ہوں۔ تیسرے باتیں کرنے سے بیان بھی خبط ہو جاتا ہے۔ بیان کرنے والے کے ذہن میں مضامین کی آمد بند ہو جاتی ہے کیونکہ مضامین کی آمد نشاط و انشراح قلب پر موقوف ہے اور سامعین کی بے توجہی دیکھ کر بیان کرنے والے کی طبیعت مکدر ہو جاتی ہے بعض دفعہ جو رات کو مجھے بیان کرنے کا اتفاق ہوتا ہے تو بعض لوگ اس وقت اونگھتے

ہوئے نظر آتے ہیں اونگھنے والی کی صورت دیکھ کر مجھے مضمون کی آمد بند ہو جاتی ہے پس یہ سخت نا انصافی ہے کہ میں تو اپنا دماغ صرف کروں آپ کے لئے اپنا وقت خرچ کروں اور تم اس کی یہ قدر کرو کہ اپنی اپنی باتوں میں لگی رہو۔ باتوں کے لئے ساری عمر پڑی ہے۔ جب میں چلا جاؤں گا پھر جتنی چاہے باتیں کر لینا۔)

اس وقت جو آیت میں نے تلاوت کی ہے یہ وہی آیت ہے جو پرسوں مردوں کے سامنے تلاوت کی گئی تھی اس وقت اسی آیت کو اختیار کرنے کی چند وجوہ ہیں ایک تو یہ کہ بعض مضامین اس آیت کے متعلق اس روز بیان سے رہ گئے تھے۔ دوسرے یہ بھی بتلانا مقصود ہے کہ حق تعالیٰ نے جس طرح مردوں کو کمال دین حاصل کرنے اور اپنی اصلاح کا حکم فرمایا ہے وہ حکم عورتوں میں بھی مشترک ہے گو خطاب صیغہ کے اعتبار سے بظاہر مردوں کو ہے لیکن حکم مشترک ہے۔ پس کسی کو یہ خیال نہ ہو کہ حق تعالےٰ کو مردوں ہی کی طرف توجہ ہے عورتوں کا اعتبار نہیں ہے یہ وہم پہلے بھی ہو چکا ہے۔ اور منشا اس وہم کا محبت ہے۔

حدیث میں آتا ہے کہ ازواج مطہرات میں سے کسی نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ میں دیکھتی ہوں کہ حق تعالیٰ احکام میں مردوں ہی کا ذکر فرماتے ہیں ہمارا (یعنی عورتوں کا) ذکر نہیں فرماتے۔ ازواج مطہرات کو یہ خیال اس لئے بھی ہوا کہ وہ صاحب زبان تھیں عربی زبان کو خوب سمجھتی تھیں اور عربی میں مذکر و مؤنث کے لئے جُدا جدا صیغے استعمال کئے جاتے ہیں تو ان کو تمام احکام میں مذکر صیغے دیکھ کر یہ خیال پیدا ہوا کہ حق تعالےٰ ہم کو خطاب نہیں فرماتے، نہ ہمارا ذکر فرماتے ہیں۔ اور ہماری مستورات تو عربی زبان حاصل ہی نہیں کرتیں اور یہ بھی ایک بڑی کمی ہے جس کا افسوس ہوتا ہے کیونکہ پہلے زمانہ میں عورتیں بھی مثل مردوں کے عربی کی تحصیل کرتی تھیں تو عربی زبان سے ناواقف ہونے کے سبب مذکر و مؤنث کے صیغوں کا فرق وہ نہیں سمجھ سکتیں اور اگر ترجمہ پڑھیں گی تو اس میں ان صیغوں کا ترجمہ نظر سے گذرے گا اور اردو میں خطاب کا صیغہ مردوں و عورتوں میں مشترک ہے دونوں کے لئے الگ الگ صیغہ موضوع نہیں مثلاً وَاتَّقِيْنَ اللہَ ط

وَ اتَّقُوا اللّٰہَ کا ترجمہ یکساں ہوگا دونوں جگہ اردو میں یہی بولتے ہیں کہ خدا سے ڈرو۔ خواہ اس کے مخاطب مرد ہوں یا عورتیں۔ اس لئے اوامر و نواہی کے صیغوں میں وہ ترجمہ دیکھ کر یہ نہیں سمجھ سکتیں کہ یہ خطاب خاص مردوں کو ہے۔ لیکن پھر بھی بعض جگہ اردو ترجمہ سے بھی مردوں کی تخصیص سمجھ میں آسکتی ہے۔ مثلاً یَاۤ اَیُّھَا النَّاسُ کا ترجمہ ہے اے لوگو! اور یَاۤ اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کا ترجمہ اے ایمان والو! یہ لفظ اردو میں بھی مردوں کے لئے مخصوص ہے۔ عورتوں کو اے لوگو یا اے ایمان والو کہہ کر ندا نہیں کرسکتے بلکہ ان کو اگر ان کو خطاب خاص ہوگا تو اے عورتو! یا اے ایمان والیو! کہا جائے گا۔ پس ہرچند کہ اوامر و نواہی کے صیغوں میں ترجمہ دیکھ کر ان کو تخصیص رجال کا وہم نہیں ہوسکتا۔ مگر ندا کے صیغوں میں ان کو بھی وہم ہوسکتا ہے۔ اور ازواج مطہرات تو اس فرق کو خطاب کے مواقع میں بھی سمجھتی تھیں اس لئے اُن کو غایت محبت کی وجہ سے یہ خیال پیدا ہوا کہ ہائے اللہ تعالےٰ ہم کو خاص طور پر خطاب نہیں فرماتے جیسا مردوں کو خطاب فرماتے ہیں۔ دیکھئے وہ عورتیں کیسی تھیں اللہ اکبر! ان کا کیسا مذاق تھا اگر آجکل کی عورتوں جیسی وہ سُست اور کم ہمت اور کام چور ہوتیں تو یوں سمجھتیں کہ اچھا ہوا ہم ان احکام سے بچ گئے کیونکہ ان میں تو خاص مردوں کو مخاطب بنایا گیا ہے۔ مگر اس زمانہ میں مستورات کو اس کا وہم بھی نہیں ہوا کہ یہ احکام ہمارے لئے نہیں ہیں بلکہ وہ خوب سمجھتی تھیں کہ احکام سب کو عام ہیں (بجز چند مخصوص باتوں کے جن کا مردوں کے ساتھ خاص ہونا۔ دوسرے دلائل سے اُن کو معلوم ہوگیا تھا اور ایسی خصوصیت عورتوں کے لئے بھی ہے کیونکہ بعض احکام صرف عورتوں ہی کے لئے مخصوص ہیں مردوں کے لئے نہیں ہیں ان کے علاوہ بقیہ احکام میں جن کا کسی کے لئے خاص ہونا دلائل سے معلوم نہ ہوا تھا اُنہوں نے یہی سمجھا کہ مردوں اور عورتوں سب کے لئے مشترک ہیں گو لفظاً خطاب خاص مردوں کو کیا گیا ہے ۱۲) اور عموم احکام پر نظر کرکے پھر ان کو یہ تمنا ہوئی کہ جب یہ احکام سب کو عام ہیں تو ان میں ہمارا بھی تذکرہ ہوتا تو اچھا تھا۔ اُن کے دل نے اس کو گوارا نہ کیا کہ اللہ تعالیٰ تمام احکام میں مردوں کے واسطہ ہی سے ان کو خطاب فرما دیں۔ ان کا جی چاہتا تھا کہ کبھی کبھی ہم کو

مردوں سے جدا کر کے بھی خطاب فرمایا کریں اور وجہ اس تمنا کی یہ تھی کہ ان کو خدا تعالیٰ سے محبت تھی (اور عاشق کا دل چاہا کرتا ہے کہ اس کا تذکرہ کبھی تو محبوب کی زبان پر آجایا کرے ؎

ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے ۱۲ جامع)

خدا تعالیٰ کا کسی کو اپنے احکام کا مخاطب بنانا ایک بڑا شرف ہے جو مردوں کو حاصل تھا۔ تو ازواج مطہرات کو اس کی تمنا ہوئی کہ اس شرف سے ہم بھی محروم نہ رہیں۔ (اس وقت پردہ کے پیچھے سے پھر عورتوں کی کچھ آواز آئی۔ حضرت حکیم الامت نے پھر فرمایا کہ بھائی باتیں کرنے سے طبیعت اچاٹ ہوئی جاتی ہے مضمون گڑبڑ ہو جاتا ہے اگر تم اپنی باتیں بند نہیں کرتیں تو پھر ہم سے کہدو ہم اپنی باتوں کو بند کر دیں ورنہ اس کی احتیاط رکھو اول تو اس وقت باتیں کرنا جائز نہیں جیسا کہ ابھی میں نے حکم بتلایا تھا اور اگر کسی کی طبیعت باتوں سے نہیں رکتی تو بلند آواز سے تو نہ کرو آہستہ ہی کر لو ۱۲) غرض وہ عورتیں دین کی عاشق تھیں وہ اپنے اوپر بوجھ لادنا چاہتی تھیں وہ یہ نہ چاہتی تھیں کہ ہم احکام کے مخاطب نہ بنیں تو اچھا ہے کیونکہ ان کو دین کے ثمرات پر اطلاع تھی اور وہ جانتی تھیں کہ دین کے ثمرات ایسے ہیں کہ ان کے لئے محنت کرنا کوئی چیز نہیں اسی پر یہ آیت نازل ہوئی فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ اِنِّی لَا اُضِیْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى بَعْضُكُمْ مِّنْ بَعْضٍ ط یعنی احکام میں کسی کی کچھ تخصیص نہیں جو کوئی بھی عمل کرے مرد ہو یا عورت سب کو اجر ملے گا۔ اور کسی کا عمل ضائع نہ ہوگا۔ باقی رہی خصوصیت خطاب کی وجہ سو وہ یہ ہے بَعْضُكُمْ مِّنْ بَعْضٍ ط کہ تم دونوں آپس میں ایک دوسرے کے جزو ہو پس حکم بھی دونوں کا یکساں ہے اس لئے ضرورت جدا خطاب کرنے کی نہیں اس کے بعد بعض جگہ خاص عورتوں کو بھی خطاب کیا گیا ہے جیسے یٰنِسَآءَ النَّبِیِّ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ اِنِ اتَّقَیْتُنَّ الخ (اے نبی کی بیبیو تم معمولی عورتوں کی طرح نہیں ہو اگر تم تقویٰ اختیار کرو) میں دور تک ازواج مطہرات کو خطاب ہے اور وَ قُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ یَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَ یَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ (اور مسلمان عورتوں سے کہدیجئے کہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت

کریں) میں سب مسلمان عورتوں کو ایک خاص حکم کا مخاطب بنایا گیا ہے اس سے اس وہم کا ازالہ مِنْ کُلِّ الْوُجُوْہ ہو گیا اور معلوم ہو گیا کہ مردوں کی طرح حق تعالیٰ کو عورتوں پر بھی عنایت ہے اور بعض جگہ مذکر و مؤنث کے دونوں صیغے مخلوط لائے گئے ہیں چنانچہ اس آیت میں اِنَّ الْمُسْلِمِیْنَ وَالْمُسْلِمَاتِ وَالْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ وَالْقٰنِتِیْنَ وَالْقٰنِتَاتِ وَ الصّٰدِقِیْنَ وَالصَّادِقَاتِ وَالصّٰبِرِیْنَ والصّٰبِرٰاتِ وَالْخَاشِعِیْنَ وَالْخٰشِعٰاتِ وَ الْمُتَصَدِّقِیْنَ وَالْمُتَصَدِّقَاتِ وَالصَّائِمِیْنَ وَالصَّائِمَاتِ وَالْحٰفِظِیْنَ فُرُوْجَھُمْ وَالْحٰفِظٰتِ وَالذّٰاکِرِیْنَ اللّٰہَ کَثِیْرًا وَالذّٰاکِرَاتِ اَعَدَّ اللّٰہُ لَھُمْ مَغْفِرَۃً وَّاَجْرًا عَظِیْمًا ٥ (توجمہ) بے شک اسلام کے کام کرنے والے مرد اور اسلام کے کام کرنے والی عورتیں اور ایمان لانے والے مرد اور ایمان لانے والی عورتیں اور فرماں برداری کرنے والے مرد اور فرماں برداری کرنے والی عورتیں اور راست باز مرد اور راست باز عورتیں اور صبر کرنے والے مرد اور صبر کرنے والی عورتیں اور خشوع کرنے والے مرد اور خشوع کرنے والی عورتیں اور خیرات کرنے والے مرد اور خیرات کرنے والی عورتین اور روزہ رکھنے والے مرد اور روزہ رکھنے والی عورتیں اور اپنی شرمگاہ کی حفاظت کرنے والے مرد اور حفاظت کرنے والی عورتیں اور بکثرت خدا کو یاد کرنے والے مرد اور یاد کرنے والی عورتیں ان سب کے لئے اللہ تعالےٰ نے مغفرت اور اجر عظیم تیار کر رکھا ہے۔ اس آیت میں مردوں اور عورتوں دونوں کا ذکر دوش بدوش کیا گیا ہے (اور گو عورتوں کی تمنا کا مقتضیٰ یہ تھا کہ اس جگہ صرف عورتوں ہی کا ذکر ہوتا مردوں کا ذکر ان کی ساتھ مخلوط نہ کیا جاتا مگر اس خلط میں اشارہ ہو گیا جواب کی طرف کہ چونکہ اکثر احکام مردوں اور عورتوں میں مشترک ہیں چنانچہ یہی احکام دیکھ لو کہ ان میں کسی کی کچھ تخصیص نہیں اس لئے عورتوں کا ذکر جدا کرنے کی ضرورت نہیں جو احکام مردوں کے لئے ہیں وہی عورتوں کے لئے ہیں ۱۲ جامع)

رہی یہ بات کہ ہر جگہ ایسا ہی کیوں نہ کیا گیا جیسا اس آیت میں دونوں کا ذکر ساتھ ساتھ کیا گیا ہے۔ اس کی دو وجہ ہیں۔ ایک وجہ تصحیح کی۔ اور ایک وجہ ترجیح کی توصیح کی وجہ تغلیب ہے (تغلیب کے معنی یہ ہیں کہ ایک نوع کو دوسری نوع پر غلبہ دے کر ایک کو

ذکر کرکے دونوں کا ارادہ کرلیا جائے (جامع) مثلاً باپ ماں کو والدین یا ابوین کہا کرتے ہیں اسی طرح اہل عرب چاند اور سورج کو قمرین کہدیتے ہیں حالانکہ ابوین کا لفظی ترجمہ ہے دو باپ اور قمرین کا ترجمہ ہے دو چاند۔ ظاہر میں ماں باپ کو ابوین کہنا غلط معلوم ہوتا ہے ان کو اب وام کہنا چاہیئے اسی طرح چاند اور سورج کو قمرین کہنا بھی بظاہر غلط ہے ان کو شمسؐ وقمرؐ کہنا چاہیئے لیکن چونکہ اس طرح عبارت طویل ہوجاتی ہے اس لئے اہل زبان اب وام کی جگہ تغلیباً بغرض اختصار ابوین اور شمس وقمر کی جگہ قمرین کہدیتے ہیں۔ اسی طرح اگر قرآن میں مردوں اور عورتوں کے لئے جدا جدا صیغہ استعمال کیا جاتا تو کلام میں طول ہوجاتا اس لئے تغلیباً صیغہ مذکور ہی میں مؤنث کو بھی داخل کرلیا گیا جس سے کلام میں اختصار پیدا ہوگیا۔ البتہ ایک دو جگہ عورتوں کے وہم مذکور کو دفع کرنے کے لئے اُن کے واسطے جدا صیغے بھی استعمال کئے گئے تاکہ ان کی تسلی ہوجائے اور اتنی مقدار سے ایجاز کلام بھی فوت نہیں ہوتا۔ اور ترجیح کی وجہ یہ ہے کہ عورتیں تابع ہیں مردوں کی ہر طرح سے خلقت کے اعتبار سے بھی۔ چنانچہ آدم علیہ السلام کے ایک جزو سے حوّا علیہا السلام کی پیدائش ہوئی ہے یعنی حق تعالےٰ نے ان کی بائیں پسلی میں سے کوئی مادہ نکالا پھر اس مادہ سے حوّا علیہا السلام کو پیدا کیا جس کا اثر یہ ہے کہ عورتیں عموماً مردوں سے خلقۃً کمزور ہوتی ہیں ان کے تمام قویٰ جسمانی اور دماغی مردوں کی برابر نہیں ہوتے۔ نیز ترتیب کے اعتبار سے بھی وہ مردوں کے تابع ہیں۔ چنانچہ کمانا اور کھیتی کرنا، تجارت کرنا، محنت ومشقت کے کام کرنا مردوں کے متعلق ہے اور پکانا کھانا عورتوں کے متعلق ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ عورتوں کی اصل یہ ہے کہ وہ پردہ دار ہوں اور تعلقات انتظامیہ کے لئے پردہ مانع ہے اس لئے امور انتظامیہ ان کے متعلق نہیں ہوسکتے۔ انتظام کا تعلق مردوں ہی سے ہوسکتا ہے اس وجہ سے تمامتر تعلق انتظام کا مردوں کے سپرد کیا گیا پس جہاں دیگر انتظامات ان کے متعلق ہیں وہاں عورتوں کی اصلاح کا انتظام بھی مردوں کے سپرد کیا گیا اور جب مردوں کے متعلق عورتوں کی اصلاح کا انتظام ہے تو وہ اس کے سردار ہوئے۔ اور یہ قاعدہ ہے کہ سلطنت کی طرف سے جو احکام

صادر ہوا کرتے ہیں ان کے مخاطب سردار ہوتے ہیں رعایا کو مخاطب نہیں کیا جاتا نہ اس کی کچھ ضرورت سمجھی جاتی ہے کیونکہ لوگ خود سمجھ لیں گے کہ جب سرداران احکام کے مخاطب ہیں تو چھوٹے بھی ان کی ساتھ ضرور شریک ہیں پھر سردار اپنے ماتحت لوگوں کو ان احکام کی اطلاع بھی کر دیتے ہیں اور ان سے کام بھی لیتے ہیں۔ اسی طرح قرآن میں اکثر مردوں کو احکام کا مخاطب بنایا گیا ہے چونکہ وہ عورتوں پر سردار ہیں تو ان کے مخاطب ہونے سے عورتوں کا ان احکام میں شریک ہونا خود سمجھ میں آجاتا ہے۔ پھر مردوں کے ذمہ ہے کہ وہ عورتوں کو احکام سے بھی اطلاع کریں اور ان سے کام بھی لیں۔ کیونکہ سرداروں کے ذمہ یہ کام ہمیشہ ہوتا ہے کہ اپنے ماتحت لوگوں کو احکام سلطنت سے مطلع کرتے رہیں اور ان سے کام لیں اگر وہ اس میں کوتاہی کریں گے تو ان سے بھی باز پرس ہوگی۔ افسوس ہے کہ آجکل مردوں نے یہ بات تو یاد کرلی ہے کہ ہم عورتوں کے سردار ہیں مگر ان کو یہ خبر نہیں کہ سردار کے ذائقض کیا ہوتے ہیں وہ نہ تو عورتوں کو احکام سے مطلع کریں اور مطلع کریں کس طرح سردار صاحب کو خود ہی خبر نہیں اور نہ ان سے کام لیں یعنی جن کو احکام معلوم بھی ہیں اور وہ عورتوں کو احکام سے مطلع بھی کرتے ہیں وہ اس کی نگہداشت نہیں کرتے کہ ہمارے گھروں میں ان احکام پر عمل بھی ہو رہا ہے یا نہیں۔ غرض جو احکام ایسے ہیں جن میں اشتراک کی خاصیت ہے جیسے نماز روزہ وغیرہ ان میں مردوں کو خطاب کافی ہے اس تمہید کے بعد یہ بات سمجھ میں آگئی ہوگی کہ اس آیت میں جو کہ میں نے اس وقت تلاوت کی تھی جس طرح حق تعالیٰ نے مردوں کو تکمیلِ دین کا حکم فرمایا ہے اسی طرح وہ حکم عورتوں کے لئے بھی ہے اور جو طریق کمالِ دین کے حاصل کرنے کا مردوں کے لئے اس میں مذکور ہے وہ طریق عورتوں کے لئے بھی ہے۔ پس حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔ یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَکُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ ؕ (ترجمہ) اے ایمان والو! تقویٰ اختیار کرو (خدا سے ڈرو) اور سچے لوگوں کے ساتھ ہو جاؤ۔ یہ تو اس آیت کا ترجمہ ہے۔ اور پہلے بیان میں اس بات کو اچھی طرح ثابت کر دیا گیا ہے کہ تقویٰ اور صدق سے کمالِ دین مراد ہے۔ پس حاصل یہ ہوا کہ اے مسلمانو! دین میں کمال حاصل

کرو اور کاملین کے ساتھ رہو پس اس میں اولاً حق تعالیٰ نے تکمیل دین کا حکم فرمایا ہے پھر اس کا طریق بتلایا ہے کہ دین میں کامل ہونے کا طریقہ یہ ہے کہ جو لوگ رَاسِخُ فِی الدِّیْن (دین میں پختہ) ہیں ان کی صحبت حاصل کرو کیونکہ کاملین کی صحبت سے اعمال میں سہولت بھی ہوتی ہے اس طرح سے کہ ان کی برکت سے تقاضائے نفس مضمحل ہوجاتا ہے جو کہ اکثر اعمال میں مزاحم ہوتا ہے۔ نیز ان کی صحبت سے طریق عمل بھی معلوم ہوجاتا ہے کہ کس عمل کو کس طرح ادا کرنا چاہیئے۔ یہ بات محض مسائل جاننے سے حاصل نہیں ہوتی جب تک کسی کو عمل کرتے ہوئے نہ دیکھا جاوے۔ اور یہ بات کچھ دین ہی کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ دنیوی کاموں میں بھی طریق عمل معلوم کرنے کے لئے اہل کمال کی صحبت ضروری ہے۔ اگر کوئی شخص یوں چاہے کہ محض کتاب دیکھ کر قسم قسم کے کھانے پکانے سیکھ لے تو ایسا نہیں ہوسکتا جب تک وہ کسی ماہر فن سے ہر کھانے کی ترکیب عملی نہ سیکھے گا، اس وقت تک کبھی اس کو کھانا پکانے کا طریقہ معلوم نہ ہوگا۔ اور اگر کسی نے کتاب دیکھ کر عمل شروع بھی کردیا تو اس کو قدم قدم پر دشواریاں پیش آئیں گی چنانچہ جب چاہے اس کا تجربہ کرلیا جائے۔ اور یہی حال ہر عمل کا ہے کہ محض ترکیب جان لینے سے کسی عمل میں کمال حاصل نہیں ہوسکتا بلکہ استاد سے سیکھنے کی ضرورت ہوا کرتی ہے پس دین میں بھی کمال حاصل کرنا صحبت کاملین پر موقوف ہے عادۃ اللہ اسی طرح جاری ہے۔ پس میں نے اسی آیت کو عورتوں میں اس لئے پڑھا ہے تاکہ دو شبہے مرتفع ہوجائیں

لہ احقر جامع عرض کرتا ہے کہ اس آیت سے اشارۃً یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ جب تک دنیا میں قرآن اور اسلام کا وجود ہے اس وقت تک ہر زمانہ میں کاملین کا بھی وجود ضرور رہےگا کیونکہ جب تک دنیا میں قرآن ہے اس وقت تک ہر شخص اس آیت کا مخاطب ہے اور اس آیت میں کمال دین کا طریقہ صحبت کاملین بتلایا گیا ہے بصورت امر جس کا امتثال بدون تحقق کاملین کے نہیں ہوسکتا اور اوامر شرعیہ کے لئے متعذر الامتثال (فرمانبرداری کا دشوار ہونا) ہونا خلاف اصل ہے اس لئے یہ مدعا ثابت ہوگیا کہ ہر زمانہ میں کاملین کا وجود ضرور رہیگا گو وہ قلیل ہی ہوں پس جو لوگ یہ کہدیا کرتے ہیں کہ صاحب آجکل اہل کمال کہاں ہیں اب تو کمال کا حاصل ہونا دشوار ہے یہ آیت اشارۃً ان پر رد کررہی ہے۔ فافہم ۱۲ جامع

ایک آرام طلب عورتوں کا شبہ کہ وہ یوں نہ سمجھیں کہ یہ حکم مردوں ہی کے لیے مخصوص ہے کیونکہ وہی اس کے مخاطب ہیں اور ہم اس سے بچے ہوئے ہیں۔ چنانچہ اکثر عورتوں کا یہ خیال ہے کہ بس خدا نے ہم کو تو کھانا پکانے اور سینے پرونے ہی کے لئے پیدا کیا ہے دین کا کمال حاصل کرنا ہمارا کام نہیں بلکہ مردوں کا کام ہے۔ دوسرے خدا طلب عورتوں کا شبہ کہ وہ اپنے دل میں یوں نہ کہیں کہ بس خدا تعالےٰ کی مردوں ہی پر عنایت ہے ہم کو منہ بھی نہ لگایا۔ ان دونوں شبہوں کا جواب میں تے دیدیا ہے کہ مردوں کو خطاب کرنا اس وجہ سے نہیں کہ عورتیں ان احکام سے مستثنیٰ ہیں اور نہ اس واسطے ہے کہ حق تعالیٰ کو عورتوں پر عنایت نہیں بلکہ خصوصیت خطاب کا منشا کچھ اور ہے جس کو میں مفصلاً بیان کرچکا ہوں۔ پس عورتوں کو جان لینا چاہیئے کہ ان کو بھی حق تعالیٰ کا یہ حکم ہے کہ اپنا دین کامل کرو ہر چند کہ مقصود اتنے ہی بیان سے پورا ہوگیا کیونکہ آیت کا مطلب ظاہر ہے کہ اس میں دین کے کامل کرنے کا حکم ہے اب ہر شخص دیکھ لے کہ دین کیا ہے اور اس کے کیا کیا اجزاء ہیں اس کے بعد سب کاموں کو طریقہ شرعیہ کے موافق بجالانا شروع کردے بس دین کامل ہوجائے گا۔ مثلاً نماز دین کا کام ہے اس کا کمال یہ ہے کہ اچھی طرح پڑھو سورتیں پڑھو جلدی جلدی ادا نہ کرو اطمینان وسکون کے ساتھ پڑھو۔ ایسے ہی زکوٰۃ دین کا کام ہے اور اس کے کمال کا طریقہ یہ ہے کہ سال پورا ہونے کے بعد فوراً ادا کرو اور خوشی سے ادا کرو بیگار مت سمجھو۔ نیز ریا و نمود سے بچو محض رضا حق کو مقصود سمجھو۔ پس دین کے کام اکثر لوگوں کو معلوم ہیں اور ان کے کمال کا طریقہ مسائل پڑھنے سے معلوم ہوسکتا ہے اگر میں اس وقت اجزاء دین کی تفصیل بیان کروں اور ہر اک کے کمال کا طریقہ جدا جدا بتلاؤں تو اس کے لیے عمر طویل بھی کافی نہیں لیکن مقصود کی تعیین تفصیل پر موقوف نہیں اجمالاً سب کو دین کے کاموں کا علم ہے اور ان کے کمال کا طریقہ دریافت کرنے سے معلوم ہوسکتا ہے۔ لیکن اب مجھ کو عورتوں کی غفلت کی شکایت کرنا باقی ہے کہ افسوس ان کو دنیا کی تکمیل کا تو خیال ہے دین کی تکمیل کا مطلق خیال نہیں میرا مقصود یہ ہے کہ عورتوں کو دین کی تکمیل سے بھی غافل نہ ہونا چاہیئے جیسا کہ ان کو اپنے زیور

کپڑے اور مکان کی ضرورت کی تکمیل سے کسی وقت بھی غفلت نہیں ہوتی اور وقتاً فوقتاً مردوں سے اس کے متعلق فرمائشیں کرتی رہتی ہیں اور اگر مرد کسی وقت کسی فرمائش کو غیر ضروری بتلاتے ہیں برتنوں اور مکان کی ضرورتوں کے متعلق اختلاف ہونے لگتا ہے کہ مرد یوں کہتے ہوں کہ ان چیزوں کی ضرورت نہیں اور مستورات کے نزدیک ان کی ضرورت ہو تو ایسے موقع پر عورتیں کہدیا کرتی ہیں کہ تم کو ان چیزوں کی کیا خبر تم کو گھر میں رہنا تھوڑا ہی ہے اس کو تو ہم تم سے زیادہ جانتے ہیں اور بعض دفعہ تو عورتوں کا یہ کہنا صحیح ہوتا ہے کیونکہ واقعی مردوں کو ان ضرورتوں کا علم پوری طرح نہیں ہوتا اور بعض دفعہ اس اختلاف کا سبب یہ ہوتا ہے کہ مردوں میں قناعت کا مادہ عورتوں سے زیادہ ہے مرد تھوڑے سے سامان میں بھی گذر کر لیتا ہے اور عورتوں میں قناعت کا مادہ ہے ہی نہیں ان کی طبیعت میں بکھیڑا بہت ہے اُن سے تھوڑے سامان میں گذر ہوتا ہی نہیں جب تک سارا گھر سامان سے بھرا بھرا نظر نہ آوے۔ مردوں کے نزدیک تو ضرورت کا درجہ یہ ہے کہ جس کے بغیر تکلیف ہو سو اتنا سامان تو اکثر متوسط الحال لوگوں کے گھروں میں بحمداللہ موجود ہوتا ہی ہے اس لئے مردوں کو اُس سے زیادہ کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔ ہاں اگر خدا وسعت دے تو اس کا بھی مضائقہ نہیں کہ اتنا سامان جمع کر لیا جاوے جس سے زیادہ راحت نصیب ہو۔ یہ درجہ مردوں کے نزدیک کمال کا مرتبہ ہے مگر عورتوں کے نزدیک ضرورت کا درجہ تو کوئی چیز ہی نہیں مرد جس کو ضرورت کا درجہ سمجھتے ہیں وہ عورتوں کے نزدیک قلت اور تنگی کا درجہ ہے ان کے نزدیک ضرورت کا درجہ وہ ہے جس کو مرد کمال کا درجہ سمجھتے ہیں اور کمال کا درجہ وہ ہے جو حقیقت میں ہوس کا درجہ ہے اور اس کا منشا یہ ہے کہ عورتوں میں ناشکری کا مادہ زیادہ ہے۔ اگر خدا تعالیٰ ان کو ضرورت کے موافق سامان عطا فرما دیں تو یہ اس کو غنیمت نہیں سمجھتیں نہ اس پر خدا کا شکر کرتی ہیں بلکہ ناشکری کرتی رہتی ہیں کہ ہائے ہمارے پاس کیا ہے کچھ بھی نہیں۔ حدیث میں بھی ان کی اس صفت کا تذکرہ آیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ناشکری کا مادہ عورتوں میں ہمیشہ سے ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ

وسلم فرماتے ہیں لَوْ اَحْسَنْتَ اِلٰی اِحْدَاهُنَّ الدَّهْرَ ثُمَّ رَأَتْ مِنْكَ شَيْئًا قَالَتْ مَا رَأَيْتُ مِنْكَ خَيْرًا قَطُّ۔ کہ اگر تم کسی عورت کے ساتھ عمر بھر اچھا برتاؤ کرتے رہو پھر کبھی ایک دفعہ کوئی خلاف مزاج بات دیکھ لے تو وہ یوں کہے گی کہ میں نے تجھ سے کبھی بھلائی نہیں دیکھی بس ذرا سی بات میں ساری عمر کے احسانات فراموش کر جاتی ہیں۔ جہاں کسی دن ان کو شوہر کے گھر میں کھانے پہننے کی تنگی ہوئی اور انہوں نے اس کو منہ پر لانا شروع کیا کہ اس نگوڑے گھر میں آکر تو میں نے سدا تنگی ہی دیکھی۔ باپ ماں نے مجھے جان بوجھ کر کنوئیں میں دھکا دیدیا میں نے اس منحوس گھر میں کیا آرام دیکھا۔ غرض جو منہ میں آتا ہے کہہ ڈالتی ہیں اور اس کا ذرا خیال نہیں کرتیں کہ آخر اسی گھر میں ساری عمر میں نے عیش برتا ہے مجھے اس کو نہ بھولنا چاہئے۔ اور خدا کا شکر کرنا چاہئے کہ اس نے کلفت آج ہی دکھلائی اور زیادہ زمانہ عیش میں گذارا۔ سو عورتوں میں چونکہ ناشکری کا مادہ زیادہ ہے اس لئے ان کو تھوڑے سامان پر قناعت نہیں ہوتی چنانچہ دیکھا جاتا ہے کہ بعض عورتوں کے پاس سال بھر کے کپڑے موجود ہوتے ہیں جو صندوق میں بھرے رکھے ہیں لیکن پھر بھی کیا مجال ہے کہ پھیری والا بزاز ان کے گھر کے سامنے سے خالی گذر جائے جہاں بزاز کی آواز سنیں گی فوراً اس کو دروازہ پر بٹھلا کر اور کپڑا پھرڑوالیں گی۔ برتن گھر میں ضرورت سے زیادہ موجود ہوں گے مگر پھر بھی ان کی فرمائشوں کا سلسلہ ختم نہ ہوگا۔ واعظوں کا بیان بڑا لچھے دار ہوتا ہے۔ دہلی میں مولانا عبدالرب صاحبؒ ایک واعظ تھے وہ عورتوں کی اس صفت کو بڑے لچھے دار فقروں میں بیان کیا کرتے تھے کہ ان عورتوں کی یہ عادت ہے کہ ان کے پاس چاہے کتنے ہی کپڑے ہوں مگر جب پوچھئے کہ تمہارے پاس کتنے کپڑے ہیں تو یوں ہی کہیں گی کہ میرے پاس کیا ہیں دو چیتھڑے اور جوتوں کے چاہے کتنے ہی جوڑے ہوں مگر جب پوچھو یوں ہی کہیں گی کیا ہیں دو لیترے اور برتن چاہے کتنے ہی ضرورت سے زیادہ ہوں مگر جب پوچھو یوں ہی کہیں گے کیا ہیں دو ٹھیکرے ٹھیکر تیسرے یہ تو مولوی صاحب کا لطیفہ ہے مگر حقیقت میں عورتوں کی عادت کا فوٹو انہوں نے خوب کھینچا۔ غرض ان کو دنیا کی تکمیل کی بہت زیادہ فکر ہے ہر وقت اسی دھن میں رہتی ہیں۔

ان کی ہوس کبھی پوری نہیں ہوتی ۔ زیور کی ہوس کا یہ حال ہے کہ بعض عورتیں سر سے پیر تک لدی پھدی رہتی ہیں مگر پھر بھی بس نہیں اگر نیا زیور نہ بنوائیں گی تو پہلے ہی زیور کی توڑ پھوڑ میں روپیہ برباد کرتی رہیں گی، آج ایک زیور بڑے شوق سے بنوایا تھا کل کو کسی عورت کے پاس وہی زیور دوسرے نمونہ کا دیکھ لیا تو اب ان کو توڑ پھوڑ کی بیکلی لگتی ہے کہ میں بھی اسی نمونہ کا بنواؤں گی مگر آج کل کچھ دنوں سے نوعمر لڑکیوں میں زیور کا شوق کم ہو گیا ہے ۔ یہ نیا فیشن چلا ہے کہ نوعمر لڑکیاں آجکل کان وغیرہ ننگے رکھتی ہیں یہاں بھی یہ اثر ضرور ہوگا یہاں کی مجھ کو زیادہ تحقیق نہیں مگر جب قصبات میں یہ اثر پہونچگیا ہے تو شہروں میں بھی ضرور ہوگا ۔ چاندی کا زیور تو آجکل عیب شمار ہونے لگا یہ تو نینوں جُلاہیوں کا زیور رہگیا ۔ شرفا کی لڑکیاں صرف سونے کا زیور پہنتی ہیں وہ بھی صرف کانوں میں دو ہلکے ہلکے بُندے ہیں اور سارا بدن زیور سے ننگا ہے ۔ ہاں پیروں میں کچھ چاندی بھی ڈال لیتی ہیں کیونکہ وہ حقیر چیز ہے پیروں ہی میں رہنی چاہیئے تو آجکل زیور میں لڑکیوں نے اختصار کر لیا ہے اور اس مذاق کی ابتدا میموں کے اتباع سے ہوئی ہے ۔ میمیں زیور نہیں پہنتیں کیونکہ ان کی قوم میں اس کا رواج نہیں ۔ حکمران قوم ہے ان کو دیکھ دیکھ کر ہندوستانی عورتوں میں بھی یہ مذاق پیدا ہو گیا اور ان کو میموں کا طرز اس طرح معلوم ہوا کہ آجکل جا بجا شفاخانے کھلے ہوئے ہیں جن میں زنانے شفاخانے بھی ہیں ہندوستانی عورتیں وہاں جا کر میموں سے علاج کراتی ہیں اس ذریعے سے ان کے پاس آمد و رفت ہوتی ہے اور جو زیادہ وسعت والے ہیں وہ میموں کو اپنے گھروں پر بلاتے ہیں ۔ دوسرے آجکل ریلوں میں بھی عورتیں سفر کرتی ہیں اسٹیشنوں پر میمیں نظر پڑ جاتی ہیں علم اجمالی تو اس طرح حاصل ہوا ۔ پھر تفصیلی علم شفاخانوں میں جا کر یا ان کو گھر پر بلانے سے ہو گیا ۔ پھر بعض عورتوں پر تو میموں کا اثر بلا واسطہ ہوا اور بعض پر بواسطہ ہوا کہ ایک نے تو میموں کو دیکھ کر ان کا طرز اختیار کیا پھر اس کو دیکھ دیکھ کر دوسریوں نے اپنا رنگ بدلا ۔ لوگ اس میں احتیاط نہیں کرتے اور یوں سمجھتے ہیں کہ یہ تو عورتیں ہیں ان سے کیا احتیاط اس لئے بے تکلف میموں سے علاج کراتے ہیں حالانکہ میمیں مردوں سے زیادہ قابل احتیاط ہیں کیونکہ مردوں سے تو مردوں کو

سابقہ پڑتا ہے اور مردوں میں تاثر کا مادہ کم ہے وہ ان کی باتوں سے متاثر بہت کم ہوتے ہیں اور میموں سے عورتوں کو سابقہ پڑتا ہے اور ان میں تاثر کا مادہ زیادہ ہے یہ ہر نئی چیز سے بہت جلد متاثر ہوتی ہیں پھر میموں کی طرز تقریر میں ایک خاص بات ہوتی ہے جو ہندوستانی عورتوں میں نہیں ہوتی اس لئے وہ میموں کی باتوں سے بہت جلد متاثر ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ ایک دیندار عورت نے اس حقیقت کو خوب سمجھا۔ اس کی آنکھ میں کچھ نقصان تھا ڈاکٹر کو آنکھ دکھانے سے وہ انکار کرتی تھی اور یہ کہتی تھی کہ آنکھ ہی کی تو شرم ہے جب غیر مرد کے سامنے آنکھ ہو گئی پھر پردہ کاہے کا رہا۔ پھر اس نے ایک میم کو اپنی آنکھ دکھائی اس نے دیکھ کر کہا کہ میں اس علاج میں ماہر نہیں ہوں تم کو ڈاکٹر صاحب کو آنکھ دکھانا چاہیئے اس نے ڈاکٹر کو دکھانے سے انکار کیا اس پر میم نے ایسی تقریر کی کہ ان کی رائے فوراً بدل گئی اور ڈاکٹر کو دکھانے کے لئے تیار ہو گئیں پھر ان کو تنبہ ہوا اور عہد کیا کہ اب ساری عمر بھی ان میموں کا منہ کبھی نہ دیکھوں گی کہ اس ساحرہ نے تو میری عمر بھر کی غیرت و حیا کو ایک منٹ میں اپنی تقریر سے مغلوب کر دیا کہ اس وقت مجھے ڈاکٹر کے سامنے آنے سے بھی غیرت مانع نہ ہوتی تھی ان کا کیا اعتبار یہ ظالم تو اپنی تقریر سے کسی کا دین بھی بدل دیں تو تعجب نہیں۔ صاحبو! اس بات کو معمولی نہ سمجھو اس کی بہت احتیاط ضروری ہے خصوصاً یہ جو مشن کی میمیں ہیں ان سے تو بہت ہی احتیاط لازم ہے یہ اپنے مذہب کی تبلیغ بڑی باریکی سے کر دیتی ہیں کہ سننے والے کو پتہ بھی نہیں چلتا مگر اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ مخاطب کے ذہن میں ان کے مذہب سے نفرت نہیں رہتی اور بعض دفعہ تو علاج کے ساتھ ساتھ وہ مذہبی گفتگو بھی صاف صاف کرتی رہتی ہیں۔ میں نے بہت واقعات ایسے سُنے ہیں کہ بعض عورتوں نے میموں کا علاج شروع کیا پھر ان پر ایسا اثر پڑا کہ کمبختوں نے دین بدل دیا۔ بعض نے دین نہیں بدلا تو پردہ کرنا چھوڑ دیا اور بعض نے لباس اور زیور وغیرہ میں ان کا طرز اختیار کر لیا ہے یہ تو سب سے ادنیٰ اثر ہے اور اب روز بروز اس کی زیادتی ہے۔ علاج کرانے کا کافر عورت سے مضائقہ نہیں مگر اس میں چند باتوں کا خیال رکھیں۔

(۱) ان سے بجز علاج معالجہ کے اور کوئی بات نہ کریں۔ (۲) ضرورت کے سوا

زیادہ میل جول نہ بڑھادیں ان سے بہناپا نہ کریں آجکل تو غضب یہ ہے کہ جس گھر میں ایک دفعہ میم صاحب کا قدم آجاتا ہے پھر وہ روز کے روز اسی میں کھڑی نظر آتی ہیں اگر وہ خود بھی نہ آئی تو گھر والیاں بلاتی ہیں اس کی بہت سختی کے ساتھ بندش کرنی چاہیئے۔ (۳) اگر وہ مذہبی باتیں شروع کرے تو فوراً روک دینا چاہیئے یا کم از کم سننا نہ چاہیئے اور اگر وہ کسی بات کا جواب مانگے تو صاف کہدو کہ شہر میں علماء موجود ہیں تم ان سے جاکر کہو وہ تم کو ہر بات کا جواب دیں گے۔ (۴) اور ایک بات کا خاص ایسی ہے جس کی طرف اکثر عورتیں تو کیا خاص خاص مرد بھی توجہ نہیں کرتے وہ یہ کہ جن مواضع جسم کا چھپانا نامحرم مرد سے فرض ہے کافر عورتوں سے بھی ان کا چھپانا فرض ہے۔ مثلاً سر کا کھولنا یا گلا کھولنا نامحرموں کے سامنے جائز نہیں۔ ان مواضع کا کھولنا کافر عورت کے سامنے بھی بلا ضرورت معالجہ کے حرام ہے البتہ اگر ان مواضع کو علاج کی غرض سے کھولنا پڑے تو جائز ہے لیکن بلا ضرورت ہرگز نہ کھولنا چاہیئے جس کی دلیل حق تعالےٰ کا یہ ارشاد ہے۔ اَوْ نِسَآءِهِنَّ اس سے پہلے حق تعالےٰ نے ان لوگوں کا ذکر کیا ہے جن کے سامنے عورتوں کو آنا جائز ہے چنانچہ ارشاد ہے لَا جُنَاحَ عَلَيْهِنَّ فِیْٓ اٰبَآئِهِنَّ وَلَآ اَبْنَآئِهِنَّ وَلَآ اِخْوَانِهِنَّ وَلَآ اَبْنَآءِ اِخْوَانِهِنَّ وَلَآ اَبْنَآءِ اَخَوٰتِهِنَّ وَلَا نِسَآئِهِنَّ وَلَا مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُنَّ وَاتَّقِيْنَ اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدًا ؀ (پیغمبر کی بیبیوں پر اپنے باپوں کے بارے میں کوئی گناہ نہیں اور نہ اپنے بیٹوں کے اور نہ اپنے بھائیوں کے اور نہ اپنے بھتیجوں کے اور نہ اپنے بھانجوں کے اور نہ اپنی عورتوں کے اور نہ اپنی لونڈیوں کے اور خدا سے ڈرتی رہو بے شک اللہ ہر چیز پر حاضر ناظر ہے)

اور سورۂ نور میں ارشاد ہے۔ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا لِبُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اٰبَآئِهِنَّ اَوْ اٰبَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اَبْنَآئِهِنَّ اَوْ اَبْنَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِیْٓ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِیْٓ اَخَوٰتِهِنَّ اَوْ نِسَآئِهِنَّ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُنَّ الآیۃ (**ترجمہ**) اور اپنی زینت (کے مواقع) کو (کسی پر) ظاہر نہ ہونے دیں مگر اپنے شوہروں پر یا اپنے باپ پر یا اپنے شوہر کے باپ پر یا اپنے بیٹوں پر یا اپنے شوہر کے بیٹوں پر یا اپنے بھائیوں پر (خواہ حقیقی ہوں یا علاتی یا اخیافی اور چچا زاد، ماموں زاد بھائی وغیرہ مراد نہیں) یا

اپنے بھائیوں کی اولاد پر یا اپنی بہنوں کی اولاد پر (یہاں بھی حقیقی و علاتی و اخیافی بہنیں مراد ہیں۔ چچازاد و ماموں زاد بہنیں مراد نہیں) یا اپنی عورتوں پر (مراد مسلمان عورتیں ہیں کیونکہ وہی اپنی کہلاتی ہیں) یا اپنی باندیوں پر (مطلقاً خواہ کافر ہوں یا مسلمان) الآیۃ تو ان آیتوں میں یہ نہیں فرمایا اَوِ النِّسَاءِ اگر اس طرح فرماتے تو یہ مطلب ہوتا کہ مسلمان عورتوں کو سب عورتوں کے سامنے آنا اور اپنے مواقع زینت کا کھولنا جائز ہے بلکہ حق تعالیٰ نے اَوْ نِسَآئِهِنَّ فرمایا ہے جس کا ترجمہ ہے اپنی عورتیں اور باتفاق مفسرین اپنی عورتیں وہی ہیں جو مسلمان ہیں۔ پس مطلب یہ ہوا کہ مسلمان عورتوں کو مسلمان کے سامنے اپنی زینت کے مواقع کا کھولنا جائز ہے کافر عورتوں کے سامنے گلا اور سر اور کلائیاں اور پنڈلیاں کھولنا جائز نہیں اس میں بکثرت مستورات مبتلا ہیں وہ یہ سمجھتی ہیں کہ عورتوں سے کیا پردہ حالانکہ شریعت میں کافر عورتوں کا حکم مثل اجنبی مرد کے ہے۔ میموں سے تو ان کو کبھی کبھار ہی واسطہ پڑتا ہے مگر اکثر بھنگنوں، چماریوں یا کنجڑیوں یا پٹونوں سے بہت واسطہ پڑتا ہے یہ عورتیں رات دن گھروں میں گھسی رہتی ہیں ان سے بہت کم احتیاط کی جاتی ہے سو خوب سمجھ لو کہ یہ عورتیں مثل اجنبی مرد کے ہیں ان کے سامنے بدن کا کھولنا ایسا ہی ہے جیسا کہ غیر مردوں کے سامنے بدن کھولنا پس ان سے تمام بدن کو احتیاط کے ساتھ چھپاؤ۔ صرف منہ اور قدم اور گٹے تک ہاتھ کھولنا ان کے سامنے جائز ہے باقی تمام بدن کا چھپانا فرض ہے خصوصاً سر کھول کر گھر میں پھرنے کا عورتوں کو زیادہ مرض ہے تو ان عورتوں کو آنے کے وقت تمام سر کو چھپا لینا چاہیئے کہ بال تک بھی ان کو نظر نہ آویں اس کی طرف عورتوں کو بالکل التفات نہیں جس کا سبب یہ ہے کہ ان کو احکام کی طرف توجہ کم ہے دنیا ہی میں ہر وقت لگی رہتی ہیں ان کو اپنے زیور کپڑے سے اتنی بھی فرصت نہیں ملتی کہ تھوڑی دیر کے لئے کوئی کتاب مسائل کی پڑھ لیا کریں میں یہ کہہ رہا تھا کہ ان میموں وغیرہ سے عورتوں کو بچنا چاہیئے بلا ضرورت ان سے ہرگز نہ ملیں نہ اپنے گھر پر بلاویں اور اس کا پورا انتظام مردوں کو کرنا چاہیئے ان عورتوں کے اختلاط کا بہت بُرا نتیجہ ہے مستورات کو ان کی اوضاع و اطوار سے بچنا چاہیئے۔ چنانچہ انہی کے اوضاع میں سے ایک اثر یہ بھی ہے کہ نوعمر لڑکیوں کو زیور کا خیال کم ہو گیا ہے۔

اس کا منشا کفایت شعاری ہرگز نہیں کیونکہ پہلی ساری کفایت شعاری زیور ہی میں رہ گئی۔ اچھا کپڑوں میں کفایت شعاری کیوں نہیں کی جاتی۔ جو لڑکیاں زیور کم پہنتی ہیں وہ کپڑوں میں بڑی رقم صرف کرتی ہیں اسی طرح گھر کی آرائش اور زینت میں بھی خرچ کی پروا نہیں کرتیں اس سے معلوم ہوا کہ ان کا مقصود محض میموں کا اتباع ہے جس چیز میں وہ رقم صرف نہیں کرتیں اس میں یہ بھی صرف نہیں کرتیں اور جس میں ان کو زیادہ غلو ہے اس میں یہ بھی خرچ کی پروا نہیں کرتیں بلکہ یہ مذاق اس درجہ غالب ہوا ہے کہ جن عورتوں میں مالی وسعت زیادہ بھی نہیں ہے وہ معمولی کپڑوں اور معمولی زیوروں ہی میں ایسی تراش خراش کرتی ہیں اور ایسی وضع سے ان کو بناتی ہیں جس سے وہ میم کی طرح نظر آنے لگیں۔ پس ایسی حالت میں ان کو زیور کا خیال کم ہونا کچھ باعث مسرت نہیں بلکہ یہ تو اس کا مصداق ہو گیا ؎

اگر غفلت سے باز آیا جفا کی
تلافی کی بھی ظالم نے تو کیا کی

اگر یہ اپنی پرانی وضع پر قائم رہیں پھر زیور کا شوق کم کر دیں اس وقت البتہ خوشی کی بات ہے اور جن لڑکیوں میں یہ مذاق نہیں آیا ان کی حالت یہ ہے کہ زیور سے کسی وقت ان کا پیٹ ہی نہیں بھرتا کانوں میں بالے بھی ہیں بالیاں بھی ہیں پتے بھی ہیں ان کو کچھ حس ہی نہیں کہ اس سے کان ٹوٹیں گے یا کیا ہو گا۔ چاہے کان جھک پڑیں مگر ان کو سب زیور لادنا فرض ہے۔ ناک میں نتھ بھی ہے اور لونگ بھی ہے پھر چاہے لونگ سے ناک میں آگ ہی لگ جائے مگر کیا مجال جو کسی وقت اتر لے۔ پھر اس زیور کے شوق میں ان کو ساری مصیبتیں آسان ہو جاتے ہیں۔ یعنی کان چھدوانے میں کتنی تکلیف ہوتی ہے مگر لڑکیاں ہنسی خوشی سب کام کر لیتی ہیں بلکہ اگر کوئی ان سے یہ کہے کہ کان چھدوا کر کیا لو گی خوامخواہ تکلیف اپنے سر مول لیتی ہو کان مت چھدواؤ تو اس سے لڑنے کو تیار ہو جاتی ہیں۔

میرے ایک دوست ہیں ان کو اپنی لڑکی سے بہت محبت تھی ایک دن وہ مجھ سے کہنے لگے کہ اگر میں اس بچی کے کان نہ چھدواؤں تو کچھ حرج تو نہیں۔ مجھے اس کی تکلیف سے بہت تکلیف ہوتی ہے میں نے کہدیا کہ نہیں حرج کیا ہوتا۔ یہ خبر کہیں اس لڑکی کو بھی پہنچ گئی

مجھ پر بڑی خفا ہوئی کہ اپنی بیوی اور ماں بہن کو نہیں دیکھتے بھلا یہ مسئلہ میرے ہی واسطے نکالا پہلے اپنے گھر والوں کو اس کی تعلیم دی ہوتی میں تو ضرور کان چھدواؤں گی۔ وہ دوست میرے پاس آئے کہ صاحب اس لڑکی نے وہ بات سن لی تو آپ پر بڑی خفا ہوئی۔ میں نے کہا بھائی تم اُس کے ایک ایک کی جگہ دو دو سوراخ کرادو۔

ایک بنئے کا قصہ مشہور ہے کہ اس نے اپنی بیوی سے کہا کہ ذرا سل کا باٹ اٹھالا اس نے کہا مجھ سے سل کا باٹ کیونکر اٹھے گا بھاری پتھر ہے کہیں میری کمر میں لچک نہ آجاوے اُس نے پتھر تو خود اٹھالیا لیکن سل کو کسی بہانہ سے باہر لے گیا اور ایک سنار کو بلاکر کہا کہ اس سل کے اوپر سونے کے پتر خوبصورتی کے ساتھ جڑدے اور اس میں ایک مضبوط زنجیر ڈالدے جب وہ تیار ہوکر آگئی تو اُسی بیوی کو لاکر دی کہ لو ہم نے تمہارے واسطے ایک ہینکل بنوایا ہے اسے پہن لو تو اُسے خوش ہوکر اسے گلے میں ڈال لیا اور گلے میں لٹکائے پھرنے لگی گردن بوجھ سے جھکی جاتی تھی مگر زیور کے شوق میں سب تکلیف گوارا تھی اس کے بعد بنئے نے نکال جوتہ خوب خبر لی کہ کمبخت اُس روز تو تجھ سے سل کا باٹ بھی نہ اوٹھتا تھا اور آج تو اسی سل کو گلے میں لٹکائے پھرتی ہے آج تیری کمر میں کچھ نہیں ہوتا۔ خیر یہ قصہ تو گھڑا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ مگر جس نے تصنیف کیا ہے اُس نے عورتوں کے مذاق کو خوب سمجھا ہے۔ حقیقت میں ان کو زیور کی حرص ایسی ہی ہے کہ اگر سونے کا زیور بہت بھاری بھی ہو تو یہ کبھی اس کے پہننے سے انکار نہ کریں گو گردن اور گلا کیسا ہی دکھتا رہے اور یوں تو عورتوں میں زیور کپڑے کی حرص طبعی طور پر ہوتی ہی ہے لیکن آپس میں ملنے ملانے سے یہ حرص اور بڑھ جاتی ہے اُن کا آپس میں ملنا جلنا بڑا غضب ہے ایک دوسری کو دیکھ کر رنگ پلٹتی ہے اگر کسی کو خدا تعالےٰ نے زیور اور کپڑا حیثیت کے موافق دے رکھا ہو تو وہ اسی وقت تک خوش ہے جب تک برادری کی بہنوں میں نہ جائے اور جہاں برادری میں نکلنا ہوا پھر ان کی نظر میں اپنا زیور اور کپڑا حقیر معلوم ہونے لگتا ہے دوسروں کا زیور دیکھ کر ان کا دل للچاتا ہے کہ ہمارے پاس بھی ایسا ہی ہونا چاہیئے اور اس میں اپنی حیثیت پر بھی ان کو نظر نہیں ہوتی کہ جس کے پاس ہم سے زیادہ زیور ہے اس کی حیثیت کیا ہے جس کے مرد کی آمدنی پچاس روپے ماہوار ہے

وہ بھی برابری کرتی ہے اس کی جس کے مرد کی آمد فی ہزار روپیہ ماہوار ہے۔ عورتوں پر ملنے جلنے کا ایسا اثر ہوتا ہے کہ سہارنپور میں ایک کورٹ انسپکٹر تھے جن کی تنخواہ چارسو یا چھسو روپے ماہوار تھی مگران کی عادت یہ تھی کہ ساری تنخواہ اپنے غریب رشتہ داروں میں خرچ کرتے تھے گھر میں کم رکھتے تھے۔ ان کی بیوی کے پاس زیور کا ایک چھلا بھی نہ تھا گھر میں نہ کوئی خادمہ تھی بیچاری اپنے ہاتھ سے آٹا پیستی تھی اور خود ہی پکاتی تھی اور اسی حالت میں خوش تھی۔ میرے ایک عزیز بھی اس زمانہ میں سہارنپور میں ملازم تھے اور ان کا مکان کورٹ انسپکٹر صاحب کے مکان سے متصل ہی تھا وہ اپنی بیوی کو کسی کے یہاں بھیجتے نہ تھے مگر ایک دفعہ ان عزیز کے گھر والوں کے اصرار پر انہوں نے ملنے کی اجازت دی۔ وہ جو یہاں آئی تو اس نے یہاں باندیوں کو بھی اپنے سے اچھا پایا ان کے پاس بھی کچھ زیور تھوڑا بہت تھا اور کورٹ انسپکٹر کی بیوی کے پاس چھلا تک نہ تھا بس یہاں سے جاکر اس نے اپنے میاں کی خوب خبر لی کہ واہ سررشتہ دار صاحب کی تنخواہ بھی تم سے کم ہے پھر بھی ان کے گھر والے زیور میں لدے پھدے ہیں اور میں بالکل ننگی ہوں اور ان کی بیوی اپنے ہاتھ سے ایک کام بھی نہیں کرتی ایک چھوڑ کئی کئی باندیاں ہیں سارا کام وہی کرتی ہیں اور میں سارا کام اپنے ہاتھ سے کرتی ہوں۔ اب تو مجھ سے اس طرح نہیں رہا جاتا تم مجھے بھی زیور بنا کر دو اور عمدہ لباس بنا کر دو اور گھر میں خادمہ نوکر رکھو۔ وہ کورٹ انسپکٹر پھر مجھ سے الہ آباد میں ملے تھے بے چارے کہتے تھے کہ شیخ کامل کی صحبت کا اثر ایک منٹ میں ایسا ہوا کہ میرا ساری عمر کا اثر فوراً زائل ہو گیا۔ اب میرے گھر میں رات دن زیور کی فرمائش کرتی ہے اور کوئی کام خود نہیں کرتی۔ زیور بناتا بناتا تھک گیا مگر سلسلہ ختم ہی نہیں ہوتا اور میری ساری خیر خیرات بند ہو گئی۔

اسی لئے میں کہتا ہوں کہ ان کا آپس میں ملنا جلنا بڑا غضب ہے۔ اور میں یہ نہیں کہتا کہ مستورات کا آپس میں ملنا جلنا بالکل بند کر دو۔ میرا مطلب یہ ہے عورتوں کو اپنے اس مرض کی اصلاح کرنی چاہیئے اگر کسی کا دل دوسروں کے زیور، کپڑے دیکھ کر نہ للچائے اس کو ملنے جلنے کا مضائقہ نہیں مگر جس پر دوسروں کو دیکھ کر برا اثر ہو اُس کو ضرور نہ ملنا چاہیئے۔ قرآن شریف میں عورتوں کو حکم ہے وَقَرْنَ فِیْ بُیُوْتِکُنَّ کہ تم اپنے گھروں میں جم کر بیٹھی ہو

اس میں تقسیم اَلْآحَادُ عَلَی الْآحَاد (اکائی کی تقسیم اکائی پر) ہے جس سے یہ مطلب حاصل ہوا کہ ہر عورت اپنے گھر میں جم کر بیٹھی رہے اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ عورتوں کے لئے اصلی حکم یہی ہے کہ وہ اپنے اپنے گھروں سے باہر نہ نکلیں نہ عورتوں سے ملنے کے لئے نہ مردوں سے ملنے کے لئے۔ پھر آخر کچھ تو بات ہے جو حق تعالیٰ نے عورتوں کو گھر میں رہنے کا حکم دیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ گھر سے باہر نکلنا ان کے لئے مضر ہے (لیکن مواقع ضرورت اس سے مستثنیٰ ہیں ۱۲) پس جس کو ملنے جلنے سے یہ ضرر ہوتا ہوا اس کے لئے یہی حکم ہوگا کہ وہ کسی سے نہ ملے اپنے گھر ہی میں بیٹھی رہے ہاں جس کو ضرر نہ ہوتا ہو وہ اپنے خاوند کی اجازت سے دوسروں کے گھر جا سکتی ہے۔

بیبیو! آخر تم کھجلی والوں سے تو بچتی ہو اور ان کے پاس بیٹھنا اور اُن سے ملنا جُلنا تم کو گوارا نہیں ہوتا کہ کہیں ہم کو بھی کھجلی نہ ہو جاوے اور یہ حالت تو کھجلی سے بھی بدتر ہے کھجلی کا ضرر تو محض جسمانی ہے اور اس کا ضرر جسمانی بھی ہے اور روحانی بھی۔ جسمانی ضرر تو یہ ہے کہ جب تم دوسری عورتوں کو اپنے سے اچھی حالت میں دیکھو گی اور ان جیسا بننا چاہو گی اور تمہاری حیثیت اُن کی برابر نہیں ہے تو تم کو خوامخواہ اس سے اُلجھن اور پریشانی ہوگی اور رات دن تم اسی فکر میں گھلو گی کہ ہائے میرے پاس بھی یہ چیز ہوتی وہ ہوتی پھر بعض دفعہ تم مردوں سے بھی اس قسم کی فرمائش کرو گی جو ان کی حیثیت سے زیادہ ہے اُن کو یہ فرمائش ناگوار ہوگی جس سے خوامخواہ دلوں میں کدورت پیدا ہوگی جس سے بعض اوقات بہت دور تک نوبت پہونچ جاتی ہے اور روحانی ضرر یہ ہے کہ اس سے ناشکری کا مرض بڑھتا ہے۔ جب تم دوسروں کو اپنے سے بڑھا ہوا دیکھو گی تو اُن نعمتوں کی قدر نہ کرو گی جو خدا تعالےٰ نے تم کو عطا فرمائی ہیں۔ ہمیشہ یہی سمجھو گی کہ میرے پاس کیا ہے کچھ بھی نہیں۔ اس لئے جس پر ملنے کا ایسا اثر پڑتا ہو اس کو یہی حکم دیا جائے گا کہ وہ کسی سے نہ ملے اور اگر ملے تو غریب نادار عورتوں سے ملے کیونکہ غریبوں سے مل کر تمہارا جی خوش ہوگا اور خدا کا شکر کرو گی کہ الحمد للہ میں بہت سی عورتوں سے اچھی حالت میں ہوں اور یہی نکتہ ہے اس حدیث میں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا یا عَائِشَۃ قَرِّبِي الْمَسَاكِيْنَ وَجَالِسِيْهُمْ

کہ اے عائشہؓ مساکین کے پاس بیٹھا کرو اور ان کو اپنے سے نزدیک کیا کرو۔ مساکین کے پاس بیٹھنے سے خدا کی نعمتوں کی قدر ہوتی ہے اور دل خوش رہتا ہے۔ ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ امرا کے پاس بیٹھنے سے دن بدن میری پریشانی بڑھتی رہی اور میں یہ سمجھتا تھا کہ میرے اوپر خدا کی کچھ بھی نعمت نہیں پھر میں نے غربا کے پاس بیٹھنا شروع کیا تو میں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا بادشاہ ہوں اور میری ساری پریشانی دور ہوگئی اور خوشی بڑھ گئی۔ اسی لئے حدیث میں ہے کہ دین کے باب میں انسان کو اپنے سے اونچے کو دیکھنا چاہیئے جو اس سے زیادہ دیندار ہو اور دنیا کے باب میں اپنے سے نیچے کو دیکھنا چاہیئے مگر آج کل معاملہ برعکس ہے لوگ دین کے باب میں تو ان لوگوں پر نظر کرتے ہیں جو زیادہ کام نہیں کرتے پھر اپنے دل کو سمجھا لیتے ہیں کہ اگر ہم رات کو نہیں اٹھتے تو کیا ہوا فلاں مولوی صاحب بھی تو رات کو نہیں اٹھتے اگر ہم عمدہ عمدہ کپڑے پہنتے ہیں تو کیا ہوا فلاں شاہ صاحب بھی تو بڑا عمدہ لباس پہنتے ہیں۔ دین کے باب میں لوگ اُن بزرگوں کو نہیں دیکھتے جن کا تہجد کبھی قضا نہیں ہوتا اور بیچارے معمولی حیثیت میں رہتے ہیں اور دنیا کے بارہ میں ہمیشہ اپنے سے زیادہ پر نظر کرتے ہیں کہ ہائے میں فلاں رئیس کے برابر نہ ہوگیا، فلاں سوداگر کے برابر نہ ہوا۔ جس سے بجز پریشانی بڑھنے کے اور کچھ نہیں ہوتا۔ عورتوں کو بھی چاہیئے کہ دنیا کے بارہ میں اپنے سے گھٹیا کو دیکھیں مثلاً تمہارا گھر کسی رئیس زادی کے گھر سے کم ہے تو تم ان لوگوں پر نظر کرو جن کے گھر تم سے بھی گھٹیا ہیں کہ نہایت تنگ ہیں پلنگ بچھنے کے بعد چلنے کو بھی راستہ نہیں رہتا۔ وہاں ہوا کا تو کہاں گذر بارش کا بھی بچاؤ نہیں اور تم ہوادار صحن میں ایسے آرام سے سوتی ہو کہ صبح کی نماز بھی قضا ہو جاتی ہے۔ ایسے لوگوں کے مکانات دیکھ کر تم کو اپنے مکان کی قدر ہوگی کہ بلا سے اس میں جھاڑ فانوس نہیں ہیں تو کیا ہوا بارش کا بچاؤ تو ہے ہوا کا گذر تو ہے

شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ ایک مرتبہ میرے پاس جوتہ نہ تھا تو میں رنجیدہ تھا کہ اچانک میں نے ایک ایسے آدمی کو دیکھا جس کے پیر ہی نہ تھے۔ میں نے خدا کا شکر کیا کہ میرے پیر تو ہیں بلا سے جوتہ نہیں تو کیا ہوا۔ تو حقیقت میں دُنیا کے باب میں اپنے سے کمتر حیثیت والوں کو دیکھنے سے بڑی راحت دل کو ہوتی ہے۔ مگر اب ایسا

مذاق بدلا ہے کہ دنیا میں جہاں ذرا کمی ہوئی اس کا تو قلق ہوتا ہے اور اس پر کبھی نظر نہیں جاتی کہ اللہ کی بہت سی مخلوق ہم سے بھی ابتر حالت میں ہے ہم پھر ان سے بہت اچھے ہیں اور دین میں ایسا استغنا برتا جاتا ہے کہ پانچ وقت کی نماز ہی پر اکتفا کر لیا ہے اگر کوئی ان سے تہجد و اشراق کو کہہ دے تو جواب میں یوں کہتے ہیں کہ کیا ہم مر جائیں بہت تو کام کرتے ہیں کہ پانچ وقت کی نماز پڑھ لیتے ہیں گویا انہوں نے نماز کیا پڑھی ساری جنت ہی خرید لی۔ جیسے ایک گنوار کا لڑکا کسی ملاّ کے پاس پڑھتا تھا تو ایک دن وہ گنوار ملاجی سے کہنے لگا کہ میرے بیٹے کو بہت نہ پڑھا دیجو کہیں لوٹ پوٹ پگمبر نہ ہو جاوے (یعنی پیغمبر نہ ہو جاوے) تو جس طرح اس جاہل کا خیال تھا کہ زیادہ پڑھنے سے آدمی پیغمبر ہو جاتا ہے اسی طرح آجکل لوگوں کا خیال ہے کہ بس پانچ وقت کی نماز پڑھ لینے سے آدمی جنید و شبلی ہو جاتا ہے پھر اسے اور کسی کام کی ضرورت نہیں رہتی۔

اسی طرح ایک گنوار کے سر میں درد تھا۔ ایک دوسرے گنوار نے کہا کہ آ میں تیرا سر جھاڑ دوں مجھے سر کے درد کی جھاڑ آتی ہے وہ سر کھول کے اس کے آگے بیٹھ گیا تو آپنے کُلْ بِاللہِ ھَدْ پڑھ کر اس کے سر کو جھاڑا (یہ قُلْ ھُوَ اللہُ اَحَدٌ کو بگاڑا تھا) تو وہ دوسرا گنوار کہتا ہے جس کے سر میں درد تھا کہ جا سا ڑے کے سا ڑے تو تو ھا یچ ہی ہو گیا (سا ڑے کے سا ڑے یہ خرابی ہے سالے کی جو گالی کا لفظ ہے اور ھا یچ خرابی ہے حافظ کی) سو دیکھئے اس کے نزدیک کُلْ بِاللہ ھَدْ ہی سے آدمی حافظ ہو جاتا ہے جس میں پوری قُلْ ھُوَ اللہ بھی یاد ہونا شرط نہیں اور اس کا صحیح پڑھنا بھی شرط نہیں۔ یہی حال آج کل عام لوگوں کا ہو رہا ہے کہ ان کے نزدیک جنید و شبلی بننے کے لئے پانچ وقت کی نماز سے زیادہ اور کچھ ضرورت نہیں اور ان نمازوں کا اچھی طرح ادا کرنا بھی ضروری نہیں بس اُلٹی پلٹی نماز پانچ وقت پڑھ لینا کافی ہے۔ جیسا ایک جُلاہے کا قصہ ہے کہ اس کا لڑکا انگریزی پڑھتا تھا کسی نے پوچھا کہ تمہارا لڑکا انگریزی پڑھتا ہے اب کتنی لیاقت ہو گئی۔ کہنے لگا کہ کھڑا کھڑا تو موتنے لگا ہے اب ذرا سی کسر رہ گئی ہے۔ اس کے نزدیک بس کھڑے ہو کر موتنے لگنا بڑی لیاقت تھی کہ اس کے بعد کامل لیاقت میں ذرا ہی سی کسر رہ جاتی ہے شاید وہ کسر یہ ہو کہ

کھڑا کھڑا بکنے بھی لگے۔ حقیقت یہ ہے کہ اوچھا آدمی ذرا سی بات میں اترانے لگتا ہے کہ جو بات کسی درجہ میں بھی قابل فخر نہیں ہوتی وہ اسی پر ناز کرنے لگتا ہے اور یہ ساری خرابی جہل کی ہے ان لوگوں کو اصلی کمالات کی خبر ہی نہیں اسی لئے ان کی نظر میں چھوٹی چھوٹی باتیں بھی کمالات معلوم ہوتی ہیں۔

مولانا نے اس کی خوب مثال دی ہے کہ جیسے ایک مچھر ایک تنکے پر بیٹھا ہوا تھا اس کے قریب بیل بندھا ہوا تھا بیل نے جو پیشاب کیا تو وہ تنکا اس میں تیرنے لگا مچھر اپنے دل میں بڑا خوش ہوا کہ آج میں نے سمندر کے اندر کشتی پر سواری لے لی۔ وہ بیوقوف بیل کے پیشاب کو سمندر اور گھاس کے تنکے کو کشتی سمجھ گیا کیونکہ اس نے اصلی سمندر کو دیکھا نہ تھا یہی حال ہم لوگوں کا ہے کہ ہم نے اصلی کمالات تو دیکھے نہیں ذرا ذرا سی باتوں کو کمالات سمجھنے لگے۔

مولانا دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں ایک بوڑھے میاں پڑھتے تھے اور قسمت سے بیٹے میاں بھی ابا جان کے ساتھ پڑھتے تھے۔ باپ اور بیٹے دونوں ایک ہی سبق میں شریک تھے مگر ان کو عقل کم تھی سبق کے وقت میں بڑے اینڈے بینڈے سوالات کرتے مولانا بڑے میاں کے سوالات کا جواب کم دیتے تھے۔ جماعت میں ایک ذہین نوجوان طالب علم بھی تھے۔ مولانا ان کے سوالات کے جوابات نہایت شوق سے دیتے تھے ایک دن وہ بڑے میاں ان نوجوان طالب علم سے کہنے لگے کہ مولانا تمہارے سوالات کے جوابات خوب دیتے ہیں اور ہمارے سوالات کا جواب نہیں دیتے حالانکہ ہم اتنے بڑے آدمی ہیں اس کی کیا وجہ۔ وہ طالبعلم ہنسنے لگے اور کہا کہ اس کی وجہ تم مولانا ہی سے پوچھو میں کیا بتلاؤں وہ ان کو پکڑ کر مولانا کے پاس لے گئے اور پکڑ کر اس واسطے لے گئے تاکہ مولانا کے سامنے ان کی طرف اشارہ کر کے بتلا دیں کہ آپ ان کے سوالات کے جواب کیوں دیتے ہیں۔ جیسے ایک وہمی آدمی نے نیتِ اقتدار کرتے ہوئے امام کی کمر میں انگلی ماری تھی کہ نماز پڑھتا ہوں پیچھے اس امام کے۔ اس بندہ خدا کو بدون انگلی لگائے تسلی نہ ہوتی تھی۔ اور جیسے فاتحہ دینے والے کھانا سامنے رکھ کر فاتحہ دیتے ہیں تاکہ معاذ اللہ حق تعالےٰ کو ثواب دینے میں غلطی

نہ ہوجائے کبھی ایسا نہ ہوکہ پلاؤ کی جگہ کسی دوسری چیز کا ثواب مردہ کو پہونچ جائے۔اس لئے وہ کھانا سامنے رکھ کرنام بنام ثواب بخشتے ہیں۔

ایک گنوار نے مجھ سے پوچھا کہ کھانا سامنے رکھ کر فاتحہ دینا کیسا ہے، میں نے کہا بدعت ہے کہنے لگا کہ اس میں کیا حرج ہے میں نے کہا کہ سامنے رکھنے کی کیا ضرورت ہے آخر تم روپیہ اور کپڑا بھی تو اللہ کے نام پر دیا کرتے ہو کیا اس پر بھی فاتحہ دیا کرتے ہو۔ کہنے لگا جی نہیں۔ میں نے کہا پھر کھانے پر فاتحہ دینے کی کیا ضرورت ہے جیسا روپیہ کپڑے کا ثواب بدون فاتحہ کے پہونچ سکتا ہے اسی طرح کھانے کا ثواب بھی بدون فاتحہ کے پہونچ سکتا ہے دونوں میں کیا فرق ہے۔ بے چارہ تھا سمجھدار۔ فوراً سمجھ گیا اور کہنے لگا جی بات تو یہی ہے یہ سارے ڈھونگ ہیں تم سچ کہتے ہو۔ بعضے گنوار بہت سمجھدار ہوتے ہیں کیونکہ ان کی طبیعت میں اینچ پینچ نہیں ہوتا سیدھی بات کو جلدی قبول کر لیتے ہیں مگر بعضے گنوار اکھڑ بھی ہوتے ہیں۔ چنانچہ ایک گنوار نے فاتحہ کے ثبوت میں یہ دلیل بیان کی تھی کہ قرآن میں تو اس کے لئے ایک خاص سورت اُتری ہے جس کا نام ہی سورہ فاتحہ ہے۔ بیوقوف۔ بھلا اس سے کوئی پوچھے کہ یہ دلیل کیسی ہوئی کیونکہ یہ بھی تو ممکن ہے کہ تم نے اس بدعت کو ایجاد کرکے اس کا نام سورۂ فاتحہ کے نام پر رکھدیا ہو۔ اور واقعہ بھی یہی ہے کیونکہ نزول قرآن کے وقت اس رسم کا کہیں پتہ بھی نہ تھا اس طرح ثواب بخشنے کو کوئی فاتحہ کہتا تھا تو بعضے گنوار ایسے کوڑ مغز بھی ہوتے ہیں غرض وہ بڑے میاں ان طالبعلم کو پکڑ کر مولانا قدس سرہٗ کے پاس لائے اور کہا کہ حضرت اس کی کیا وجہ کہ آپ ان کے سوالات کا تو جواب دیتے ہیں اور ہمارے سوالات کا جواب نہیں دیتے حالانکہ ہم اتنے بڑے آدمی ہیں۔ مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے جوابات بہت مختصر اور چبھتے ہوئے ہوا کرتے تھے۔ فرمایا کہ وجہ تو تم نے خود بیان کردی۔ بس یہی تو وجہ ہے کہ تم اپنے آپ کو بڑا سمجھتے ہو۔ ہائے یہ تکبر بڑا سد راہ ہے یہ کمبخت انسان کو تمام فیوض و برکات سے محروم کردیتا ہے۔ یہی تو وہ بلا ہے جس سے شیطان مردود ہوا۔ صاحبو! ہمارے اندر یہ تکبر گھسا ہوا ہے اسی واسطے ہم کمال دین سے محروم ہیں۔ اسی کا ایک اثر یہ ہے کہ ہم نے جہاں تھوڑا سا کام کرلیا پانچ وقت کی نماز پڑھ لی اور اپنے آپ کو کچھ سے کچھ سمجھنے لگے۔

عورتوں میں بھی یہ مرض بہت ہے۔ اول تو ان میں دیندار بہت ہی کم ہیں اور جو دو چار دیندار ہیں بھی وہ اپنے آپ کو نہ معلوم کیا سمجھتی ہیں جس کا منشا یہ ہے کہ عورتیں کم حوصلہ ہوتی ہیں اور ذراسی بات میں تکبر اور بڑائی کرنا کم حوصلہ آدمی کا کام ہے۔

ایک عورت بڑی نمازن تھی اتفاق سے اس کی شادی کسی ڈاڑھی منڈے بے نمازی سے ہوگئی تو وہ کیا کہتی ہے کہ اللہ رے تیری شان الیسی پارسا ایسے بیدین سے بیاہی گئی۔ گویا نعوذباللہ اسے خدا پر بھی اعتراض تھا کہ خدا تعالیٰ کے یہاں کچھ ضابطہ نہیں ہے جوڑ بے جوڑ کچھ نہیں دیکھتے استغفراللہ۔ ارے تم کو کیا خبر ہے کہ خاتمہ کس کا اچھا ہو۔ اور خدا تعالیٰ کس کو بخشے کس کو جہنم میں بھیجدے کیا تعجب ہے کہ خدا تعالیٰ اس بے نمازی کو کسی ادا پر بخشدے اور تم کو اس تکبر کی وجہ سے دوزخ میں ڈالدے۔ اول تو خاتمہ کا حال کسی کو معلوم نہیں۔ دوسرے جن اعمال پر تم کو ناز ہے کیا خبر ہے وہ قبول بھی ہوتے ہیں یا نہیں۔ گو امید تو یہی رکھنی چاہیئے کہ قبول ہوتے ہیں مگر کوئی وحی بھی نہیں آگئی اس لئے ڈرتے بھی رہنا چاہیئے اور کبھی اپنے اعمال پر ناز نہ کرنا چاہیئے نہ دوسروں کو حقیر سمجھنا چاہیئے کہ اس سے اندیشہ ہے حبطِ نورِ اعمال کا۔ اسی طرح بعض لوگوں کی یہ حالت ہے کہ جہاں ذرا ان کے قلب میں حرارت پیدا ہوئی اور وہ سمجھنے لگے کہ میں صاحبِ نسبت ہوگیا۔

مولانا شاہ عبدالرحیم صاحب دہلوی (شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی کے والد بزرگ) کے پاس ایک شخص آیا اور کہنے لگا کہ میرا دل جاری ہوگیا شاہ صاحب ہنسنے لگے فرمایا کہ لوگوں کو کبھی حرارت ذکر سے خفقان (اختلاج قلب) ہوجاتا ہے وہ سمجھتے ہیں کہ ذکر جاری ہوگیا۔ بعض لوگوں کے ذہن میں یہ بات جمی ہوئی ہے کہ قلب جاری ہونے کا مطلب یہ ہے کہ دل کو حرکت ہو کھٹ کھٹ کی آواز سنائی دیتی ہو۔ یاد رکھو یہ اختلاج قلب ہے جو کہ سخت مرض ہے اس کا نام دل کا جاری ہونا نہیں ہے۔ مکہ معظمہ سے جب ہم غار ثور پر گئے اور پہاڑ پر چڑھنا شروع کیا تو سب لوگوں کے سانس پھول گئے اس وقت بے تکلف دل کی حرکت صاف محسوس ہوتی تھی اور کھٹ کھٹ کی آواز آرہی تھی۔ میں نے ساتھیوں سے کہا کہ لو آج سب کے دل جاری ہوگئے سب صاحبِ نسبت ہوگئے۔ اگر یہی نسبت ہے تو بس روزانہ ایک میل دوڑلیا کرو دل جاری ہوجایا کرے گا یہ محض غلط خیال ہے۔ ذکر جاری ہونے کے لئے آواز کھٹکا

کچھ ضروری نہیں بلکہ ذکر جاری ہو جانے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ سالک کو اکثر اوقات حق تعالےٰ سے ذہول و غفلت نہ ہوتی ہو زیادہ اوقات میں حق تعالیٰ کی طرف توجہ رہے اسی کا نام ملکۂ یادداشت ہے لیکن یہ بھی نسبت مطلوبہ نہیں ہے بعض لوگ ملکۂ یادداشت ہی کو نسبت سمجھتے ہیں یہ بھی غلطی ہے اور اس سے ایک بڑا دھوکہ سالکین کو پیش آتا ہے وہ یہ کہ صوفیۂ کرام نے فرمایا ہے کہ معصیت سے نسبت سلب ہو جاتی ہے اور ملکۂ یادداشت معصیت سے زائل ہوتا نہیں تو جو شخص اسی کو نسبت سمجھتا ہے وہ ائمہ فن کے خلاف سمجھنے لگتا ہے کہ معاصی مجھ کو مضر نہیں بعض تو معاصی کو حلال سمجھنے لگتے ہیں وہ تو زندیق ہیں بعض حلال تو نہیں سمجھتے مگر یوں خیال کر لیتے ہیں کہ ہم کو نسبت حاصل ہوگئی ہے جس سے ہر وقت ہم ذکر میں رہتے ہیں اور ذکر حسنہ ہے اور حق تعالےٰ کا ارشاد ہے اِنَّ الْحَسَنَاتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّئَاتِ کہ حسنات سیئات کو زائل کرتی رہتی ہیں پس یہ نسبت ایسا حسنہ ہے جس سے تمام گناہ دُھلتے رہتے ہیں اور کوئی گناہ ہم کو مضر نہیں ہوتا وہ نسبت سب گناہوں کا کفارہ ہوتی رہتی ہے یہ بڑی گمراہی ہے جس کا منشاء یہ ہے کہ ان لوگوں نے ملکۂ یادداشت کو جو کہ مشق ذکر سے پیدا ہو جاتا ہے نسبت مقصودہ سمجھ رکھا ہے خوب سمجھ لو کہ نسبت اس کا نام نہیں ہے نسبت مقصودہ کے لئے گناہ اور معصیت سخت مضر بلکہ سمِ قاتل ہے۔ نسبت کی حقیقت و احکام کی تفصیل زیادہ ہے (جس کو میں کسی قدر پرسوں کے وعظ میں بیان کر چکا ہوں) مگر اجمالاً ایک حکایت سے اس کی حقیقت سمجھ میں آجائے گی۔ وہ حکایت یہ ہے کہ ایک طالب علم سے ان کے کسی مہمان نے پوچھا تھا کہ میاں آج کل کیا شغل ہے۔ کہنے لگے کہ شاہزادی سے نکاح کی فکر میں ہوں۔ اس نے پوچھا کہ پھر کچھ سامان کر لیا ہے۔ کہنے لگے کہ آدھا سامان تو ہوگیا آدھا باقی ہے۔ اس نے کہا یہ کیونکر کہا میں تو راضی ہوں مگر وہ راضی نہیں اور نکاح طرفین کی رضا سے ہوتا ہے۔ لہٰذا ایک کا راضی ہونا آدھا نکاح ہے۔

تو جو لوگ ملکۂ یادداشت حاصل کر کے معاصی سے اجتناب نہیں کرتے اور اپنے کو

صاحب نسبت سمجھتے ہیں اُن کی نسبت ایسی ہی ہے جیسے اس طالب علم کا آدھا نکاح۔ کہ یہ لوگ تو خدا سے یاد داشت کا تعلق رکھتے ہیں مگر خدا کو ان سے کچھ علاقہ نہیں۔ یاد رکھو نسبت اس تعلق کو کہتے ہیں جو طرفین سے ہو یعنی بندہ کو خدا سے تعلق ہو اور خدا کو بندہ سے تعلق ہو اور نصوص سے یہ بات معلوم ہو چکی ہے کہ عاصی سے خدا کو رضا کا تعلق نہیں ہوتا لہذا معصیت کے ساتھ نسبت مطلوبہ کبھی جمع نہیں ہو سکتی مگر افسوس ہے کہ لوگ اس غلطی میں بہت مبتلا ہیں کہ وہ ملکۂ یاد داشت ہی کو نسبت سمجھتے ہیں۔ خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ میں یہ بیان کر رہا تھا کہ عورتوں میں یہ مرض زیادہ ہے کہ جہاں ذرا نماز پڑھنے لگیں اپنے آپ کو رابعہ سمجھنے لگیں اور چھے آدمی بہت جلدی اپنے معتقد ہو جاتے ہیں مثل مشہور ہے۔ اَلْحَائِكُ اِذَا صَلّٰى يَوْمَيْنِ اِنْتَظَرَ الْوَحْيَ۔ جلاہا دو دن نماز پڑھ کر تیسرے دن وحی کا منتظر ہو جاتا ہے۔

بہت لوگ اپنے کمالات کے معتقد ہیں مگر ان کو یہ خبر نہیں کہ ہم دھوکہ میں پڑے ہوئے ہیں۔ ان لوگوں کو امام غزالی رحؒ کی احیاء میں کتاب الغرور دیکھنی چاہیئے (غرور بمعنے تکبر نہیں یہ اردو کا محاورہ ہے۔ عربی میں غرور کے معنے دھوکہ کے ہیں۔ حق تعالےٰ فرماتے ہیں وَغَرَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ ط (ان کو اللہ نے دھوکہ میں ڈال دیا) یہاں دھوکہ میں ڈالنا ہی مراد ہے) یہ وہ کتاب ہے جس نے امام غزالی رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ پر کفر کے فتوے لگوائے کیونکہ اس میں انھوں نے ہر فرقہ کی غلطیاں ظاہر کی ہیں اور ان دھوکوں پر متنبہ کیا ہے جن میں وہ مبتلا ہیں تو چونکہ اس سے دنیا بھر کے اترے پترے کھلتے تھے اس لئے سب لوگ ان کے درپے ہو گئے۔ پھر کافر بنانے کو موقع مل ہی جاتا ہے ؎

چشم بداندیش کہ برکندہ باد
عیب نماید ہنرش درنظر

(بدخواہ کی آنکھ پھوٹ جائے کہ اس کی نظر میں ہنر بھی عیب دکھائی دیتا ہے)

جب آدمی کسی کے درپے ہو جاتا ہے تو اس کو کمالات بھی عیوب نظر آتے ہیں۔ وہ کتاب دعوے پست کرنے والی ہے جو لوگ اپنے کمالات کے معتقد ہیں اُس کو دیکھیں پھر

غور کریں کہ وہ کس دھوکہ میں مبتلا تھے۔ بعض لوگ اپنے اعمال پر ناز کرتے ہیں اور خوش ہیں کہ ہم خدا کی عبادت کرتے ہیں مگر ہماری طاعات کی ایسی مثال ہے جیسے بعض دفعہ نوکر آقا کو پنکھا جھلتا ہے کبھی اتنے زور سے کہ ٹوپی بھی اس کے سر سے اڑجاتی ہے۔ کبھی اتنے آہستہ کہ اس کو ہوا بھی نہ لگے آقا کو ایسا پنکھا جھلنے سے تکلیف ہوتی ہے مگر وہ خوش اخلاقی کی وجہ سے کچھ نہیں بولتا تو اگر وہ نوکر ایسی خدمت کر کے ناز کرے کہ میں نے آج دو گھنٹے آقا کی خدمت کی تو اس کا یہ ناز بجا ہے یا بیجا۔ یقیناً ہر شخص اس کو احمق بتائے گا کہ تو ناز کس بات پر کرتا ہے جتنی دیر تو نے خدمت کی ہے آقا کو تکلیف پہونچائی ہے تو اسی کو غنیمت سمجھ کہ اس نے تجھ کو سزا نہیں دی نہ کہ تو الٹا ناز کرتا اور اپنے کو انعام کا مستحق سمجھتا ہے۔

صاحبو! یہی حالت ہماری طاعات کی ہے کہ حق تعالیٰ ان طاعات پر ہم سے مواخذہ ہی نہ فرمائیں تو بس غنیمت ہے یہ اُلٹا ناز کیسا۔ آخر کیا ہم کو اپنی طاعات کی حقیقت معلوم نہیں کہ ہم اُن کو کس طرح بے سروپا ادا کرتے ہیں۔

مولانا نے مثنوی میں ایک بہرہ کی حکایت لکھی ہے کہ وہ اپنے ایک دوست کی عیادت کرنے گیا تھا راستہ میں سوچنے لگا کہ میں تو بہرہ ہوں مجھے دوسرے کی خصوص ضعیف مریض کی بات سنائی نہ دے گی اس لئے ابھی سے حساب لگا لینا چاہیئے کہ میں جاکر پہلے کیا کہوں گا وہ اس کا کیا جواب دے گا پھر مجھ کو اس کے جواب میں کیا کہنا چاہیئے۔ چنانچہ اس نے حساب لگایا کہ پہلے میں اس سے پوچھوں گا کہ مزاج کیسا ہے وہ کہے گا شکر ہے پہلے سے افاقہ ہے میں کہوں گا الحمد للہ حق تعالیٰ اور زیادہ کرے۔ پھر میں کہوں گا کہ معالجہ کو نسے طبیب کا ہے وہ کہے گا فلاں حکیم صاحب کا میں کہوں گا سبحان اللہ بہت ہی لائق طبیب ہیں، بڑی شفقت فرماتے ہیں ان کا علاج ترک نہ کرنا چاہیئے۔ پھر پوچھوں گا کونسی دوا استعمال میں ہے وہ کسی دوا کا نام لے گا میں کہوں گا خدا اُس کو آپ کی رگ و پے میں پیوستہ کرے اور خوش گوار فرمائے یہ حساب لگا کر وہ پہونچے۔ بیمار نے جو بہرہ کی صورت دیکھی گھبرا گیا کہ یہ کمبخت کہاں سے آگیا اب یہ میرا دماغ کھائے گا اپنی سب کچھ کہہ لیگا میری بات سنے گا نہیں۔ اب بہرہ میاں آگے بڑھے اور مزاج پوچھا کہ اب طبیعت کیسی ہے بیمار نے

جھلا کر کہا حال کیا ہوتا مر رہا ہوں۔ آپ نے کہا الحمد للہ خدا اور زیادہ کرے۔ بیمار اور بھی جھلا گیا۔ پھر پوچھا کون سے حکیم صاحب کا علاج ہے اس نے کہا ملک الموت علیہ السلام کا آپ نے کہا سبحان اللہ بڑے ہی لائق طبیب ہیں ان کا علاج کبھی نہ چھوڑیے ماشاء اللہ بڑے ہی شفیق ہیں اللہ تعالیٰ ان کا قدم مبارک فرماوے پھر پوچھا کہ آج کل کونسی دوا استعمال میں ہے اس نے کہا زہر پی رہا ہوں۔ آپ بولے ماشاء اللہ آنکھیں ہے خدا اس کو آپ کی رگ رگ میں پیوستہ کرے اور خوشگوار فرمائے۔ تو اب آپ غور کیجئے کہ ایسی عیادت سے کیا کسی کا جی خوش ہو سکتا ہے۔ ہرگز نہیں مگر وہ بہرہ اپنے دل میں خوش تھا کہ میں نے اپنے دوست کا حق ادا کر دیا اس کی عیادت کر لی اور اس کا جی خوش کر دیا۔ ڈلے پتھر جی خوش کر دیا وہ تو اسکی جان کو کوستا ہوگا۔

مولانا فرماتے ہیں کہ بعض لوگ ایسی ہی عبادت کرتے ہیں جیسی اس شخص نے عیادت کی تھی اور ان کا اپنی عبادت پر خوش ہونا ایسا ہی ہے جیسا وہ بہرہ اپنی عیادت پر خوش تھا۔ صاحبو! یہ حال ہے ہماری ان عبادات کا جن پر ہم ناز کرتے ہیں مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ جو کچھ عبادت ٹوٹی پھوٹی ہم کر رہے ہیں اس کو بھی چھوڑ دیا جائے۔ بعضے ایسے احمق بھی ہیں جو یہی مطلب سمجھے ہوں گے کہ جب ہماری عبادت کسی کام کی نہیں تو پھر کیوں سر مارا۔ ارے وہ ایسے کریم ہیں کہ اکثر ٹوٹی پھوٹی عبادت کو بھی قبول کر لیتے ہیں نقل کو اصل کی جگہ کر دیتے ہیں۔ جیسا آپ نے دیکھا ہوگا کہ بعضے کاریگر مٹی کا خربوزہ بنا کر رؤسا کے سامنے پیش کرتے ہیں اور وہ ان کو انعام دیدیتے ہیں حالانکہ اس میں سوا مٹی کے اور کچھ نہیں ہوتا مگر چونکہ خربوزہ کی شکل ہوتی ہے اس لئے وہ اُس کی وہی قدر کرتے ہیں جو اصلی خربوزہ کی کرتے ہیں بلکہ اصلی خربوزہ سے بھی بعض دفعہ زیادہ قیمت دیدیتے ہیں مگر شرط یہ ہے کہ نقل پوری ہو۔ افسوس یہ ہے کہ ہمارے اعمال میں تو نقل بھی صحیح نہیں ہوتی۔ اب یہ کیا نماز ہے کہ قیام میں ہاتھ زانوں پر پڑے ہوئے ہیں، ہاتھ بھی ڈھنگ سے نہیں باندھے جاتے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا کی کچھ بھی عظمت دل میں نہیں۔ عورتیں الحمد کو الہمد پڑھتی ہیں الفاظ بھی درست نہیں خشوع خضوع کا تو کیا ذکر۔ یاد رکھو قرآن کا صحیح پڑھنا واجب ہے۔

کم از کم جتنا قرآن نمازمیں پڑھو اس کو تو صحیح کرلو اس کی کوشش کرنا ہر ایک کے ذمہ واجب ہے کوشش کے بعد بھی درست نہ ہو تو معذور ہے تو دیکھئے ہم تو نماز کی نقل بھی صحیح طور پر نہیں کرتے باقی امید رتو یہ ہے کہ حق تعالےٰ اس مکروہ نماز کو بھی قبول فرمالیتے ہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ یہ لوگ مہمل ہیں ان کے پاس یہی ہے ہی کیا۔ اس مہمل نماز کو بھی رد کر دیا جائے تو یہ بالکل ہی محروم رہ جائیں گے اس لئے اکثر تو وہ ہماری بے ڈھنگی طاعت کو بھی قبول ہی فرمالیتے ہیں۔

حاجی صاحب کا ارشاد ہے کہ بھائی جس عبادت کے بعد پھر اس کی توفیق دوبارہ ہو جائے تو یہ اس کے قبول ہونے کی علامت ہے اگر پہلی عبادت قبول نہ ہوئی ہوتی تو دوبارہ اس کی توفیق نہ ہوتی کیونکہ بادشاہ کو جس شخص کا اپنے دربار میں آنا ناگوار ہوتا ہے تو ایک بار کے بعد دوبارہ اس کو اپنے دربار میں گھسنے نہیں دیا کرتا۔ یہ دلیل امید کے واسطے بہت ہے گو قطعی دلیل نہیں ہاں اَنَا عِنْدَ ظَنِّ عَبْدِیْ بِیْ (میں اپنے بندہ کے گمان کے نزدیک ہوں جو اس کو میرے ساتھ ہے) کو اس کی ساتھ ملالو تو پھر کافی ہے۔ غرض میرا یہ مطلب نہیں کہ اگر اس وقت تم کو کامل عبادت کی توفیق نہیں تو ناقص کو چھوڑ دو بلکہ مطلب یہ ہے کہ اسی پر بس نہ کرد بلکہ اس کی تکمیل کی کوشش کرو۔ دین کا طریقہ معلوم کرو اور دین میں کامل بننے کی سعی کرو جس کا طریقہ کتب دینیہ کا پڑھنا سننا ہے خصوصاً عورتوں کے لئے تو یہی ایک طریقہ ہے کیونکہ ان کو علماء سے ملنے اور ان سے مسائل دریافت کرنے اور اُن کے مواعظ و بیانات سننے کا موقع ہی نہیں ملتا لہٰذا ان کو کتب دینیہ کے پڑھنے اور سننے کا زیادہ اہتمام کرنا چاہیئے مگر افسوس یہ ہے کہ اول تو عورتیں پڑھتی ہی نہیں ہیں اور جو لکھنا پڑھنا جانتی ہیں وہ دین کی کتابیں نہیں دیکھتیں۔ اب ان کے پڑھنے کی کیا کتابیں رہ گئی ہیں۔ سایٔن نامہ۔ معجزۂ آلِ نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم جس میں حضرت علیؓ کا ایک چھوٹا قصہ ہے۔ اور وفات نامہ جس غلط روایات ہیں۔ اور ہرنی نامہ یہ قصہ صحیح ہے مگر اس سے بھی کچھ احکام معلوم نہیں ہوتے اور منظوم تفسیر سورۂ یوسف اس میں بھی بعض روایات صحیح نہیں ہیں۔ پھر اس میں زلیخا کے عشق کو بہت صاف صاف بیان کیا گیا ہے جس کا اثر

اخلاق پر بہت بڑا پڑتا ہے۔ بس یہ ہے عورتوں کی انتہائی تعلیم جس نے یہ کتابیں پڑھ لیں وہ گویا سب سے زیادہ پڑھی ہوئی ہے جیسے سہارنپور میں ایک جاہل آیا تھا اس نے یہی کتابیں پڑھی تھیں اور اس کو ناز تھا کہ میں بھی عالم ہوں چنانچہ جمعہ کی نماز کے بعد اس نے خود ہی اعلان کیا بھائیو اُواج (وعظ) ہوگی آپ کی لیاقت کا حال تو لوگوں کو ان دو لفظوں ہی سے معلوم ہوگیا مگر تماشا دیکھنے کے لئے لوگ بیٹھ گئے کہ دیکھیں بھائی اُواج کیسی ہوتی ہے وعظ تو بہت سنے مگر اواج کبھی نہ سنی تھی تھوڑی دیر میں وعظ صاحب منبر پر پہونچے اور تین مرتبہ یٰسٓ یٰسٓ یٰسٓ پڑھ کر اس کی تفسیر بیان کی اے محمد اے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اگر میں تجھے نہ پیدا کرتا تو نہ عرش کو پیدا کرتا نہ کرسی کو نہ آسمان کو نہ زمین کو۔ بھائیو آدمی اوج آج ہوگئی آدھی کل کہوں گی۔ ہارے تھکے ہیں خرچ پاس نہیں ہے کچھ ہماری امداد کرد۔ بس واعظ ختم ہوا۔ اول تو احمق نے یٰسٓ کو شین سے پڑھا پھر اس کی تفسیر کیسی خوبصورت کی اس مجمع میں ایک نابینا عالم بھی جن کا نام مولانا سعید الدین صاحب تھا موجود تھے اور لوگ اُن کے علم و فضل کے معتقد تھے انہوں نے لوگوں سے فرمایا کہ ذرا ان مولانا کو میرے پاس لانا چنانچہ لایا گیا آپ نے فرمایا کہ ان کا ہاتھ میرے ہاتھ میں دیدو (کہیں بھاگ نہ جائیں) غرض اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر آپ نے دریافت فرمایا کہ مولانا آپ کی تحصیل کہاں تک ہے تو واعظ صاحب فرماتے ہیں کہ ہماری تحصیل ہاپوڑ۔ مولانا سعید الدین صاحب سمجھ گئے کہ بیچارہ بالکل جاہل ہی ہے اس کو تحصیل کے معنے بھی معلوم نہیں۔ پھر آپ نے اردو الفاظ میں کہا کہ میں یہ پوچھتا ہوں کہ تم نے کہاں تک تعلیم حاصل کی ہے کہنے لگا کہ ہم نے پڑھا ہے ہرنی نامہ، وفات نامہ، معجزہ آل نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم۔ سائین نامہ اور تو کیا جانے اندھے مولانا سعید الدین صاحب نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا اور لوگوں سے فرمایا کہ اس کو کچھ نہ کہو جانے دو بے چارہ معذور ہے۔ تو جیسے اس جاہل کو ان کتابوں کے پڑھنے پر ناز تھا کہ اس نے ایک فاضل شخص کو بھی منہ نہ لگایا اور صاف کہدیا کہ تو کیا جانے اندھے۔ اسی طرح آجکل جو عورتیں یہ کتابیں پڑھ لیتی ہیں وہ اپنے آپ کو بہت بڑا سمجھنے لگتی ہیں کہ بس اب ہم سے زیادہ پڑھا ہوا کون ہوگا پھر غضب یہ ہے کہ عورتیں چونکہ عموماً ان پڑھ ہیں اس لئے ان میں سے جو کچھ پڑھ لیتی

ہیں ان کی قدر خوب ہونے لگتی ہے کیونکہ دوسری عورتیں اتنا بھی پڑھنا نہیں جانتیں جب ان کی قدر ہونے لگی تو اب ان کو آگے پڑھنے کی کیا ضرورت رہی۔

گنگوہ میں ایک جاہل واعظ آیا تھا جو جہنم کو جہندم کہتا تھا۔ اس کے وعظ عورتوں میں ہوا کرتے تھے اور عورتیں اس کی بہت معتقد تھیں بلکہ بعضے مرد بھی معتقد تھے۔ اور یوں کہتے تھے کہ یہ ایسا بڑا عالم ہے کہ مولوی رسید کو تو بارہ برس پڑھاوے۔ میں نے کہا واقعی مولانا رشید احمد صاحب کو تو بارہ برس میں بھی یہ علوم نہ حاصل ہوں گے بارہ برس تو کیا وہ تو ساری عمر میں بھی جہنم کو جہندم نہ کہہ سکیں گے۔ تو یہ عورتیں ہر اک کی بہت جلدی معتقد ہو جاتی ہیں چاہے اس نے الف بے تے ہی پڑھی ہو اور یہ سب جہل کی خرابی ہے جو ان میں پڑھی لکھی کہلاتی ہیں وہ بھی جاہل ہی ہیں۔ کیونکہ ان کے درس میں ایسے ایسے فضول قصے رہ گئے ہیں جن سے احکام کا علم بالکل نہیں ہوتا۔ آجکل ایک مناجات پڑھی جاتی ہے جس کو عورتیں اور مرد بڑے شوق سے سنتے ہیں جس میں ہر دو شعر کے بعد یہ مصرع پڑھا جاتا ہے۔ "مری بار کیوں دیر اتنی کری" اس کا مضمون بالکل خلاف شرع ہے۔ مگر جہل ایسا عام ہوا ہے کہ کسی کو بھی ادھر التفات نہیں ہوتا۔ اس نظم میں اول تو خدا تعالیٰ کی شکایت ہے کہ سب کو تو یہ یہ نعمتیں دیدیں اور میری بار میں کیوں دیر کر رکھی ہے۔ اس میں علاوہ شکایت کے حق تعالیٰ کی طرف نعوذ باللہ ظلم کی بھی نسبت ہے کہ عجب کارخانہ ہے جس میں کچھ ضابطہ ہی نہیں کہ ایک بندے کو سب کچھ دیدیا اور مجھے ٹال رکھا ہے اب تک میرا مقصود پورا نہیں ہوتا۔ نیز اس میں حضرات انبیاء علیہم السلام کی مساوات کا بھی دعوٰی ہے اور ان پر حسد بھی ہے کیونکہ اس میں تمام انبیاء مشہورین کا ذکر کیا گیا ہے کہ آدمؑ کو یہ دیا اور نوحؑ کو دی پیغمبری اور سلیمان (علیہم السلام) کو دی سروری اور ہر ایک کے بعد یہ مصرع بھی ہے کہ مری بار کیوں دیر اتنی کری۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ شاعر کو ان حضرات پر حسد ہے کہ ان کو تو سب کچھ مل گیا اور مجھے کچھ بھی نہ ملا مری بار میں دیر ہو رہی ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ناظم کی نیت بھی یہی تھی مگر اس میں کچھ شک نہیں کہ یہ مطلب ان اشعار کا

مدلول ضرور ہے اور قاعدہ ہے کہ جس بات میں ایہام خلاف بھی ہو اس سے بھی منع کیا جائے گا۔ آخر حق تعالٰے نے صحابہ کو رَاعِنَا کہنے سے کیوں منع فرمایا کیا معاذ اللہ صحابہ کرام کے ذہن میں اس کے معنے کچھ بُرے تھے۔ ہرگز نہیں بلکہ محض اس لئے کہ یہ لفظ موہم ہوتا ہے برے معنے کو اور دشمنوں کو موقع ملتا ہے کہ وہ اس کو بُرے معنے کا قصد کر کے استعمال کریں۔ اس قاعدہ کے تحت میں یہ نظم بھی داخل ہے گو قائل کا قصد برا نہ ہو پس اس کا پڑھنا اور سننا اور پڑھوانا سب ناجائز ہے۔ پس یہ کتنے افسوس کی بات ہے کہ عورتوں کے نصاب تعلیم میں تمام فضول اور خرافات قصے ہی رہ گئے اور یہاں تک بھی بس تھی اب تو غضب یہ ہے کہ عورتیں ناول پڑھتی ہیں جس سے اخلاق بہت ہی خراب ہو جاتے ہیں۔ ان ناولوں کی بدولت شرفاء کے گھروں میں بھی بڑے بڑے واقعات شرمناک وقوع میں آچکے ہیں مگر اب بھی ان کی آنکھیں نہیں کھلتیں میں کہتا ہوں کہ ان ناولوں سے تو وہ پرانی کتابیں قصہ گل بکاؤلی وچہار درویش وطلسم ہوشربا ہی غنیمت ہیں اگرچہ میں ان کے دیکھنے سے بھی عورتوں کو سختی کے ساتھ منع کرتا ہوں مگر واللہ ان ناولوں سے وہ ہزار درجہ بہتر ہیں ان کی برابر وہ اخلاق کو خراب نہیں کرتیں قصے گو ان میں بھی خرافات ہی ہیں مگر تدابیر اختلاط وحیلہائے وصول الی المقصود (مقصود تک پہونچنے کے حیلے) میں ایسے بتلائے ہیں جو نہایت متعذر الحصول (جن کا حاصل ہونا دشوار ہے) اور دشوار ہیں۔ مثلاً شاہزادہ کا گل بکاولی کے باغ میں پہونچنا کیسے ہوا کہ راستہ میں ایک دیو ملا اس کو اس نے ماموں بنایا اسے اس پر رحم آیا اور اس نے باغ میں پہونچا دیا۔ اسی طرح چہار درویش کے قصے میں بھی تمام صورتیں حصول مقصود کی ایسی ہیں جو انسان کے قبضہ کی نہیں ہیں خدا ہی چاہے تو ان طریقوں سے مقصود میسر آسکتا ہے۔ اور ان کمبخت ناولوں میں تو ایسی سہل سہل ترکیبیں لکھی ہیں جن سے ہر شخص کام لے سکتا ہے۔ مثلاً یہ کہ عاشق نے کسی نین کو یا جُلاہی کو لالچ دلایا کہ میں تجھ کو اتنے روپیے دوں گا تو فلاں لڑکی سے مجھ کو ملا دے۔ اب یہ ترکیب ایسی آسان ہے کہ جس کے پاس روپیہ ہو وہ اس سے بآسانی کام نکال سکتا ہے کیونکہ ایسی عورتیں بہت جلد لالچ میں

آجاتی ہیں نہ ان میں دین ہے نہ حیا نہ کسی کی آبرو کا ان کو خیال ان کے ذریعہ سے گھروں میں کچھ سے کچھ واقعات ہو جانا بڑی بات نہیں۔ اس لئے میں ان ناولوں کو گل بکاؤلی وغیرہ سے بھی بدتر جانتا ہوں۔

صاحبو! خدا کے واسطے اپنی عورتوں کو ان ناپاک کتابوں سے بچاؤ اور ناول کو ہرگز اپنے گھر میں نہ گھسنے دو اگر کہیں نظر بھی پڑ جائے تو فوراً جلا دو اور عورتوں کے پاس ایسی کتابیں پہونچاؤ جن میں دین کے پورے اجزاء سے کافی بحث ہو۔ عقائد کا بھی مختصر بیان ہو۔ وضو اور پاکی ناپاکی کے بھی مسائل ہوں۔ نماز روزہ حج زکوٰۃ نکاح بیع وشرا کے بھی مسائل ہوں اصلاح اخلاق کا طریقہ بھی مذکور ہو۔ آداب اور سلیقہ کی باتیں بھی بیان کی گئی ہوں یہ بات مردوں کے ذمہ ہے اگر وہ اس میں کوتاہی کریں گے تو اُن سے بھی مؤاخذہ ہوگا کیونکہ حق تعالیٰ کا حکم ہے۔ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قُوْۤا اَنْفُسَكُمْ وَ اَهْلِیْكُمْ نَارًا ط اے مسلمانوں اپنی جانوں کو بھی جہنم سے بچاؤ اور اپنے گھر والوں کو بھی۔ اگر کوئی مرد خود متقی بن جائے اور اپنے گھر والوں کے دین کی خبر نہ لے تو خدا تعالٰے اس کی عورتوں کے ساتھ اس کو بھی جہنم میں بھیجدیں گے۔ تنہا اس کا متقی بن جانا قیامت میں عذاب سے نجات کے لئے کافی نہ ہوگا۔

پس مردوں کا کام یہ ہے کہ عورتوں کے پاس ایسی کتابیں پہونچائیں اور عورتوں کا کام یہ ہے کہ وہ اپنے مردوں سے یہ کتابیں پڑھیں اور ان پر عمل کریں۔ خود بھی دیکھیں اور اپنی لڑکیوں کو بھی پڑھائیں اور جو اَن پڑھ عورتیں ہیں ان کو بھی احکام سنائیں اور ہمت کر کے ان پر عمل کا اہتمام کریں۔ ان شاء اللہ تعالٰے دین بہت جلد مکمل ہو جائے گا۔ اجمالاً میں نے دین کامل کرنے کا طریقہ بتلا دیا اب مجھے تفصیل کی ضرورت نہیں رہی لیکن جس طرح بعض ضروری فروع پر مردوں کے وعظ میں تنبیہ کی گئی تھی اسی طرح بعض فروع یہاں بھی بیان کرتا ہوں جن میں اکثر عورتیں کوتاہی کرتی ہیں تاکہ ان پر قیاس کر کے وہ دوسرے اجزاء دین سے بھی غفلت نہ کریں کیونکہ اس وقت

میں اُن فروع کا ذکر کروں گا جو بہت ظاہر ہیں جب ان میں بھی کوتاہیاں کی جاتی ہیں تو دوسرے فروع کا کیا حال ہوگا۔ اس کو خود سمجھ لینا چاہیئے۔ چنانچہ سب سے پہلے میں نماز کا بیان شروع کرتا ہوں جس کا فرض ہونا ہر مسلمان کو معلوم ہے مگر افسوس ہے کہ عورتیں نمازی بہت کم ہیں حالانکہ قرآن کی ایک آیت میں نماز ترک کرنے کو شرک میں داخل کیا گیا ہے۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں مُنِيبِيْنَ اِلَيْهِ وَاتَّقُوْهُ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ (ترجمہ) یہ ہے کہ نماز کو قائم کرو اور مشرکین میں سے مت بنو۔ اس سے معلوم ہوا کہ نماز نہ پڑھنا مشرک بننا ہے۔ اور حدیث میں تو یہ مضمون بہت صاف ہے مَنْ تَرَكَ الصَّلٰوةَ مُتَعَمِّدًا فَقَدْ كَفَرَ جس نے نماز کو قصداً ترک کر دیا وہ کافر ہو گیا۔ گو جمہور علماء نے ان آیات واحادیث میں تاویل کی ہے کہ مطلب یہ ہے کہ نماز کا چھوڑنا کافروں کا سا کام کرنا ہے۔

مگر صاحبو! اللہ تعالیٰ نے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تو ظاہر الفاظ میں ایسے شخص کو کافر کہدیا ہے گو علماء تاویل کرتے ہیں۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ یہ تاویل غلط ہے لیکن ہم کو اس تاویل کے بھروسہ پر بے فکر نہ ہونا چاہیئے کیونکہ خدا و رسول صلی اللہ علیہ وسلم جس بات کو کفر فرما رہے ہیں اگر وہ واقع میں کفر بھی نہیں تو یقیناً کفر سے بہت قریب ہے۔ اور کفر کا انجام جو کچھ ہے سب کو معلوم ہے کہ ابدالآباد کے لئے جہنم کی سزا ہے تو جو کام اس سے قریب کرنے والا ہو مسلمان کو اس سے کوسوں دور بھاگنا چاہیئے۔ بعضی عورتیں نماز پڑھتی ہیں مگر افسوس یہ ہے کہ وہ رکوع وسجدے ٹھیک نہیں کرتیں۔ بڑی جلدی کرتی ہیں۔ حالانکہ تعدیل ارکان واجب ہے بلکہ بعض علماء کے نزدیک فرض ہے تعدیل ارکان کا مطلب یہ ہے کہ نماز کے ہر رکن کو اطمینان وسکون کے ساتھ ادا کیا جاوے مثلاً رکوع کے بعد سر اٹھا کر تھوڑی دیر سیدھا کھڑا ہو جانا چاہیئے۔ اور سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ۔ سیدھا کھڑا ہو کر کہے اس کے بعد اطمینان سے سجدہ میں جاوے اس کو قومہ کہتے ہیں۔ عورتیں قومہ بالکل نہیں کرتیں اور بعض مرد بھی نہیں کرتے بس رکوع سے فارغ ہو کر ذرا سر کا اشارہ کر کے فوراً سجدہ میں چلے جاتے ہیں اس طرح نماز نہیں

ہوتی۔ رکوع کے بعد سیدھا کھڑا ہوجانا ضروری ہے اسی طرح اکثر عورتیں دونوں سجدوں کے بیچ میں جلسہ نہیں کرتیں بس ایک سجدہ کرکے ذرا سا سر کا اشارہ کرکے فوراً دوسرا سجدہ کردیتی ہیں اس طرح بھی نماز نہیں ہوتی۔ اس کا خوب خیال رکھو اور قومہ و جلسہ اطمینان سے ادا کرو۔ بعضی عورتیں قرآن غلط پڑھتی ہیں اس کا اہتمام بھی ضروری ہے۔ بعض دفعہ ایسی غلطی ہوجاتی ہے جس سے نماز ٹوٹ جاتی ہے چند صورتیں نماز کے لئے کم از کم ضرور صحیح کرلو۔ بعض عورتیں نماز وقت سے ٹال دیتی ہیں۔ نماز کا وقت آگیا اور بیٹھی باتیں بنا رہی ہیں جب وقت قریب الختم ہوتا ہے اس وقت پیشاب پیخانہ کے لئے لوٹا ہاتھ میں لیا جاتا ہے حتیٰ کہ ان مقدمات ہی میں وقت نکل جاتا ہے۔ یاد رکھو بدون کسی عذر کے نماز کا وقت سے ٹالنا سخت گناہ ہے (عورتوں کو سب نمازیں اول وقت میں پڑھنی چاہئیں ان کے لئے یہی افضل ہے ۱۲ جامع)

بعض دفعہ ایام سے پاک ہونے کے بعد جلدی نماز شروع نہیں کرتیں دو تین وقت ٹال دیتی ہیں کہ کل کو سر دھو کر بال درست کرکے نہا دیں گے پھر نماز شروع کریں گے اس کا حکم یہ ہے کہ اگر تین دن پورے ہونے سے پہلے پاک ہوجائے تب تو آخر وقت مستحب تک انتظار کرنا واجب ہے اگر آخر وقت تک پاک ہی رہی تو غسل کرکے نماز پڑھنا واجب ہے اور اگر تین دن کے بعد مگر عادت سے پہلے پاک ہوئی تو آخر وقت تک انتظار کرنا مستحب ہے۔ پھر غسل کرکے نماز پڑھنا واجب ہے غرض پاکی نظر آنے کے بعد ایک وقت کی نماز قضا کرنا بھی جائز نہیں اور یہی حکم روزہ کا ہے خوب سمجھ لو (عورتوں کو اپنے ایام عادت کا یاد رکھنا واجب ہے اس میں غفلت جائز نہیں۔ ایام عادت کے بھول جانے سے بڑی پریشانی ہوگی اور اس کے لئے مسئلہ بہت پیچ در پیچ ہوجائے گا۔ جب کوئی عورت کسی معمول سے پاک ہو فوراً اس کے دن لکھ لیوے یا اچھی طرح یاد کرلیوے ۱۲ جامع)

پاکی ناپاکی کے مسائل معلوم کرنا بھی عورتوں کے ذمہ لازم ہے۔ بقدر ضرورت بہشتی زیور میں اس کے مسائل موجود ہیں کسی سمجھدار عورت سے یا اپنے شوہروں سے سمجھ کر پڑھ لیں۔ بعضی عورتیں اگر خود نماز کی پابندی کرتی ہیں تو وہ اپنے بچوں اور

ماماؤں کو نماز کے واسطے نہیں کہتیں۔ بچوں کی پرورش زیادہ تر ماؤں کی آغوش میں ہوتی ہے لہٰذا ان کو اخلاق حسنہ سکھلانا اور نماز وغیرہ کی تعلیم دینا عورتوں کے ذمہ ہے اس میں ہرگز غفلت نہ کریں۔ جب بچہ سات برس کا ہوجاوے اس وقت سے نماز کی تاکید شروع کریں اور جب دس سال کا ہوجاوے تو مار پیٹ کر نماز پڑھاویں۔ اطبار نے لکھا ہے کہ اخلاق حسنہ واعمال صالحہ کا اثر صحت پر بھی اچھا ہوتا ہے۔ جس بچے کو نیک کاموں کی عادت ہوگی اس کی صحت بھی عمدہ ہوگی عورتوں کو بچوں کی صحت کا بہت خیال ہوتا ہے اس لئے میں نے یہ فائدہ بھی بتلادیا کہ اگر کسی کو دین کا خیال نہ ہو تو صحت ہی کا خیال کر کے بچوں کو نماز وغیرہ کی تاکید کرتی رہے۔ اسی طرح ماماؤں کو بھی نماز کی تاکید کرنی چاہیئے چونکہ وہ تمہاری ماتحت ہیں اگر تم ان کو دھمکاؤ گی تو ضرور اثر ہوگا اور اس میں سستی کرنے سے تم پر بھی مواخذہ رہے گا کہ تم نے قدرت ہوتے ہوئے کیوں سستی کی بلکہ جس ماما کو مقرر کرو اس سے یہ شرط کرلیا کرو کہ تم کو پانچوں وقت کی نماز پڑھنا ہوگی۔ جس گھر میں ایک شخص بھی بے نمازی ہوتا ہے اس گھر میں نحوست برستی ہے۔ عورتوں کو اس طرف تو بالکل ہی توجہ نہیں۔

یہ تو عورتوں کی نماز کے متعلق چند کوتاہیاں ہیں۔ روزہ کو میں اس واسطے نہیں کہتا کہ عورتوں کو روزہ زیادہ دشوار نہیں اس میں وہ ماشاء اللہ مردوں سے بھی زیادہ شیر ہیں۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ عورتیں روزے بہت رکھ لیتی ہیں مگر نماز سے ان کی جان نکلتی ہے۔ اور روزہ رکھنا کچھ عورتوں کا زیادہ کمال بھی نہیں بلکہ اس میں ایک طبی راز ہے وہ یہ کہ ان میں رطوبت وبرودت کا غلبہ ہے۔ سرد مزاج والے کو بھوک پیاس کم لگتی ہے۔ اس لئے ان کو روزہ آسان ہے۔ دوسرے ان کو کھانے کے اندر مشغولی رہتی ہے۔ اپنے ہاتھ سے سب چیزیں پکاتی ہیں۔ خوشبو سونگھتی رہتی ہیں اس سے بھوک تو فوراً کم ہوجاتی ہے صرف پیاس کی تکلیف رہ گئی اس کی سہار بھی ان کو مشکل نہیں کیونکہ اول تو وہی برودت ورطوبت مانع عطش بھی ہے۔ دوسرے یہ دن بھر گھر ہی میں رہتی ہیں کہیں دھوپ میں آنے جانے کا ان کو کام نہیں پڑتا رہا یہ کہ کھانا پکانے میں آگ کے سامنے بیٹھنا پڑتا ہے تو

اکثر جو عورتیں روزہ دار ہیں وہ اپنے ہاتھ سے کم پکاتی ہیں ان کے آگے خدمت کرنے کو ماما ئیں موجود ہوتی ہیں اور جن کو خود کام کرنا پڑے وہ یہ ترکیب کرتی ہیں کہ پہلے سالن کی ہانڈیاں تیار کرلیتی ہیں۔ سالن پکانے میں آگ کے سامنے جم کر نہیں بیٹھنا پڑتا۔ ایک دفعہ آگ جلا دی ہانڈی رکھدی اور چلتے پھرتے پکالی۔ پھر جب عصر کا وقت ہوگیا گرمی کم ہوگئی جلدی جلدی پندرہ بیس منٹ میں روٹی پکالی اس لئے ان کو کھانا پکانے میں بھی کچھ زیادہ دقت نہیں ہوتی۔ تیسری وجہ سہولت روزہ کی یہ ہے کہ عموماً عورتوں کو کھانے کی حرص کم ہوتی ہے ان کو عمدہ کھانا مرغوب نہیں ہوتا بس اُن کی ہانڈی محض مردوں کی خاطر سے پکتی ہے اگر کبھی مرد گھر پر نہ ہوتو یہ چٹنی پیس کر ہی گذر کرلیتی ہیں۔ شریف عورتیں عمدہ غذائیں کھانے سے بہت بچتی ہیں۔ آپس میں کہا کرتی ہیں کہ اگر ہم اچھی غذائیں کھائیں گے تو لوگ یوں کہیں گے کہ بڑی چٹوری ہے۔ ہائے یہ کیسی بُری بات ہے جب یہ اس طرح اپنے نفس کو مارتی ہیں تو رفتہ رفتہ ان کی بھوک بھی مرجاتی ہے۔ اس لئے روزہ میں انکا کمال نہیں بلکہ اس میں مردوں کا کمال ہے کہ ہاؤ ھپ ہیں اور پھر روزہ رکھتے ہیں۔ مگر افسوس اب مردوں نے روزہ رکھتے ہیں ہمت بہت ہاردی ہے آجکل مردوں میں روزہ دار بہت کم ہیں۔ پس میں عورتوں سے یہ تو نہیں کہتا کہ وہ روزہ نہیں رکھتیں ہاں روزہ میں غیبت سے بچنے کو ضرور کہونگا کیونکہ ان کا روزہ غیبت سے بہت کم پاک ہوتا ہے جب ان کو روزہ میں کھانا پکانے کا دھندا کم ہوتا ہے تو آپس میں محفل جما کر بیٹھتی ہیں اور تیری میری غیبت شکایت میں روزہ برباد کرتی ہیں۔ یوں تو غیبت ہر حال میں حرام ہے مگر روزہ کی حالت میں اس کا گناہ زیادہ ہے جیسے زنا کرنا ہر جگہ حرام ہے اور مکہ معظمہ میں کرنا سخت گناہ ہے کیونکہ شرف مکان و شرفِ زمان سے جس طرح طاعات کا ثواب بڑھتا ہے اسی طرح معاصی کا گناہ بھی بڑھ جاتا ہے۔ نیز روزہ میں پان کھانے والیاں یہ بھی کوتاہی کرتی ہیں کہ سحری میں منہ کے اندر پان دبا کر سورہتی ہیں اگر صبح تک منہ میں پان رہا تو روزہ نہیں ہوتا اس کی احتیاط بہت ضروری ہے۔

زکوٰۃ میں بھی عورتیں بہت سستی کرتی ہیں کہ اپنے زیوروں لچکوں کی زکوٰۃ نہیں دیتیں۔ یاد رکھو جتنا زیور عورت کو جہیز میں ملتا ہے وہ اس کی ملک ہے اس کی زکوٰۃ دینا اس پر واجب ہے اور جو زیور شوہر کے گھر سے ملتا ہے اگر وہ اس نے ان کی ملک کر دیا ہے تو اس کی زکوٰۃ بھی ان پر واجب ہے اور اگر ملک نہیں کیا محض پہننے کے واسطے دیا ہے تو اس کی زکوٰۃ مردوں کے ذمہ واجب ہے۔ ہر سال اپنے زیور کا حساب کر کے جتنی زکوٰۃ اپنے ذمہ ہو فوراً ادا کر دینی چاہیئے۔ اس میں سستی کرنے سے گناہ ہوتا ہے دیکھو خدا تعالےٰ نے بہت سے غریبوں کو مال نہیں دیا حالانکہ تم ان سے کچھ زیادہ نہیں ہو اکثر غربا کمالات میں تم سے بڑھے ہوئے ہیں کہ وہ نمازی بھی ہیں دیندار بھی ہیں پھر بھی جوان کو خدا نے مال نہیں دیا اور تم کو دیا ہے تو اس کی کیا وجہ۔ خدا نے امیروں کو اسی واسطے مال دیا ہے کہ وہ غریبوں کو دیا کریں۔ کیونکہ ہر شخص اتنے ہی مال کا حقدار ہے جتنے کی اس کو ضرورت ہے پھر جس کو خدا نے حاجت سے زیادہ مال دیا ہے وہ جمع کرنے کے واسطے نہیں ہے بلکہ ان لوگوں کو دینے کے واسطے ہے جن کو حاجت کے موافق بھی نہیں ملا اور اس میں خدا تعالےٰ کی بہت سی حکمتیں ہیں کہ وہ غریبوں کو امیروں کے ہاتھ سے دلوانا چاہتے ہیں اس قاعدہ کا تو یہ مقتضا تھا کہ امیروں کو یہ حکم دیا جاتا کہ جتنا مال ان کی ضرورت سے زیادہ ہو سب غریبوں کو دیدیا کریں کیونکہ عقلاً وہ انہی کا حق ہے لیکن یہ خدا کی کتنی بڑی رحمت ہے کہ اس نے سارا مال دینے کا حکم نہیں کیا بلکہ صرف چالیسواں حصہ واجب کیا ہے پھر اس میں بھی کوتاہی کرنا بڑا ظلم ہے۔

ایک کوتاہی عورتوں میں یہ ہے کہ ان میں پردہ کا اہتمام کم ہے۔ اپنے عزیزوں میں جو نامحرم ہیں ان کے سامنے بے تکلف آتی ہیں۔ ماموں زاد، چچا زاد، خالہ زاد بھائیوں سے بالکل پردہ نہیں کرتی ہیں اور غضب یہ کہ ان کے سامنے بناؤ سنگار کر کے بھی آتی ہیں پھر بدن چھپانے کا ذرا اہتمام نہیں کرتیں۔ گلا اور سر کھلا ہوا ہے اور ان کے سامنے آجاتی ہیں اور اگر کسی کا سارا بدن ڈھکا ہوا بھی ہے تو کپڑے ایسے باریک ہوتے ہیں جنمیں سارا بدن جھلکتا ہے۔ حالانکہ باریک کپڑے پہن کر محارم کے سامنے آنا بھی جائز نہیں۔

کیونکہ محارم سے علاوہ ماتحت الازار کے پیٹ اور کمر اور پہلو اور پسلیوں کا چھپانا بھی فرض ہے پس ایسا باریک کرتہ پہن کر محارم کے سامنے آنا بھی جائز نہیں جس سے پیٹ یا کمر یا پہلو یا پسلیاں ظاہر ہوں یا ان کا کوئی حصہ نظر آتا ہو شریعت نے تو محارم کے سامنے آنے میں بھی اتنی قیدیں لگائی ہیں اور آج کل کی عورتیں نامحرموں کے سامنے بھی بے باکانہ آتی ہیں گویا شریعت کا پورا مقابلہ ہے۔

بی بیو! پردہ کا اہتمام کرو اور نامحرم عزیزوں کے سامنے قطعاً نہ آؤ اور محارم کے سامنے احتیاط سے آؤ۔ اس جگہ مجھکو ایک بات یاد آئی جس پر اہل علم کو تنبیہ کردینا ضروری سمجھتا ہوں وہ یہ کہ متون میں تو صرف یہ مسئلہ لکھا ہوا ہے کہ محارم کے سامنے ماتحت الازار کے علاوہ ظہر و بطن کا چھپانا ضروری ہے اور شروح میں اس پر اتنی زیادت اور مذکور ہے مع الجنبین یعنی پہلوؤں کا چھپانا بھی ضروری ہے اس کو ایک بہت بڑے عالم نے مع الجبین پڑھ کر ترجمہ یہ کر دیا کہ محارم سے پیشانی کا بھی چھپانا فرض ہے۔ یہ بہت بڑی غلطی ہے اور حیرتناک غلطی ہے کیونکہ جبین داخل وجہ ہے اور ستر وجہ فرض نہیں کیونکہ وجہ و کفین و قدمین عورۃ نہیں ہیں گو بوجہ خوف فتنہ کے غیر محارم کے سامنے کشف وجہ سے وجوباً منع کیا جاتا ہے۔ یہ اور بات ہے اس سے وجہ کا داخل عورت ہونا لازم نہیں آتا۔ اس لئے یہ مسئلہ اگر کسی کی نظر سے گذرے تو دھوکہ نہ کھاوے اس میں ان عالم سے غلطی ہوگئی ہے مگر اس سے ان کے عالم فاضل ہونے میں کچھ نقص نہیں آگیا کیونکہ عالم سے کسی مقام پر لغزش بھی ہوجاتی ہے اور اس سے کوئی بھی بچا ہوا نہیں بجز انبیاء علیہم السلام کے دگو لغزش ان سے بھی ہوجاتی ہے مگر وہ خطا پر مستمر نہیں رہ سکتے وحی سے فوراً ان کو متنبہ کردیا جاتا ہے ۱۲ جامع)

الغرض عورتوں کو نامحرم عزیزوں سے گہرا پردہ کرنا چاہیئے ہاں جس گھر میں بہت سے آدمی رہتے ہوں جن میں بعض نامحرم ہوں اور بعضے محرم اور گھر تنگ ہو اور پردہ کرنے کی حالت میں گذر مشکل ہو۔ ایسی حالت میں نامحرم عزیزوں سے گہرا پردہ کرنے کی ضرورت نہیں اور نہ ایک گھر میں اس طرح نباہ ہوسکتا ہے۔ اس صورت میں نامحرموں کے

سامنے بقدر ضرورت چہرہ کا کھولنا جائز ہے۔ مگر باقی تمام بدن سر سے پیر تک لپٹا ہوا ہونا چاہیئے۔ کفوں کے چاک سے ہاتھ نہ جھلکیں۔ گریبان کھلا ہوا نہ رہے بٹن اچھی طرح لگے ہوئے ہوں تاکہ گلا اور سینہ نہ جھلکے۔ دوپٹے سے تمام سر لپیٹا ہوا ہو کہ ایک بال بھی باہر نہ رہے۔ اس طرح بدن کو چھپا کر انکے سامنے کھولکر گھر کا کام کاج کر سکتی ہیں (اور بہتر یہ ہے کہ ایسی حالت میں بھی گھونگھٹ کی عادت رکھیں کھلم کھلا ان کے سامنے چہرہ ظاہر نہ کریں" جامع) اور یہی حکم کافر عورتوں کا ہے کہ ان کے سامنے صرف چہرہ اور ہاتھ اور پیر کھولنا جائز ہے باقی تمام بدن کا ان سے چھپانا واجب ہے کہ سر کا بال بھی ان کے سامنے نہ کھلے۔ عورتیں بھنگنوں اور چماریوں سے بالکل احتیاط نہیں کرتیں حالانکہ ان سے بھی بجز وجہ اور کفین اور قدمین کے باقی بدن کا شرعاً ویسا ہی پردہ ہے جیسے نامحرم مردوں سے لیکن گھبراؤ نہیں کہ اتنی احتیاط ہم سے کس طرح ہو سکتی ہے۔ تم احتیاط کرنا تو شروع کرو ان شاء اللہ تعالیٰ ذرا دقت نہ ہوگی۔ یاد رکھو اس نفس کی مثال بچہ جیسی ہے کہ بچہ کا اگر دودھ نہ چھڑایا جاوے تو وہ بارہ برس تک بھی دودھ ہی پیتا رہیگا اور خود کبھی نہ چھوڑیگا۔ اور اگر دو برس کے بعد دودھ چھڑا دیا جاوے تو دو چار روز کیلئے تو دقت ہوتی ہے مگر پھر بچہ کو روٹی کی ایسی عادت ہو جاتی ہے کہ اس کو ماں کے دودھ سے نفرت ہو جاتی ہے اور اب اگر کوئی اسے دودھ پینے کو کہے تو وہ ہرگز راضی نہ ہو۔ یہی حال نفس کا ہے اگر گناہوں کے کام اسے نہ چھڑائے جائیں تب تو یہ کبھی اپنے آپ اُن سے نہیں رُک سکتا اور اگر ہمت کر کے قصد کر لیا جاکہ بس آج سے پیچھے یہ گناہ نہ کرینگے تو اول اول دو چار روز تک تو تکلیف ہوتی ہے پھر آسانی ہو جاتی ہے بلکہ کچھ دنوں کے بعد اس سے نفرت ہو جاتی ہے۔ پھر جیسے بچہ کا اگر دودھ نہ چھڑایا جاوے تو اس کا معدہ کمزور رہتا ہے کہ عمدہ اور نفیس غذائیں ہضم نہیں کر سکتا اور دودھ چھڑانے کے بعد وہ دنیا بھر کی نعمتیں کھانے لگتا ہے ان کا مزہ چکھکر باپ ماں کو دعا دیتا ہے کہ خدا ان کا بھلا کرے کہ انھوں نے میرا دودھ چھڑا کر ان نعمتوں کے قابل مجھے بنا دیا اسی طرح گناہوں کو چھوڑکر آپ کا دل انوار طاعات کے قابل ہو جائے گا پھر جب طاعات کے انوار قلب پر فائض ہوں گے تو آپ بھی دعا دیں گے کہ خدا اس شخص کا بھلا کرے جس نے گناہوں کو ہم سے چھڑا کر ہم کو ان انوار کے قابل بنا دیا پھر آپ کو ان گناہوں کی طرف التفات بھی نہ ہوگا البتہ چند روز ہمت کرنا پڑیگی

مصرع: چند روزے جہد کن باقی بخند

(چند روز کوشش کرو پھر خوش رہو گے)

اور چند روز کے لئے ہمت کرنا کچھ مشکل بھی نہیں کیا آپ بچے سے بھی گئے گذرے
کہ وہ تو دودھ چھڑانے کی کلفت برداشت کرلیتا ہے اور آپ سے ایک ذرا سی کلفت
برداشت نہ ہو۔ ایک کوتاہی عورتوں کی یہ ہے کہ وہ شوہروں کی تعظیم اوران کا ادب نہیں کرتیں
اور یہ سخت بے حیائی ہے بعضی عورتیں مردوں سے ایسا برابری کا برتاؤ کرتی ہیں گویا شوہر
ان کا برابر کا بھائی ہے اور یہ بھی غنیمت ہیں بعض جگہ تو عورتیں مردوں پر حکومت کرتی ہیں۔
حالانکہ شریعت میں شوہروں کی تعظیم کے متعلق سخت تاکید ہے۔ حدیث میں صاف آیا ہے
کہ اگر میں خدا کے سوا کسی کے لئے سجدہ کو جائز کرتا تو عورتوں کو حکم دیتا کہ اپنے شوہروں
کو سجدہ کیا کریں۔ لیکن سجدہ تو خدا کے سوا کسی کو جائز نہیں مگر اس سے یہ بات تو معلوم
ہوگئی کہ شوہر کی کس درجہ تعظیم عورتوں کے ذمہ واجب ہے (کہ جو چیز خدا کے لئے مخصوص
ہے اگر اس کا مستحق کوئی غیر ہوسکتا تو شوہر اس کا مستحق ہوتا ۱۲) بعض جگہ تو عورتیں مردوں
کو ذلیل کرتی ہیں اور بعض جگہ مرد بھی ظالم ہوتے ہیں کہ وہ عورتوں کو بہت ذلیل رکھتے ہیں
اور بعض جگہ دونوں طرف سے یہ برتاؤ ہوتا ہے قیامت میں ان سب کا حساب ہوگا اور
جس نے جس کی حق تلفی کی ہوگی اس سے انتقام لیا جائیگا۔ پس مردوں کو چاہیئے کہ وہ عورتوں
کے حقوق کی رعایت رکھیں اور عورتوں کو مردوں کی تعظیم کرنی چاہیئے ان کی اطاعت
وفرمانبرداری کا خیال کرنا چاہیئے۔
ایک کوتاہی عورتوں کی یہ ہے کہ یہ اسراف بہت کرتی ہیں روپیہ کو احتیاط سے خرچ
نہیں کرتیں۔ بس یہ سمجھ لیا ہے کہ ہم کو تو کمانا پڑتا نہیں ہم جس طرح چاہیں خرچ کریں مرد اپنے آپ
کما کر لائے گا۔ بعض جگہ مامائیں خوب گھر لوٹتی ہیں اور یہ ذرا خبر نہیں لیتیں۔ یاد رکھو! شوہر کے
مال کی نگہبانی عورتوں کے ذمہ واجب ہے اس کو اس طرح رائیگاں کرنا ان کو جائز نہیں
قیامت میں عورتوں سے اس کا بھی حساب ہوگا۔ خصوصاً شادیوں میں تو بہت ہی فضول
خرچی کرتی ہیں۔ اُن میں تو عورتیں ہی مفتی اعظم ہوتی ہیں۔ سارے کام انہی سے پوچھ پوچھ کر کئے
جاتے ہیں۔ مرد جانتے ہی نہیں کہ شادیوں میں کہاں خرچ کی ضرورت ہے کہاں نہیں بس
جس جگہ عورتیں خرچ کرنے کا حکم دیتی ہیں وہاں بلا چون وچرا خرچ کیا جاتا ہے اور

اوران عورتوں نے ایسے بیڈھنگے خرچ نکال رکھے ہیں جن میں فضول روپیہ برباد ہوتا ہے۔ ان شادیوں کی بدولت بہت سے بڑے بڑے گھر تباہ و برباد ہوگئے ہیں۔ لیکن اب بھی لوگوں کو عقل نہیں آتی اور وہ ان رسوم وغیرہ میں عورتوں کا اتباع نہیں چھوڑتے۔ حتیٰ کہ ایک صاحب یہ کہتے تھے کہ خدا بھلا کرے اصلاح الرسوم کے مصنف کا کہ ہم کو رسموں کی تفصیل یاد نہ رہی تھی اس میں ہم عورتوں کے محتاج تھے۔ اصلاح الرسوم میں بہت تفصیل کے ساتھ تمام رسموں کو لکھدیا ہے۔ بس اب ہم اُسی کو دیکھ دیکھ کر سب کام کرتے ہیں اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ اس بندۂ خدا نے اصلاح الرسوم سے یہ کام لیا حالانکہ اس میں تو رسموں کی خرابیاں ظاہر کی گئی ہیں اور ہر رسم کا گناہ ہونا بتلایا گیا ہے مگر اس ظالم نے اس مضمون کو تو چھوڑ دیا اور صرف رسموں کا بیان دیکھ لیا کہ فلاں وقت یوں ہوتا ہے اس کے بعد یہ ہوتا ہے۔ تو اب بھی لوگوں کی آنکھیں نہیں کھلیں۔ جب سارا گھر باہر نیلام ہو جائے گا اس وقت شریعت کے موافق شادی کرنے کی سوجھے گی۔

صاحبو! شادیوں میں بہت اختصار کرنا چاہیئے تاکہ بعد میں افسوس نہ ہو کہ ہائے ہم نے یہ کیا کیا۔ اگر کسی کے پاس بہت زیادہ ہی رقم ہو تو اس کو اس طرح برباد کرنا مناسب نہیں بلکہ دنیا دار کو کچھ رقم جمع کرنا بھی چاہیئے اس سے دل کو اطمینان رہتا ہے۔ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد ہے کہ صاحب اسباب کو کچھ رقم اپنے پاس نفس کے بہلاوے کے لئے جمع رکھنی چاہیئے اس سے دل مطمئن رہتا ہے اور طاعات میں یکسوئی نصیب ہوتی ہے۔ صاحب اسباب کے پاس اگر رقم جمع نہ ہو تو اس کا دل پریشان رہتا ہے جس سے دین کے کاموں میں بھی خلل پڑتا ہے۔ ہاں جس کو توکل کی قوت نصیب ہو وہ جمع نہ کرے بلکہ خوب اللہ کے نام پر لٹائے تاکہ ثواب بھی ملے مگر فضول روپیہ برباد نہ کرو۔ ایک کوتاہی عورتوں میں یہ ہے کہ یہ غمی میں بھی بہت اسراف کرتی ہیں بھلا وہاں خرچ کا کیا موقع وہ تو کوئی افتخار کا وقت نہیں بلکہ عبرت کا موقع ہے مگر ان کے یہاں غمی میں بھی خاصی بارات کا اہتمام ہوتا ہے پھر حیرت تو ان جانے والیوں پر ہے کہ جہاں

کسی کے گھر موت ہوئی اور یہ گاڑیاں لے کر اس کے گھر پہونچ گئیں۔ اب اس غریب پر ایک تو موت کا صدمہ تھا ہی دوسرا یہ وبال سر پر آ کھڑا ہوا کہ آنے والیوں کے کھانے کی فکر کرے، پان چھالیہ کا انتظام کرے، گاڑی کے گھاس دانہ کا اہتمام کرے پھر اگر ذرا بھی کسی بات میں کوتاہی ہوگئی تو آنے والیاں طعنے دیتی ہیں کہ ہم گئے تھے ہمیں پان بھی نصیب نہ ہوا بھلا کوئی ان سے پوچھے کہ یہ وقت تمہارے ناز نخرے پورا کرنے کا تھا یا اس بیچاری پر مصیبت کا وقت تھا مگر ان کی بلا سے ان کے ناز نخرے کسی وقت کم نہیں ہوتے۔ حالانکہ اس وقت تو یہ مناسب تھا کہ آنے والیاں اپنا دال آٹا ساتھ باندھ کر لاتیں اور گھر والوں سے کہدیتیں کہ اس وقت تم ہماری فکر نہ کرو تم خود مبتلائے رنج ہو جب بھی خوشی کا موقع ہوگا ہماری خاطر مدارات کر لینا باقی اس وقت تو ہم اپنا انتظام خود ہی کریں گے اور یہ تو بہت ہی سخت بے حیائی ہے کہ وہاں جاکر بھی اپنے سارے معمولات پورے کریں کہ نہ پان میں فرق آوے نہ چائے میں۔

بلند شہر میں ایک رئیس زادے کے باپ کا انتقال ہو گیا تھا۔ ان کے اعزہ چاروں طرف سے جمع ہو گئے اور ایک بارات سی ان کے گھر پر آگئی۔ رئیس زادے نے سب کے لئے عمدہ عمدہ کھانے پکوائے جب کھانا چُنا گیا تو اس نے مہمانوں سے کہا کہ مجھے کچھ عرض کرنا ہے پہلے میری بات سن لیجئے پھر کھانا شروع کیجئے گا سب لوگ ہاتھ روک کر بیٹھ گئے۔ اس نے سب کو مخاطب کر کے کہا کہ آپ حضرات کو معلوم ہے کہ اس وقت مجھ پر کیسا سانحہ گذرا ہے۔ اس وقت میرے والد ماجد کا سایہ میرے سر پر سے اٹھ گیا ہے اور سب جانتے ہیں کہ باپ کا سایہ اٹھ جانے سے کیسا صدمہ ہوتا ہے تو کیا یہی انصاف ہے کہ مجھ پر تو یہ مصیبت گذرے اور تم آستین چڑھائے مرغن کھانا کھانے کو تیار ہو گئے۔ کیوں صاحب یہی ہمدردی ہے بس مجھ کو جو کہنا تھا کہہ چکا اب کھانا شروع کیجئے۔ بھلا اب کون کھاتا جب سر پر جوتیاں پہلے ہی پڑ گئیں سب لوگ دسترخوان سے اٹھ کھڑے ہوئے اور رئیس زادے نے غربا کو بلا بھیجا کہ بیٹھو کھاؤ تمہارے کھانے سے میرے باپ کی روح کو ثواب بھی پہونچے گا اور یہ برادری کے کھاتے پیتے لوگ آستین چڑھا کر بیٹھ گئے ان کے کھانے سے ان کو کیا ثواب ملتا اور میری رقم برباد ہو جاتی۔ غرض غریبوں نے خوب پیٹ بھر کر کھانا کھایا۔

اور دعا دیتے ہوئے چلے گئے۔ اس کے بعد برادری کے چند معزز لوگ اس طرف جاکر بیٹھے اور غمی کی رسوم میں مشورہ کرنے لگے سب نے بالاتفاق یہ طے کیا کہ واقعی یہ رسمیں بالکل عقل کے خلاف ہیں اور شریعت کے خلاف تو ہیں ہی ان سب کو یک لخت موقوف کر دینا چاہیئے کسی نے اُن رئیس زادے سے کہا کہ میاں جب تم کو کھلانا منظور نہ تھا تو پہلے ہی سے یہ بات کہدی ہوتی اتنا انتظام ہی تم نے کیوں کیا تھا اس نے جواب دیا کہ اگر میں یہ انتظام نہ کرتا اور کھانا تیار کرنے سے پہلے یہ بات کہتا تو لوگ یوں سمجھتے کہ اپنی بچت کیلئے یہ بات نکالی ہے۔ اب کسی کا یہ منہ نہیں رہا کہ مجھے یہ الزام دے سکے کیونکہ میں نے کھانے عمدہ سے عمدہ تیار کرادیئے تھے جس سے معلوم ہوگیا کہ مجھے اپنی بچت منظور نہ تھی بلکہ محض اس بیہودہ رسم کا بیہودہ ہونا ظاہر کرنا تھا۔

واقعی اس شخص نے خوب کیا اگر دو چار آدمی اسی طرح کریں تو یہ سب رسمیں موقوف ہوجاویں۔ مگر ایسا کرنے کے لئے ہمت کی ضرورت ہے ہر اک کی ایسی ہمت نہیں ہوتی۔ جب کسی کے گھر پر آدمی پہونچ جاتے ہیں تو وہ شرما شرمی ان کا انتظام کرتا ہی ہے۔ مگر جانے والوں کو خود اس کا خیال کرنا چاہیئے۔ یہ تو نمونہ ہے عورتوں کی کوتاہیوں کا ان سے بچنے کا اُن کو اہتمام کرنا چاہیئے یہاں تک تو گویا وَاتَّقُوا اللّٰہَ (اللہ تعالےٰ سے ڈرو) کا بیان ہوا کیونکہ تقویٰ کے معنے معاصی سے بچنے ہی کے ہیں نمونہ کے طور پر میں نے چند معاصی کی فہرست گنادی ہے اور یہ تو وہ باتیں ہیں جو اس وقت میرے ذہن میں بے تکلف آگئیں اسی پر دوسرے اعمال کو قیاس کرلیں۔ کیونکہ ہمارے اکثر اعمال کوتاہی سے خالی نہیں۔ اگر کوئی عورت یہ سوال کرے کہ اس آیت میں تو تقوے کا امر اول مردوں کو ہے اور ان کے واسطہ سے ہم کو ہے مگر کہیں خاص ہمکو بھی حکم ہوا ہے۔ اسکا جواب یہ ہے کہ ہاں خاص عورتوں کو بھی اس کا حکم ہوا ہے۔ حق تعالےٰ سورۂ احزاب میں فرماتے ہیں وَاتَّقِیْنَ اللّٰہَ جو کہ صیغہ جمع مؤنث حاضر کا ہے اس میں خاص عورتوں ہی کو خطاب ہے اب تو سوال نہیں رہا۔

اب میں دوسرے جزء وَکُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ کے متعلق کچھ مختصر بیان کرتا ہوں۔ (کیونکہ وقت کم رہ گیا ہے نماز عصر قریب ہے) اس جزء کا حاصل تو یہی ہے کہ اس میں کمال

ـــــ اور سچوں کے ساتھ ہوجاؤ۔

دین حاصل کرنے کا طریقہ بتلایا گیا ہے کہ تم کاملین اور راسخین فی الدین کی ساتھ ہو جاؤ۔
مردوں کو تو اس طریقہ پر عمل کرنا آسان ہے اب قابل غور یہ ہے کہ عورتوں کے لئے اس کا طریقہ کیا ہے اور یہ سوال واقعی بہت ضروری ہے۔ سو جواب یہ ہے کہ اس کے دو طریقے ہیں ایک یہ کہ عورتیں بھی ان ہی بزرگوں سے فیض حاصل کریں جن سے مرد فیض حاصل کرتے ہیں مگر یہ ذرا دشوار ہے کیونکہ اول تو مردوں اور عورتوں کا ساتھ کیا دوسرے پردہ کی وجہ سے شیخ کو ان سے مناسبت کامل نہیں ہو سکتی اور بدون مناسبت کے نفع کامل نہیں ہوتا اور بزرگوں کے سامنے آنا اور ان سے پردہ نہ کرنا جائز نہیں ہاں جن عورتوں کا باپ یا خاوند کامل ہو وہ ان سے فیض حاصل کر سکتی ہیں۔ مگر سب کے تو باپ اور شوہر کامل نہیں اس لئے یہ طریقہ کافی نہیں۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ مرد کامل مردوں سے فیض لیں اور عورتیں کامل عورتوں سے اور اصل قیاس کا مقتضی بھی یہی ہے کہ جس طرح مردوں کو حکم ہے کُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ (اور سچوں کے ساتھ ہو جاؤ) اسی طرح عورتوں کو حکم دیا جاوے کُنَّ مَعَ الصّٰدِقَاتِ (اے عورتو تم سچی عورتوں کے ساتھ ہو جاؤ) مگر اس پر سوال یہ ہوتا ہے کہ کیا عورتیں بھی کامل ہو سکتی ہیں جواب یہ ہے کہ ہاں قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ عورتیں بھی کامل ہو سکتی ہیں کیونکہ جس طرح حق تعالیٰ نے مردوں کو صادقین فرمایا ہے اسی طرح عورتوں کو صادقات فرمایا ہے چنانچہ سورۂ احزاب کی ایک آیت اِنَّ الْمُسْلِمِیْنَ وَالْمُسْلِمٰتِ الآیۃ (مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں) میں نے ذرا دیر ہوئی پڑھی تھی اس میں یہ بھی ہے وَالصّٰدِقِیْنَ وَالصّٰدِقٰتِ (سچے مرد اور سچی عورتیں) اور صادقین کے معنے کاملین کے ہیں تو صادقات بمعنے کاملات ہوا اس سے عورتوں کے بھی کامل ہونے کا ثبوت ملتا ہے اور واقعی عورتوں کی اصلاح کا طریق سب سے اچھا یہی ہے کہ جو عورتیں کامل ہوں یہ ان کی صحبت میں رہیں مگر افسوس ہے ہمارے طبقۂ اناث پر کہ آجکل ان میں کامل بہت کم ہیں۔

جب میں نے جزاء الاعمال لکھی ہے تو اس میں میں نے چند بزرگوں کے نام کی فہرست لکھی تھی کہ عام لوگ ان میں سے کسی کے ساتھ وابستہ ہو جاویں اس وقت میرا جی چاہا کہ چند عورتوں کے نام بھی لکھوں تاکہ عورتیں ان سے فیض حاصل کریں۔ مگر عورتوں میں کوئی ایسی

نظر ہی نہ پڑی جس کا نام میں اطمینان کے ساتھ لکھ دیتا اور بعضی ایسی بھی تھیں جن کے کمال کی خبریں میں سنتا تھا اور اس وقت تک ان کے متعلق کوئی بات بے اطمینانی کی نہ تھی مگر ان کا نام لکھنے سے چند وجوہ سے رکا۔

(۱) یہ کہ ان کے کمالات عورتوں ہی کی زبانی سنے تھے خود مجھ کو ان کے کمال کی تحقیق نہ تھی اور نہ تحقیق کی کوئی صورت تھی بخلاف ان بزرگوں کے جن کے نام شائع کئے گئے تھے کہ ان سب سے میں خود مل چکا تھا اور عورتوں کے بیانات پر مجھے وثوق نہ ہوا کہ نہ معلوم یہ اپنے ذہن میں کمال کسے سمجھتی ہوں گی اور کس کو کامل کہتی ہوں گی ان سے یہ بھی بعید نہیں کہ ناقص کو کامل سمجھتی ہوں۔

(۲) اگر عورتوں کا نام کاملات کی فہرست میں شائع ہوا تو ایسا نہ ہو کہ مردوں کو بھی ان سے اعتقاد ہو جاوے اور بعضے مردان سے فیض حاصل کرنے جاویں۔

(۳) ممکن ہے کہ عورتیں دور دراز سے ان کی ملاقات و زیارت کے لئے سفر کریں اور ایسا ضرور ہوتا اور میں عورتوں کے لئے سفر کو پسند نہیں کرتا اور جب عورتیں سفر کر کے ان کے پاس آتیں تو ان بیچاری کاملات کو آنے والیوں کی خاطر مدارات اور مہمانی کرنی پڑتی جس سے ان پر بار ہوتا۔

(۴) پھر آنے والیوں کی خاطر مدارات کے متعلق ان کاملات میں اور ان کے شوہروں میں نزاع ہوتا شوہر چلاتا کہ میرے گھر روز روز یہ گاڑیاں کیسی آنے لگیں مردوں کو روز روز عورتوں کے آنے سے پردہ وغیرہ کی تکلیف ہوتی اُن کی آزادی میں خلل پڑتا۔

(۵) اس قدر رجوعات سے کہیں ان کاملات کا دماغ نہ بڑھ جاتا کیونکہ یہ تعظیم و تکریم وہ بلا ہے کہ اس کی ساتھ کامل سے کامل مرد کو بھی سنبھلنا دشوار ہوتا ہے۔ عورتوں کا دماغ تو بہت ہی بڑھ جاتا کہ ہاں ہم بھی کچھ ہیں تو ان بیچاریوں کا تھوڑا بہت جو کچھ کمال تھا وہ بھی اس تکبر کی بدولت زائل ہو جاتا۔ خیر وجوہ تو میرے ذہن میں بہت سی آئیں مگر سب سے زیادہ مانع پہلی وجہ تھی کہ ان کے کمالات عورتوں ہی کی زبانی سنے ہوئے تھے اس لئے پوری طرح وثوق نہ ہوا۔ اور حقیقت میں میرا خیال صحیح نکلا۔ کیونکہ میں نے جن مردوں کو کاملین میں شمار کیا تھا

الحمدللہ اس وقت تک قریب قریب میں ان سب کے کمال کا معتقد ہوں اور بجز ایک دو کے باقی سب ایسے ہیں کہ ان کی بابت کوئی بات خلافِ کمال مجھے معلوم نہیں ہوئی اور جن عورتوں کے متعلق میں نے کامل ہونے کی خبریں سنی تھیں قریب قریب اس وقت میں ان سے کسی کا معتقد نہیں رہا کیونکہ ہر اک میں کچھ نہ کچھ بات بعد میں معلوم ہوئی اس لئے میں خدا کا شکر کرتا ہوں کہ اس وقت میں نے ان کے نام شائع نہ کئے ورنہ شائع ہوجانے کے بعد اب بڑی دقت ہوتی۔ چنانچہ انہی میں سے ایک مسماۃ ایک قصبہ کی رہنے والی بھی تھیں جنکو میں نے کاملات میں شمار کرنے کا قصد کیا تھا ان کا نام جنت تھا شاید اب تو وہ مرگئی ہیں اس وقت ان کی حالت بہت اچھی سننے میں آرہی تھی کہ بہت نیک ہیں سوائے نماز روزہ اور تسبیح کے ان کو اور کوئی کام نہیں تھا لڑکیوں کو پڑھایا بھی کرتی تھیں مگر اخیر میں وہ بجائے جنت کے دوزخ بن گئیں۔ اسی قصبہ میں کچھ زمانہ سے ایک بے نکاحی عورت نے فتنہ برپا کر رکھا ہے اپنے آپ کو ولی اور بزرگ ظاہر کرتی ہے مردوں عورتوں کو مرید کرتی ہے اور کسی سے شادی نہیں کرتی۔ اس کمبخت کے ایک بچہ بھی بدون خاوند کے ہوا جب اس سے پوچھا گیا تو اس نے جواب دیا کہ جس طرح مریم علیہا السلام کے عیسیٰ علیہ السلام بدون باپ کے ہوئے تھے اسی طرح میرے بھی بدون باپ کے بچہ ہوگیا نعوذ باللہ مگر عورتوں کی جہالت دیکھئے کہ باوجود ایسی بے حیائی اور بدکاری کے پھر بھی اس کی معتقد ہیں اور اس کو پیرانی کا لقب دے رکھا ہے۔ حیرت یہ ہے کہ بعضے مردوں کی عقل پر بھی پتھر پڑ گئے کہ پڑھ لکھ کر ڈوب گئے اور اس کے معتقد بن گئے اور ان تمام بدکاریوں اور بےحیائیوں کی تاویل کرنے لگے (خدا ان کو غارت کرے قَاتَلَهُمُ اللّٰهُ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ۱۲ جامع) (اللہ تعالیٰ ان کو ہلاک کرے کہاں جا رہے ہیں) وہ بی جنت بھی اخیر عمر میں ایسی بےحیا عورت کی معتقد ہوگئی تھیں اور اس کی مرید بن گئی تھیں اور ان کے سامنے جو کوئی اس کی برائی کرتا اور ان کو بیوقوف بناتا کہ تم اس کی مرید کیوں ہوگئیں تو وہ الٹا کہنے والے کو بیوقوف بناتیں اور اسے کوسنے دیا کرتیں۔ غرض اخیر میں وہ بالکل مسخ ہوگئی تھیں (خدا مغفرت کرے ۱۲) تو جن عورتوں کو میں نے کامل سنا تھا کچھ دنوں کے بعد اکثروں کا ناقص ہونا معلوم ہوگیا۔ تو اب یہ صورت تو عورتوں کی اصلاح کی ہو نہیں سکتی کہ وہ آپس میں اپنی ہم جنس عورت سے فیض حاصل کریں۔ اب دو ہی صورتیں ہیں ایک یہ کہ جن کے محارم میں سے کوئی

کامل ہو وہ اس سے مستفیض ہوں جس کا خاوند کامل ہو وہ اپنے خاوند سے فیض حاصل کرے مگر اس میں یہ مشکل ہے کہ شوہر تو بعض جگہ غلام ہے ورنہ برابر کا دوست تو ہے ہی۔ شوہر کی تعظیم وتکریم عورتیں اس درجہ نہیں کرتیں جتنی مربی کی تعظیم ہونی چاہیئے اور بدون اس کے فائدہ نہیں ہوسکتا۔ دوسرے بیوی کو شوہر سے ویسا اعتقاد بھی نہیں ہوتا جیسا دوسروں سے اعتقاد ہوتا ہے گو اپنا شوہر کتنا ہی بڑا کامل ہو۔ ہمارے حضرت حاجی صاحب قدس سرہٗ کے گھر میں جو پہلی بیوی تھیں باوجودیکہ حضرت کی بہت فرمانبردار تھیں مگر بیعت ہونے کو وہ حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ سے کہتی تھیں۔ مولانا گنگوہی نے فرمایا کہ آپ حضرت حاجی صاحب سے کیوں نہیں بیعت ہوجاتیں، بھلا حضرت کے ہوتے ہوئے مجھ سے بیعت ہونا کیا مناسب ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ حاجی صاحب کے کمال میں شبہ نہیں مگر میں ان سے بیعت نہیں ہوتی۔ میں تو آپ سے ہی بیعت ہونا چاہتی ہوں (پھر معلوم نہیں کہ حضرت مولانا گنگوہی نے ان کو بیعت کیا یا نہیں مگر دیکھ لیجئے کہ ان کو حاجی صاحب سے بیعت ہونا منظور نہ تھا بلکہ ان کے خلفاء سے بیعت کی درخواست کرتی تھیں)

اور حضرت حاجی صاحب کی دوسری بیوی تو سنا ہے کہ بہت ہی نیک تھیں جن عورتوں نے ان کو دیکھا ہے وہ کہتی ہیں کہ حاجی صاحب میں اور ان میں صرف اتنا فرق تھا کہ حضرت مرد تھے اور وہ عورت تھیں اور کچھ فرق نہ تھا۔ سنا ہے کہ وہ مثنوی کو بھی خوب سمجھتی تھیں۔ اور یہ دوسری بیوی حضرت حاجی صاحب کی منگیتر تھیں پہلے ان سے حضرت کی منگنی ہوئی تھی مگر حضرت کے انکار کی وجہ سے نکاح نہ ہوا تھا۔ کسی دوسرے سے نکاح ہوگیا تھا۔ پھر شوہر اول کے انتقال کے بعد حاجی صاحب نے ان سے دوسرا نکاح کرلیا تھا تو اگر خاوند سے بھی فیض حاصل نہ کرسکیں اور اپنے محارم میں بھی کوئی کامل نہ ہو تو اب دوسری صورت یہ ہے کہ بزرگوں کی کتابوں اور ان کے ملفوظات ومواعظ کا مطالعہ کیا جائے بزرگوں کی تصانیف اور ان کے ملفوظات میں بھی وہی اثر ہوتا ہے جو ان کی صحبت میں اثر ہوتا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

چوں کہ گل رفت وگلستاں شد خراب　　بوئے گل را از کہ جوئیم از گلاب

چونکہ خورشید ومارا کرد داغ چارہ نبود درمقامش از چراغ

یعنی جب پھولوں کی موسم چلی جائے تو اب اس کی خوشبو گلاب سے حاصل کرنی چاہیے گلاب میں بھی پھول کی خوشبو مل سکتی ہے اسی طرح آفتاب چھپ جائے تو اب چراغ سے روشنی حاصل کرنی چاہیے۔ یہ مشاہدہ ہے کہ اہل اللہ کے کلام میں نور ہوتا ہے اور ملحدوں کے کلام میں ظلمت ہوتی ہے۔ گو بزرگوں کی کتابوں کی عبارت سادی ہوتی ہے ان میں عبارت آرائی نہیں ہوتی مگر ان کے مطالعہ سے نور قلب میں پیدا ہوتا ہے اور جو لوگ متبع شریعت نہیں ہیں ان کی کتابوں کی عبارت گو کیسی ہی شستہ ہو مگر باطن میں اس سے ظلمت پیدا ہوتی ہے گو ان میں تمام باتیں دین ہی کی ہوں مگر الفاظ چونکہ ان کے اپنے ہیں اس لئے وہ ظلمت سے خالی نہیں ہوتے جس کے دل میں کچھ بھی ادراک ہے وہ اس فرق کو ضرور محسوس کرے گا۔ اسی طرح اہل اللہ کی تقریر میں بھی ایک نور ہوتا ہے جو غیر اہل اللہ کے کلام میں نہیں ہوتا۔

ایک بزرگ کے صاحبزادے تحصیل علم کے لئے کہیں باہر گئے تھے جب وہ فارغ ہو کر واپس ہوئے اور پورے عالم ہوگئے تو اپنے والد صاحب کے پاس آئے انہوں نے ان سے فرمایا کہ تم وعظ کہو چنانچہ صاحبزادے نے وعظ کہا اور بڑے بڑے عالی مضامین بیان کئے مگر کسی پر کچھ بھی اثر نہ ہوا۔ جب وہ وعظ کہہ چکے تو ان کے والد صاحب ممبر پر تشریف لائے اور وعظ سے پہلے انہوں نے اپنا واقعہ اُسی رات کا بیان فرمایا کہ رات ہم نے روزہ کی نیت کی تھی سحری کے لئے کچھ دودھ رکھا تھا مگر بلّی آئی اور سارا دودھ پی گئی۔ بس اتنا ہی بیان فرمایا تھا کہ ساری مجلس تڑپنے لگی اس کے بعد اُن بزرگ نے اپنے صاحبزادے سے فرمایا کہ صاحبزادے سننے والے پر قلب کا اثر پڑا کرتا ہے الفاظ کا اثر نہیں ہوتا۔ تم نے اب تک علم الفاظ حاصل کیا ہے اب قلب کے اندر بھی اس علم کو پہنچانا چاہیئے۔ اہل اللہ کے کلام سے یہ ضرور نہیں کہ آنکھوں سے آنسو نکلنے لگیں بلکہ اہل دِل کے کلام سے سامعین کے دل آنسوؤں سے بھر جاتے ہیں۔ غرض تجربہ اور مشاہدہ سے یہ بات ثابت ہے کہ بزرگوں کی تصانیف سے بھی قریب قریب وہی فائدہ ہوتا ہے جو ان کے پاس رہنے سے ہوتا ہے گو بالکل اس کے برابر نہ ہوگا مگر اس کے قریب ضرور ہوگا۔ تو اگر عورتوں کو بزرگوں کی صحبت میسر نہ آسکے تو ان کے ملفوظات اور احوال موجود ہیں

ان کو دیکھتی رہا کریں ان شاء اللہ تعالیٰ کمال ضرور حاصل ہوگا اور مردوں کو بھی بزرگوں کی تصانیف اور ان کے ملفوظات واحوال کا مطالعہ کرتے رہنا چاہیئے کیونکہ ہر شخص کو اتنی مہلت نہیں ملتی جو ان کے پاس جا کر رہے۔ عارف شیرازی رحمۃ اللہ علیہ گویا اسی زمانہ کے واسطے یہ فرما گئے ہیں ؎

دریں زمانہ رفیقے کہ خالی از خلل است　　صراحی مئے ناب وسفینۂ غزل است

(اس زمانہ جو رفیق خلل سے خالی ہے وہ کتاب ذکر وشغل طاعت وعبادت اور بزرگوں کے ملفوظات ہیں)

صراحی مئے ناب سے مراد ذکر وشغل اور طاعات وعبادات ہیں اور سفینۂ غزل سے مراد اہلِ عشق کے ملفوظات ہیں۔ اس میں حضرت حافظ نے کتاب کو رفیق بتلایا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو فائدہ رفیق سے ہوتا ہے وہ اس سے بھی ہوتا ہے اور شیخ بھی رفیق طریق ہوتا ہے تو جس کو شیخ میسر نہ ہو وہ کتابوں کو رفیق بنائے۔ پس الحمد للہ کہ اس سوال کا جواب ہر پہلو سے مکمل ہو گیا کہ عورتوں کے لئے معیت صادقین کی کیا صورت ہوگی۔ حاصل جواب کا یہ ہوا کہ جن کے محارم میں کوئی کامل موجود ہو وہ تو اس کی صحبت اختیار کریں اور جن کے محارم میں کوئی کامل نہ ہو وہ اس کی تلاش کریں کہ کوئی عورت کامل فی الدین ملے تو اس کی صحبت سے فائدہ اٹھائیں اور جس کو دونوں باتیں میسر نہ آئیں وہ بزرگوں کے کلام اور ملفوظات اور قصص واحوال کا مطالعہ کریں۔ پس اب عورتوں کے لئے بھی اس آیت کا بیان مکمل ہو گیا اور میں نے ان کو بھی کمال دین حاصل کرنے کا آسان سے آسان طریق بتلا دیا اب آگے ان کی ہمت ہے کہ عمل کریں یا نہ کریں۔ پس مضمون تو ختم ہو گیا اب اُس ایک ذُنابہ رہ گیا اس کو بیان کر کے میں اپنی تقریر ختم کر دوں گا وہ ذُنابہ ایک طالبعلمانہ اشکال وجواب ہے جس کو طلبۂ اہل علم خوب سمجھ لیں گے اشکال یہ ہے کہ قرآن سے تو معلوم ہوتا ہے کہ عورتیں کامل ہو سکتی ہیں چنانچہ اَلصّٰدِقِیْنَ وَالصّٰدِقٰتِ اس پر دلالت کر رہا ہے اور ایک حدیث میں بھی ہے کَمُلَ مِنَ الرِّجَالِ کَثِیْرٌ وَلَمْ یکمل من النساء الا مریم بنت عمران وآسیہ امرأۃ فرعون وفضل عَائِشَۃَ عَلَی النِّسَاءِ کَفَضْلِ الثَّرِیْدِ عَلٰی سَائِرِ الطَّعَامِ جس کا حاصل یہ ہے کہ مردوں میں تو بہت لوگ کامل ہوئے

لیکن عورتوں میں بجز مریم علیہا السلام اور آسیہ فرعون کی بیوی کے اور کوئی کامل نہیں ہوئی اور حضرت عائشہ کی فضیلت تمام عورتوں پر ایسی ہے جیسے ثرید کی فضیلت ہے تمام کھانوں پر۔ اس سے علماء نے حضرت عائشہ کا کمال بھی سمجھا ہے کہ وہ بھی کامل ہیں۔ بہر حال اس حدیث سے معلوم ہوا کہ عورتیں کامل ہو بھی سکتی ہیں اور اس کا وقوع بھی ہوا ہے گو ان میں کامل افراد بہ نسبت مردوں کے کم ہیں۔ مگر ایک حدیث سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ عورتیں کامل ہو ہی نہیں سکتیں۔ وہ حدیث یہ ہے کہ آپ نے ایک بار عورتوں کو خطاب کر کے فرمایا مَا رَأَيْتُ مِنْ نَاقِصَاتِ عَقْلٍ وَدِيْنٍ أَذْهَبَ لِلُبِّ الرَّجُلِ الْحَازِمِ مِنْ إِحْدٰكُنَّ کہ میں نے عورتوں سے بڑھ کر کوئی ناقص العقل اور ناقص الدین ایسا نہیں دیکھا جو ہوشیار مرد کی عقل کو جلدی زائل کر دیتا ہو۔ اس پر عورتوں نے سوال کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہماری عقل اور دین میں کیا نقصان ہے آپ نے فرمایا کیا عورتوں کی گواہی مردوں کی آدھی گواہی کے برابر نہیں ہے۔ انہوں نے کہا بیشک۔ آپ نے فرمایا کہ یہ تو ان کی عقل کا نقصان ہے کہ دو عورتوں کی گواہی ایک مرد کی برابر شمار کی گئی ہے۔ اور کیا جب تم کو حیض آتا ہے تو تم نماز روزہ چھوڑ کر نہیں بیٹھ جاتیں۔ انہوں نے کہا بیشک۔ فرمایا کہ یہ تمہارے دین کا نقصان ہے۔ اس حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کے ناقص ہونے کا جو سبب بیان فرمایا ہے وہ ایسا سبب ہے جس سے کوئی عورت بھی خالی نہیں لہٰذا لازم آتا ہے کہ عورتوں میں کوئی بھی کامل نہ ہو سکے حالانکہ قرآن اور دیگر احادیث سے ان میں بھی کاملات کا وجود معلوم ہوتا ہے۔ یہ اشکال عرصہ سے میرے ذہن میں تھا مگر اس کا کوئی شافی جواب اب تک ذہن میں نہ آیا تھا اسی لئے اس اشکال کو اب تک میں نے کہیں بیان نہ کیا کہ خواہ مخواہ دوسروں کو بھی کیوں پریشانی میں ڈالا۔ الحمد للہ اس وقت جواب ذہن میں آ گیا اس لئے میں نے اشکال کو بھی بیان کر دیا اور جواب بھی عرض کرتا ہوں اس کا حاصل یہ ہے کہ کمال کی دو قسمیں ہیں ایک کمال اختیاری ایک کمال غیر اختیاری۔ اسی طرح نقصان کی بھی دو قسمیں ہیں ایک اختیاری ایک غیر اختیاری اور انسان مکلف ہے تحصیل کمال اختیاری کا جو کہ امر مکتسب ہے اور مکلف ہے ازالہ نقصان اختیاری کا جو اس کی قدرت میں داخل ہے اور کمال غیر اختیاری کی تحصیل اور نقصان غیر اختیاری سے اجتناب کا انسان مکلف نہیں لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا۔

(اللہ تعالیٰ کسی شخص کو اس کی وسعت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتے) لیکن یہ ضرور ہے کہ کمال غیر اختیاری کے حاصل نہ ہونے سے عورتوں کو گناہ نہ ہوگا لیکن گناہ نہ ہونے سے اس کا موجب نقصان نہ ہونا لازم نہیں۔ بہت سی چیزیں ایسی ہیں جن کے نہ ہونے سے گناہ نہیں ہوتا لیکن نقصان ضرور ہے (مثلاً ایک آدمی میں طبعاً بزدلی اور خوف بہت زیادہ ہے جس کی وجہ سے وہ جہاد نہیں کر سکتا اس صورت میں اس کو گناہ تو نہیں ہوگا لیکن یہ نقصان ضرور ہے اور مجاہدین کی برابر وہ شخص نہیں ہو سکتا ۱۲) پس قرآن میں جو عورتوں کو کامل کہا گیا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ کمال مکتسب کا درجہ ان کو حاصل ہو سکتا ہے اور حدیث میں جو ان کو ناقصات الدین کہا گیا ہے اس میں نقصان غیر اختیاری کو بیان کیا گیا ہے اور کمال مکتسب و نقصانِ غیر اختیاری کے جمع ہونے میں کوئی اشکال نہیں۔ اب یہ سوال رہا کہ دوسری حدیث میں جو فرمایا گیا ہے کہ مردوں میں تو بہت لوگ کامل ہوئے اور عورتوں میں بجز مریم علیہا السلام و حضرت آسیہ کے اور کوئی کامل نہیں ہوا۔ اس سے متبادر یہ ہوتا ہے کہ ان دونوں میں کمال کا وہی درجہ تھا جو مردوں میں تھا کیونکہ جس کمال کو مردوں کے لئے ثابت کر کے عورتوں سے اس کی نفی کی گئی ہے حدیث میں صیغۂ استثناء کے ساتھ اسی کمال کو ان دونوں کے لئے ثابت کیا گیا ہے۔ اگر یہ مطلب نہ ہو تو ان کے استثناء کرنے کے کچھ معنی نہ ہوں گے ۱۲) اور جب یہ مطلب ہوا کہ ان دونوں کو کامل مردوں کی برابر کمال حاصل تھا تو پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ان میں نقصانِ عقل و نقصانِ دین کا وہ سبب غیر اختیاری موجود نہ تھا جو دوسری عورتوں میں موجود ہے اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ ممکن ہے ان میں وہ نقصان غیر اختیاری موجود نہ ہو اور خدا تعالیٰ کی قدرت سے یہ کچھ بعید نہیں دوسرے ممکن ہے کہ ان میں بھی نقصان غیر اختیاری موجود ہو لیکن ان میں کوئی کمال ایسا ہو جس سے اس نقصان غیر اختیاری کی تلافی ہو گئی ہو۔ اب میں اس مضمون کی زیادہ تفصیل نہیں کرتا بعض لوگ سمجھ گئے ہیں بس اتنا ہی کافی ہے جن کی سمجھ میں نہ آیا ہو وہ ان سے سمجھ لیں۔ حضرت حاجی صاحب بھی ایسا ہی کیا کرتے تھے کہ کسی دقیق مضمون کی تقریر ایک بار فرما دیا کرتے اس کے بعد اگر کوئی اس کے متعلق سوال کرتا تو آپ فرما دیتے کہ فلاں شخص اس کو خوب سمجھ گیا ہے اس سے سمجھ لو۔ البتہ یہاں ایک سوال اور رہ گیا میں اس کو بھی حل

کر دینا چاہتا ہوں وہ یہ کہ اس تقریر سے تو یہ معلوم ہوا کہ نقصان غیر اختیاری بھی موجب نقص ہے حالانکہ بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نقصان غیر اختیاری موجب نقص نہیں چنانچہ ایک حدیث میں آیا ہے کہ جب کسی شخص کا کوئی ورد ہو اور وہ سفر کرے یا بیمار ہو جائے اور سفر یا بیماری کی وجہ سے ورد ناغہ ہو جاوے تو حق تعالیٰ ملئکہ سے فرماتے ہیں کہ اس کا ثواب پورا ہی لکھو یعنی سفر اور بیماری میں گو ورد ناغہ ہو جاتا ہے مگر ثواب ان دنوں کے برابر ہی ملتا ہے جن میں ورد ناغہ نہیں ہوتا اس سے معلوم ہوا کہ غیر اختیاری عذر کی وجہ سے اگر اعمال میں کمی آوے تو ثواب کم نہیں ہوتا پھر اس کی کیا وجہ کہ حیض وغیرہ میں عورتوں کی نماز ناغہ ہوتی ہے تو اس کو نقصان کا سبب شمار کیا گیا وہ بھی تو اعذار غیر اختیاری ہیں بلکہ بظاہر ان کا غیر اختیاری ہونا سفر سے زیادہ ہے کیونکہ سفر من وجہ اختیاری ہے اور من وجہ غیر اختیاری یعنی سفر شروع کرنے کے بعد تو اوقات پر قبضہ نہیں رہتا اور مجبوراً اوراد ناغہ ہو جاتے ہیں لیکن سفر کا شروع کرنا تو اختیاری امر ہے۔ اگر ہم سفر ہی نہ کرتے تو اس کی نوبت نہ آتی پس سفر انتہاءً غیر اختیاری ہے اور ابتداءً اختیاری ہے یہ سوال میرے ذہن میں ابھی آیا ہے اور جواب بھی اسی وقت ذہن میں آگیا ہے وہ یہ کہ عذر کی دو قسمیں ہیں۔ ایک عذر اتفاقی۔ دوسرے عذر مستمر۔ قانون شریعت میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ عذر اتفاقی و عذر مستمر میں فرق ہے۔ عذر اتفاقی سے ثواب کم نہیں ہوتا اور عذر مستمر موجب نقصان اجر ہوتا ہے۔ چنانچہ موت سے بڑھ کر عذر غیر اختیاری کونسا ہوگا لیکن نصوص سے معلوم ہوتا ہے کہ موت سے اجر و ثواب منقطع ہو جاتا ہے چنانچہ ایک حدیث میں ہے کہ دو شخص ایک ساتھ اسلام لائے تھے اور دونوں کے اعمال بھی برابر تھے۔ ان میں سے ایک صاحب تو کسی غزوہ میں شہید ہو گئے اور دوسرے ان کے بعد ایک ہفتہ کے فاصلہ سے انتقال کر گئے صحابہ کو یہ خیال ہوا کہ پہلا شخص شہید ہو کر مرا ہے اور یہ بستر پر مرا ہے اس لئے شاید اس کا درجہ اس سے کم رہے تو انہوں نے دوسرے کے حق میں یہ دعا کی اَللّٰھُمَّ اَلْحِقْهُ بِصَاحِبِهٖ کہ اے اللہ اس کو بھی اس کے ساتھی کے درجہ میں پہونچا دیجئے۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا وَاَیْنَ صَلٰوتُهٗ وَصِیَامُهٗ وَقِیَامُهٗ بَعْدَهٗ اَوْ کَمَا قَالَ کہ اس نے جو اس کے بعد ہفتہ بھر نمازیں پڑھی ہیں اور روزے رکھے ہیں اور تہجد کی نماز پڑھی ہے یہ اعمال کہاں چلے گئے یعنی تم نے اس کے لئے پہلے شخص کے برابر ہونے کی کیوں

دعا کی۔ اس نے جو اس کے بعد اعمال کئے ہیں ان کا ثواب بھی تو اس کے نامۂ اعمال میں لکھا گیا ہے تو یہ اس سے بڑھا ہوا ہے۔ چنانچہ آپ نے اس شخص کے بارہ میں تصریحًا بھی فرمایا کہ واللہ دونوں کے درجہ میں ایسا تفاوت ہے جیسا زمین و آسمان کے درمیان میں رہ رہی یہ بات کہ پہلا شہید تھا اور یہ شہید نہیں ہوا تو اس سے اس کا درجہ کم ہونا لازم نہیں آتا کیونکہ شہادت کے لئے یہ بھی تیار تھا جہاد میں دونوں شریک ہوئے تھے اب یہ اور بات ہے کہ اس کا وقت آ گیا تھا وہ شہید ہو گیا اس کا وقت نہ آیا تھا یہ قتل نہ ہوا۔ مگر نیت دونوں کی برابر تھی اس لئے شہادت کا اجر اس کے لئے بھی ہے ۱۲) اس سے صاف معلوم ہوا کہ موت سے اجر منقطع ہو جاتا ہے اور ایک حدیث میں اس سے بھی زیادہ تصریح ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں یَنْقَطِعُ اَجْرُ الْمُؤْمِنِ بِمَوْتِہٖ اِلَّا مِنْ ثَلٰثٍ الخ (مومن کا اجر موت سے منقطع ہو جاتا ہے بجز تین کے) پس مرض اور سفر اتفاقی عذر ہیں ان سے اجر کم نہیں ہوتا اور حیض و نفاس وغیرہ عذر مستمر ہیں اور عذر مستمر سے اجر کم ہو جاتا ہے اور راز اس میں یہ ہے کہ عذر اتفاقی ابتداء عمل کے وقت ذہن میں نہیں ہوتا جب آدمی کوئی عمل بہ نیت مداومت شروع کرتا ہے تو اس کے ذہن میں یہ بات ہرگز نہیں ہوتی کہ اگر میں سفر میں جاؤں گا یا بیمار ہو جاؤں گا تو یہ عمل نہ کروں گا کیونکہ سفر اور مرض عارضی امور ہیں اصل حالت یہی ہے کہ انسان تندرست رہے اور اپنے گھر میں رہے اس لئے نیت دوام کی باقی رہتی ہے پھر جب اتفاقًا عذر پیش آتا ہے تو اس کو ثواب پورا ملتا ہے دوسرے یہ کہ سفر اور مرض کا کوئی خاص وقت نہیں ہوتا ممکن ہے کہ آدمی برسوں بھی سفر نہ کرے نہ بیمار ہو اس لئے ایام سفر و مرض کو عمل سے مستثنیٰ کرنے کی طرف التفات نہیں ہو سکتا پس وہ دن بھی اس کے ذہن میں عمل ہی کے لئے مقرر تھے مگر اتفاق سے ناغہ ہو گیا بخلاف حیض و نفاس وغیرہ کے کہ یہ اعذار مستمرہ ہیں نیز اکثر ان کے اوقات بھی معین ہوتے ہیں پس عورتیں جب نماز پڑھنا شروع کریں گی ان کے ذہن میں یہ بات ہوتی ہے کہ حیض و نفاس کے وقت نماز کو چھوڑ دیں گے تو ان کی نیت دوام کی نہیں ہوتی۔ یہ نیت کسی عورت کی نہیں ہوتی کہ میں ان دنوں میں بھی نماز پڑھوں گی۔ ایسے ہی موت کا آنا یقینی ہے گو وقت معلوم نہیں مگر ہر شخص جس کام کو شروع کرتا ہے اس کی نیت یہی ہوتی ہے کہ جب تک زندہ ہوں یہ کام کرتا رہوں گا یہ نیت کوئی نہیں کرتا کہ موت کے بعد بھی عمل کرتا رہوں گا اور اگر کوئی ایسی نیت کرے کہ تو وہ معتبر نہیں کیونکہ وہ محض الفاظ

ہی الفاظ ہیں نیت اور عزم کا درجہ اس میں کبھی نہیں ہوسکتا اور اس نیت کی ایسی مثال ہوگی جیسے امام ابویوسف رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے ایک شاگرد سے فرمایا تھا کہ مجلس املا میں سب لوگ سوال کرتے ہیں تم کچھ سوال نہیں کرتے اس نے کہا ان شاء اللہ تعالیٰ اب سے سوال کیا کروں گا چنانچہ ایک دن حضرت امام نے یہ مسئلہ بیان فرمایا کہ روزہ غروب کے ساتھ فوراً افطار کرنا چاہیئے تو وہ طالب علم صاحب پوچھتے ہیں کہ حضرت اگر کسی دن غروب ہی نہ ہو تو الخ امام ابویوسف نے فرمایا کہ بس آپ خاموش ہی رہیں آپ کو بولنے کی ضرورت نہیں جیسے کسی کے یہاں بہو آئی تھی وہ بولتی نہ تھی ساس کو بہت رنج تھا کہ ہائے بہو گونگی آئی بولتی ہی نہیں جب ساس نے اس کو بہت سمجھایا بجھایا کہ لڑکیاں تو بولتی ہوئی اچھی لگا کرتی ہیں تو بولتی کیوں نہیں تو ایک دن آپ یہ بولیں کہ ساس سے کہنے لگیں کہ میں تم سے یوں پوچھوں ہوں کہ اگر تمہارا بیٹا مرگیا تو تم میرا دوسرا نکاح بھی کردوگی یا یوں ہی ساری عمر بٹھائے رکھوگی ساس نے کہا کہ بس بی تو چپ ہی رہا کر مہینوں میں بولی تھی تو یہ پھول جھڑے آگے کو نہ معلوم کیا ستم ڈھائے گی ایسے ہی وہ طالب علم صاحب تھے کہ یا تو سوال ہی نہ کرتے تھے اور سوال کیا تو یہ کہ حضرت بھلا اگر آفتاب غروب ہی نہ ہو تو جیسے یہ قضیہ شرطیہ مہمل ہے جس میں مقدم کا وجود ہی نہیں ہوسکتا جبتک کہ عالم کا بقاء ہے اسی طرح اگر کوئی عورت یہ نیت کرے کہ مجھ کو اگر حیض و نفاس نہ آیا تو میں ساری عمر نماز پڑھتی رہونگی یا کوئی یہ نیت کرے کہ اگر میں نہ مرا تو ساری عمر نماز پڑھتا رہوں گا یہ قضیہ بھی مہمل ہے جس کا شریعت میں اعتبار نہیں شرط وہی معتبر ہوسکتی ہے جس کا وقوع بھی عادۃً ہوتا ہو۔ پس یہ عذر نیت دوام کو مانع ہے اور سفر و مرض نیت دوام کو مانع نہیں اس لئے جب وہاں دوام کی نیت ہوسکتی ہے تو ثواب بھی مرض وسفر میں اس نیت کی وجہ سے ملے گا اور عذر نسوانی اور موت قاطع نیتِ دوام ہیں اس لئے وہاں ان اعذار کے وجود سے ثواب منقطع ہوجائے گا یہ وجہ ہے حیض و نفاس کے سبب نقصان ہونے کی اور سفر و مرض کے سبب نقصان نہ ہونے کی خوب سمجھ لو۔

بحمد للہ اب یہ مبحث مکمل ہوگیا اور تمام شبہات زائل ہوگئے اور دلائل سے معلوم ہوگیا کہ عورتیں بھی کامل ہوسکتی ہیں یعنی کمال مکتسب ان کو حاصل ہوسکتا ہے گو اس کی ساتھ ایک نقصان غیر اختیاری بھی رہے اور ان کے لئے کمال کا طریقہ یہ ہے کہ اول تو وہ کتابیں دیکھیں جن میں مسائل و احکام شرعیہ کا ذکر ہے اُن کو دیکھ کر ہر عمل کے کامل کرنے کا طریقہ

معلوم کریں اور جن اعمال میں کوتاہی ہو رہی ہے اس کی اصلاح کریں یہ تو اصل طریق ہے اور اس میں آسانی پیدا کرنے کے لئے یہ طریق ہے کہ اگر کوئی کامل مرد اپنے محارم میں مل جائے تو اس کی صحبت سے فائدہ اٹھائیں اس سے اپنے اخلاق و عادات کی اصلاح کا طریقہ پوچھ کر دل کی اصلاح کریں اور اگر کوئی مرد ایسا نہ ملے تو کسی کاملہ کی صحبت میں رہیں اگر کوئی کاملہ بھی نہ ملے تو اپنے گھر کے مردوں کی اطلاع اور اجازت سے کسی دوسرے بزرگ سے بذریعہ خط و کتابت کے اپنی اصلاح کا تعلق رکھیں اور اس کو اپنے حالات سے اطلاع دیتی رہیں جو کچھ وہ لکھے اس پر عمل کریں اور اپنے گھر ہی میں رہیں اس کے پاس جانے کی زحمت نہ اٹھاویں ہاں اپنے گھر پر بزرگوں کے قصے ان کے حالات اور ملفوظات اور ان کی تصانیف کا مطالعہ جاری رکھیں اس سے بھی وہی نفع ہوگا جو پاس رہنے سے ہوا کرتا ہے اور اگر مردوں میں سے بھی کسی کو بزرگوں کے پاس جانے کی فرصت نہ ہو وہ بھی اسی طریقہ پر عمل کریں جو میں نے عورتوں کو بتلایا ہے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ اس طرح ان کا بھی دین کامل ہو جائے گا۔

پس اصل طریقہ کمال فی الدین کا تحصیل تقویٰ ہے اور اس کی تیسیر و تسہیل کا طریقہ معیت کاملین ہے۔ یہ خلاصہ ہے تمام بیان کا اب میں ختم کرتا ہوں کیونکہ عصر کی نماز قریب ہے گو بعضے مضامین اب بھی ذہن میں باقی ہیں مگر اول تو وقت نہیں دوسرے ضروری باتیں بیان ہی ہو چکی ہیں اس لئے ان مضامین کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ پھر کسی موقع پر دیکھا جائے گا۔ اب دعا کیجئے کہ حق تعالیٰ ہم کو فہم سلیم اور عمل کی توفیق عطا فرماویں۔ آمین

واخر دعونا ان الحمد للہ رب العلمین
وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ سیدنا ومولانا محمد وعلیٰ
الہ واصحابہ اجمعین

تمت بالخیر

قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ اٰیَۃً"
(رواہ البخاری)

سلسلہ التبلیغ کا

وعظ ملقب بہ

نفی الحرج

حکیم الامۃ مجدد الملۃ حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی
رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

ناشر: محمد عبد المنان غفرلہ
مکتبہ تھانوی ـــــ دفتر الابقاء
مسافر خانہ بندر روڈ ایم اے جناح روڈ کراچی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیمؕ

سلسلۂ التبلیغ کا وعظ ملقب بہ

نفی الحرج

این	متٰی	کم	کیف	ماذا	من ضبط	المستمعون	اشتات
کہاں ہوا	کب ہوا	کتنی دیر ہوا	کیسے ہوا	کیا مضمون تھا	کس نے لکھا	سامعین کی تعداد	متفرقات
مدرسہ احیاء العلوم الہ آباد	۹ محرم ۱۳۳۰ھ یوم یکشنبہ	تین گھنٹے			مولانا سعید احمد صاحب تھانوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ		نو تعلیم یافتہ لوگ بھی تھے۔

الحمد للہ نحمدہٗ ونستعینہ ونستغفرہ ونومن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا و من سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ و من یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ و نشھد ان سیدنا و مولانا محمدا عبدہٗ ورسولہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ الہٖ واصحابہ وبارک وسلم۔ اما بعد فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ھُوَ اجْتَبٰکُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَیْکُمْ فِی الدِّیْنِ مِنْ حَرَجٍ مِلَّۃَ اَبِیْکُمْ اِبْرٰھِیْمَ ھُوَ سَمّٰکُمُ الْمُسْلِمِیْنَ مِنْ قَبْلُ وَفِیْ ھٰذَا لِیَکُوْنَ الرَّسُوْلُ شَھِیْدًا عَلَیْکُمْ وَتَکُوْنُوْا شُھَدَاءَ عَلَی النَّاسِ فَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰہِ ھُوَ مَوْلٰکُمْ فَنِعْمَ الْمَوْلٰی وَنِعْمَ النَّصِیْرُ ؕ (ترجمہ:۔ اس نے تم کو مخصوص فرمایا اور اس نے تم پر دین میں کسی قسم کی تنگی نہیں کی تم اپنے

باپ ابراہیم کی ملت پر قائم رہو اور اس اللہ نے تمہارا لقب مسلمان رکھا ہے پہلے بھی اور بعد کو بھی تاکہ تمہارے رسولؐ گواہ ہوں اور تم لوگوں کے مقابلہ میں گواہ ہو نماز کی پابندی رکھو اور زکوٰۃ دیتے رہو اور اللہ ہی کو مضبوط پکڑے رہو وہ تمہارا کارساز ہے، سو کیا اچھا کارساز ہے اور کیا اچھا مددگار ہے)

یہ آیت جو میں نے پڑھی ہے اس میں سے صرف جزء اول کا بیان کرنا مقصود ہے اور اس کا تعلق جمعہ کے مضمون سے ہے چنانچہ عنقریب معلوم ہو جائے گا اور یہی وجہ ہوئی اس کے اختیار کرنے کی کیونکہ کوئی نیا مضمون اس وقت ذہن میں نہیں آیا دو وجہ سے ایک تو اس لئے کہ کوئی مقام نہیں بدلا۔ نیز زمانہ بھی دوسرے وعظ کا پہلے کے قریب ہے تو زمان و مکان دونوں متحد ہیں اور ایسے موقع پر مجمع بھی اکثر ایک ہی ہوتا ہے تو سامعین بھی متحد ہیں اور اس خاص موقعہ کے اعتبار سے سامعین کے مناسب حال جو مضمون تھا وہ پہلے بیان ہو چکا اب کسی دوسرے مضمون کی ضرورت ذہن میں نہیں آئی لہٰذا اسی گذشتہ مضمون کے متعلق ایک مضمون کو بیان کرتا ہوں اور میں نے بانئ جلسہ سے عرض کیا تھا کہ ایک ہی جگہ دو بیان سے کیا فائدہ ہوگا مگر کوئی فائدہ بتلایا نہیں گیا میں نے یہ بھی پوچھا کہ آخر کیا بیان کروں تو یہ کہا گیا کہ اُسی مضمون کے متعلق بیان کر دیا جاوے جو جمعہ کو بیان کیا گیا تھا۔ پھر اس کی بھی تعیین نہ بتلائی گئی مگر خود ہی اس کے مناسب مضمون میرے ذہن میں آ گیا۔ اور ہر چند کہ ارتباط مضمون کے لحاظ سے مناسب یہ تھا کہ اُسی آیت کی تلاوت اس وقت بھی کی جاتی جو کہ جمعہ کو پڑھی گئی تھی اور اس میں سے یہ مضمون نکل بھی سکتا تھا جو آج بیان ہوگا۔ مگر اس میں استنباط کرنا پڑتا اور استنباط اس طور سے ہوتا کہ اس آیت کے اخیر میں ہے۔ وَيَعْفُوْ عَنْ كَثِيْرٍ (اور بہت درگذر کر دیتے ہیں) اور عفو اثر ہے رحمت کا اور سہولت بھی رحمت ہی کا اثر ہے تو معلوم ہوا کہ حق تعالیٰ اپنے بندوں کے ساتھ سہولت کی رعایت کرتے ہیں اور کسی خاص جزء دین کے ساتھ خصوصیت کی کوئی دلیل نہیں تو معلوم ہوا کہ دین کی ہر بات میں سہولت مرعی ہے تو استنباط اس طرح ہو سکتا مگر اس آیت میں استنباط کی ضرورت تھی اور یہاں صریح ہے پھر چونکہ قرآن سب ایک ہی ہے اس لئے اس آیت کو بھی یہی سمجھا جاوے گا کہ وہی ہے اس لئے تلاوت کے لئے اس آیت کو ترجیح دی۔

مضمون کا حاصل یہ ہے اور اسی سے تعلق بھی معلوم ہو جاوے گا دونوں ....

مضمونوں میں کہ جمعہ کے روز میں نے بیان کیا تھا کہ جو کچھ مصیبت آتی ہے ہمارے اعمال کی خرابی سے آتی ہے اور اس کا علاج اعمال کی درستی ہے یا یوں کہئے کہ ہمارے اوپر یہ مصائب دینی سستی کی وجہ سے ہیں۔

پس دین کو درست کیا جائے اس پر ایک اشکال بعض لوگوں کے دل میں وارد ہوا کرتا ہے وہ یہ کہ مرض کا سبب اور اس کا علاج دونوں معلوم ہو گئے مگر اتنی بات رہ گئی کہ تدبیر کبھی آسان ہوتی ہے کبھی دشوار تو جو تدبیر بتلائی گئی ہے اس میں قابل غور بات ہے کہ وہ آسان ہے یا دشوار ہم تو دیکھتے ہیں کہ سخت دشوار ہے۔ پس دوا تو بتلائی مگر ایسی جو امریکہ سے ملے گی اس تجویز کی تو وہی مثل ہوگئی کہ تا تریاق از عراق آوردہ شود مار گزیدہ مردہ شود۔ (جب تک تریاق عراق سے لایا جائے سانپ کا کاٹا ہوا مرجائے) دین کی اب بلاشبہ ایسی حالت ہوگئی کہ بالکل تباہ ہو رہا ہے مگر ساتھ ہی دیندار بننا بھی سخت دشوار ہے۔ چنانچہ بعض لوگوں کا دعویٰ ہے کہ اس کا مشاہدہ بھی ہو رہا ہے چنانچہ دیندار کو سخت دقتیں پیش آتی ہیں مال میں تو یہ کہ سود حرام ہے قمار (یعنی جوا) حرام ہے۔ رشوت حرام ہے۔ یہاں تک تو زیادہ وحشت نہیں ہوتی کیونکہ بہت لوگ سمجھتے ہیں کہ ہم سود بھی نہیں لیتے رشوت کا مال بھی نہیں کھاتے تو ان چیزوں سے اپنے دین کو بہت لوگ محفوظ سمجھتے ہیں لیکن ان میں وسعت اتنی ہے کہ بہت دور تک ان کا اثر پہونچتا ہے۔ اکثر لوگ سود صرف اس کو سمجھتے ہیں کہ روپیہ دے کر سوار دپیہ لے لیں، رشوت اس کو سمجھتے ہیں کہ ظلم کر کے کام کے عوض میں لیں۔ قمار اس کو سمجھتے ہیں کہ چت پٹ ہو جائے۔ مگر حقیقت میں یہ ابواب بہت وسیع ہیں پس جو لوگ ناواقف ہیں اُن سے یہ تو کہا ہی جائے گا کہ واقفیت پیدا کرلو اس وقت معلوم ہو جائے گا کہ ہر معاملہ فاسدہ ربوا ہے علیٰ ہذا رشوت نام ہے ہر غیر متقوم چیز پر عوض لینے کا اور یہ بات جلدی سمجھ میں نہیں آسکتی کیونکہ یہ تو ابواب فقہ کے متعلق ہے مگر میں ایک مختصر سا رسالہ بتلاتا ہوں جس میں رشوت کے متعلق اچھی تقریر آپ کو معلوم ہوگی اور اس رسالہ کا نام "ازالۃ الغشوہ" جو تحذیر الاخوان کا ایک جزو ہے۔ یہ ایک رسالہ سود کے متعلق ہے۔ علیٰ ہذا قمار میں بھی بڑی وسعت ہے تو جان کا بیمہ وغیرہ یہ سب قمار میں داخل ہیں تو آمدنی کی اکثر صورتیں آج کل سود یا رشوت یا قمار میں داخل ہیں۔ (دلبقیان شاء اللہ تعالیٰ آئندہ)

توجو دیندار بننا چاہے اس کو ہر جگہ دقت اور رکاوٹ پیش آتی ہے۔ مثلاً ایک شخص نے اپنے ورثہ کے لئے کچھ روپیہ جمع کرنا چاہا کہ دس دس روپیہ سالانہ یا ماہوار کسی کمپنی میں داخل کرتا رہے تاکہ ورثہ کو دو ہزار روپے اس کے بعد مل جائیں اتفاق سے ایک مولوی صاحب سے جو پوچھا تو انہوں نے ناجائز کہدیا یا دوسری صورت نکالی کہ پرامیسری نوٹ خریدے تھے ایک دوسرے مولوی صاحب نے اس کو بھی ناجائز بتلا دیا گویا مولویوں نے عہد کر لیا ہے کہ ہر ایک بات کو ناجائز ہی کہو اسی سے لوگ متوحش ہیں علی ہذا اور ابواب آمدنی کے کہ بکثرت حرام ہیں یہ تو مال میں دشواریاں تھیں۔ اب جاہ کی کیفیت سنئے کسی مولوی صاحب کی زبانی سن لیا تھا کہ من تشبہ بقوم فھو منھم (جس نے کسی قوم کا تشبہ اختیار کیا وہ اسی میں شمار ہوگا) اس پر کسی نے عمل بھی کر لیا اور کوٹ پتلون پہننا چھوڑ دیا مگر اب حالت یہ ہے کہ کوئی عزت نہیں کرتا نہ پلیٹ فارم پر نہ کہیں اب افسوس ہوتا ہے کہ اچھی دینداری اختیار کی کہ عزت وجاہ ہی جاتی رہی سقوں جولاہوں تک اس شخص کے مقابلہ کی جرات ہوگئی یہ جاہ پر اثر پڑا علیٰ ہذا ہر امر میں دیندار کو دقت ہی پیش آتی ہے اور ایک یہ اثر ہوا کہ دینداری اختیار کرنے سے پہلے تو سارے جاڑے تندرست رہتے تھے اب جو صبح کے وقت اٹھے اور وضو کرنا پڑا تو ساری سردی چھینکیں ہی آتی رہتی ہیں۔ ایک مولوی صاحب ہمارے دوست للت پور میں تھے ایک رئیس کے یہاں لڑکوں کو پڑھاتے تھے اور نماز بھی پڑھایا کرتے اتفاق سے ان لڑکوں کو زکام ہو گیا تو ان لڑکوں کی ماں مولوی صاحب کو کوسا کرتی تھی کہ اچھی نماز پڑھوائی کہ بچے بیمار ہی ہو گئے۔ اسی طرح روزہ ہے کہ بعض موسموں میں نہایت سخت ہوتا ہے کہ بجز پکے دین دار شخص کے ہر شخص رکھ نہیں سکتا اگر ایسا روزہ دوسری قوموں میں ہوتا تو ضرور وہ اس کو دوسرے موسم میں بدل دیتے۔ چنانچہ ایک مسلمان رئیس کسی بڑے انگریز حاکم سے ملنے کے لئے گئے تو اس انگریز حاکم نے پوچھا کہ نواب صاحب ہم آپ کو دُبلا پاتے ہیں اس کی کیا وجہ مسلمان رئیس نے جواب دیا کہ گرمی کا موسم ہے اور آجکل ہمارے یہاں رمضان کا مہینہ ہے ہم روزہ رکھتے ہیں، تو وہ کہتا ہے کہ آپ اپنے علماء سے کیوں نہیں درخواست کرتے کہ کمیٹی کر کے دوسرے موسم میں منتقل کر دیں انہوں نے جواب دیا کہ ہمارا دین کمیٹی پر نہیں تو روزہ میں یہ دقت پیش آئی کہ گرمی کے دن پہاڑ ہوتے ہیں پیاس کے مارے ہونٹ خشک ہیں

نوٹ۔ خط وکتابت کرتے وقت یا اپنا پتہ تبدیل کراتے وقت خریداری نمبر کا ضرور حوالہ دیا کریں۔

مگر کھانا پینا بند ہے یہ بھی کوئی مولوی صاحب فتویٰ نہیں دیتے کہ بجائے گرمی کے جاڑوں میں روزہ رکھ لینا۔ اب حج کی سنئے حج کرنے کے لئے جو گئے تھے وہاں کہیں آب و ہوا کے اختلاف سے بیمار ہو گئے، کہیں کسی کو بدوؤں نے کوٹا پیٹا اب جو واپس آئے تو سب سے کہتے ہیں کہ حج کرنے مت جاؤ بڑی مصیبت کا سفر ہے۔ ان سب دشواریوں کو دیکھ کر اکثر لوگوں کے دلوں میں یہ اشکال واقع ہوتا ہے کہ علاج تو ٹھیک ہے مگر تلخ اتنا ہے کہ مرجانا سہل ہے تو وہ مثل ہوئی کہ پنچوں کا کہنا سر پر مگر پرنالہ ادھر ہی کو اترے گا۔ ایسے ہی مولویوں کا کہنا سر پر مگر ؎

جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد　　　پر طبیعت ادھر نہیں آتی

جب یہ اشکال ہے تو ہم دیندار کیسے بنیں یہ تو عقلاء کو اشکالات پیش آتے ہیں ایک جہلاء کو اشکال پیش آتا ہے کہ جب نماز وغیرہ دینداری کے کام شروع کئے مالی نقصان ہونا شروع ہو گیا۔ آج بھینس مر گئی کل بیل مر گیا دو چار دن کے بعد بیٹا مر گیا۔ ایک بڈھا دیہاتی تھا کہ بیٹے اس کی پرواہ نہ کرتے تھے۔ ایک مولوی صاحب نے اس سے کہا کہ کمبخت نماز تو پڑھ لیا کر پہلے ہی دن نماز پڑھی تھی کہ بھینس مر گئی۔ اس کے بیٹوں نے کہا باوا نماز مت پڑھا کرو۔ اس نے کہا تو پھر میری خوب خدمت کرو۔ انہوں نے وعدہ کیا اب جب ذرا خدمت میں کوتاہی کرتے وہ دھمکاتا کہ میں پھر نماز شروع کر دوں گا وہ ڈر جاتے اور خدمت شروع کر دیتے۔ مدرسہ جامع العلوم میں بعض خیر خواہوں نے یہ تجویز کی تھی کہ لوگوں کے گھروں میں مدرسہ کے نام سے گھڑے رکھدیئے جائیں کہ اس میں روزانہ ایک چٹکی آٹے کی ڈالدیا کریں چند روز میں باسانی طلبہ کے لئے بہت سا آٹا جمع ہو جائے گا۔ ان ہی گھروں میں سے ایک گھر میں اتفاق سے ایک لڑکا مر گیا انہوں نے مدرسہ کا گھڑا پھینک دیا کہ اس کی نحوست سے لڑکا جاتا رہا۔ اس پر مجھے ایک حکایت حیدرآباد کی یاد آئی کہ ایک بزرگ سے پیر پر پیر رکھ کر لیٹنے کی نسبت ایک شخص نے پوچھا کہ سُنا ہے کہ یہ طریقہ منحوس ہے حالانکہ حدیث میں آتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کبھی اس طرح بھی لیٹتے تھے اور بعض احادیث میں اس طریقہ سے ممانعت بھی آئی ہے مگر ممانعت اس ہیئت کی ہے کہ جس میں بے پردگی ہو جاوے۔ اُن بزرگ نے جواب دیا کہ ہاں بھائی منحوس تو ہے ہی اور ایک ہی کیا ساری سنتیں اور

احکام شرعیہ منحوس ہیں رشوت کو حرام کردیا یہ ایک کھلی نحوست ہے کہ مال نہ بڑھ سکا۔ زکوٰۃ واجب کردی یہ بہت ہی بڑی نحوست ہے کہ جو جمع کیا تھا اسے فضول خرچ کرادیا نیز کبھی احکام شرعیہ کے ماننے والے کا امتحان بھی ہوتا ہے کہ یہ محبت سے احکام مانتا ہے یا محض دنیوی نفع کے لئے نیز کبھی حق تعالیٰ کو اس فرمانبردار پر یہ رحمت کرنا بھی مقصود ہوتا ہے کہ دنیا ئے مضر سے اس کو بچاتے ہیں اس کے متعلق مجھے ایک حدیث یاد آئی کہ ایک شخص حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت عالی میں حاضر ہوا اور کہا اِنِّیْ اُحِبُّکَ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ کہ یارسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم مجھے آپ سے محبت ہے آپ نے ارشاد فرمایا اِعْلَمْ مَاتَقُوْلُ کہ جو کہہ رہے ہو سمجھ کر کہو (مطلب یہ کہ میری محبت آسان چیز نہیں اس میں بڑی آزمائش ہوتی ہے) اس نے عرض کیا کہ واقعی محبت ہے آپ نے فرمایا کہ فَاَعِدَّ لِلْفَقْرِ تَجْفَافاً (یعنی فقر وفاقہ کے لئے اپنے پاکھر کو تیار کرلے) اور ارشاد فرمایا کہ جو شخص مجھ سے محبت کرتا ہے اس کی طرف فقر وفاقہ اس طرح آتا ہے جیسا کہ سیلاب نشیب کی طرف دوڑ کر آتا ہے جو میری حالت ہے وہی تمہاری ہوگی اَلْمَرْءُ مَعَ مَنْ اَحَبَّ (آدمی جس سے محبت کرتا ہے اسی کے ساتھ ہوتا ہے) اور اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم جیسی حالت کسی کو بھی پیش آئے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے محب کو اس حالت سے محبت تو ضرور ہوگی تو وہ اس کے آنے پر ہر وقت تیار تو رہے ہی گا۔ نیز جیسا میں اوپر کہہ چکا ہوں جب یہ شخص خدا تعالیٰ کا محبوب ہوگا تو وہ اس کو مضرات سے ضرور بچائیں گے۔ اور حدیث میں ہے کہ حق تعالیٰ شانہٗ اپنے خاص بندوں کو دنیا سے اس طرح بچاتے ہیں جیسے تم اپنے استسقاء کے مریض کو پانی سے بچاتے ہو اس لئے دین دار کو ایک بد دین کی برابر تمول تو ہرگز نہیں ہوگا مگر اس کو ایک دوسری دولت ایسی ملیگی کہ یہ تمول اس کے سامنے گرد ہے اور وہ وہی دولت ہے جس نے کہ حضرت ابراہیم بن ادھم رحمۃ اللہ علیہ سے تخت سلطنت چھڑادیا مگر کوئی یہ نہ سمجھے کہ تخت چھوڑ دینا دولت باطنی کے ساتھ ہر ایک کو ضروری ہے۔ بات یہ ہے کہ اہل باطن دل سے تو ہمیشہ اس کو چھوڑ ہی دیتے ہیں یعنی اس کی طرف ان کو رغبت نہیں ہوتی پھر جو منتہی ہوتے ہیں وہ ظاہر میں اس کو نہیں چھوڑتے کیونکہ وہ متحمل ہوتے ہیں چنانچہ حضرات صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اس کے متحمل تھے مگر اب عموماً طبائع اس کے متحمل نہیں اس کی ایسی مثال ہے کہ کسی کی جیب کمزور ہو اور اس میں دس اشرفیاں اور دس روپے بھرے

ہوئے ہوں تو روپے کو نکال کر جیب سے الگ کر دیں گے اور اگر کسی کی جیب مضبوط ہے اس کو نکالنے کی ضرورت نہیں اسی طرح ایسے بتدی کو بھی اسباب ظاہرہ کا ترک کرنا زیبا نہیں جس سے آثار ترک کا تحمل نہ ہو سکے ایسے ہی موقع پر عالمگیر کا شعر ہے ؂

شنیدم ترک منصب کرد عاقل خاں بنادانی　　چرا کارے کند عاقل کہ باز آید پشیمانی

(میں نے سنا کہ عاقل خاں نے نادانی سے ترک منصب کر دیا عاقل ایسا کام کس واسطے کرے کہ پشیمانی سے واپس آئے)

اسی وجہ سے ہمارے حضرت اقدس سرہ فرمایا کرتے تھے کہ نوکری خود نہ چھوڑو جب توکل غالب آجائے گا تو سارے اسباب خود بخود چھوٹ جائیں گے مگر چھوڑنے میں جلدی نہ کرے کہ پھر ندامت ہوتی ہے۔ غرض باطنی دولت والے کو تمول سے کبھی رغبت نہیں رہتی۔ لہذا وہ معنے تارک ہی ہوتا ہے مگر بعض اوقات ترک صوری میں بھی مصلحت ہوتی ہے اور چونکہ رغبت نہیں ہوتی اس لئے یہ شخص چھوڑ کر پچھتاتا بھی نہیں۔ بلکہ واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر پھر ملتی تو اور نفرت زیادہ ہوتی۔ چنانچہ حضرت ابراہیم بن ادہم رحمہ اللہ کے پاس سلطنت چھوڑنے کے بعد ایک وزیر آیا کہ آپ کے سلطنت چھوڑ دینے سے لوگوں کو قلق ہے۔ فرمایا الحمد للہ مجھے قلق نہیں فقیری میں بہت راحت ہے۔ اس نے پوچھا کہ فقیری میں کیا راحت ہے میں تو دیکھتا ہوں کہ سارا کام آپ کو خود ہی کرنا پڑتا ہے نہ کوئی نوکر نہ خادم اس میں تو سخت تکلیف ہے۔ جب اس نے بہت ہی اصرار کیا تو آپ نے اپنا ایک ظاہری تصرف دکھلایا کہ سمندر کے قریب جا کر ایک سوئی اس میں پھینک دی اور فرمایا کہ اے سمندر کی مچھلیو میری سوئی سمندر میں گری ہے نکال کے دیدو صدہا مچھلیاں چاندی سونے کی سوئیاں منہ میں لئے ہوئے کھڑی ہوگئیں آپ نے فرمایا وہی سوئی لوہے کی میری لادو۔ ایک مچھلی آئی اور وہی سوئی لیکر کھڑی ہو گئی۔ اس وقت وزیر کو معلوم ہوا کہ اس فقیری سے حضرت ابراہیم کو اتنی عظیم الشان سلطنت حاصل ہوگئی ہے کہ ہر چیز ان کے کہنے میں ہے۔ اور یہ اس کے مذاق کے موافق آپ نے ایک مثال دکھلادی ورنہ اصل دولت کے سامنے یہ کیا چیز ہے۔

ایک دوسرا واقعہ اور ہے وہ یہ کہ آپ نے وضو کے لئے پانی لینے کے لئے ڈول کنویں میں

ڈالا تو ڈول چاندی سے بھرا ہوا آیا، دوسری مرتبہ سونے سے بھرا ہوا آیا، تیسری مرتبہ جواہرات سے تو آپ نے آسمان کی طرف منہ کر کے عرض کیا کہ میری تو نماز کا وقت جا رہا ہے اس وقت امتحان نہ لیجئے مجھے پانی کی ضرورت ہے اس سونے چاندی کو لیکر میں کیا کروں گا۔ تو ان دونوں حکایتوں سے یہ بات معلوم ہوگئی ہوگی کہ یہ حضرات دنیا کو چھوڑ کر پچتائے نہیں بلکہ اگر غور کر کے دیکھا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ دنیا جتنی زیادہ ہوتی ہے اسی قدر زیادہ کوفت ہوتی ہے آخر کار چھوڑنی پڑتی ہے تو اصل تارک تو اہلِ تمول ہی ہیں اور تارکین میں سے کوئی بھی تارک نہیں کیونکہ ان کی اول سے یہی رائے ہوتی ہے کہ دنیا اس قدر جمع نہ کی جائے جس کو چھوڑنا پڑے تو عاقل کی آخری رائے یہی ہوتی ہے کہ اس کو چھوڑ کر ہلکا ہونا چاہیئے گو بعض کے لئے خدا تعالے کو منظور رہی یہ ہوتا ہے کہ دنیا دی تعلقات میں بھی پھنسے رہیں تاکہ مخلوق کو نفع پہونچے اور ان کی ظاہری و باطنی حالت کو درست کیا جائے جیسے کہ حضرات خلفا ر راشدین رضی اللہ تعالیٰ عنہم مگر یہ حضرات باوجود ان تعلقات کے بھی دنیا کی طرف دل سے مشغول نہیں ہوتے حضرات خلفار کی یہ حالت تھی کہ پھٹے ہوئے کپڑے پہنتے تھے اور رعب تھا کسریٰ و قیصر پر تو اس قسم کا تعلق جو ان حضرات کو دنیا سے ہوتا ہے وہ تو عین عبادت ہے اس سے چنداں کلفت نہیں ہوتی۔ موجب کلفت و باعث خسارہ تعلق دنیا وی ہوتا ہے خیر یہ گفتگو تو استطرادی تھی اصل گفتگو یہ تھی کہ علاج تو مصائب کا دینداری ہے مگر اس علاج اور تدبیر پر یہ اشکال پیش آتا ہے کہ یہ تو سخت دشوار ہے کوئی آسان طریقہ بتلاؤ۔ اور اسی پر ایک دوسرا اشکال یہ ہوتا ہے کہ وہ آسان تدبیر بتلاوے کون۔ کیونکہ ہم شارع تو ہیں نہیں جو اس کو بدل دیں اور اگر بدلیں بھی تو ہمارے بدلنے سے ہوتا کیا ہے حق تعالے اس دین کے خود محافظ ہیں اگر ہم بدل بھی دیں گے تو مسلمان خود اس کو نہیں مانیں گے اور اگر کہو کہ خیر تم بھی مجبور ہو خدا تعالیٰ ہی کو آسان علاج بتلانا چاہیئے تھا تو اس کا اصل جواب تو یہ ہے کہ جس کو جرارت ہو جاکر خدا تعالے سے عرض کرے ہمیں اس کے جواب کی ضرورت نہیں مگر چونکہ ہم خدا تعالے کے غلام ہیں اور غلام سے آقا پر اعتراض سنا نہیں جاتا اس لئے ہم بھی جواب بتلاتے ہیں۔ مگر پہلے ایک سوال ہم آپ سے کرنا چاہتے ہیں پھر تمہارے اس سوال کا جواب خود بخود معلوم ہو جائیگا۔ اگر کسی مریض کیلئے

طبیب نے ایک نسخہ تجویز کیا ہو کہ اس کے مرض کے لئے وہی مناسب ہوا اور مریض یہ کہے کہ حکیم صاحب یہ تو بہت دشوار اور سخت علاج ہے کوئی آسان تدبیر بتلایئے غور کر کے فرمایئے کہ حکیم صاحب اس کو کیا جواب دیں گے ظاہر ہے کہ نسخہ چاک کر کے پھینک دیں گے اور کہیں گے معلوم ہوتا ہے تجھ کو مریض ہی رہنا پسند ہے جو ذرا سی دشواری سے گھبراتا ہے۔ حکیم صاحب کو معالج ہونے کے لحاظ سے مرض کے مناسب تجویز کرنی چاہیئے سہل ہو یا سخت اور مریض کو اگر اپنا مرض زائل کرنا مقصود ہے تو اس مناسب تجویز پر عمل کرنا چاہیئے۔ اگر سہولت و سختی پر اس کی نظر ہوگی تو حکیم بجز اس کے کہ اپنا نسخہ واپس لے لیگا اور کیا کرے گا۔ یہ تو حق تعالیٰ کی بڑی عنایت ہے کہ انہوں نے آپ کی اصلاح میں دریغ نہیں کیا ورنہ ان کو کیا غرض پڑی تھی جو کوئی دیندار اپنے لئے بے دین بنے تو اپنے لئے۔ جو اعمال تجویز کئے گئے ہیں وہ بالخاصہ ہمارے امراض کے لئے مفید ہیں اب کسی کو شفا ہی کی ضرورت نہ ہو تو اس کا کیا علاج۔ اور طالب شفا کو اس پر نظر کرنی کب زیبا ہے کہ یہ سہل ہے یا دشوار اس کو تو یہ دیکھنا چاہیئے کہ میرے مرض کے لئے بھی یہ مفید ہے یا نہیں۔ تو اب عقلاء کو تو شک رہا نہ ہوگا کیونکہ وہ خوب جانتے ہیں کہ ہر چیز میں ایک خاصیت ذاتی ہوتی ہے کہ اس کی جگہ دوسری چیز وہ نفع نہیں دے سکتی تو ان اعمال کا بھی ایک خاصہ ہے جو بدون ان کے حاصل نہیں ہوسکتا۔ اور اگرچہ یہ بناء فاسد ہے کیونکہ متدین خوش عقیدہ خود خواص اشیاء ہی کا اس درجہ میں قائل نہیں کہ وہ اس کی خاصیت ذاتی ہو جس کا انفکاک نہ ہوسکے یا عموم نہ ہوسکے لیکن مدعیان عقل فلسفی طبع لوگوں پر تو یہ حجت ہے اس لئے الزام کے طور پر میں کہہ سکتا ہوں کہ جب یہ عذر علاج جسمانی میں کبھی نہیں کیا جاتا تو علاج روحانی میں سہولت و دشواری پر کیوں نظر ہوتی ہے البتہ متدین لوگوں کو یہ شبہ ہوسکتا ہے کہ حق تعالیٰ تو اعمال کی خاصیت بدلنے پر قادر ہیں ایک دشوار سے دشوار عمل کی خاصیت ایک آسان عمل میں پیدا کر سکتے ہیں طبیب ظاہری چونکہ تبدیل خاصیت سے مجبور ہے اس لئے وہ بجز اس کے کہ مریض طالب سہولت کو جواب دیدے اور کیا کر سکتا ہے مگر حق تعالےٰ تو قادر ہے اس لئے وہ سوال باقی ہے سو اُس کا جواب یہ ہے کہ حق تعالیٰ بیشک خاصیت کے بدلنے پر قادر ہیں مگر جن حکمتوں کی وجہ سے وہ خواص ایک عمل میں رکھے ہیں بدلنے کی صورت میں، وہ خاص حکمتیں باقی نہ رہتیں۔ اس سے آگے سرحد ملی ہوئی ہے قدرت کی

اس میں ہم زیادہ گفتگو نہیں کرسکتے مگر ایک نظیر سے آپ اس کو کسی قدر سمجھ سکتے ہیں کہ جب حق تعالے نے آدم علیہ السلام کو خلیفۃ الارض بنانے کے لئے پیدا کرنا چاہا تو فرشتوں نے عرض کیا تھا کہ یَسْفِكُ الدِّمَاءَ (خونریزی کرے گا) توحق تعالےٰ نے فرشتوں کو دو جواب دیئے ایک تو حاکمانہ جواب دیا کہ اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَالَا تَعْلَمُوْنَ میرے معاملات کی تمہیں کیا خبر۔ رموزِ مملکت خویش خسرواں دانند (سلطنت کے رموز کو بادشاہ ہی جانتے ہیں) میں اپنے معاملات کا تم لوگوں سے زیادہ علم رکھتا ہوں۔ اور دوسرا جواب حکیمانہ دیا کہ عَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا الآیۃ کہ تمام اوصاف اور اسماء اور خواص اشیاء کے جن سے کہ ان کو کام پڑنے والا تھا تعلیم فرما دیئے تاکہ وہ ان اشیاء میں تصرف کرنے پر قادر ہوں۔ خواہ وہ تصرف کسی قسم کا ہو کیونکہ تصرف ایک تو جمادات وغیرہ میں کرے گا اور ایک تصرف کرے گا خود انسان میں کہ اس کی اصلاح کریگا۔ اور یہ ظاہر ہے کہ اصلاح وہی کرسکتا ہے جو خوب اچھی طرح محل اصلاح کے اوصاف وخواص سے واقف ہو۔ غرض سب سکھلا کر پھر فرشتوں پر پیش کیا اور پھر فرشتوں سے فرمایا کہ اَنْۢبِئُوْنِیْ بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ۝ اگر تم سچے ہو ان کے نام بتلاؤ اور اسماء کی تخصیص محض ذکر کی ہے مقصود مع اوصاف وخواص بتلانا ہے۔ پھر فرشتوں نے حق تعالیٰ سے اپنے عجز کا اقرار کیا اور کہا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا الآیۃ۔ پھر حق تعالےٰ نے آدم علیہ السلام سے فرمایا کہ تم ان کے نام بتلاؤ قَالَ یٰٓاٰدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ (اے آدم تم بتلاؤ ان کے اسماء کو) پس آدم علیہ السلام نے سب بتلا دیا فَلَمَّآ اَنْۢبَاَهُمْ جب آدم علیہ السلام نے نام بتلا دیئے تو قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ الآیۃ حق تعالےٰ نے فرشتوں سے فرمایا کہ کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ میں آسمانوں اور زمین کے غیب کو جانتا ہوں تو خلاصہ یہ ہوا کہ خلافت کے لئے جس چیز کی ضرورت ہے وہ ان کو تعلیم فرمائی۔ اب اس پر یہ شبہ ہوسکتا ہے کہ جو چیزیں آدم علیہ السلام کو بتلائیں اگر فرشتوں کو بھی بتلا دیتے تو وہ بھی اسی طرح بتلا سکتے تھے یہ تو ایسا ہوا کہ دو طلبہ کو امتحان میں اس طرح شریک کریں کہ ایک کو تو اول بند رہویں مقالہ کی شکل اول خلوت میں سکھلا دیں اور دوسرے سے اسی شکل میں بغیر سکھلائے ہوئے امتحان لیں اس شبہ کا جواب سننے کے قابل ہے کہ یہ کہیں سے ثابت نہیں کہ خدا تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو تنہائی میں اسماء وغیرہ بتلائے تھے اور جب ثابت نہیں تو یہ بھی احتمال ہے کہ فرشتوں کے

سامنے ہی بتلایا ہو اور یہی احتمال خدا تعالیٰ کے لطف کے اعتبار سے راجح ہے تو اب وہ مثال صحیح نہیں ہو سکتی بلکہ اب اس کی مثال ایسی ہو گئی کہ پندرھویں مقالہ کی شکل اول دونوں طلبہ کے سامنے بیان کی گئی اور امتحان کے وقت ایک تو بوجہ مناسبت بتلا سکا اور دوسرا نہیں بتلا سکا تو اعتراض جو وارد ہوتا ہے اول صورت میں ہوتا ہے اس پر منع کافی ہے اور اگر وہ احتمال بالفرض راجح نہ بھی مگر احتمال تو ہے ہی کہ فہرست سب کے سامنے پیش ہوئی ہو اور پھر بھی حضرت آدم علیہ السلام نے تو بتلا دیا اور فرشتے نہ بتلا سکے کیونکہ ہر علم کے واسطے استعداد کی ضرورت ہے اور اُن علوم کی استعداد بشر ہی میں تھی۔ مثلاً بھوک کی حقیقت کہ جبرئیل علیہ السلام نہیں سمجھ سکتے تو فرشتے باوجود سننے کے بھی بوجہ عدم استعداد اس کی حقیقت نہ بتلا سکے تو حق تعالیٰ نے اس امتحان سے یہ بتلا دیا کہ تم میں وہ استعداد نہیں اور وہی شرط تھی خلافت کی اب ایک شبہ اور رہا کہ جب آدم علیہ السلام نے ان کو بھی بتلا دیا تو وہ ضرور سمجھ سکے ہوں گے تو ان میں بھی استعداد ثابت ہو گئی مگر یہ محض لغو اعتراض ہے کیونکہ بتلانے کے لئے مخاطب کا سمجھ لینا لازم نہیں اور اسی لئے اَنْبِئْ فرمایا عَلِّمْهُمْ نہیں فرمایا تعلیم کے معنی ہیں سمجھا دینے کے اور انبار کے معنی ہیں اخبار کے یعنی تقریر کر دی گو مخاطب نہ سمجھا ہو۔ بہرحال استعداد کی ہر علم کے لئے ضرورت ہوتی ہے تو اس تقریر پر یہی اعتراض پڑتا ہے کہ اگر خدا تعالیٰ خاصیت ہی بدل دیتے اور وہ استعداد ملائکہ ہی میں پیدا کر دیتے تو وہ بھی تو سمجھ لیتے۔ جواب یہ ہے کہ خاصہ اس کو کہتے ہیں کہ اس ذات کے علاوہ کسی اور ذات میں نہ پایا جاوے۔ ورنہ خاصہ نہ رہے گا تو استعداد جو خاصہ بشر ہے ملائکہ میں کیسے پائی جا سکتی ہے اور اگر کہو کہ ان ہی فرشتوں کو بشر کر کے خلیفہ کر دیتے تو یہ مسئلہ تقدیر کا ہے اس میں ہم نہیں کہہ سکتے کہ ان کو بشر کیوں نہیں کیا اس کی نسبت صرف یہی کہا جاوے گا کہ ؎

حدیث مطرب و مے گو و راز دہر کمتر جو ۔۔۔ کہ کس نکشود و نکشاید بحکمت این معما را

(یعنی عشق و محبت کی باتیں کرو اور زمانہ کے بھید و اسرار کی ٹوہ میں مت لگو کیونکہ یہ عقدہ نہ کسی سے حل ہوا نہ کوئی حل کر سکے گا)

ؔ ؎ بصفۂ ماضی ۱۲

اور یہیں سے معلوم ہوگیا ہوگا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی کیا شفقت ہے کہ مسئلہ قدر میں گفتگو کرنے سے منع فرمادیا کیونکہ اس میں سوالات کا انقطاع نہیں ہوتا. تو اس کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اول ہی میں فرمادیا (ع) اول ما آخر ہر منتہی ست (ہمارا شروع ہی ہر منتہی کا آخر ہے)

غرض جو کام بڑے بڑے عقلاء ٹھوکریں کھاکر کرتے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اول ہی میں بتلادیا۔ پس اسی طرح اس سوال کا جواب ہم نہیں دے سکتے کہ خاصیت اعمال کی بدل دیتے جیسے وہاں فرشتوں کو بشر کر دینے کا اعتراض تھا تو غرض یہ ہے کہ ہر گناہ کی ایک خاص خاصیت حق تعالےٰ نے پیدا کر دی اور اس کا ایک علاج مقرر کر دیا تو اب یہ اعتراض لغو ہے کہ جو خاصہ نماز کا ہے وہ بدوں نماز ہی کے کر دیتے تو یہ اشکال بھی مندفع ہوگیا پس اب معلوم ہوا کہ اُن امراض کا علاج انہیں اعمال میں ہے اب وہ مثال توضیح کے لئے طبیب کی کافی ہوگئی کہ جیسے طبیب علاج کو خاص دوا میں منحصر کرتا ہے اور اس پر اعتراض کرنا لغو ہے اسی طرح خدا تعالےٰ پر یہ شبہ کرنا لغو ہے تو یہ اعتراض کہ خدا تعالیٰ نے اصلاح کو ان ہی موجودہ احکام میں منحصر کیوں کیا نہ خدا پر ہوسکتا ہے نہ مولوں پر کیونکہ اول تو مولوی احکام کو مشروع ہی کیوں کرتے اور اگر کرتے تو ان کے کرنے سے ہوتا ہی کیوں۔ بلکہ ایسا ہوتا جیسا کہ ایک رند نے کسی واعظ سے یہ سن کر کہ بے وضو نماز نہیں ہوتی، کہا تھا کہ بارہا کردیم شد (ہم نے بارہا کیا ہے اور ہوگئی) اعمال کی صورت تو ہو جاتی. مگر واقع میں ان کی روح تو نہ ہوتی البتہ اس کا خدا کو بے شک اختیار تھا مگر اب تو وحی بھی منقطع ہوگئی، اب تو احتمال ہی نہیں اور وحی کے وقت بھی کیوں ہوتا. لَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ اَهْوَاءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ (اور اگر حق ان کی خواہشوں کے تابع ہوتا تو زمین و آسمان فاسد ہوجاتے) وہ قانون ایسا ہوتا جیسے بہت سے ڈاکو جمع ہو کر کہیں کہ ہم سے مشورہ کر کے قانون بناؤ کہ ڈکیتی کو جائز کہدو تو مجلس وضع قانون کی یہ کہے گی کہ اگر قانون تمہاری خواہش کے تابع ہو تو تمام عالم میں فساد ہو جاوے گا. اسی طرح خدا تعالےٰ فرماتے ہیں تو معلوم ہوا کہ احکام شرعیہ میں تبدل تو ہو نہیں سکتا تو یہ ہوس تو گئی مگر صرف یہ اشکال رہا کہ یہ دشوار تو ہے یہ ہے اشکال جو بہت بڑا عقبہ ہے

اور یہی مانع ہے مسلمانوں کو اتباع شریعت سے مسلمان دلائل سے مان تو ضرور جاتے ہیں خصوصاً انقلاب عالم کو دیکھ کر اکثر عقلا اقرار بھی کرنے لگتے ہیں کہ شریعت کے چھوڑنے کی ساری خرابی ہے۔ مگر اقرار بھی اسی وقت تک ہے جب تک کہ الفاظ ہی الفاظ ہیں کچھ کرنا نہیں پڑا کیونکہ الفاظ تو شیریں ہی ہیں باقی کرنے کے نام صفر۔

مجھے الفاظ پر ایک قصہ یاد آیا کہ ایک شخص مرا اس کا ایک بیوقوف بیٹا تھا جب وہ باپ مرنے لگا تو اس نے سوچا کہ یہ ہے بیوقوف اور آئیں گے تعزیت کرنے والے خدا جانے اون کی ساتھ کس بے تمیزی سے پیش آوے گا اس لئے ان کو مناسب دستور العمل سکھلا دینا مناسب ہے۔ پس اس نے وصیت کی کہ جو شخص آئے اس کو اونچی جگہ بٹھلانا اور اس سے نرم و شیریں باتیں کرنا اور اس کو قیمتی کھانا کھلانا اور بھاری کپڑے پہنکر اس سے ملنا اتفاقاً ایک شخص آپہونچا آپ نے حکم دیا کہ ان کو اونچی مچان پر بٹھلاؤ اور خود جوڑہ بدلنے گئے بھاری بھاری قالین اور دریاں لپیٹ کر تشریف لائے اب مہمان جو بات کرتا ہے اس کے جواب میں گڑ اور روئی ارشاد ہوتا ہے پھر کھانے کے وقت گوشت آیا ذرا سخت تھا مہمان نے شکایت کی تو آپ فرماتے ہیں میاں کے لئے پچاس روپیہ کا کتا کاٹ ڈالا آپ کو پسند ہی نہیں آیا۔ مہمان حیران ہے فعل عجیب ہے وجہ پوچھنے پر سب کی توجیہ فرمائی چنانچہ گڑ اور روئی کی وجہ نرم اور شیریں الفاظ کی وصیت بتلائی تو جیسے اس نے معنی سے قطع نظر کر کے صرف نرمی اور شیرینی پر دلالت کرنے والے الفاظ یاد کر لئے تھے ایسے ہی ہمارے بھائیوں نے محض الفاظ یاد کر لئے کہ مذہب ضروری چیز ہے اس میں پختگی کرنی چاہیئے۔ مگر میں ڈرتا ہوں کہ جب ان کو عمل کے لئے کہا جاوے گا اس وقت خامی ظاہر ہوا اور پھر وہی سوال دشواری کا پیش کریں اس لئے ضروری ہے کہ عمل کے وقت کی دشواری کے متعلق ان کو بتلا یا جاوے کہ آیا دین دشوار ہے یا نہیں سو ایک جواب تو معروض ہو چکا ہے اگر دشوار بھی ہو تو خواص مطلوبہ ضروریہ کی تحصیل کے لئے قبول کرنا چاہیئے اور دوسرا جواب یہ ہے کہ واقع میں دین میں دشواری ہی نہیں۔ یہاں اسی جواب کو فرماتے ہیں کہ مَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ (اللہ تعالےٰ نے تم پر دین میں تنگی نہیں کی ہے) اور کیسی بے فکری سے کہتے ہیں آخر

خدا ہیں نا اگر کوئی بندہ ہوتا تو ایسے موقع پر کہ ایک عالم دشواری کا مدعی ہو خدا جانے کتنی تمہیدوں کے بعد جواب دیتا۔ یہاں ایک دم سے نہایت پرزور لہجہ میں حرج کی نفی فرمادی اس کی ایسی مثال ہے کہ جیسے کوئی بڑا انجنیر جرثقیل سے ایک بڑے بھاری بوجھ کو اٹھا رہا ہو اور ایک گنوار کہے کہ اس کو یہیں رہنے دو کہ مصلحت ہے تو وہ نہایت لاپروائی سے کہے گا کہ نہیں یہ وہیں جاوے گا۔ اور خدا کی تو بڑی شان ہے ان کو وجوہ بتلانے کی کیا ضرورت ہے۔ جب اہل تحقیق اپنی خاص شان میں ہوتے ہیں تو محض عوام کے نہ ماننے کی ضرورت سے اسرار و نکات و وجوہ نہیں بتلایا کرتے۔ ہاں کبھی اس کے پر پرزے بھی بیان کر دیتے ہیں۔ چنانچہ خدا تعالیٰ نے بھی کہیں کہیں بیان کئے ہیں۔ اس لئے محققین نے کہا ہے کہ ؎

با مدعی مگوئید اسرار عشق مستی
بگذار تا بمیرد در رنج خود پرستی

(مدعی سے عشق و مستی کے اسرار نہ کہو اس کو رنج اور خود پرستی میں مرنے دو)

بخلاف غیر محقق کے کہ اس پر جب اعتراض ہوتا ہے وہ بھڑک اٹھتا ہے اور زور و شور کی تقریر شروع کر دیتا ہے اور محقق بھڑکتا نہیں بلکہ سارے جوابوں کو طے کر کے اوپر پہونچتا ہے اس لئے بعض اوقات جواب ہی نہیں دیتا پس جواب نہ دینے کی دو صورتیں ہوتی ہیں یا تو جواب سے نیچے ہو کہ جواب تک نہ پہونچا یا اوپر ہو کہ اس سے بھی عبور کر گیا ہو محقق کی یہی شان ہوتی ہے۔ پس خدا تعالیٰ کا کلام کہیں تو حکیمانہ ہے اور کہیں حاکمانہ اور یہ حاکمانہ طرز زیادہ شفقت پر دلالت کرتا ہے کیونکہ حکیمانہ جواب میں ذرا اجنبیت ہوتی ہے جیسے ایک تو طبیب کہے کہ یہ فلاں وجہ سے مضر ہے اس کو نہ کھاؤ اور ایک باپ کہے کہ خبردار اس کو مت کھاؤ اور اگر وہ وجہ پوچھے تو کہے گا کہ بکو مت بس مت کھاؤ۔ اب اگر کوئی کہے کہ یہ بڑا سخت باپ ہے تو غلطی ہے بلکہ وہ بڑا شفیق باپ ہے تو حاکمانہ انداز بڑی شفقت کی دلیل ہے تو حق تعالیٰ حاکمانہ فرماتے ہیں مَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ (اور اس نے تم پر دین میں کسی قسم کی تنگی نہیں کی) تو اصل میں تو مجھے اس کا بیان کرنا ہے مگر اس سے پہلے ایک ایسا جملہ حق تعالیٰ نے

فرمایا ہے کہ اگر اس کو ذہن میں رکھ لیں تو پھر جواب میں تفصیل ہی کی ضرورت نہ رہے وہ جملہ یہ ہے هُوَ اجْتَبَاكُمْ کہ اس نے تم کو مخصوص بنا لیا ہے مقصود یہ کہ کیا ہمارے خاص ہو کر تم ہماری بات نہ مانو گے ایک تو مخصوص کہنے میں یہ اثر ہوتا ہے دوسرے خود مخصوص ہونے میں ایک خاص مناسبت بھی ہو جاتی ہے جس سے خود بھی وہیں پہونچنے لگتا ہے جہاں پہونچا نا مقصود ہے جیسے ایک نوکر کہ وہ گھر کا کام کرتا تھا اور پوچھ پوچھ کر کرتا تھا اس کے بعد آپ نے اس کو خاص کر لیا کہ وہ آپ کے گھر کے مشورے بھی سنتا ہے تو اس کو احکام کے اسرار بھی معلوم ہونے لگے ہیں تو خصوصیت میں یہ خاصہ ہے خاصکر جو کہ خدا کا مخصوص ہے اس کی تو علوم میں یہ حالت ہو جاتی ہے وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ (اور ایسی جگہ سے روزی دیتے ہیں جہاں گمان بھی نہیں ہوتا) اور علوم باطنہ میں یہ حالت ہو جاتی ہے ؂

بینی اندر خود علوم انبیا   بے کتاب و بے معید و اوستا

(تم کو بے مددگار اور بغیر استاد و کتاب کے انبیاء جیسے علوم حاصل ہو ں گے)

اور یہ تفسیر نہیں ہے مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ کی محض مثال ہے لیکن اگر کوئی اس لطیفہ کو آیت کے عموم کی تفسیر بھی کہے تو گنجائش ہے چنانچہ بعض مفسرین نے وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنْفِقُونَ (جو کچھ ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے کچھ خرچ کرتے ہیں) میں اُس کے عموم سے رزق سے فیض علمی مراد لیا ہے اور ایک دوسری آیت میں بھی رزق کو دنیا کے رزق سے عام لیا ہے يُرْزَقُونَ فَرِحِينَ (رزق دیا جاتا ہے ان کو اس حال میں وہ خوش ہیں) تو اسی طرح اگر کوئی اس آیت میں بھی رزق سے علم مراد لے لے تو جائز ہے۔ نیز مشاہدہ بھی ہے کہ حق تعالیٰ کے مخصوصین علوم میں خود وہاں تک پہونچتے ہیں جہاں اہل نظر نہیں پہونچتے۔ مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے کتابیں کچھ بہت نہیں پڑھی تھیں بلکہ پڑھنے کے زمانہ میں بھی بہت شوق و مشقت سے نہ پڑھا تھا مگر مولانا کا علم اُن کے رسائل سے ملاحظہ فرمالیجئے۔

ایک مرتبہ مولانا محمد یعقوب صاحب نے ایک مضمون نیا بیان کیا کسی نے حاضرین

میں سے کہا کہ یہ مضمون تو ایک بار مولانا محمد قاسم صاحب نے بھی بیان فرمایا تھا ارشاد فرمایا جہاں سے ہم کہتے ہیں وہاں ہی سے وہ بھی فرماتے تھے مگر اتنا فرق ہے کہ اُن کے لئے سمندر کی برابر کھلتا تھا، ہمارے لئے سوئی کے ناکہ کی برابر کھلتا ہے۔ تو جب یہ بات ہے تو اب ایسے شخص کو دلائل کی کیا ضرورت ہے مجھے علم مکسوب اور علم موہوب پر ایک مثال یاد آئی۔ ایک سیاح امیر عبدالرحمٰن کی فراست کی حالت بیان کرتے تھے کہ میں نے ایک رقعہ چند مشوروں پر مشتمل تنہائی میں لکھ کر پیش کرنے کے ارادہ سے جیب میں رکھ لیا۔ قبل اس کے کہ میں پیش کرتا انہوں نے خود ہی سب مضامین کا جواب دے دیا کہ بعض خیر خواہوں کی ایسی ایسی رائے ہے مگر اس کا یہ یہ جواب ہے مجھ کو حیرت ہوئی۔ جب دربار برخواست ہوا تو میں نے کہا کہ امیر صاحب کیا آپ کو کشف ہوتا ہے، انہوں نے فرمایا کہ نہیں میں کیا صاحب باطن ہوں جو کشف ہوگا عقل سے ادراک ہوجاتا ہے اور عقل اور کشف میں تھوڑا ہی فرق ہے کہ کشف مشابہ ٹیلیفون کے ہے کہ صاف صاف معلوم ہوتا ہے اور عقل مشابہ ٹیلیگراف کے کہ ذرا غور سے معلوم ہوتا ہے۔ واقعی عجب مثال ہے۔ کلام الملوک ملوک الکلام تو حق تعالے ان کو گویا ٹیلیفون سے بتلا دیتے ہیں فرق یہ ہے کہ ٹیلیفون میں تو خاص متکلم کی آواز ہوتی ہے اور خدا تعالیٰ آواز سے پاک ہیں تو علم بالکنہ کا جو نتیجہ ہوتا وہ اس کو حاصل ہوجاتا ہے۔ پس هُوَ اجْتَبٰىكُمْ (اس نے تم کو مخصوص بنالیا ہے) کو اس طرف اشارہ کرنے کے لئے مقدم فرمایا۔ اور اس میں یہ بتلا دیا کہ اگر اسرار شریعت جاننا چاہتے ہو تو خدا کے برگزیدہ بنو اور خدا کا برگزیدہ ہونا تو بڑی بات ہے۔ بزرگوں کے پاس بیٹھنے بلکہ ان کا چہرہ دیکھنے سے بہت شبہات کا حل ہوجاتا ہے۔ مولانا رومی نے سچ فرمایا ہے ؎

اے لقائے تو جواب ہر سوال　　مشکل از تو حل شود بے قیل وقال

(آپ ایسے بابرکت ہیں کہ آپ کی ملاقات ہی ہر سوال کا جواب ہے بلاشبہ آپ سے ہر مشکل آسان ہوجاتی ہے)

میرے ایک ہم وطن جو کہ اس وقت انگلستان میں ہیں وہ مجھ سے نقل کرتے تھے کہ میں

یس ایک وقت باندہ میں تھا وہ انگریزی میں بڑے ذی استعداد ہیں اور نوکری میں ایسے خوش اقبال کہ جب کوشش کی فوراً ہی چار سو یا پانسو کے نوکر ہو گئے۔ مگر بے استقلالی کے سبب ان کو کبھی نوکری سے انتفاع نہیں ہوا۔ غرض ذکی بہت ہیں مگر علم دین سے واقف نہیں اس لئے یہ واقعہ ہوا کہ ایک مرتبہ صحابہ کرام کی تاریخ دیکھ رہے تھے اور رمضان کا روزہ بھی تھا اس میں تھا کہ ایک جگہ گئے اور کسی کافر بادشاہ کے پاس پیام بھیجا کہ یا اسلام لاؤ یا جزیہ دو ورنہ قتال ہے ان کو شبہ ہوا کہ بس اسلام کی یہ قیمت ہے کہ بجائے اسلام کے جزیہ پر راضی ہو گئے حالانکہ اسلام کی تو وہ قیمت ہے کہ ؎

قیمت خود ہر دو عالم گفتہ نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز

(اپنی قیمت دونوں جہان بتلائی ہے نرخ بڑھاؤ ابھی تک ارزانی ہے)

یہ محض شریعت کی رحمت عامہ ہے کہ اسلام پر جبر نہ کر کے جزیہ قبول کر لیا اور ان لوگوں کے حقوق برابر رکھے اور یہ شبہ ایسا بڑھا کہ اسلام کی حقانیت ہی کا انکار دل میں جم گیا۔ پھر خیال آیا کہ جب اسلام ہی کچھ نہیں ہے تو روزہ کیا چیز ہے آخر پانی پی لیا اس کے بعد رنج ہوا کیونکہ اسلام بہت مدت کا رفیق تھا۔ شام کو حسب معمول ایک دوست کے پاس پہنچے انہوں نے افطار میں شرکت کے لئے بلایا تو انہوں نے کہا کہ میری ایسی حالت ہے کہ اگر تم کو معلوم ہو جاوے تو پاس بھی نہ بٹھلاؤ انہوں نے کہا کہ بیش بریں نیست (اس سے زیادہ نہیں ہے) کہ تم کافر ہو گئے ہو گے تو وہ اللہ تعالے کے ساتھ معاملہ ہے باقی اس کا اثر باہمی دوستی پر کیوں ہو یہ حکمت تالیف کیلئے کہا جب کھا پی چکے انہوں نے حقیقت پوچھی معلوم ہونے پر کہا ہماری خاطر سے تم مولانا فضل الرحمن صاحب سے مل لو یہ ہنسے کہ مولوی صاحب بجز قرآن و حدیث کے ان حقائق فلسفیہ کو کیا جانیں اور میرے شبہات کا کیا جواب دیں گے۔ مگر جس چیز کے نہ جاننے کو یہ نقص سمجھ رہے ہیں وہ اس پر فخر کرتے ہیں کہ ؎

ما ہرچہ خواندہ ایم فراموش کردہ ایم الا حدیث یار کہ تکرار میکنیم

(جو کچھ ہم نے پڑھا سب کو فراموش کر دیا بجز محبوب حقیقی کی باتوں کے ان ہی کا تکرار کرتے ہیں)

یہ شعر میں نے خود مولانا کی زبان سے سنا ہے۔ حقیقت میں علم تو وہی ہے ایک صوفی فرماتے ہیں ؎

علم نبود غیر علم عاشقی مابقی تلبیس ابلیس شقی

(ترجمہ: علم عاشقی کے علاوہ جو بھی علم ہے وہ ابلیس شقی کی تلبیس ہے)
اور وہی کہتے ہیں ؎

اَیُّھَا الْقَوْمُ الَّذِیْ فِی الْمَدْرَسَہ   کُلَّمَا حَصَّلْتُمُوْہُ وَسْوَسَہ

(جو کچھ مدرسے میں علم حاصل کیا وہ وسوسہ تھا)

پس یہ تو اپنے علم پر فخر کرتے ہیں مگر عام لوگ اس کو ذلیل کہتے ہیں کہ یہ کیا جانیں سوائے قرآن و حدیث کے۔ حالانکہ تمام دنیا کے فلسفی قرآن وحدیث کے آگے گرد ہیں آخر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بڑے بڑے فلسفی آئے مگر سب ساکت تھے غرض انہوں نے غایت تحقیر سے کہا کہ مولانا کیا جانیں، انہوں نے کہا تم میری ہی خاطر سے جاؤ تو سہی انہوں نے کہا کہ خیر تمہاری خاطر چلا جاؤں گا، آخر گئے اور ادب کے سبب زیادہ رستہ پیدل قطع کیا اور اسی حالت ہجوم اعتراضات میں پہنچے اور خوب منصوبے سوچ رکھے تھے کہ یہ کہوں گا وہ کہوں گا۔ جاکر کہا السلام علیکم مولانا نے سلام لیکر فرمایا بولو کیا شبہ ہے بیان کرتے تھے کہ اب جو اعتراض سوچتا ہوں اس کا جواب ذہن میں موجود اب مولانا تو تقاضا فرما رہے ہیں اور یہ گم سم حیران۔ خلاصہ یہ کہ کچھ بھی نہ رہا قلب صاف ہو گیا آخر میں انہوں نے عرض کیا کہ مجھ کو بیعت کر لیجئے کہتے تھے کہ مجھ سے عمل میں تو بڑی بڑی کوتاہیاں ہوتی ہیں لیکن عقاید کے متعلق کبھی کوئی وسوسہ تک اس روز سے نہیں آیا۔ مجھ کو یہ حکایت اس پر یاد آگئی کہ ؎

اے لقاء تو جواب ہر سوال   مشکل از تو حل شود بے قیل و قال

(آپ ایسے بابرکت ہیں کہ آپ کی ملاقات ہی ہر سوال کا جواب ہے۔ بلاشبہ آپ سے ہر مشکل آسان ہو جاتی ہے)

یہ برکت ہے اہل اللہ سے تعلق رکھنے کی خود بھی اس کا اہتمام کیجئے اور اپنی اولاد کے لئے اس کا انتظام کیجئے اور اگر عذر ہو کہ وہ انگریزی پڑھتے ہیں ان کو اتنی فرصت کہاں تو میں اس کی ایک سہل اور مختصر صورت بتلاتا ہوں کہ صرف تعطیلات میں اپنے بچوں کو کسی بزرگ کے پاس بھیج دیا کیجئے اور خود بھی رہ لیا کیجئے۔ اور میں اس کا اطمینان دلاتا ہوں کہ وہ تعلیم انگریزی یا نوکری نہ چھڑا دیں گے۔ بلکہ اگر آپ خود بھی چھوڑنا چاہیں گے تو وہ نہ چھوڑنے دینگے

کیونکہ وہ حکیم ہیں سمجھتے ہیں کہ ضعفاء کے لئے نوکری چھوڑنے میں زیادہ مفاسد ہیں۔ غرض تمام
تر وجہ آپ کے شبہوں کی یہ ہے کہ اسلام کی حقیقت معلوم نہیں تو جب بزرگوں کے قرب میں
انکشاف حقیقت کا اثر ہے تو خدا کے قرب میں تو یہ اثر کیسے نہ ہوگا۔ تو خلاصہ یہ ہے کہ تم مجتبیٰ
(مخصوص) بنو اگر کہو کہ خدا تعالیٰ نے تو مجتبیٰ بنا لیا چنانچہ هُوَ اجْتَبَاكُمْ کا یہی ترجمہ ہے پھر
ہم کو کیا ضرورت ہے تو سبحان اللہ اگر کوئی کہے کہ شام کو فلاں شخص نے تمہاری دعوت
کی ہے تو کیا اس کے یہ معنی ہیں کہ وہی خود تمہارے منہ میں بھی دے گا اس نے تو تمہارے
لئے سامان کیا ہے باقی کھاؤ تم خود اسی طرح اجتباء کا سامان تمہارے لئے کر دیا ہے باقی اسکو
حاصل کرو تم۔ اس پر مجھے ایک حکایت یاد آئی کہ ایک گوجر کے یہاں ایک موٹو تی پیر آیا گوجر بولا
اب کے تو بہت ہی دُبلے ہو رہے ہو پیر صاحب بولے تم نماز نہیں پڑھتے تمہارے بدلے میں پڑھتا ہوں
تم روزہ نہیں رکھتے میں ہی رکھتا ہوں علیٰ ہذا سب اعمال۔ پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ پلصراط پر جو کہ بال
سے باریک اور تلوار سے تیز ہے تمہارے عوض چلنا پڑتا ہے تو کہاں تک دُبلا نہ ہوں گوجر
بولا بہت ہی کام کرنا پڑتا ہے جا میں نے فلاں کھیت تجھے دیدیا پیر خوش ہوئے کہا کہ قبضہ
کرادے وہ ساتھ چلا۔ دھانوں کی پتلی پتلی ڈولیں ہوتی ہیں ایک جگہ پیر پھسل کر گر گئے گوجر نے
ایک لات دی کہ تو پلصراط پر کیا چلتا ہوگا جھوٹا ہے میں ایسے جھوٹے کو کھیت نہیں دیتا۔ اب
وہ کھیت بھی چھین لیا اور چوٹ بھی لگی۔ تو اسی طرح اب اگر کوئی چاہے کہ مجتبیٰ تو ہم ہوں مگر
کام سارے کوئی دوسرا کرلے۔ نہیں بلکہ طریقہ بتلا دیا اب تم کرو۔ یہ سب هُوَ اجْتَبَاكُمْ (اس نے
تم کو مخصوص بنا لیا ہے) کے متعلق بیان تھا اب اس مقصود یعنی نفی حرج کے متعلق عرض کرتا ہوں
وہ عرض یہ ہے کہ یہ جو کہا جاتا ہے کہ دین میں دشواری ہے اس کے معنی کیا ہیں کیونکہ اس کے دو درجے
ہیں ایک تو یہ کہ قانون کی پابندی کرنی پڑتی ہے اور یہ دشوار ہے اور ایک یہ کہ خود قانون ہی سخت
ہے تو اسلام میں کونسی دشواری ہے آیا یہ کہ قانون کی پابندی کرنی پڑتی ہے تو تسلیم ہے کیونکہ اس میں
ضرور دشواری ہوتی ہے خواہ کتنا ہی سہل قانون ہو۔ مثلاً جو لوگ کہ عدالت میں نوکر ہیں اور ان کا
وقت دس بجے سے ہے تو کیا کبھی یہ پابندی دشوار نہیں ہوئی ضرور ہوتی ہے اور اس وقت کہتے
ہیں کہ نوکری بڑی ذلت کی چیز ہے مگر اتنی ہی بات پر اس کو کبھی چھوڑ نہ دیا۔ تو جب قانون کی پابندی

ہو گی اس میں دشواری ضرور ہو گی تو اگر اسلام میں یہ دشواری ہے تو تسلیم ہے بلکہ اس کو تو خود ہی ثابت کرتے ہیں لَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰى (خواہش کا اتباع مت کرو) اور اس سے صاف اِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ (بلاشبہ وہ (نماز) دشوار ہے بجز خدا سے ڈرنے والوں پر) غرض یہ دشواری تو تسلیم ہے مگر اس میں اسلام کی کیا تخصیص ہے یہ تو سب ہی کام میں بلکہ کھانے میں بھی ہے کوئی اپاہجوں سے پوچھے خاص کر واجد علی شاہ کے احدیوں سے کہ کھانا کتنا مشکل کام ہے. مشہور ہے کہ واجد علی شاہ کے یہاں دو احدی تھے ان میں باری اس طرح تھی کہ ایک لیٹا ہوا آرام کرے دوسرا بیٹھا ہوا اس کی حفاظت کرے۔ اسی طرح ایک لیٹا ہوا تھا ایک بیٹھا ہوا۔ ایک سوار ادھر سے گذرا لیٹے ہوئے نے پکارا کہ میاں سوار ذرا یہ بیر جو میرے سینے پر رکھا ہے میرے منہ میں ڈالدو اس آرام طلبی سے سخت حیرت ہوئی اور اس سے زیادہ یہ حیرت ہوئی کہ اس کا رفیق جو پاس بیٹھا ہے اس سے اتنا کام نہیں ہوتا۔ اس لئے اس بیٹھے ہوئے سے کہا کہ بھائی تو ہی اس کے منہ میں ڈالدے، وہ بہت بگڑا اور کہنے لگا کہ جناب میری آپ کی لڑائی ہو جائے گی آپ کو کیا خبر یہ میرے ساتھ کیسا ہے. کل میں لیٹا تھا یہ بیٹھا تھا مجھ کو جو جمائی آئی اُس سے منہ کھل گیا، ایک کتا آکر منہ میں موتنے لگا یہ بیٹھا ہوا دیکھتا رہا اور اس سے اتنا نہ ہوا کہ کتے کو ہٹا دے۔ میں سن کر اس کے منہ میں بیر دونگا۔ سوار حیرت میں غرق ہو گیا اور لاحول پڑھتا ہوا چلدیا۔ تو حضرت اگر کوئی احدیوں سے پوچھے تو ان کو تو کھانا بھی مشکل ہے ہمارے ایک عزیز دو بھائی ہیں ایک چھوٹے ایک بڑے۔ بڑے صاحب ہاتھ پانوں لپیٹ کر بیٹھ جاتے ہیں اور چھوٹے سے کہتے ہیں کہ میرے منہ میں لقمے دیکر مجھ کو کھانا کھلا۔ تو ایسی نظیریں بھی موجود ہیں اور رہیں گی تو اس طرح تو کھانے میں بھی دشواری ہے۔ اور اس میں شرعی اور قانونی پابندیاں بھی ہیں. مثلاً یہ کہ دوسرے کی چیز نہ کھاؤ اور ڈکیتی نہ ڈالو مگر اس کو کسی نے نہ کہا کہ بڑا سخت قانون ہے وجہ یہ کہ آپ کو ڈکیتی ڈالنا ہی نہیں ہے اس لئے آپ کو اس کی ممانعت کا قانون سخت معلوم نہیں ہوتا اور رشوت لینا مقصود ہے اس لئے اس کی ممانعت سخت معلوم ہوتی ہے. لیکن جو ڈکیتی پیشہ ہیں ان سے کوئی پوچھے اس ممانعت کے قانون کو کتنا سخت سمجھتے ہیں۔ اسی طرح ایک جماعت یہودیوں کی ایسی بھی ہے کہ ان کی رائے یہ ہے کہ کوئی سلطنت نہ ہو حالانکہ ضرورت سلطنت کا قانون امر فطری ہے مگر یہ ان کو گراں ہے۔ تو ایسے لوگ تو انسانیت ہی سے خارج ہیں تو محض پابندی سے تو کوئی بھی نہیں بچ سکتا۔

پھر اسلام ہی پر کیوں اعتراض ہے۔ دوسرا درجہ یہ ہے کہ پابندی کی ضرورت تو تسلیم اور یہ سختی نہیں مگر خود قانون ہی بڑا سخت ہے تو واقعی یہ دشواری دشواری ہے مگر دین میں ایسی دشواری ہی نہیں کہ قانون سخت ہو اب یہ شبہ ہوگا کہ یہ تو مشاہدہ کے خلاف ہے تو حقیقت میں اس میں تلبیس ہوئی ہے قانون کی سختی تو وہ ہے کہ اگر اس کو سب بھی مان لیں تب بھی دشواری پیش آوے مثلاً یہ قانون ہو جاوے کہ اگر چھٹانک بھر سے زیادہ کوئی کھاوے تو پھر پھانسی ہوگی یہ ایسی سخت بات ہے کہ اگر سب عمل کرنے کا ارادہ کریں تب بھی سب کو تکلیف ہو۔ اور ایک دشواری اس طرح کی ہے کہ قانون تو نرم ہے اور علامت اس کی یہ ہے کہ اگر سب اس پر عمل کرنے لگیں تو کسی کو بھی دشواری پیش نہ آوے لیکن اس میں ایک خاص عارض سے سختی پیش آجاوے وہ عارض یہ ہے کہ زیادہ آدمی اس پر عمل نہیں کرتے پس جب تھوڑے آدمی عمل کریں گے تو اُن کو دوسروں کی وجہ سے ضرور تنگی ہوگی کیونکہ تعلق معاملات کا ان ہی دوسروں سے ہے تو اس کو قانون کی سختی نہ کہیں گے بلکہ اس سختی کا منشاء اُن باغیوں کی بغاوت مثلاً کوئی اگر ایسی جگہ پہونچے کہ وہاں کے لوگ باغی ہوں اور یہ شخص وہاں پہنچکر کوئی چیز خریدے اور دام دیدے پھر اس سے کہا جائے کہ گو قانون سلطنت یہ ہے کہ پورے دام لیکر پوری چیز دو مگر ہم اس قانون کو نہیں مانتے اس لئے تم کو آدھی چیز ملے گی۔ تو ایمان سے کہئے کہ یہ دشواری قانون کی ہے یا ان بدمعاشوں کی بدمعاشی قانون کا منشاء تو یہ ہے کہ سیر بھر کی سیر بھر دو مگر ان بدمعاش لوگوں نے بدمعاشی کی اور سیر بھر کی آدھ سیر دی تو اس دشواری سے اگر کوئی گورنمنٹ کو بُرا کہنے لگے تو وہ احمق ہے یا نہیں تو جو دشواری اس وقت پیش آرہی ہے وہ دشواری یہ ہے جس کو اسلام پر تھوپا جاتا ہے۔ کوئی شخص اسلام کا کوئی ایسا قانون بتلائے کہ سب مسلمانوں کے مان لینے اور عمل کرنے کے بعد بھی اس میں دشواری پیش آوے۔ اگر پچاس قیامتیں بھی آجاویں جب بھی شریعت کا کوئی ایک قانون بھی ایسا نہیں بتلا سکتے۔ صرف موجودہ دشواری کی وجہ یہ ہے کہ نافرمانوں سے سابقہ پڑ رہا ہے۔ مثلاً قرض کی ضرورت ہوئی آپ جن کے پاس جاتے ہیں وہ کہتا ہے کہ سود لاؤ تو سود کی حرمت کا الزام شریعت پر دینا اور اپنے کئے کو اسلام پر تھوپنا ایسا ہے کہ

حملہ برخود میکنی اے سادہ مرد ہمچو آں شیرے کہ برخود حملہ کرد

(اے بیوقوف اپنے ہی اوپر حملہ کرتا ہے جیسا کہ اس شیر نے اپنے اوپر حملہ کیا تھا)

مثنوی میں شیر کی ایک حکایت لمبی چوڑی لکھی ہے کہ ایک شیر کو ایک خرگوش نے دھوکا دیا اور کہا میں تمہارے راتب کے لئے ایک موٹا خرگوش لاتا تھا رستہ میں ایک دوسرا شیر ملا اور مجھ سے چھین لیا شیر کو غصہ آیا کہ بتلا وہ کہاں ہے اس نے ایک کنویں پر لیجاکر کھڑا کردیا۔ واقعی اس میں شیر کا عکس نظر آیا بس شیر اس کنویں میں جاکودا اندر پہونچکر معلوم ہوا کہ میں نے اپنے ہی اوپر حملہ کیا تھا۔ مولانا اسی کو فرماتے ہیں۔ ؎

حملہ برخود میکنی اے سادہ مرد ہمچو آں شیرے کہ برخود حملہ کرد

(اے بیوقوف اپنے ہی اوپر حملہ کرتا ہے جیسا کہ اس شیر نے اپنے اوپر حملہ کیا)

اسی طرح ہم کو بھی اپنی دشواری کی صورت شریعت میں نظر آتی ہے۔ مگر حقیقت میں یہ اپنے اوپر اعتراض ہے۔ اس پر ایک حکایت اور یاد آئی کہ ایک حبشی نے ایک آئینہ دیکھا اس میں اپنی صورت نظر پڑی آئینہ کو بڑے زور سے پتھر پر کھینچ مارا کہ ایسا ہی بدشکل تھا تب تو کوئی مجھ کو راستہ میں پھینک گیا۔ ایک اور احمق کی حکایت ہے کہ اس کا بچہ روٹی کھا رہا تھا لوٹہ میں ایک ٹکڑا گر پڑا۔ جھانکنے سے اپنی صورت نظر آئی سمجھا کہ اس میں کوئی بچہ ہے۔ باپ سے کہا ابّا اس نے میرا ٹکڑا لے لیا۔ باپ چھینے اوٹھے جھانک کر دیکھا تو اپنی شکل۔ بولے کہ لعنت خدا کی بڈھا ہوکر بچہ کا ٹکڑا چھین لیا تُف ہے تیری اوقات پر سو وہ کس کو تف کہہ رہے تھے اپنے کو اسی طرح ہم لوگوں نے آئینہ شریعت میں اپنی شکل کو دیکھا اور وہ تنگی اپنی صفت تھی اس کو شریعت کی تنگی سمجھا۔ حضرت یہ ہے حقیقت سختی کی اور میں ایک مثال دیا کرتا ہوں کہ ایک طبیب علاج کررہا ہے اور بہت شفیق بھی ہے مگر نہ ایسا آزاد کہ خاک پتھر سب کی اجازت دیدے ظاہر ہے کہ جب غذائیں کھائی جاویں گی تو کسی چیز کی تو ضرور ہی ممانعت ہوگی۔ اتفاق سے ایک دیہاتی پہنچا کہ صاحب کھاؤں کیا جواب دیا کہ بکری کا گوشت پالک وہ بولا یہ تو ملتا نہیں کہا مونگ کی دال، کہا یہ بھی نہیں ملتی، کہا فیرینی، کہنے لگا یہ بھی نہیں ہے پھر خود پوچھا بیگن کھالوں کہا ہرگز نہ کھانا، کریلہ کو پوچھا اس کو بھی منع کیا آلو سے بھی روکدیا تو دیہاتی نے کہا کہ صاحب ہمارے یہاں تو یہی چیزیں ملتی ہیں۔ طبیب نے کہا کہ فتویٰ طب کا یوں ہی ہے۔ دیہاتی نے باہر آکر کہا کہ صاحب یہ تو بڑے سخت ہیں کہ یہ بھی نہ کھاؤ وہ بھی نہ کھاؤ تو کیا طبیب پر یہ الزام صحیح ہے یا یہ کہا جاوے گا

کہ وسعت تو یہ ہے کہ متعدد چیزوں کی سب کی اجازت دیدی لیکن وہ مقام ایسا کور دہ ہے کہ بجز معض چیزوں کے وہاں کچھ ملتا ہی نہیں تو یہ طب کی تنگی تو نہیں اس شخص کے گاؤں والوں کی معاشرت کی تنگی ہے اسی طرح حاجت ضروریہ پر نظر کر کے دیکھئے کہ معاش کی ضروری سبیلوں کو جوکہ قریب الوقوع ہیں اگر پچیس آپ نکالیں گے تو بیس کو شریعت یجوز (جائز ہے) کہیگی اور پانچ کو لایجوز (ناجائز ہے) لیکن اگر آپ کے ملک والے ہمیشہ ان ہی پانچ کو استعمال کریں اور بیس کو متروک کر دیں تو یہ تنگی معاشرت کی ہوئی یا قانون شریعت کی۔ پس یہ الزام تو بحمداللہ بوجہ احسن و اکمل رفع ہوگیا اور اگر اس کی تصدیق میں شبہ ہو تو علم دین پڑھئے اس سے معلوم ہوگا کہ شریعت نے ابواب معاش میں کس قدر توسع کیا ہے۔ اب صرف ایک فریاد رہ گئی ہے اس میں جی چاہتا ہے مسلمانوں کی ہمدردی کرنے کو وہ یہ ہے کہ یہ تو سمجھ میں آگیا کہ شریعت میں تو دشواری نہیں مگر حالت موجودہ میں اس عارض کے سبب کہ ہم کو سابقہ ایسوں سے پڑا ہے جو شریعت پر عمل نہیں کرتے عارضی دشواری تو ہوگئی تو ہم پر تو دشواری کا اثر آخر پہونچ گیا' البتہ اعتقاد درست ہوگیا کہ شریعت میں دشواری نہیں۔ مگر عمل کس طرح کریں کیا لین دین چھوڑ دیں کیونکہ نوکریاں اکثر ناجائز معاملات اکثر ناجائز تجارت اکثر ناجائز تو یہ ایک فریاد قابل استماع ہے سو اس کے متعلق بھی سن لیجئے اس میں قدرے تفصیل ہے وہ یہ کہ آپ نے جو چند معاملات کو دیکھ کر اس عارضی دشواری کے اعتبار سے عام حکم کر دیا کہ سب ہی دشوار ہے یہ غیر مسلم ہے سمجھئے کہ ایسے اعمال دو قسم کے ہیں ایک تو وہ کہ ان کی اصلاح کرنے سے معاش کی گاڑی کچھ اٹکتی ہے اور ایک وہ کہ ان کی اصلاح سے معاش کا کچھ بھی نقصان نہیں مثلاً وضع شریعت کے موافق بنائے نماز روزہ کرے حج کرے تکبر نہ کرے، باجا گاجا چھوڑ دے تو بتلایئے اس میں معاش کا کیا نقصان ہے۔ تو اس میں تو آپ آج ہی سے اصلاح کر لیجئے۔ پس زیادہ اعمال تو آپ کے آج ہی سے درست ہو جاویں گے کیونکہ پچاس عمل میں چالیس ایسے نکلیں گے کہ محض گناہ بے لذت ہیں کہ خواہ مخواہ آپ نے ان کو اپنے پیچھے لگا رکھا ہے۔ آگے دس ہی رہ جاویں گے اس میں اگر آپ کی اصلاح نہ بھی ہوئی تو چونکہ غالب درجہ اعمال صالحہ کا موجود ہو چکا ہے اس لئے حق تعالیٰ سے امید ہے کہ بقیہ اعمال کو جوکہ مغلوب و قلیل ہیں درست فرما دیں گے جیسے ایک شعلہ جوالہ کو دیکھنے میں پورا دائرہ شعلہ نظر آتا ہے حالانکہ اس میں بہت چھوٹی قوس نورانی ہے اور بڑی قوس ظلمانی مگر جب نور و ظلمت

جمع ہوتے ہیں تو نور ہی غالب آتا ہے۔ اور اس درستی میں گو یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کی خاصیت ہی یہی ہے جیسے مقناطیس کہ بالخاصہ جاذب حدید ہے پس اگر ہم یہ کہیں کہ اعمال صالحہ میں بھی خاصیت یہی ہے کہ بقیہ اعمال کو درست کر دیتا ہے تو اس کا دعویٰ ہو سکتا ہے مگر میں اس کا راز بھی بتلاتا ہوں کہ اعمال صالحہ میں ایک اثر ہے کہ اس سے قلب میں قوت ہوتی ہے اور صحابہ کی ترقی کا راز یہی ہے۔ ہم نے بزرگوں کو دیکھا ہے کہ بیماری میں اٹھا نہیں جاتا مگر نماز کے وقت بلا تکلف کھڑے ہو کر نماز ادا کر لیتے ہیں خوب کہا ہے ؂

ہر چند پیر وخستہ دلبس ناتواں شدم ہر گہ نظر بروئے تو کردم جواں شدم

(ہر چند بوڑھا اور بہت ناتواں ہو گیا ہوں جس وقت تیرے چہرہ پر نظر ڈالتا ہوں جوان ہو جاتا ہوں)

ان کی خدمت میں جب جی چاہے جا کر دیکھ لیجئے، غرض طاعت سے قوت ہوتی ہے اور اصلاح نہ کرنے کا صرف یہی سبب تھا کہ ہمت نہیں ہوتی تھی مگر جب قوت ہوگی تو تمام موانع مضمحل ہو جاویں گے اور اگر کوئی اس ڈر سے کہ کبھی اصلاح ہو جاوے یہ تدبیر بھی نہ کرے تو دوسری بات ہے جیسے کسی نے یہ سنکر کہ چاند دیکھنے سے روزہ فرض ہو جاتا ہے کہا تھا کہ ہم چاند ہی نہ دیکھیں گے۔ غرض اس طرح قوت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور ضعف جاتا رہتا ہے۔ یہ ہے وہ راز اور اگر بالفرض اصلاح بھی نہ ہوئی تو ایک اور بات تو ضرور پیدا ہو جاوے گی کہ اس معصیت کی مذمت آپ کے قلب میں جمتی چلی جاوے گی اور اس سے نفرت پیدا ہو جاوے گی اور یہ خدمت ونفرت آپ کی اصلاح کر دے گی۔ اور آخری بات یہ ہے کہ اگر اس طرح بھی اصلاح نہ ہوئی تو جرائم تو گھٹ گئے۔ اگر ایک شخص پر چار جرم قائم ہوئے اور وکیل نے کہا کہ تین تو ٹل سکتے ہیں مگر ایک نہیں ٹل سکتا۔ تو کیا کوئی یہ کہے گا کہ

چو آب از سر گذشت چہ یک نیزہ چہ یک دست (جب پانی سر سے گذرے کیا ایک نیزہ کیا ایک ہاتھ)

ہر گز نہیں بلکہ تخفیف ہی کو غنیمت سمجھیں گے۔ تو اسی طرح آپ بھی پچاس جرائم میں سے صرف دس ہی کے مجرم رہ گئے۔ اب وہ حصہ رہ گیا جس میں تغیر کرنے سے معاش کا حرج ہے تو اول تو چونکہ آپ کو شریعت کے احکام نہیں معلوم ہیں اس وجہ سے بہت سے افعال ناجائز صادر ہو جاتے ہیں اگر آپ احکام کی تحقیق کیجئے گا تو آپ کو معلوم ہوگا کہ تھوڑے سے تغیر سے

وہ ناجائز جائز ہو جاوے گا۔ مسئلہ اگر آپ نے چاندی خریدی تو اس میں مسئلہ یہ ہے کہ چاندی کا مقابلہ اگر چاندی سے ہو تو زیادتی کمی حرام ہے۔ اب اگر کہئے کہ صاحب اچھا مسئلہ سنا کہ نرخ کے حساب سے تو سو روپیہ کی چاندی ایک سو بیس بھر آتی مگر اب سو روپیہ کی سو ہی روپیہ بھر لی اچھا عمل کیا کہ بیس روپیہ کا خسارہ ہوا۔ اب ساری عمر کے لئے مولویوں کو خیرباد کہدیں گے تو سنئے بات یہ ہے کہ اگر مولوی صاحب سے یوں پوچھتے کہ مولوی صاحب جب چاندی میں زیادتی حرام ہے تو اب اگر اس پر اس خاص صورت میں عمل کریں تو بڑا نقصان ہوگا کیا کوئی جائز شکل بھی معاملہ کی ہے تو مولوی صاحب یوں کہتے کہ ان روپیوں میں ایک گنی بھی ملا لو تو ایک سو بیس بھر چاندی جو آوے گی تو بچاسی روپیہ بھر تو بچاسی روپیہ کی آوے گی اور باقی کو اس گنی میں شریعت محسوب کر دے گی۔ تم کو نیت کرنے کی بھی ضرورت نہیں۔ شریعت خود فیصلہ کر چکی ہے۔ تو اب بتلایئے کیا نقصان ہوا اب مشکل تو یہ ہے کہ علماء سے پوچھتے بھی نہیں صاحبو پوچھتے تو رہو اور میں یہ تو نہیں کہتا کہ سب کو مولوی صاحب جائز ہی کہدیں گے۔ کیونکہ شریعت ان کے گھر کی تو ہے نہیں کہ وہ اپنے اختیار سے جسے چاہے جائز کر دیں جیسا کہ ایک مطوف سے.... ایک بڑھیا نے صفا مروہ کی سعی میں تھک کر کہا تھا کہ مولوی صاحب اب تو معاف کر دو۔ اسی طرح بعضے لوگ یوں چاہتے ہیں کہ علماء ہند مثل بعض علماء مصر کے کرنے لگیں ان بعض علماء نے ایسا کر رکھا ہے کہ جو دنیا میں ہو رہا ہے سب جائز، تو یہاں کے لوگ بھی یہی کرانا چاہتے ہیں علماء سے جیسے ایک رئیس نے ایک نوکر سے یہ کام لیا تھا کہ جو ہماری زبان سے نکلے تم اس کی تصدیق کر کے توجیہ کر دیا کرو چنانچہ ایک بار اس رئیس کے منہ سے نکلا کہ ہم شکار کو گئے ایک ہرن پر گولی چلائی وہ اس کے سُم کو توڑ کر ماتھے کو پھوڑ کر نکل گئی سب اہلِ مجلس ہنسنے لگے کہ سُم اور ماتھے کا کیا جوڑ۔ نوکر بولا سچ ہے حضور وہ اس وقت سُم سے پیشانی کھجلا رہا تھا۔ تو حضور علماء سے تو ایسی نوکری ہوتی نہیں نہ ہم اتنے ذہین ہیں اور نہ خدا کرے کہ ہوں۔ تو حاصل یہ کہ یہ تو نہیں ہو سکتا کہ سب کو جائز کہدیں۔ مگر پوچھ کر دیکھو تو بہت سے اشکالات کا جواب مل جاوے گا۔ تو بہت بڑا حصہ اس عارضی دشواری کا اس طرح ختم ہو جائے گا۔ ہاں بعض امور پھر بھی ایسے رہ جائیں گے کہ وہ بالکل

ناجائز ہوں گے مگر اس میں بھی دو درجے ہیں ایک تو وہ کہ اُس کو چھوڑ کر دوسرے کام میں لگ سکتے ہیں پس اس کو تو چھوڑ دیا جاوے کیونکہ اس کا چھوڑنا مضر حوائج ضروریہ نہیں اور ایک درجہ وہ ہے کہ اس کو چھوڑ نہیں سکتے کیونکہ دوسرے کام اس کے حوائج ضروریہ کو کافی نہیں تو بادلِ ناخواستہ اس کو کرتے رہو اور گو یہ جائز تو نہ ہوں گے مگر اس کے متعلق ایک دستورالعمل ایسا بتلاتا ہوں کہ اس سے ایسے جرائم خفیف ہوجاویں گے وہ یہ کہ اس میں دو برتاؤ کرنا چاہیئے ایک تو یہ کہ ہر روز توبہ کیا کرے۔ اب تو غضب یہ ہے کہ لوگ توبہ کی حقیقت نہیں سمجھتے۔ توبہ کی حقیقت یہ ہے کہ جو کچھ کیا اس پر پچھتائے اور دعا کیجیے کہ اے اللہ مجھے معاف فرمائیے مواخذہ نہ کیجیے تو یہ کیوں نہیں کرتے کیا ایسا کرنے سے نوکری سے موقوف ہوجاؤ گے ہرگز نہیں بلکہ تم نوکر ہی رہو گے دوسرے یہ دعا کیا کرو کہ اے اللہ کوئی دوسری سبیل میرے لئے نکال دیجیے تو اس میں یا تو کوئی سبیل نکلے گی اور جو کوئی دوسری سبیل نہ نکلی تو یہ شخص شرمندہ گنہگاروں کی فہرست میں تو لکھا جاوے گا۔ جری گنہگاروں کی فہرست میں نہیں لکھا جاوے گا اور یہ توسع آپ میری ہی زبان سے سنیں گے اور اس توسع میں راز شرعی یہ ہے کہ اگر چھوڑنے پر مجبور کیا جاوے تو شاید اس کو چھوڑ کر اس سے بھی زیادہ کسی گناہ شدید میں مبتلا ہوجائے۔ مثلاً یہی کہ چلو آریہ بنیں تو یہ توسع ایں بلا دفع بلاہائے بزرگ (یہ بلا بری بلاؤں کو دفع کرنے والی ہے) کا مصداق ہے تو میں کفر سے بچا رہا ہوں کیونکہ جب آدمی نادار ہوتا ہے تو خدا جانے کیا کیا اس کو سوجھتا ہے۔ ہمارے حضرت حاجی صاحب تھانہ بھون میں رہتے تھے۔ ایک پٹھان حضرت کی خدمت میں دعا کرانے آیا کرتے تھے کہ مجھ پر ایک شخص نے جائداد کے معاملہ میں بڑا ظلم کر رکھا ہے حضرت دعا فرما دیتے۔ ایک بار آکر کہنے لگے کہ اب تو اس نے حد ہی کر دی اور جائداد غصب ہی کر لی ہے۔ حضرت نے فرمایا بھائی صبر کرو اُس نے کہا بہت اچھا دفعۃً حافظ محمد ضامن صاحبؒ حجرہ میں سے نکل آئے اور اس پٹھان سے فرمایا ہرگز صبر مت کرنا جاؤ نالش کرو اور ہم دعا کریں گے اور حضرت سے

؎ واعظوا المفسد تلین ما بینہ تویباً فی قولہ والحکمۃ فی اذ نہ ثواب طالہ ان یکون ابلغ فی قطع مادتہم فی ذلک وزجرہم عن مثلہ اھ۔

فرمایا آپ تو صابر شاکر تھے سب چھوڑ کر بیٹھ رہے اس میں تو اتنی قوت نہیں یہ اگر اسباب معاش کو چھوڑ دے گا تو جب حاجت ستا دے گی یہ جھوٹی گواہی دے گا، چوری کرے گا تو ایسوں کو صبر نہیں کرایا کرتے تو یہ ہے اصل راز توسع کا تو آپ کسی سے اتنی گنجائش نہ سنیں گے مگر یہ اس لئے ظاہر کر دیا گیا کہ یہ کفر سے بچانا ہے لیکن خدا کے لئے اس کو آپ تمام معاصی میں آڑ نہ بنالیں کہ یہ چیز تو بہت اچھا ہاتھ آیا۔ بات یہ ہے کہ اول تو یہ بہت تھوڑا حصہ ہے سب معاصی میں اس کا توڑ یہ نہیں ہوسکتا۔ دوسرے اس میں یہ قید بھی تو لگی ہوئی ہے کہ اس سے نکلنے کی ہر وقت فکر کرتے رہو جیسے کوئی پاخانہ میں بیٹھا ہوا اور تقاضا نکلنے کا رہتا ہے۔ اس پر مجھے ایک حکایت یاد آئی کہ ایک رئیس صاحب ریل میں بیٹھے ہوئے تھے اور کہیں جگہ نہ تھی مگر انہوں نے کئی آدمیوں کی جگہ گھیر رکھی تھی اور کوئی کچھ کہتا تو دھمکاتے آخر ضرورت سے پاخانہ میں گئے تو چٹخنی لگ گئی اور ان کے کھولے نہ کھلی پر پریشان لوگوں سے التجا کی سب نے انکار کر دیا۔ آخر بڑی سماجت کے بعد لوگوں نے دوسروں کو تنگ نہ کرنے کی قسم کھلائی یہ بھی نہ دیکھا کہ یہ پاخانہ ہے اس میں قسم کھلانا جائز نہیں تو جس طرح وہ پاخانہ سے نکلنے کی کوشش کر رہا تھا اسی طرح حرام نوکری میں ایسے ہی رہو کیا کوئی پاخانہ میں جاکر فخر کرتا ہے بلکہ قید سمجھتے ہیں مگر مجبوری میں کیا کریں بس اس کی یہ حالت ہوگی کہ ؎

چونکہ برمیخت بہ بندد بستہ باش ــــ چوں کشاید چابک و برجستہ باش

(جب وہ باندھ دیں بندھ جاؤ ــــ جب کھول دیں چابک اور برجستہ ہو جاؤ)

تو نکلنے کی فکر تو کرو کوشش تو کرو گو کچھ امید نہ بھی ہو، اسی کو فرماتے ہیں ؎

گرچہ رخنہ نیست عالم را پدید ــــ خیرہ یوسف وار می باید دوید

(اگرچہ عالم رخنہ نظر نہیں آتا لیکن یوسف علیہ السلام کی طرح دوڑنے کی کوشش ضرور کرنی چاہئے)

یوسف علیہ السلام کا قصہ یہ ہوا کہ جب زلیخا نے دروازہ بند اور مقفل کر لیا اور آپ نکلنے کے لئے دوڑے ہیں عجیب توکل اور ہمت تھی کہ باوجود قفل لگے رہنے کے دوڑے اور آخر قفل ٹوٹ ٹوٹ کر سب دروازے کھل گئے اس کو فرماتے ہیں کہ ؎

گرچہ رخنہ نیست عالم را پدید ــــ خیرہ یوسف وار می باید دوید

(اگرچہ عالم میں کوئی رخنہ نظر نہیں آتا لیکن یوسف علیہ السلام کی طرح دوڑنے کی کوشش ضرور کرنی چاہئے)

اور اگر یہ بھی کہیے گا تو حق تعالیٰ یہ تو دیکھیں گے کہ یہ تو دوڑا ٹکر بھی لگ گئی اتنے پر بھی فضل ہوجاوےگا اب بتلاہے اس میں کونسی مشکل چیز ہے میں تو نوکری نہیں چھڑاتا مگر نفور رہیں سو یہ کیا مشکل ہے اب تو یہ بھی نہیں بلکہ معصیت پر نازے بے باکی ہے سو یہ فخر کیسا اور تکبر کیسا اور اہل دین کو ذلیل کیوں کہا جاتا ہے سواہل اسباب کا علمار کی ساتھ بڑا اختلاف معاش کے باب میں تھا مگر اس سے زیادہ معاش کے متعلق کیا گنجائش ہوسکتی ہے تو اب کونسا مرتبہ اختلاف کا رہگیا. نرا قانون تو دشوار ہے نہیں اور نہ قانون سخت نہیں صرف بات یہ تھی کہ لوگوں کی طرف سے دشواری ہوجاتی ہے تو اس میں بہت بڑی فہرست اصلاح کی تو معاش میں مخل ہی نہیں اور جو مخل ہے اس کا بڑا حصہ تدبیر سے جائز ہوسکتا ہے اور جو تدبیر سے بھی جائز نہ ہوسکے وہ اولاً بہت مختصر ثانیاً اس میں اس طرح رہنے کی اجازت کہ اس سے نکلنے کی کوشش اور کئے پر پچھتانا اور توبہ کرتے رہنا تو اب وہ کونسا جز ہے جس پر یہ اشکال ہے کہ شریعت کی پابندی بہت سخت ہے تو بحمداللہ بے غبار یہ ثابت ہوگیا کہ مَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ الآیہ (اس نے تم پر دین میں کسی قسم کی تنگی نہیں کی) اس کے بعد ایک عملی مرحلہ دشواری کا اور رہ گیا مگر وہ بہت ہی معمولی ہے وہ یہ کہ تدبیرات مذکورہ کے لئے جو ہمت کی ضرورت ہے اور لوگ ہمت سے کام نہیں لیتے حتیٰ کہ کم ہمتی کے سبب توبہ تک کا ارادہ نہیں کرتے یا کرکے توڑ دیتے ہیں۔

ع۔ بہ شب توبہ کردو سحر گہ شکست۔ (رات کو توبہ کرلی صبح کو توڑ دی)

ایسے بہت سے لوگ ہیں تو اس کا صرف ایک علاج ہے وہ یہ کہ اہل اللہ کی صحبت اختیار کرے اور کچھ علاج نہیں اب چاہے آپ مجاہدہ کریں یا وظیفہ پڑھیں اس سے فائدہ مطلوبہ حاصل نہیں مگر مشائخ کے یہاں آجکل وظیفہ بہت سستا ہے. نماز کی پابندی کے لئے ایک وظیفہ پھر اس وظیفہ کے دوام کے لئے ایک اور وظیفہ مگر بالکل بے جوڑ علاج بھلا وظیفوں کو ترک گناہ میں کیا دخل ہر چیز کا علاج الگ ہے وظیفہ صرف ذریعہ ہے غلبۂ ذکر علی القلب کے لئے. بشرطیکہ دنیا کے لئے نہ ہو باقی اگر ایک شخص کو عادت ہے لڑکوں کو دیکھنے کی تو یہ روزہ یا وظیفہ سے نہیں جاتی اگرچہ روزہ میں کمی شہوت کی ہوتی ہے مگر مجھ سے ایک ستر برس کے بوڑھے نے جو ایک اسلامی ریاست میں کلکٹر تھے شکایت امرد پرستی کی کی اور روتے تھے بھلا ستر برس کے بوڑھے میں کیا شہوت ہوتی تو وظیفہ سے

اس میں کیا ہوتا پس اس کا علاج یہی ہے کہ کسی اہل اللہ کے پاس چلا جاوے کہ ؎

گر تو سنگ خارۂ و مرمر شوی چوں بصاحب دل رسی گوہر شوی

(اگر تو سخت پتھر اور سنگ مرمر ہو جب صاحب دل کے پاس پہونچے گوہر ہو جائیگا)

نفس نتواں کشت الا ظل پیری دامن آں نفس کش را سخت گیر

(نفس بلا پیر کی صحبت کے نہیں مرتا اس نفس مارنے والے دامن کو مضبوط پکڑو)

غرض اس کا علاج اس کے سوا کچھ بھی نہیں کہ کسی اہل اللہ کے پاس رہے مگر اس کے پاس رہنے کے کچھ آداب بھی ہیں وہ یہ کہ اس طرح سے رہے کہ ؎

قال را بگذار و مرد حال شو پیش مرد کاملے پامال شو

(قال کو چھوڑ دو حال پیدا کرو یہ اس وقت پیدا ہوگا جب کسی اہل اللہ کے قدموں میں گر پڑجاؤ)

نیز اس کے ساتھ رہنے میں یہ ضرور ہے کہ جو کہے وہ کرو۔ اور اطمینان رکھو کہ وہ کہیگا ایسا کہ جو آسان ہو مگر نیت یہی رکھو کہ اگر سخت بھی کہیگا تو ہر گز خلاف نہ کریں گے۔ نیز اس کے زجر سے برا نہ مانو کیونکہ بعض امراض کا علاج یہی ہے۔ ایک صاحب نے میرے پاس ایک دفتر سوالات کا بھیجا میں نے لکھا کہ یہاں آؤ اور سمجھ لو۔ انہوں نے لکھا کہ آؤں گا مگر دو شرط سے ایک یہ کہ گفتگو کے وقت چلاّ نا نہیں۔ دوسرے یہ کہ تمہارے گھر کا کھانا نہ کھاؤں گا۔ میں نے لکھ دیا کہ آؤ دونوں شرطیں منظور ہیں۔ آئے ملے میں نے کہا صاحب ایک شرط سے رجوع کرتا ہوں۔ یعنی یہ کہ چلانا نہیں میں ضرور چلاؤں گا کیونکہ بعض مرض کا علاج چلانا ہی ہے اور اس میں بڑی برکت ہے اور اگر کہئے کہ دھوکہ دیکر بلایا تو اگر منظور نہیں آمد و رفت کا کرایہ لیجئے اور جائیے آخر سیدھے ہو گئے میں نے کہا کھانے کی نسبت کیا رائے ہے کہنے لگے وہی پہلی شرط ہے میں نے کہا بہتر پھر میں اٹھکر گھر چلا تو پیچھے سے انہوں نے ایک لڑکا بھیجا کہ میں نے اس شرط کو بھی چھوڑ دیا کھانا بھی کھاؤں گا پھر ان سے گفتگو کی اور تسلی ہو گئی اور میں نے ان کو نصیحت بھی کی کہ مختلف کتابیں نہ دیکھو۔ زیادہ خرابی اسی سے ہوئی ہے۔ غرض یہ ضرور ہے کہ اگر وہ ڈانٹیں تو برا نہ مانو ؎

ور بہر زخمے تو پر کینہ شوی پس کجا صیقل چو آئینہ شوی

(اگر ہر زخم یعنی مصلح کی ہر تنبیہ پر پرکینہ یعنی ناک بھوں چڑھاؤ تو کس طرح قلب مثل آئینہ کے صاف ہو سکتا ہے)

مولانا نے ایک حکایت بڑی عجیب لکھی ہے کہ ایک قزوینی کسی کے پاس گیا کہ میری کمر پر شیر کی تصویر

گودنے وہ گودنے بیٹھا۔ ایک جگہ سوئی جبھوئی چلایا کہ یہ کیا کرتا ہے اس نے کہا تیری فرمائش پوری کرتا ہوں۔ کہنے لگا کہاں سے شروع کیا ہے بولا دُم سے کہنے لگا شیر بے دم سہی اس نے دوسری جگہ سوئی رکھی پھر چلایا کہ اب کیا بناتا ہے اس نے کہا شکم بولا شکم کیا ہوگا اس نے تیسری جگہ سوئی لگائی پھر چلایا کہ یہ کیا ہے بولا کہ کان کہنے لگا کہ کان بھی نہ سہی وہ گودنے والا بڑا پریشان ہوا سوئی پھینک دی اور کہا ؎

شیر بے گوش وسر واشکم کہ دید ایں چنیں شیرے خدا ہم نا مرید

(شیر بغیر کان وسر اور پیٹ کا کس نے دیکھا ہے ایسا شیر تو خدا نے بھی نہیں بنایا)

یعنی خدا نے بھی تو ایسا شیر پیدا نہیں کیا اس پر مولانا فرماتے ہیں ؎

چوں نداری طاقت سوزن زدن پس توازشیر ژیاں دم کم بزن

(جب سوئی چبھنے کی تم میں طاقت نہیں ہے تو شیر ہونے کا دعویٰ نہ کرو)

اور اسی مقام پر فرماتے ہیں ؎

در بہر زخمے تو پر کینہ شوی پس کجا صیقل چو آئینہ شوی

(اگر ہر زخم پر تم پر کینہ ہو یعنی مرشد کی تنبیہ پر ناک بھوں چڑھاؤ تو کس طرح قلب مثل آئینہ کے صاف ہوسکتا ہے)

آخر نوکری کی خوشامد میں حکام کی ڈانٹ سہتے ہو اگر اصلاح باطن کے لئے شیخ کا زجر سہ لیا تو کیا بڑی بات ہے تو ان کے پاس رہنے سے اعمال صالحہ کا عزم قوی ہوجاتا ہے اور بری چیزوں سے نفرت ہوجاتی ہے اور پھر بڑے بڑے کام آسان ہوجاتے ہیں اور یہی مراد ہے ہمت سے اور راز اس کا یہ ہے کہ ان کے پاس رہنے سے یہ شخص صاحب محبت ہوجاتا ہے اور محبت کی خاصیت ہے کہ

ع: از محبت تلخہا شیریں شود (محبت میں سختیاں بھی گوارا ہوتی ہیں)

محبت وہ چیز ہے کہ میں نے ایک نوجوان کو اسی سفر میں دیکھا کہ وہ کسی رنڈی پر عاشق ہوگیا۔ کہتا تھا کہ راتوں کا جاگنا اور نماز کو جانا سہل ہوگیا اور پہلے فرض نماز کے لئے اُٹھنا بھی دشوار تھا۔ مگر میں نے کہہ دیا کہ یہ نفع عارضی ہے اور چونکہ نفع سے زیادہ اس میں مفاسد ہیں تو یہ ایسا ہے کہ قُلْ فِيهِمَا اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ (ان دونوں (کے استعمال) میں بڑے گناہ ہیں اگرچہ لوگوں کے لئے منافع بھی ہیں) اس پر ایک اور واقعہ یاد آیا کہ میں ایک بار کاندھلہ گیا نماز عشاء کے بعد سونے کے متعلق یہ تجربہ

ٹھیری کہ مسجد کی سمت شمال کی طرف ایک سہ دری تھی وہاں سوئیں گے۔ اتنے میں محلہ میں سے ایک قاصہ کی آواز گانے کی آئی میں نے کہا اب یہاں نہیں رہوں گا کسی مردانے مکان میں سونے کا انتظام کیا جائے میری ساتھ ایک صوفی آزاد تھے وہ وہاں ہی رہے اور صبح کو کہنے لگے کہ اس کی آواز سے آج نماز میں خوب یکسوئی ہوئی خطرات بالکل نہیں آئے میں نے کہا کہ خیال کا نہ آنا کافی نہیں بلکہ دوسری طرف کا خیال آنا چاہیئے یعنی خدا کی طرف کا سو اس کی آواز اس سے بھی مانع تھی تو یہ مفسدہ اس منفعت سے بدرجہا زیادہ ہے مجھے اس پر ایک حکایت یاد آئی ایک ترک کی کہ اس کی مجلس میں مطرب نے اس قسم کی غزل گائی ؎

گلے یا سوسنے یا سرو یا ماہی نمیدانم　　　　ازیں آشفتہ بیدل چہ میخواہی نمیدانم

(پھول ہے تو یا سوسن ہے یا سرو یا چاند ہے اس عاشق شفتہ سے تو کیا چاہتا ہے میں نہیں جانتا ہوں)

اور اسی طرح نمیدانم نمیدانم کا سلسلہ دیر تک چلتا رہا۔ اس ترک کو غصہ آیا اس نے ایک گھونسہ دیا اور کہا کہ کمبخت کب تک نمیدانم نمیدانم بکے گا جو جانتا ہے وہ کہہ۔ تو مولانا اس مقام پر فرماتے ہیں کہ مقصود اثبات ہے نفی نہیں تو اس نفی خطرات سے چونکہ مفسدہ پیدا ہوا کہ اثبات اس مردار کا ہوا نہ کہ خدا کا اس لئے یہ نفی مقصود نہیں خدا کا اثبات مطلوب ہے جو کہ یہاں مقصود ہے تو جو حکایت اوپر بیان کی گئی کہ وہ عاشق ہوگئے اور نماز میں جانے لگے تو یہ کچھ بھی نہیں معصیت اگر ذریعہ بن جاوے عبادت کا تب بھی وہ معصیت ہی رہے گی چنانچہ اگر کوئی مسجد کے قرب میں ناچ کرانے لگے کہ اس بہانہ سے لوگ جمع ہوجاویں گے پھر ان کو مسجد میں لے چلیں گے۔ یہ تو جملہ معترضہ تھا مقصود یہ ہے کہ جس کو صبح کو بھی اُٹھنا مشکل تھا اب وہ عشق کی بدولت رات کو جاگتا ہے تو ؎

عشق مولٰے کے کم از لیلٰے بود　　　　گوئے گشتن بہر او اولٰے بود

(خدا کا عشق کیا لیلٰی سے بھی کم ہو اس کے لئے تو کوچہ گردی کرنا زیادہ بہتر ہے)

اور سنو ؎

ترا عشق ہم چون خودی ز آب و گل　　　　رباید ہمہ صبر و آرام دل

اور یہ حالت ہوتی ہے ؎

چو در چشم شاہد نیاید زرت　　　　زر و خاک یکساں نماید برت

(ترجمہ: جب محبوب کی نظر میں تیرا تر رومال نہیں آتا تو تیرے نزدیک مال وزر اور خاک یکساں ہیں)
تو اس حالت پر نظر کرتے ہوئے ؎

عجب داری از سالکان طریق — کہ باشند در بحر معنی غریق

(تو سالکین طریق سے تعجب کرتا ہے جو کہ معنی اور حقیقت کے دریا میں غرق ہیں)

غرض محبت کا یہ خاصہ ہے اور اہل اللہ کے پاس بیٹھ کر خدا کی محبت پیدا ہو جاتی ہے اس لئے ہمت پیدا ہو جاتی ہے پس یہ تدبیر ہے ہمت کی اور ظاہر ہے کہ اس میں کچھ دشواری نہیں تو اب سارے مرحلے طے ہو گئے اور یہ صحبت اگر کسی سے متصل نہ ہو سکے تو مختلف زمانوں میں سہی یعنی جب کسی کو جتنا موقع اس کا ملے دریغ نہ کرے حق تعالیٰ مدد فرماویں گے۔ اور مصاحبت کی دو صورتیں ہیں ایک تو زندوں کے پاس بیٹھنا اور ایک قبروں پر یہ بھی بزرگوں کا طرز ہے اور ہر چند کہ اس کے بیان کی ضرورت نہ تھی مگر اب لوگوں نے اس میں غلطی کی ہے کہ انہوں نے قبروں ہی کو سب کچھ سمجھ لیا۔ دولت باطنی کا بھی اور ظاہری کا بھی مدار قبروں ہی پر سمجھ لیا ہے اور سب زندوں کو چھوڑ دیا اس لئے اس تقسیم کی تصریح کی تاکہ زندوں سے استغناء نہ ہو جاوے بلکہ اصل تو یہی ہے بلکہ اہل قبور سے مستفید ہونے کی شرط خود زندوں سے مستفید ہونا ہے اور ان کے مقابل بعضے وہ لوگ ہیں جو اولیاء ہی کے منکر ہیں اور بعضے فیوض قبور ہی کے منکر ہیں۔ میں نے ایک رسالہ دیکھا ہے ایک اہل ظاہر کا کہ اس لے استفادہ عن اہل القبور (اہل قبور سے استفادہ کی) کی نہی پر اس سے استدلال کیا ہے لَا تَجْلِسُوْا عَلَى الْقُبُوْرِ (قبروں پر مت بیٹھو) تو جلوس سے مراد جلوس الاستفادہ لیا ہے حالانکہ اس کی کوئی دلیل نہیں[1] میں نے ایک رسالہ لکھا ہے اس میں میں نے حدیث سے ثابت کر دیا ہے کہ اہل قبور سے فیض ہوتا ہے اور ہمارے بعض بیانوں سے شبہ ہو جاتا ہے کہ یہ بزرگوں کے قائل نہیں کیا کہا جاوے یہ محض تہمت ہے آپ چاہتے ہیں کہ خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ کر بزرگوں کے بندے ہو جاویں سو یہ تو ہوگا نہیں۔ صاحبو میں تو آپ کو خود بزرگ بنانا چاہتا ہوں تو دیکھو بزرگ کا ہے سے ہوئے ہیں صراحت سے میں اس کی تعلیم کر رہا ہوں۔ ایک بزرگ نے کہا ہے کہ ملفوظات کے یاد کرنے سے چنداں نفع نہیں تم خود ایسے ہی کیوں نہ ہو جاؤ کہ تم سے ویسے ہی ملفوظات صادر ہونے لگیں۔ تو اس رسالہ سے ہم لوگوں پر سے

[1] بلکہ اس کے معنی تغوط قبر پر ہے یا اس پر بیٹھنا جس سے اس کی اہانت ہے ۱۲

یہ شبہ بھی بزرگوں کے انکار کا رفع و زائل ہو جاوے گا اور بحمداللہ وہ کتاب ایسی مقبول ہوئی کہ ایک غیر مقلد نے مطبع میں وہ کتاب دیکھ کر ناظم مطبع سے کہا کہ مصنف کو لکھ دو کہ اس میں اختصار نہ کرے۔ اور ایک شخص میرے پاس آئے جو کہ بیعت کے منکر تھے وہ اس کو دیکھ کر خود بیعت ہو گئے اس میں ساڑھے تین سو حدیثیں ہیں اور ہر حدیث سے کم سے کم ایک مسئلہ تو ضرور ہی ثابت ہے اور بعض سے کئی کئی اس کتاب کا نام ہے تکشف اس کا منگانا ضروری ہے اور ایک رسالہ میرالقاسم میں نکلتا ہے اصلاح انقلاب اس سے ظاہری اعمال کی اصلاح ہو گی وہ بھی ضروری ہے۔

غرض اس کتاب تکشف میں یہ ثابت کیا ہے کہ قبروں سے فیض ہوتا ہے مگر اس کے ساتھ ہی یہ ضروری ہے کہ اگر کوئی پوچھے کہ حلوا کھانا جائز ہے یا نہیں تو ایک تو قانونی جواب ہے کہ جائز ہے اور ایک شفیق کا جواب ہے کہ مریض کو جائز نہ کہے اسی کو شیخ کہتے ہیں ؎

سماع اے برادر بگویم کہ چیست | مگر مستمع را بدانم کہ کیست

(برادر سمع سنتا ہیں بتلاؤں کیسا ہے مگر سمع سننے والے کو جان لوں کہ کون ہے)

اگر مرد لہوست و بازی و لاغ | قوی ترشود دیوش اندر دماغ

(اگر مرد راہی اور لہو و لعب و بازی میں مبتلا ہے تو اس کی شیطانیت دماغ اور قوی ہو جاتی ہے)

اگر از برج معنی بود طیر او | فرشتہ فرو ماند از سیر او

(اگر برج حقیقت سے ہے اس کی پرواز تو فرشتہ بھی اس کی سیر سے عاجز ہے)

چنانچہ ضلع بارہ بنکی کی حکایت ہے کہ ایک شخص کہتے تھے کہ ایک شخص نے عورت سے سماع سنا اور مجلس ہی میں سے اس کو ایک کوٹھری میں لیجا کر منہ کالا کیا۔ اور باہر آکر اپنی اس حرکت کی توجیہ کی کہ جب آگیا جوس نہ رہا ہوس۔ یہ دونوں لفظ چھوٹے سین سے فرمائے اور شیخ اس تفصیل کے بعد صاحب حال پر اعتراض کرنے والوں کو دفع کرتے ہیں ؎

مکن عیب درویش حیران و مست | کہ غرق ست از آن میزند پا و دست

(بزرگوں کی ظاہری برائی دیکھ کر حیران نہ ہو خدا کی محبت میں غرق ہونکی وجہ ہاتھ پیر مارتے ہیں)

یعنی اس پر اعتراض نہ کرو ایسی ہی تفصیل حضرت جامی فرماتے ہیں ؎

زندہ دلاں مردہ تناں را رواست | مردہ دلاں زندہ تناں را خطاست

ترجمہ (زندہ دل مرد تنوں کے لئے روا ہے۔ مردہ دل زندہ تنوں کے لئے گناہ ہے)

توغرض محققین کی عادت ہے کہ وہ ایک ہی فتوٰی سب کو نہیں دیتے۔ اس لئے طبیب سے جب حلوا کھانے کی نسبت پوچھا جاوے تو اس کو پوچھنا چاہیئے کہ حلوا کون کھائیگا اگر معلوم ہو کہ مریض کھاویگا ناجائز کہدے اگر معلوم ہو کہ تندرست کھاویگا جائز کہدے۔ یہ ممانعت مریض کی سنکر اگر کوئی کہے کہ یہ تو حلوہ کے منکر ہیں تو کیسی بیوقوفی ہے۔ حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ سے ایک نوعمر مولوی نے پوچھا کہ قبر والے سے فیض حاصل ہوتا ہے یا نہیں۔ مولانا نے فرمایا کہ کون فیض لینا چاہتا ہے انہوں نے کہا کہ میں مولانا نے فرمایا کہ نہیں ہوتا تو یہ ہے محققین کی شان۔ غرض فیض تو بشرائط خاصہ سے ہوتا ہے لیکن ان کو کارفرما سمجھنا یہ تو صریح شرک ہے۔ رام پور کی ایک حکایت سنی ہے مولوی عبدالحق صاحب خیرآبادی کی کہ ایک پٹھان ملنے آئے۔ مولوی صاحب نے کہا کہ خانصاحب کیسے فرصت ہوگئی آجکل تو آپ کو دیہات میں بہت انتظام کرنا ہوگا۔ تو خانصاحب بولے کہ انتظام تو بڑے پیر صاحب کے سپرد کر آیا ہوں مولوی صاحب نے فرمایا آہا ہم تو ان کو ولی سمجھتے تھے مگر معلوم ہوا کہ بدھا ہیں۔ خانصاحب کو بہت ناگوار ہوا کہ انہوں نے بے ادبی کی مگر واقع میں بے ادبی تو خود انہوں نے کی تو بعضے آدمی سب کام اولیاء اللہ کے سپرد کرتے ہیں۔ میں نے مکہ مکرمہ میں دیکھا کہ ایک شاہ صاحب نے آکر حضرت کے بھتیجے حافظ احمد حسین صاحب کو کچھ روپیہ امانت کا سپرد کیا حافظ صاحب نے کہا اللہ کی سپردگی میں رکھ جاؤ تو آپ کیا کہتے ہیں کہ اللہ کے سپرد تو کرنا چاہیئے نہیں اور اس پر ایک محل حکایت ہانکدی کہ کسی شخص کی ایک دوکان تھی وہ جب جاتا دوکان حضرت غوث اعظمؒ کے سپرد کرکے جاتا اس کا ایک بھائی تھا وہ ہمیشہ دل میں اس پر نکیر کرتا ایک بار یہ بھائی دوکان پر تھا یہ جب جانے لگا تو خدا تعالیٰ کے سپرد کر گیا۔ اسی دن چوری ہوگئی۔ دوسرے بھائی کو خبر ہوئی کہنے لگا تو نے نادانی کی کہ اللہ میاں کے سپرد کی اللہ میاں کا تو کام یہی ہے کہ اس سے لیا اس کو دیدیا اور حضرت غوث اعظم تو محکوم ہیں یہ خلاف امانت کر نہیں سکتے۔ یہ حکایت ان شاہ صاحب نے حافظ احمد حسین صاحب کے سامنے بیان کی وہ بہت جھلائے کہ کوئی بڑا مردود ہوگا

اب مشکل ہم لوگوں کی ہے کہ ہم نہ وہابی نہ بدعتی ہمارا مشرب یہ ہے کہ اعمال ظاہرہ میں فقہاء کی تقلید کرتے ہیں اور اعمال باطنہ میں صوفیہ کی اور اعمال ظاہرہ میں صوفیہ کی تقلید نہیں کرتے مثلاً سماع وغیرہ کہ ان کو باطن میں کچھ دخل نہیں خواہ یہ جائز ہو یا جائز و ناجائز دونوں سے مرکب تو اس میں تو ہم فقہاء کے مقلد ہیں اور جو اعمال باطنہ ہیں اس میں ہم صوفیہ کے

مقلد ہیں۔ مثلاً ذکر جہر کو فقہا مکروہ کہتے ہیں اور صوفیہ جائز اور اس کو باطن میں دخل ہے تو اس میں ہم صوفیہ کے مقلد ہیں تو ہمارے بزرگوں کا مشرب حنفی صوفی ہے تو ایسے شخص کی کمبختی دونوں طرف سے آتی ہے۔ اب عرس میں شریک نہ ہوئے تو وہابی اور ذکر جہر کیا تو بدعتی ہونیکا اعتراض۔ اسی طرح فیض قبور میں نہ تو ہم ایسے قائل کہ سب کام وہی کہتے ہیں اور نہ اس کے قائل کہ اس سے کچھ ہوتا ہی نہیں۔ ضرور ہوتا ہے مگر فیض دو ہیں ایک تعلیم کا اور ایک تقویت نسبت کا تو تعلیم کا فیض تو قبور سے تو نہیں ہوتا یہ تو زندہ بزرگوں سے ہوتا ہے اس لئے کہا ہے کہ گربہ زندہ بہ از شیر مردہ (زندہ بلی مردہ شیر سے بہتر ہے)

اور ایک درجہ ہے تقویت نسبت کا کہ کسی زندہ کی بدولت نسبت حاصل ہو گئی۔ اب اس کو بڑھانا چاہتا ہے تو یہ قبور سے ہو جاتا ہے تو جو صاحب نسبت نہ ہو اس کو تو چاہیئے کہ زندہ پیروں سے لے قبور سے لینے کی کوشش کرنا اس کو بے کار۔

ایک موضع ہے ضلع انبالہ میں "ہراس" وہاں مولانا رفیع الدین صاحب تشریف لے گئے وہاں کے متعلق بعض بزرگوں کو مکشوف ہوا ہے کہ بعض انبیاء کی قبور ہیں تو مولانا رفیع الدین صاحب گردن جھکا کر بیٹھے تھے بعضے طالب علم بھی اسی طرح بیٹھے میں نے کہا کہ اُدھر سے تو اندھے ہو ہی ادھر کی آنکھیں بھی کیوں بند کیں۔ تو زندہ بزرگوں کی خدمت میں رہ کر جب وہاں سے قابلیت دیکھ کر اجازت ہو تو اس وقت اس غرض سے قبور پر جائیں اور غیر صاحب نسبت تو فاتحہ پڑھ آوے کیونکہ یہ بھی ثواب ہے کہ کھڑا ہو کر فاتحہ پڑھ کر چلا آوے۔ اور جو صاحب نسبت ہے اُس کا دوسرا حال ہے تو جس مرتبہ کا کوئی شخص ہو جو اس کو مناسب ہو اس کا التزام رکھے۔ یہ کلام تھا صحبت اموات میں باقی اصل طریق صحبت ہے احیاء کی اسی سے علم صحیح حاصل ہوتا ہے اسی سے ہمت میں قوت ہوتی ہے جو شرط اعظم ہے سہولت اعمال کی جس کا راز وہی ہے جو عرض کیا گیا کہ اس صحبت سے محبت بڑھتی ہے اور محبت سے سہولت ہوتی ہے۔

الحمد للہ مَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ (اللہ تعالیٰ نے تم پر دین میں تنگی نہیں کی) پر ہر پہلو سے کلام کافی ہو گیا اب ختم کرتا ہوں۔ دعا کیجئے کہ علم و عمل و توفیق ہو (پھر دعا کے بعد جلسہ ختم کیا گیا)

تمت

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ اٰیَۃً

(رواہ البخاری)

سلسلۃ التبلیغ کا وعظ

مسمّٰی بہ

الباب

لاولی الالباب

منجملہ ارشادات

حکیم الامّۃ مجدّد الملّۃ حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی

(رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ)

ناشر: محمد عبد المنّان غفرلہٗ

مکتبۂ تھانوی —— دفتر الابقار

مسافر خانہ بندر روڈ (ایم۔اے جناح روڈ) کراچی ۱

سلسلہ التبلیغ کا واعظ مسمّٰی بہ

البَــابُ

لِاُولِی الْاَلْبَابُ

این	متی	کم	کیف	لم	ماذا	من رای شان	من ضبط	المستمعون	الاشتات
کہاں ہوا	کب ہوا	کتنی دیر ہوا	کیسے ہوا	کیوں ہوا	کیا مضمون تھا	[illegible]	کس نے ضبط کیا	سامعین کی تعداد	متفرقات
[illegible] میدان عیدگاہ	بروز جمعہ بعد نماز جمعہ [illegible] شعبان ۱۳۳۲ھ	۲ گھنٹہ	کھڑے ہو کر	[illegible]	[illegible]	[illegible]	احقر ظفر احمد تھانوی عفا اللہ عنہ	تقریباً ۵۰۰	[illegible]

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہٗ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللّٰہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللّٰہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الٰہ الا اللّٰہ وحدہ لاشریک لہ ونشھد ان سیدنا ومولانا محمدًا عبدہ ورسولہ صلی اللّٰہ تعالٰی علیہ وعلٰی اٰلہ واصحابہ وبارک وسلم۔ امابعد فاعوذ باللّٰہ من الشیطان الرجیم بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم ــــ وَلَیْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُیُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰى وَاْتُوا الْبُیُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ؕ

(یہ کوئی نیک کام نہیں کہ تم گھروں کے پچھواڑے آیا کرو لیکن نیک کام یہ ہے کہ آدمی تقویٰ اختیار کرے

اور گھروں میں ان کے دروازوں سے آیا کرو اور خدا سے ڈرتے رہو تاکہ تم کامیاب ہو)

یہ ایک طویل آیت کا ٹکڑا ہے اس میں ایک خاص واقعہ کے متعلق حق تعالےٰ نے خاص حکم ارشاد فرمایا ہے۔ اس سے مجھ کو ایک ضروری مضمون مستنبط کرنا ہے جس کی ضرورت عنقریب واضح ہوجائے گی وہ مضمون ایک تفسیر پر تو آیت کا مدلول بھی ہے۔ بوجہ عموم الفاظ کے اور ایک تفسیر پر مستنبط ہے۔ پہلے واقعہ سن لیجئے تاکہ فہم مطلب میں سہولت ہوجائے۔ واقعہ یہ ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں بعض لوگوں کی عادت تھی کہ وہ حالت احرام میں اپنے گھروں کے اندر دروازہ سے نہیں داخل ہوتے تھے بلکہ دیوار پھاند کر یا دیوار میں سوراخ کرکے آتے تھے۔ اُن کا گمان یہ تھا کہ احرام تمتعات سے مانع ہے چنانچہ شریعت اسلامیہ نے بھی بعض تمتعات سے حالتِ احرام میں منع کردیا ہے کہ خوشبو لگانا، سلے ہوئے کپڑے پہننا، سر ڈھانکنا، بال مونڈنا، خط بنانا، بیوی کے پاس جانا مُحرِم کو ناجائز ہے۔ اہل جاہلیت نے بطور غلو کے یہ سمجھا کہ جب احرام تمتعات سے مانع ہے تو اس کا مقتضا یہ ہے کہ گھر میں بھی نہ جائے بلکہ کھلے میدان میں رہے۔ کیونکہ گھر میں جانا اور محفوظ جگہ رہنا بھی ایک تمتع ہے۔ اور اگر کسی کو بہت ہی ضرورت گھر میں جانے کی ہو تو عادت کے خلاف کسی اور طریقہ سے جائے خواہ دیوار پھاند کر یا دیوار میں نقب دے کر۔ تاکہ اگر ترک کامل نہ ہو تو ہیئت معتادہ کا تو ترک ہوجائے کہ یہ بھی فی الجملہ ترک تمتع ہے۔ جاہلیت کے افعال کی وجہ بیان کرنے کی مجھے ضرورت نہیں۔ اگر ان کے افعال کے لئے وجوہ معقولہ ہوا کرتے تو وہ افعال جاہلیت ہی کیوں کہلاتے لیکن اگر کسی فعل کی وجہ معلوم ہوجائے جو ان کے ذہن میں وجہ تھی گو واقعہ میں وجہ بننے کے قابل نہ ہو تو اس کا بیان کردینا مناسب ہے کیونکہ وجہ بتلادینے سے اس کا جاہلیت ہونا زیادہ واضح ہوجاتا ہے۔ بعض دفعہ وجہ نہ بیان کرنے سے مخاطب کے ذہن میں اُس فعل کی وقعت رہ سکتی ہے کہ نہ معلوم اس فعل کی کیا وجہ ہوگی شاید کوئی معقول وجہ ہو اور بیان کردینے کے بعد وہ وقعت زائل ہوجاتی ہے اور ہر شخص کو وجہ نامعقول ہوجانے کے بعد اس کا جاہلیت ہونا واضح ہوجاتا ہے۔ بہرحال ان کا خیال یہ تھا کہ دروازہ سے گھر میں آنا حالتِ احرام میں خلاف برّ اور خلاف تعبّد و تقرب ہے اور جب یہ صورت خلاف بر ہے تو اس کی خلاف صورت

داخل بِر ہوئی اور اگر بِر نہ ہو تو احتمال بِر تو ہے۔ پس اس مسئلہ میں ان لوگوں نے دو غلطیوں کا ارتکاب کیا۔ ایک یہ کہ بحالت احرام دروازہ سے گھر میں آنا جائز تھا اس کو حرام سمجھا۔ دوسرے یہ کہ دیوار پھاند کر یا نقب دے کر آنا باعث ثواب نہ تھا اس کو ان لوگوں نے باعث ثواب سمجھا۔ اس لئے حق تعالیٰ نے اس کی نفی اس آیت میں فرمائی وَلَيْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰى۔ یعنی یہ کوئی نیک کام نہیں کہ تم گھروں میں پچھواڑے سے آیا کرو۔ ہاں لیکن نیک کام یہ ہے کہ آدمی ناجائز امور سے) تقوٰی اختیار کرے (اور دروازہ سے آنا ناجائز نہیں تو اس سے بچنا تقوٰی میں داخل نہیں۔) وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰى (لیکن نیک کام یہ ہے کہ آدمی تقوٰی اختیار کرے) دو توجیہیں ہوسکتی ہیں ایک یہ کہ جانب خبر میں مضاف مقدر مانا جاوے یعنی لٰكِنَّ الْبِرَّ مِنَ اتَّقٰى (کہ نیکی اس شخص کی نیکی کو کہہ سکتے ہیں جو تقوٰی اختیار کرے) دوسرے یہ کہ جانبِ اسم میں مضاف مقدر ہو یعنی وَلٰكِنَّ ذَا الْبِرِّ مَنِ اتَّقٰى اس صورت میں ترجمہ یہ ہوگا۔ لیکن نیک کام کرنے والا وہ ہے جو متقی ہو۔ اور حذف مضاف میں اس جگہ نکتہ یہ ہے کہ بطور مبالغہ کے یہ بتلانا ہے کہ بِرّ اور متقی گویا متحد ہیں جیسے زَيْدٌ عَدْلٌ اور یہ محاورہ ہماری زبان میں بھی ہے چنانچہ بولتے ہیں کہ فلاں شخص سراپا اخلاق ہے، سراپا کرم ہے۔ اسی طرح محاورہ عرب میں بھی اطلاق مصدر کا ذات پر مبالغۃً ہوتا ہے جیسا اس آیت میں ہے وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰى یعنی سراپا بر وہ ہے جو متقی ہو۔ آگے بطور تفریع کے فرماتے ہیں کہ جب تقوٰی بر ہے تو اس کا مقتضا یہ ہے کہ بدعات جاہلیت سے بچا جائے اور اہل جاہلیت کی طرح اپنی طرف سے کسی کام کو طاعت یا معصیت نہ قرار دیا جائے۔ وَأْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا اور گھروں میں ان کے دروازوں سے آیا کرو۔ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ اور خدا سے ڈرتے رہو (یعنی تقوٰی اختیار کرو۔) تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ۔ وَاتَّقُوا اللّٰهَ (اللہ سے ڈرتے رہو) میں تقوٰی عملی و اعتقادی دونوں کا امر ہے یعنی نہ اپنے عمل سے کسی جائز کام کو ناجائز اور مباح کو طاعت ظاہر کرو نہ اعتقاداً ایسا سمجھو بلکہ عمل اور اعتقاد دونوں کو حکم الٰہی کا تابع بناؤ۔ کہ حرام اسی کو سمجھو جس کو خدا نے حرام کیا ہے اور طاعت بھی اسی کو سمجھو جس کو خدا نے طاعت کہا ہے اپنی طرف سے طاعات و محرمات ایجاد نہ کرو۔ اس آیت سے ایک بات کام کی معلوم ہوئی وہ یہ کہ گو گھر میں دروازہ سے

جانا یا پشت کی طرف سے آنا عبادات میں سے نہیں ہے بلکہ گھر میں دروازہ سے آنا محض عادات میں سے ہے اور پشت کی طرف سے آنا عادت کے خلاف ہے لیکن اس آیت میں حق تعالےٰ نے اس عادت سے بھی تعرض فرمایا ہے کیونکہ لوگوں نے حالتِ احرام میں عادت قدیمہ کو ناجائز اور اس کی مخالفت کو ثواب سمجھ لیا تھا حق تعالےٰ نے اس سے منع فرمایا جس کا حاصل یہ کہ تم بلا دلیل شرعی کے کسی عادت کو حرام اور اس کی مخالفت کو ثواب کا کام نہ سمجھو اس سے معلوم ہوا کہ دین کا تعلق عادات وعبادات دونوں سے ہے اور شریعت دونوں میں تصرف کرتی ہے خواہ یہی حکم دیدے کہ یہ عادت جائز ہے کیونکہ مباح کا مباح ہونا یہ بھی ایک حکم شرعی ہے اور کسی امر کو مباح کرنا بھی ایک قسم کا تصرف ہے۔

چنانچہ جو لوگ کسی سلطنت کی رعایا بن کر رہتے ہیں وہ اس راز کو خوب سمجھتے ہیں کہ سلطنت بعض امور سے منع کرتی ہے اور بعض امور کی اجازت دیتی ہے۔ جس طرح کسی امر سے منع کرنا تصرف ہے اسی طرح یہ بھی تصرف اور دست اندازی ہے کہ اس نے بعض چیزوں کی اجازت دی ہے اب اگر کوئی شخص کسی کو ایسے کام سے روکنے لگے جس کی قانوناً اجازت ہے تو وہ اس پر دعوےٰ کرسکتا ہے۔ یا اگر کوئی شخص قانون میں ایک دفعہ زیادہ کرکے ان امور مباحہ کو ممنوع قرار دیدے تو خود سلطنت اس سے مواخذہ کرتی ہے کہ جس چیز کی ہم نے اجازت دی ہے تم نے اس کو ممنوع کیوں قرار دیا۔

بعض دفعہ پولیس کسی کی تلاشی لیتی ہے تو بعض کو تو سزا ہوجاتی ہے اور بعض کو چھوڑ دیتی ہے تو جس طرح سزا کرنا ایک تصرف ہے اسی طرح چھوڑ دینا بھی تصرف ہے۔ جب دنیوی سلطنت کا یہ حال ہے کہ اس کو تصرف اباحت کا بھی حق ہے تو حق تعالےٰ کو تصرف اباحت کا کیوں حق نہ ہوگا ضرور ہونا چاہیئے۔

پس دین کا تعلق عبادات وعادات دونوں سے ہے اب چاہے وہ بعض عادات کو مباح ہی کردے یہ بھی اس کا ایک تصرف ہے۔ بعض لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ شریعت کو امور دنیوی سے اور عادات الناس سے کیا تعلق، شریعت کو محض عبادات سے بحث کرنی چاہیئے مگر یہ خیال غلط ہے کیونکہ اس میں در پردہ حق تعالیٰ کے وسعتِ اختیارات پر

اعتراض ہے کہ خدا تعالےٰ کے اختیارات اتنے وسیع نہ ہونے چاہئیں کہ ہماری عادات میں بھی دخل دیں اور اس کا زندقہ ہونا بدیہی ہے۔ ان لوگوں نے ایک حدیث یاد کر رکھی ہے اَنْتُمْ اَعْلَمُ بِاُمُوْرِ دُنْيَاكُمْ (یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ صحابہ رضی اللہ عنہم سے فرمایا کہ دنیوی امور کو تم خود زیادہ جانتے ہو) اس سے معلوم ہوا کہ دنیوی کاموں سے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو کچھ واسطہ نہیں ہم ان کو خود زیادہ جانتے ہیں، میں اس دلیل کا بھی جواب دینا چاہتا ہوں اور وہ جواب خود اسی حدیث کے اندر موجود ہے مگر لوگ حدیث کے الفاظ میں غور نہیں کرتے اس لئے اشکال پڑجاتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جگہ یہی تو فرمایا ہے کہ تم دنیا کے کاموں کو زیادہ جانتے ہو۔ یہ تو نہیں فرمایا کہ تم دنیوی اموریں خود مختار ہو کہ جو چاہو کرو۔ پس ثبوت علم سے ثبوت اختیار کیونکر لازم آگیا ذرا اس کی دلیل تو بیان کیجئے۔

دیکھئے اگر کوئی حاکم کسی کاریگر لوہار سے یہ کہے کہ بھائی ہتھیار بنانا تم ہم سے زیادہ جانتے ہو تو کیا اس کا یہ مطلب ہوا کرتا ہے کہ تم ہتھیاروں کے بارہ میں بالکل آزاد ہو کہ جس کو چاہو ہتھیار بنا کر دیدیا کرو۔ خواہ اس کے پاس لیسنس ہو یا نہ ہو یا جو ہتھیار چاہو بنا لیا کرو۔ چاہے قانوناً اس کی اجازت ہو یا نہ ہو۔ ہر عاقل سمجھ سکتا ہے کہ حاکم کے اس قول کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہوتا اسی طرح اس حدیث میں صرف اتنی بات ہے کہ دنیوی کاموں کا طریقہ اور ان کے آثار و خواص لوگوں کو زیادہ معلوم ہیں اور یہ بات اس حدیث میں کہاں ہے کہ دنیوی کاموں میں لوگ بالکل آزاد ہیں کہ جو چاہیں کریں کسی کام سے ان کو نہ روکا جائے گا کہاں اعلمیت اور کہاں تخییر علم سے اختیار کیونکر نکل آیا بلکہ اختیار کی نفی دوسری نصوص میں صراحۃً مذکور ہے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ بندوں کو یہ اختیار نہیں دیا گیا کہ وہ جو چاہیں کیا کریں۔ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے وَرَبُّكَ يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ وَيَخْتَارُ ط (اور آپ کا پروردگار جو کچھ چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور جس چیز کو چاہتا ہے اختیار کرتا ہے) یعنی جس طرح صفت خلق میں کوئی اس کا شریک نہیں اسی طرح صفت اختیار میں بھی کوئی اس کا شریک نہیں۔ شاید کسی کو یہ شبہ ہو کہ یہاں اختیار تکوینی مراد ہے مگر یہ صحیح نہیں کیونکہ يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ (جو کچھ چاہتا ہے پیدا کرتا ہے) سے اختیار تکوینی خود ظاہر ہے۔ اگر يَخْتَارُ سے بھی اختیار تکوینی مراد ہوتا تو يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ کے بعد اس کی ضرورۃ

ہی کیا تھی معلوم ہوا کہ اختیار تشریعی مراد ہے۔ اس کے بعد فرماتے ہیں مَا كَانَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ ط بندوں کے لئے کچھ اختیار نہیں چونکہ اوپر یَخْتَارُ میں اختیار شرعی کا مراد ہونا متعین ہو چکا ہے اس لئے مَا كَانَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ ط (ان کو کچھ اختیار نہیں ہے) میں بھی اسی کی نفی مراد ہونی چاہیئے۔ اس صورت میں لام تعریف عہد کے لئے ہوگا۔ اور اگر لام جنس کے لئے مانا جاوے تو عموم کی وجہ سے ہر اختیار کی نفی ہو جاوے گی یعنی یہ ہوں گے کہ اختیار تکوینی اور تشریعی دونوں خدا کے لئے مخصوص ہیں کسی کو کوئی اختیار حاصل نہیں نہ تشریعی نہ تکوینی۔ آگے فرماتے ہیں سُبْحَانَهٗ وَتَعَالٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ یعنی خدا تعالیٰ شرک تکوینی اور تشریعی دونوں سے پاک ہے۔ ایک دوسرے مقام پر ارشاد ہے اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ ط یعنی خدا ہی کے لئے ہے خالقیت و آمریت۔ یہ آیت تو بہت زیادہ صریح ہے کیونکہ اس میں اختیار تکوینی کا احتمال بھی نہیں کیونکہ امر کا اطلاق جبکہ خلق کے مقابلہ میں ہے شریعت میں امر تشریعی ہی پر ہوا کرتا ہے۔ امر کے معنی حکم کرنے کے ہیں۔ مطلب یہ ہوا کہ خدا تعالیٰ کے سوا حکم کرنے والا اور احکام مقرر کرنے والا کوئی نہیں خلق سے اختیار تکوین اور آمر سے اختیار تشریعی مراد ہے اور ان دونوں کو بصورت حصر خدا کے لئے ثابت کیا گیا ہے جس سے دونوں کی نفی ماسوا سے لازم آگئی۔ اور یہاں میں ایک اور نکتہ بیان کرتا ہوں وہ یہ کہ بعض لوگوں نے اس آیت سے عالم مجردات کے وجود پر دلیل قائم کی ہے۔ عالم مجردات کو صوفیہ کی اصلاح میں عالم امر بھی کہا جاتا ہے اس لئے اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ (خدا ہی کے لئے خالقیت و آمریت ہے) سے لوگوں کو دھوکہ ہوا اور انہوں نے اس کا یہ مطلب سمجھا کہ خدا ہی کے لئے ہے عالم خلق و عالم امر۔ حالانکہ یہ بالکل غلط ہے کیونکہ قرآن کے مخاطب اول اہل عرب تھے اور وہ عالم امر کو جانتے بھی نہ تھے۔ یہ اصطلاح بعد میں حادث ہوئی نزول قرآن کے وقت عالم امر کو کوئی جانتا بھی نہ تھا مگر لوگوں کی عادت ہے کہ اصطلاحات علمیہ کو یاد کر کے ہر جگہ انہی کو چلایا کرتے ہیں اسی لئے میں کہا کرتا ہوں کہ علوم قرآنیہ کو علوم درسیہ سے مقدم کرنا چاہیئے بلکہ پہلے بھی علوم قرآنیہ کو پڑھیں اور خاتمہ بھی انہی پر کریں۔ نہ تو یہ کریں کہ علوم درسیہ کو سب سے پہلے پڑھیں نہ یہ کریں کہ علوم دینیہ سے بالکل فارغ ہو کر پھر علوم درسیہ میں مشغول ہوں کیونکہ پہلی صورت میں یہ اصطلاحات ذہن میں رچ جائیں گی۔

پھر ہر جگہ قرآن و حدیث میں وہی سوجھیں گی۔ حالانکہ قرآن و حدیث میں یہ اصطلاحات اور علوم درسیہ کام نہیں دیتے۔ اور دوسری صورت میں یہ خرابی ہے کہ جو علم اخیر میں پڑھا جاتا ہے دل پر اسی کا اثر رہ جاتا ہے پس معقول و فلسفہ کو سب سے اخیر میں پڑھنا بھی بُرا ہے بلکہ ان علوم کو وسط میں رکھنا چاہیئے ورنہ کم از کم دوش بدوش تو ضرور ہوں۔ اصطلاحات کے رَچ جانے کا ایک واقعہ میں آپ کو سناتا ہوں۔

دیوبند میں جب میں پڑھتا تھا تو حضرت استاد (مولانا محمد یعقوب صاحب) علیہ الرحمۃ نے مجھے مسئلہ تصور شیخ لکھ کر نقل کے لئے دیا، میں اس کو نقل کر رہا تھا کہ ایک نو وارد طالب علم آئے جو اب تک معقول ہی میں منہمک رہے تھے مجھ سے پوچھنے لگے کیا لکھ رہے ہو۔ میں نے کہا مسئلہ تصور شیخ وہ بولے کیا شیخ بو علی سینا۔ بس ان کے نزدیک بو علی سینا ہی ایک شیخ تھا۔ کیونکہ معقول پڑھنے کی وجہ سے وہی دِل میں رچ گیا تھا۔ پس ایسے ہی لوگوں نے جن کے قلوب پر اصطلاحات علمیہ رچی ہوئی ہیں اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ (اسی کے لئے ہے خالقیت اور آمریت) سے عالم امر و عالم مجردات کو ثابت کیا ہے مگر یہ بالکل غلط ہے۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ میں عالم مجردات کا منکر ہوں بلکہ میرا مقصود یہ ہے کہ اس آیت کی تفسیر میں اس کو بیان کرنا غلط ہے باقی ویسے میں اس کا منکر نہیں میں اس کو مانتا ہوں کہ عالم مجردات موجود ہے لیکن اس کی دلیل نصوص قرآنیہ میں کہیں نہیں بلکہ مکاشفہ اس کی دلیل ہے یہ کوئی مسئلہ شرعیہ نہیں ہے جس کے لئے نصوص کی ضرورت ہو بلکہ اس کا تعلق مکاشفہ سے ہے جیسے امریکہ کا وجود شرعی مسئلہ نہیں ہے اسی طرح اس کو سمجھنا چاہیئے۔ پس جن لوگوں کے آنکھیں ہیں انہوں نے عالم مجردات کو دیکھا ہے چنانچہ صوفیہ کرام میں بعضے اصحاب کشف ہیں ان کو عالم مجردات منکشف ہوا ہے اور چونکہ ہم ان کو سچا سمجھتے ہیں اس لئے ہم ان کی تصدیق کرتے ہیں باقی جو چیز مشاہدہ کے متعلق ہو اس کے لئے دلائل بیان کرنا غلطی ہے بس اس کی سب سے بڑی دلیل یہی ہے کہ اگر کسی کے آنکھیں ہوں وہ خود دیکھ لے۔ رہا یہ کہ فلاسفہ نے تو اس پر دلائل قائم کئے ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ وہ دلائل محض لچر ہیں سب بِنَاءُ الْفَاسِدِ عَلَى الْفَاسِدِ (فاسد کی بنا فاسد پر) چنانچہ طلبہ خوب جانتے ہیں۔ مگر وہ مجردات قدیم نہیں ہیں بلکہ حادث ہیں اور حادث بھی بالزمان جس کی دلیل

اَلَا لَہُ الْخَلْقُ (اس کے لئے خالقیت ہے) ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام چیزیں مخلوق ہیں اس میں مثال بھی داخل ہے۔ اگر کوئی اس استدلال پر یہ شبہ کرے کہ اس آیت میں تو خلق مقابل امر کا ہے اس لئے یہ احتمال ہو سکتا ہے کہ عالم کی دو قسمیں ہیں ایک حادث بالزمان جو عالم خلق ہے ایک غیر حادث بالزمان جس کا نام عالم امر ہے تو یہ احتمال اگرچہ غلط ہے مگر میں اس سے قطع نظر کرکے دوسری دلیل بیان کرتا ہوں حق تعالیٰ فرماتے ہیں اَللّٰہُ خَالِقُ کُلِّ شَیْءٍ (اللہ تعالیٰ ہر چیز کے خالق ہیں) دیکھو کل شئے میں مجردات بھی آ گئے۔ اگر کہا جاوے کہ خلق ایجاد من العدم کے ساتھ خاص نہیں تو دوسری آیت لیجئے بَدِیْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (آسمانوں اور زمینوں کے نمونہ پیدا کرنے والا ہے) ابداع اخراج من العدم ہی کے ساتھ خاص ہے اور فلاسفہ عالم مجردات و افلاک دونوں کو غیر حادث بالزمان کہتے ہیں اور فرق کا کوئی قایل نہیں۔ پس ایک کے ابداع سے دوسرے کے ابداع کا بھی قایل ہونا پڑے گا۔ پس فلاسفہ اور صوفیہ کے قول میں اتحاد نہیں۔ فلاسفہ عالم مجردات کو قدیم مانتے ہیں کیونکہ ان کے نزدیک کوئی مجرد حادث نہیں اور صوفیہ مجردات کے قایل ہیں مگر ان کو حادث بالزمان مانتے ہیں البتہ متکلمین تجرد کو اخص صفات باری تعالےٰ قرار دے کر ان کو یہ معلوم ہو چکا ہے کہ خدا تعالےٰ کے سوا تمام چیزیں حادث ہیں اس کے قائل ہیں کہ خدا تعالےٰ کے سوا مجرد ہی کوئی نہیں لہذا وہ عالم مجردات کے منکر ہو گئے مگر صوفیہ نے چونکہ عالم مجردات کو دیکھا ہے اس لئے وہ اس کے وجود کے قائل ہو گئے لیکن وہ اس کو حادث مانتے ہیں۔ فلاسفہ کی طرح قدیم نہیں مانتے۔ پس ان کے نزدیک تجرد حق تعالےٰ کے لئے اخص صفات سے نہیں بلکہ وجوب و قدم اس کے اخص صفات سے ہے پس مجرد تو غیر خدا بھی ہو سکتا ہے۔ مگر مجرد قدیم خدا کے سوا کوئی نہیں۔ اور یہاں سے بعض لوگ یہ سمجھ گئے کہ صوفیہ فلسفی ہیں حالانکہ یہ بالکل غلط ہے۔ صوفیہ فلسفہ کی کچھ بھی وقعت نہیں سمجھتے وہ تو ہمہ تن شریعت کے متبع ہیں۔ البتہ جن امور سے شریعت نے سکوت کیا ہے ان کے متعلق بعض دفعہ وہ اپنے مکاشفات بیان کر دیتے ہیں چنانچہ عالم مجردات کا مسئلہ بھی محض کشفی ہے جو اتفاقاً فلاسفہ کے قول سے من وجہ موافق ہو گیا لیکن ہر عاقل جانتا ہے کہ توافق اور چیز ہے اخذ اور چیز ہے۔ صوفیہ نے اس مسئلہ کو فلاسفہ سے نہیں لیا بلکہ خود اپنے کشف سے معلوم کیا ہے جو لوگ اس

حقیقت سے ناواقف ہیں وہ صوفیہ پر فلسفی ہونے کا گمان کرنے لگے۔ جیسا کہ بعض لوگوں نے قرآن میں بعض باتیں تورات و انجیل کے موافق دیکھ کر یہ گمان کرلیا ہے کہ قرآن تورات و انجیل سے ماخوذ ہے۔ حالانکہ توافق اور چیز ہے اور اخذ اور چیز ہے توافق سے اخذ کیونکر لازم آگیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تورات و انجیل کو کبھی دیکھا بھی نہیں نہ آپ عبرانی اور نہ سریانی زبان کو جانتے تھے نہ اہلِ کتاب سے اختلاط کی آپ کو نوبت آئی پھر قرآن تورات و انجیل سے ماخوذ کیونکر ہوگیا۔ علاوہ ازیں بعض واقعات میں اہل کتاب نے تحریف و تبدیل بھی کردی تھی جن کو قرآن میں صحیح طریقہ سے بیان کیا گیا ہے۔ اگر قرآن ان کتابوں سے ماخوذ ہوتا تو یہ واقعات قرآن میں بھی اسی طرح ہوتے جس طرح انجیل و تورات میں تھے حالانکہ عیسیٰ علیہ السلام اور داؤد علیہ السلام اور یوسف علیہ السلام کے واقعات قرآن میں ایسے طرز پر مذکور ہیں جن سے ان حضرات انبیاء علیہم السلام کی نزاہت و عصمت ثابت ہوتی ہے اور تورات و انجیل میں لوگوں نے نہ معلوم کیا گڑ بڑ کر رکھی ہے ان سے ہرگز ان حضرات کی عصمت و نزاہت ثابت نہیں ہوتی۔ پس جس طرح قرآن مجید کی نسبت یہ خیال غلط ہے اسی طرح صوفیہ پر بھی فلسفی ہونے کا گمان بالکل غلط ہے۔

غرض عالم مجردات کا وجود فی نفسہ صحیح ہے جس کے قائل بعض صوفیہ ہوئے ہیں اور متکلمین اس کے بالکل منکر ہیں مگر کچھ مضائقہ نہیں کیونکہ اس کا قائل ہونا شرعاً لازم نہیں جیسے امریکہ کا قائل ہونا ضروری نہیں اور متکلمین کے منکر ہونے سے یہ بات واضح ہوگئی کہ اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ (اسی کے لئے خالقیت اور آمریت ہے) سے عالم امر مراد ہونا ثابت نہیں ورنہ وہ ہرگز انکار نہ کرتے۔ نص قرآنی کے ہوتے ہوئے متکلمین کبھی کسی مسئلہ کا انکار نہیں کرسکتے۔ خیر یہ توبیچ میں ایک جملہ معترضہ تھا۔

میں یہ کہہ رہا تھا کہ اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ سے خالقیت و آمریت دونوں کا خدا کے لئے مخصوص ہونا معلوم ہوگیا۔ پس مخلوق کو نہ اختیار تکوینی حاصل ہے نہ اختیار تشریعی۔ بلکہ یہ دونوں اختیارات خدا تعالیٰ کے لئے مخصوص ہیں اور اسی کی فرع یہ بھی ہے کہ مباحات میں بھی تصرفِ شرعی کا اجرا ہوتا ہے۔ اگر کوئی یہ کہے کہ یہ قاعدہ فقہیہ ہے اَلْاَصْلُ فِی الْاَشْیَاءِ الْاِبَاحَۃُ (اصل اشیاء میں اباحت ہے) جس سے معلوم ہوا کہ قبل شریعت کے بھی اباحت موجود تھی۔

پس اباحت کا وجود شریعت پر موقوف نہیں اِسکا جواب یہ ہے کہ اَلْاَصْلُ فِی الْاَشْیَاءِ الْاَبَاحَۃُ (اشیاء میں اصل اباحت ہے) یہ قاعدہ بھی تو شریعت ہی سے معلوم ہوا۔ تو اباحتِ اصلیہ کا ظہور بھی شریعت کے بتلانے پر موقوف ہوا۔ اگر شریعت یہ قاعدہ نہ بتلاتی تو اباحت اصلیہ کا ظہور کبھی نہ ہوتا۔ تو گویا قبل ورود شرع کے اباحت کا وجود اشیاء میں تھا مگر ظہور نہ تھا۔ شریعت نے اُس کو ظاہر کیا۔ اور اس میں کچھ شک نہیں کہ ظہور کے بغیر وجود بمنزلہ عدم کے ہے۔ پس یہ کہنا صحیح ہے کہ اباحت بھی شریعت ہی پر موقوف ہے۔ اس کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی کہے کہ اس دوا کو طبیب سے پوچھ کر استعمال کرنا چاہیئے نہ معلوم مُضر ہے یا نافع ظاہر ہے کہ نفع یا ضرر جو کچھ بھی ہے دوا میں پہلے سے موجود ہے طبیب اُس میں ضرر یا نفع پیدا نہ کرے گا مگر پھر بھی اس کا استعمال طبیب کی رائے پر موقوف ہے کیونکہ وہ مظہر نفع و ضرر ہے۔ اور یہاں تو خالق و مظہر دونوں حق تعالیٰ ہی ہیں پہلے خدا تعالیٰ نے اشیاء میں اباحت و حرمت پیدا کی پھر اس کو ظاہر کیا چنانچہ اس ظاہر کرنے ہی کا نام ورود شرع ہے پس یہ مسئلہ ثابت ہو گیا کہ حلال و حرام کرنا حق تعالیٰ ہی کا کام ہے۔ چنانچہ ایک جگہ نہایت تصریح کے ساتھ حق تعالیٰ فرماتے ہیں وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَا تَصِفُ اَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هٰذَا حَلٰلٌ وَّهٰذَا حَرَامٌ لِتَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ط یعنی کسی چیز کے بارہ میں بدون علم کے یہ نہ کہو کہ یہ حلال ہے اور یہ حرام ہے کیونکہ اس میں خدا تعالیٰ پر افترا باندھنا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جس طرح کسی چیز کو حرام کرنا خدا کا کام ہے جب ہی تو بلا دلیل حرام کہنا افتراء ہو گا۔ اسی طرح حلال کرنا بھی خدا ہی کا کام ہے پس وہ دعویٰ بخوبی ثابت ہو گیا جس کو میں نے شروع میں بیان کیا تھا کہ مباح کو مباح کرنا بھی ایک تصرف ہے اور دین کا تصرف جس طرح فرائض و واجبات و محرمات میں ہوتا ہے اسی طرح مباحات میں بھی ہوتا ہے اور لِتَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ (تاکہ کذب کا اللہ تعالےٰ پر افترا کرو) سے معلوم ہوا کہ کسی چیز کو بدون علم کے حرام و حلال کہنا خدا پر افترا کرنا ہے۔ اس کی دو صورتیں ہیں اگر حلال و حرام کہنے کا مطلب یہ ہے کہ عند اللہ حلال یا حرام ہے حالانکہ حکم شرعی ہم کو معلوم نہیں تب تو افتراء ہونا ظاہر ہے اور اگر یہ

مطلب ہے کہ یہ چیزیں خود بخود حلال وحرام ہیں بدون خدا کے حلال وحرام کئے تب بھی جھوٹ ہے کیونکہ خود بخود کوئی چیز حلال وحرام نہیں ہو سکتی چنانچہ یہ ایسی بدیہی بات ہے کہ کفار بھی اس خیال کے قایل نہ تھے وہ بھی جن چیزوں کو حلال وحرام کہتے تھے ان کے متعلق یوں کہا کرتے تھے وَاللّٰہُ اَمَرَنَا بِهَا کہ خدا نے ہم کو اس کا حکم کیا ہے تو اتنی بات وہ بھی جانتے تھے کہ بدون خدا کے حکم کے حلت وحرمت کا ثبوت نہیں ہو سکتا۔ مگر افسوس آج کل بعض مسلمان اس خیال کے ہو گئے ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ خدا تعالےٰ کو دنیوی کاموں سے کیا تعلق ان میں ہم خود مختار ہیں جو چاہیں کریں گویا وہ امور دنیویہ کو خود بخود حلال سمجھتے ہیں۔ اس عقیدہ میں یہ لوگ کفار سے بھی دو قدم آگے بڑھ گئے۔ جیسے بعض کفار کی یہ حالت قرآن میں بیان کی گئی ہے کہ دریا میں سوار ہو کر جب طوفان میں مبتلا ہوتے ہیں تو خدا ہی کو پکارتے ہیں خدا تعالےٰ کے سوا کسی کو نہیں پکارتے اپنے سب معبودوں کو اس وقت بھول جاتے ہیں مگر ہم نے بعض مسلمانوں کو جہاز میں دیکھا ہے کہ وہ طوفان کے وقت یا غوثِ اعظم یا علی وغیرہ کہتے ہیں ان ظالموں کا شرک اس وقت بھی دور نہ ہوا جبکہ مشرکین کا شرک زائل ہو جاتا ہے تو یہ ان سے بھی بڑھ گئے۔ اسی طرح جو لوگ یوں سمجھتے ہیں کہ بعض چیزیں خود بخود حرام وحلال ہیں یا اپنی طرف سے ان کو حلال وحرام کہتے ہیں تو یہ خدا پر افترا وکذب کرتے ہیں کیونکہ قاعدہ ہے اَلشَّیْءُ اِذَا ثَبَتَ ثَبَتَ بِلَوَازِمِهٖ (کوئی چیز جب ثابت ہوتی ہے تو اپنے لوازم کے ساتھ ثابت ہوتی ہے) اور کسی چیز کے حلال وحرام ہونے کے لئے لازم ہے کہ خدا تعالےٰ اس کو حلال وحرام کریں اس لئے کہ حلت وحرمت حق تعالےٰ کا حق ہے تو جب اس نے خود کسی چیز کو بدون حکم خداوندی کے حلال وحرام کہا تو یہ شخص اس حق کو اپنے واسطے ثابت کرنا چاہتا ہے اور یہ بہت بڑا افترا ہے کہ اپنے کو خدا کا شریک بنا رہا ہے اس میں جھوٹ کے ساتھ بے حیائی اور بے شرمی بھی ہے جیسے ایک شخص کسی نواب یا رئیس کا مال چرا لاوے اور یہ کہے کہ فلاں نواب صاحب نے یہ مجھ کو عطا کیا ہے اس نے جھوٹ تو بولا مگر نمک حرامی نہیں کی اس چیز کو نواب صاحب ہی کی طرف منسوب کیا کہ یہ اُن کی ہے مگر انہوں نے مجھے دے دی، اور ایک شخص چرا کر یہ کہے کہ یہ چیز میری ہے۔ یہ چور بھی ہے اور نمک حرام بھی

پس آجکل جو مسلمان خود بخود بعض چیزوں کو حلال و حرام کرتے رہتے ہیں وہ دوسری صورت میں داخل ہیں جس سے پہلے زمانہ کے کافر بھی بچتے تھے وہ کسی چیز کو از خود حلال و حرام نہ کہتے تھے بلکہ تحلیل و تحریم کا حق خدا ہی کے لئے مانتے تھے، ہاں ایک دعویٰ جھوٹا کیا کرتے تھے کہ اَللّٰہُ اَمَرَنَا بِھَا (خدا نے ہم کو اس کا حکم دیا ہے) جس کا جواب حق تعالےٰ نے یہ دیا قُلْ اِنَّ اللّٰہَ لَا یَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ ط کہ خدا تعالےٰ فحش و بے حیائی کا امر نہیں کیا کرتا اور جو کام تم کرتے ہو یہ فحش اور بے حیائی کے کام ہیں یہ ہرگز خدا کی طرف سے مامور و ماذون بہا نہیں ہو سکتے۔ غرض یہ بات ثابت ہوگئی کہ تحلیل و تحریم خدا کا کام ہے بدون خدا کے بتلائے ہم کسی مباح کو مباح بھی نہیں کہہ سکتے خواہ وہ عبادات میں سے ہو یا عادات میں سے۔ پس لوگوں کا یہ کہنا کہ آجکل مولویوں کا ڈاڑھی رکھنے کو فرض کہنا تجارات و معاملات میں دخل دینا کہ یہ ناجائز اور حرام ہے یہ جائز اور مباح ہے صحیح نہیں بالکل غلط ہے کیونکہ دین کا تعلق محض عبادات ہی سے نہیں ہے بلکہ وہ عادات میں بھی تصرف کرتا ہے اور اَنْتُمْ اَعْلَمُ بِاُمُوْرِ دُنْیَاکُمْ (تم اپنی دنیا کے کاموں کو مجھ سے زیادہ جانتے ہو) سے استدلال کا جواب ہو چکا ہے کہ علم اور تخییر میں فرق ہے اور تفسیر حدیث کی آگے آتی ہے سو اس حدیث میں یہ کہاں کہا گیا ہے کہ امور دنیا میں تم خود مختار رہو۔ بلکہ اس کے خلاف دلائل صحیحہ سے ثابت ہے کہ امور دنیا میں بھی ہم لوگ خود مختار نہیں ہیں بلکہ حکم شرعی کے پابند ہیں۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زید بن حارثہ کا پیغامِ نکاح زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا سے بھیجا۔ چونکہ حضرت زید لوگوں کی زبانوں پر غلام مشہور تھے واقع میں وہ غلام نہ تھے بلکہ شریف الاصل آزاد تھے لیکن بدوؤں نے ان کو کسی قافلہ سے پکڑ کر زبردستی غلام بنالیا اور بیع کر دیا تھا اس لئے وہ غلام کے لقب کے ساتھ بدنام ہو گئے۔ جیسے بعض قصبات میں بعض شریف قوموں کے کچھ القاب مشہور ہو جاتے ہیں پھر لوگ ان کو حقیر سمجھنے لگتے ہیں۔ اسی طرح حضرت زید بھی بدنام ہو گئے تھے اس لئے حضرت زینب نے اور ان کے بھائی نے اس پیغام کی منظوری میں تامل کیا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی وَمَا کَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَۃٍ اِذَا قَضَی اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَمْرًا اَنْ یَّکُوْنَ لَھُمُ الْخِیَرَۃُ مِنْ اَمْرِھِمْ۔ اور کسی مسلمان مرد یا عورت کو یہ اختیار نہیں کہ جب خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم

کسی بات کا فیصلہ فرما چکیں تو پھر ان کو اپنے معاملہ میں کوئی اختیار نہ رہے۔ صاحبو! ظاہر ہے کہ پیغام نکاح کا منظور کرنا یا نہ کرنا عبادات میں سے نہیں ہے بلکہ یہ ضروریاتِ زندگی میں سے ایک امر ہے جیسے کھانا پینا۔ پھر اس میں عورت اور اس کے اولیاء کی رضا مندی بھی شرعاً وعرفاً ضروری ہے چنانچہ کفاءت کا اعتبار خود شریعت نے کیا ہے لیکن بایں ہمہ اس واقعہ میں عتاب نازل ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قطعی مرضی معلوم ہو جانے کے بعد مسلمانوں کو کچھ اختیار نہیں کہ وہ دنیوی امور میں بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے کی مخالفت کریں۔ اگر دنیوی امور میں تخییر ہے تو یہ عتاب کیوں ہوا۔ اس پر یہ شبہ نہ کیا جائے کہ جب شریعت نے کفاءت کا لحاظ خود ضروری سمجھا ہے تو حضرت زینبؓ اور ان کے بھائی پر اس لحاظ سے عتاب کیوں ہوا جواب یہ ہے کہ حضرت زیدؓ واقع میں کفو تھے لیکن انہوں نے محض ظاہری شہرت کی بناء پر ان کو کفو نہیں سمجھا۔ نیز یہ بھی نہ شبہ کیا جائے کہ حضرت بریرہؓ کے واقعہ میں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان پر کچھ عتاب نہیں کیا حالانکہ انہوں نے مشورۂ نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی مخالفت کی تھی۔ یہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مشورہ کے خلاف کرنے پر حضرت زینب اور ان کے بھائی پر کیوں عتاب ہوا۔ بات یہ ہے کہ واقعہ بریرہؓ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ فیصلہ نہیں فرمایا تھا محض مشورہ کا درجہ تھا۔ اور یہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے دل میں یہ بات طے فرما چکے تھے کہ زید کا نکاح زینب سے ہو جائے اور اُن صحابیوں کو بھی قرائن سے اس کا علم ہو گیا تھا لہٰذا بعد معاملہ طے فرما دینے کے ان کو مخالفت کا حق نہ تھا اور اس کی دلیل خود قرآن کے الفاظ میں موجود ہے اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗۤ اَمْرًا (جب اللہ اور اس کا رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کسی بات کا فیصلہ کر دیں) اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنی طرف سے اس معاملہ کو طے فرما چکے تھے۔ بہرحال اس واقعہ سے معلوم ہو گیا کہ دنیوی امور میں بھی شریعت کا تصرف جاری ہے اور مسلمانوں کو اس کی مخالفت کا حق نہیں۔ اسی لئے تو کہا جاتا ہے کہ ناتمام علم کافی نہیں۔ محض دو چار کتابیں پڑھنے سے انسان عالم نہیں ہو جاتا۔ آپ نے اس ناقص علم کی حالت دیکھ بھی لی کہ یہ لوگ اَنْتُمْ اَعْلَمُ بِاُمُوْرِ دُنْيَاكُمْ (تم دنیا کے کاموں کو زیادہ جانتے ہو) سے دنیوی امور میں

تخییر کے قائل ہوگئے یہ نہ دیکھا کہ دوسری نصوص سے اس کی نفی ہو رہی ہے اس لئے یہ مطلب صحیح نہیں۔ آجکل ہر شخص اپنے کو عالم اور مجتہد سمجھتا ہے مگر جب محقق کے سامنے وہ جاتے ہیں اس وقت ان کو معلوم ہو جاتا ہے کہ ہمارا علم سراسر جہل تھا اس لئے اپنے علم کو کسی محقق کو سامنے پیش کرو اگر وہ تصدیق کردے تب اس کو صحیح سمجھو ورنہ وہ محض جہل ہے۔ صائب کہتے ہیں ؎

بنمائے بصاحب نظرے گوہر خود را
عیسیٰ نتواں گشت بتصدیق خرے چند

(اپنے جوہر کسی صاحب نظر کو دکھلاؤ چند گدھوں کی تصدیق سے کوئی عیسیٰ نہیں بن سکتا)

پس احمقوں کے مولانا کہنے سے کوئی عالم اور مولانا نہیں ہو جاتا اس کے لئے کسی صاحب نظر کے پاس رہنے کی اور تصدیق کی ضرورت ہے۔ صاحب نظر کون لوگ ہیں یہ وہ کاملین ہیں جو شریعت و طریقت کے جامع ہیں ان کے پاس رہ کر دین سے ایک خاص ذوق حاصل ہوتا ہے۔ یہ ذوق محض کتابوں کے ترجمہ سے نہیں حاصل ہوتا بلکہ اس کا طریقہ صحبت کاملین ہی ہے۔ مولانا فرماتے ہیں ۔؎

قال را بگذار دمرد حال شو   پیش مردے کاملے پامال شو

(قال کو چھوڑ کر حال پیدا کرو یہ اس وقت ہوگا جب کسی اہل اللہ کے قدموں میں جاکر پڑجاؤ)

صاحبو! علماء کے اندر بھی سب محقق نہیں ہوتے بلکہ ان میں سے کوئی کوئی محقق ہوتا ہے ورنہ اکثر محض کتابی عالم ہوتے ہیں جن کو عبارتوں کا ترجمہ کرنا آتا ہے اور اب تو یہ حالت ہوگئی ہے کہ میزان پڑھنے والے کو بھی مولوی سمجھتے ہیں اور جو درسیات سے فارغ ہو جائے وہ تو گویا رجسٹری شدہ مولوی ہے حالانکہ علم صرف اسی کا نام نہیں بلکہ اس کے بعد ایک علم اور ہے اس کے بعد آدمی محقق ہوتا ہے علم اور دین کا ذوق اسی کو عطا ہوتا ہے۔ عارف فرماتے ہیں ؎

نہ ہر کہ چہرہ برافروخت دلبری داند   نہ ہر کہ آئینہ دارد سکندری داند

ہزار نکتۂ باریکتر زمو اینجا ست — نہ ہرکہ سر بتراشد قلندری داند
(دلبری ہر وہ شخص نہیں جانتا جو چہرہ کو چمکالے نہ ہر وہ شخص سکندری جانتا ہے
جو اپنے پاس آئینہ رکھتا ہو یہاں بال سے بھی زیادہ باریک ہزاروں نکتے
ہیں قلندری ہر وہ شخص نہیں جانتا جو اپنا سر منڈالے)

تعجب ہے کہ ہر فن میں تجربہ کی ضرورت مسلّم ہے ہر علم میں نو تعلیم یافتہ اور تجربہ کار میں فرق کیا جاتا ہے مثلاً نجار اور معمار اور طبیب وغیرہ جتنے پرانے تجربہ کار ہوں اسی قدر ان کی قدر زیادہ ہوتی ہے اور نو تعلیمیافتہ کو ان کی برابر ہرگز نہیں سمجھا جاتا حالانکہ کتابیں جتنی نئے طبیب نے پڑھی ہیں اتنی ہی پرانے طبیب نے پڑھی ہیں اور جو مسائل نجاری کے نئے نجار نے سیکھے ہیں وہی پرانے نے سیکھے ہیں مگر اس میں ایک بات زیادہ ہے یعنی تجربہ اس لئے اس کی قدر و منزلت زیادہ ہے مگر علمِ دین میں جو لوگ تجربہ کی ضرورت ہی نہیں سمجھتے سب کو ایک ہی لکڑی ہانکتے ہیں۔ تو کیا ان کے نزدیک علوم خسیسہ کے مسائل تو باریک ہیں اور شریعت ہی کے مسئلے موٹے ہیں افسوس ان لوگوں کو شریعت کی حقیقت معلوم نہیں۔
دیکھئے طب کی کتابوں میں ہر مرض کی دوا لکھی ہوئی ہے جن کو دیکھ کر ہر شخص بتلا سکتا ہے کہ اس مرض کی یہ دوا ہے مگر طبیب کی ضرورت پھر بھی ہوتی ہے کیونکہ یہ تشخیص کون کرے گا کہ اس شخص کو فلاں مرض ہے فلاں مرض نہیں اسی کی تشخیص کے لئے اطباء کی خوشامد کی جاتی ہے ورنہ علاج کر دینا کیا مشکل ہے اسی طرح شریعت میں بھی تمام امراض روحانیہ کا علاج موجود ہے مگر طبیب روحانی کی ضرورت اس لئے ہے تاکہ یہ تشخیص ہو کہ آپ کے اندر مرض کیا ہے نیز جس طرح اطباء کو پہلے زمانہ کے نسخوں میں اجتہاد کرنا پڑتا ہے کیونکہ وہ آجکل کے مزاجوں کے موافق نہیں ہیں اسی طرح اطباء روحانی کو بھی اس کی ضرورت پیش آتی ہے تو یہ کام ہر عالم تو نہیں کر سکتا یہ تو بڑا ہی تجربہ کار کر سکتا ہے۔ اگر ناتجربہ کار یہ کام کرنے لگے تو وہ ضرور مخلوق کو تباہ کرے گا۔

چنانچہ ہماری طرف ایک طبیب ہیں جو باقاعدہ طب پڑھے ہوئے نہیں ہیں نہ کسی کے پاس رہ کر مطب کیا ہے لیکن وہ علاج کرتے ہیں اور علاج کا طریقہ یہ ہے کہ مریض سے

کہد یتے ہیں کہ پہلے کسی ہوشیار طبیب سے مرض کی تشخیص کرالاؤ علاج میں کر دوں گا۔ جب مریض کسی حکیم سے تشخیص کرالاتا ہے تو وہ کتاب دیکھ کر علاج کر دیتے ہیں اگر کہیں مریض کو نقصان ہوا تو وہ یہ کہکر الگ ہو جاتے ہیں کہ صاحب فلاں حکیم نے تشخیص میں غلطی کی ہوگی باقی میں نے تو اسی مرض کا علاج با قاعدہ کیا ہے جو انہوں نے تشخیص کیا تھا بھلا یہ بھی کوئی جواب ہے۔ جو شخص مرض کی تشخیص نہیں کرسکتا وہ علاج کیسے کرسکتا ہے دوسرے کی تشخیص سے آپ کو مزاج کا درجہ اور تغیر اخلاط کی کیفیت کیسے معلوم ہو جائے گی اور جب یہ معلوم نہیں تو آپ نسخہ میں اس کی رعایت کیسے کریں گے جب اس کی رعایت نہ ہوگی تو مریض کو نفع کیسے ہوگا مگر آجکل ہر شخص مجتہد بنا ہوا ہے جو جی میں آتا ہے کرتے ہیں ذرا وہ صاحب مجھ سے ملیں تو میں ان کی خبر لوں گا کیونکہ وہ مجھ سے محبت کرتے ہیں اور محبت تو بلا ہے۔ جو اس کا دعویٰ کرے گا اس کی ساتھ تو ایسا ہی برتاؤ کیا جائے گا۔ ہاں کوئی محبت کا دعویٰ نہ کرے تو میں اس سے خاص خطاب نہیں کرتا عام خطاب میں سب کچھ کہدیتا ہوں۔ غرض آجکل ہر شخص مفسر و مترجم ہے اور ہر ایک شریعت میں رائے دیتا ہے۔ گویا شریعت کا سمجھنا تمام فنوں سے آسان ہے حالانکہ یہ تو قانونِ الٰہی ہے جب دنیوی سلاطین کے قوانین کو ہر شخص نہیں سمجھ سکتا بلکہ خاص وکلاء اور بیرسٹر اور ہائی کورٹ کے جج ہی اس کو سمجھتے ہیں تو خدائی قانون کو ایسا کیا آسان سمجھ لیا ہے۔

بہاولپور میں ایک شخص نے قرآن کا ترجمہ یاد کر رکھا تھا اور اس کو بڑا ناز تھا کہ میں ترجمہ قرآن کو خوب جانتا ہوں ایک مرتبہ حضرت مولانا خلیل احمد صاحب نے اس سے پوچھا کہ بتلاؤ مُدْهَامَّتَانِ کا کیا ترجمہ ہے، کہنے لگے بہت سیاہ، مولانا نے پوچھا بہت کا ہے کے معنی اور سیاہ کا ہے کے معنی تو آپ فرماتے ہیں مُدہام کے معنی بہت اور متان کے معنے سیاہ پس کتابیں پڑھنا اور ہے اور علم سے مناسبت اور ہے چنانچہ اَنْتُمْ اَعْلَمُ بِاُمُوْرِ دُنْیَاکُمْ (تم دنیا کے کاموں کو زیادہ جانتے ہو) کے معنے میں بھی غلطی اسی وجہ سے کی گئی کہ محض ترجمہ حدیث کا یاد کر رکھا ہے فن سے مناسبت اور دین کا ذوق نہیں پیدا ہوا۔ دیکھئے خزانچی کو خزانہ کا حال بادشاہ سے زیادہ معلوم ہوتا ہے کیونکہ سلاطین خزانہ کا

حساب و کتاب خود نہیں کیا کرتے پس اگر بادشاہ خزانچی سے کسی وقت یہ کہدے کہ بھائی خزانہ کا حال تم کو مجھ سے زیادہ معلوم ہے تو کیا اس کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ تم اس میں خود مختار بھی ہو کہ جس کو چاہو بانٹ دو، ہرگز نہیں۔ زیادہ جاننے سے خود مختار ہونا کیسے لازم آیا پس جس طرح خزانچی کو خزانہ کا حال بادشاہ سے زیادہ معلوم ہے مگر اسے خرچ کرنے کا اختیار نہیں وہ بدون اجازت شاہی کے کسی کو ایک حبہ بھی نہیں دے سکتا اسی طرح دنیا کے کاموں کو ہم انبیاء سے زیادہ جانتے ہیں کہ زراعت کیونکر ہوا کرتی ہے باغبانی کس طرح کیا کرتے ہیں، کپڑے کیسے بُنا کرتے ہیں مگر ہم ان کاموں میں خود مختار نہیں ہیں کہ جس طرح چاہیں کرلیں۔ بلکہ جس کام کو انبیاء علیہم السلام جائز کریں گے ہم اس کو کرسکتے ہیں اور جس سے منع کردیں اس کو چھوڑ دینا واجب ہے۔ اگر یہ شبہ کیا جائے کہ اس حدیث میں تو لفظ اعلمُ مطلق ہے جس کے یہ معنی بھی ہوسکتے ہیں اَنْتُمْ اَعْلَمُ بِاَحْکَامِ اُمُوْرِ دُنْیَاکُمْ (تم دنیاوی کاموں کے احکام کو زیادہ جانتے ہو) اور یہ معنی بھی ہوسکتے ہیں اَنْتُمْ اَعْلَمُ بِتَدَابِیْرِ اُمُوْرِ دُنْیَاکُمْ (تم دنیوی کاموں کے طریقے خوب جانتے ہو) پس تم نے دوسرے معنی کو کس دلیل سے ترجیح دی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ میں نے دوسرے معنی کو اس لئے ترجیح دی ہے کہ دوسری احادیث سے یہ بات ثابت ہے کہ ہم لوگ دنیوی کاموں کے احکام کو حضور صلے اللہ علیہ وسلم سے زیادہ نہیں جانتے۔

چنانچہ حضرت زینب رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے نکاح کا واقعہ اوپر گذر چکا ہے اس کے علاوہ اور بھی بہت احادیث اس قسم کی ملیں گی۔ دوسرے خود اس حدیث کے واقعہ سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ جو مطلب میں نے بیان کیا ہے وہی صحیح ہے۔ آپ نے فقط انہی الفاظ کو دیکھا ہے اس لئے اشکال پیدا ہوا اگر پوری حدیث کو دیکھتے تو شبہ نہ ہوتا۔ اور اکثر آیات و احادیث میں جہاں کسی کو اشکال ہوتا ہے اس کا سبب زیادہ تر یہی ہوتا ہے کہ اس کے سیاق وسباق میں غور نہیں کیا گیا اس لئے طلبہ کو چاہیے کہ ہر آیت کو منفرداً نہ دیکھا کریں بلکہ اُس کی ساتھ اُس کے سیاق وسباق میں بھی غور

کیا کریں تب ان شاء اللہ تعالٰی کوئی اشکال نہ ہوگا۔

چنانچہ اس وقت مجھ کو ایک آیت یاد آئی اس میں اکثر طلبہ کو اشکال ہوا کرتا ہے لیکن اس کا منشاء بھی سباق میں نظر نہ کرنا ہے۔ حق تعالٰی فرماتے ہیں وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا ؕ ترجمہ آیت کا یہ ہے۔ اور حق تعالٰی کافروں کو ہرگز مسلمانوں پر راہ نہ دے گا یعنی غالب نہ کرے گا۔

اس پر اشکال ہوتا ہے کہ ہم تو دیکھتے ہیں بعض دفعہ کفار کو مسلمانوں پر غلبہ ہوجاتا ہے مگر ان صاحبوں نے اس سے پہلے جملے کو نہیں دیکھا، پوری آیت اس طرح ہے۔ فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا ؕ پس خدا مسلمانوں میں اور کافروں میں قیامت کے دن فیصلہ فرما دیں گے اور خدا تعالٰی کافروں کو ہرگز مسلمانوں پر راہ نہ دے گا یعنی قیامت کے فیصلہ میں ہرگز ان کو غلبہ نہ ہوگا کیونکہ وہ ظہور حقائق کا وقت ہے اس وقت حق و باطل میں پورا امتیاز ہوجائے گا، اس لئے وہاں حق ہی کو غلبہ ہوگا۔ باطل کو ہرگز غلبہ نہ ہوگا اور دنیا دارالعمل ہے یہاں بطور امتحان کے کبھی باطل کو حق پر غلبہ ظاہر میں ہوسکتا ہے تو یہاں دنیوی سلطنت و حکومت سے کیا بحث جو یہ اشکال وارد ہو۔ دنیا میں کفار کے غلبہ کی نفی اس آیت سے کہاں مفہوم ہوتی ہے۔ پس قرآن و حدیث کو جب دیکھو پورے مضمون کو دیکھو ادھورا مضمون مت دیکھو، اشکال اسی سے وارد ہوتا ہے۔ پس سب سے پہلے اس حدیث کا واقعہ دیکھنا چاہیئے وہ یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ منورہ میں تشریف لائے تو اہل مدینہ کو آپ نے دیکھا کہ وہ کھجوروں کی تابیر کرتے ہیں۔ تابیر اسے کہتے ہیں کہ نر کھجور کے پھولوں کو مادہ سے چھوا دیا جائے۔ خدا تعالٰی کی قدرت ہے کہ کھجور میں ایک نر ہوتا ہے ایک مادہ. نر کے اوپر صرف پھول آتے ہیں پھل نہیں آتا، مادہ پر پھل بھی آتا ہے تو نر کے پھولوں کو مادہ کے اوپر سے چھوا کر گرا دیا جاتا ہے اس سے مادہ پر بہت پھل آتا ہے اگر ایسا نہ کیا جائے تو پھل کم آتا ہے، عجیب خدا کی قدرت ہے۔ جب ایک مس گل میں یہ خاصیت ہے کہ اس سے مادہ بار آور ہوجاتی ہے تو اگر نفخ جبریل سے حضرت مریم علیہا السلام کو حمل رہ گیا تو

کیا تعجب کی بات ہے ملحدوں کی عقل میں یہ بات نہیں آتی اس لئے وہ اس واقعہ کے منکر ہیں اور انہوں نے یوسف نجار کو حضرت مریم علیہا السلام کا شوہر نکالا خیر ملحدوں پر تو تعجب نہیں کیونکہ وہ قدرت خداوندی کے قائل نہیں مگر افسوس یہ ہے کہ بعض مسلمانان مدعی مفسریت نے بھی جن کو مفسر کہنا ہرگز جائز نہیں اس واقعہ نفخ جبریل کا انکار کیا ہے اور یوسف نجار کو حضرت مریم کا شوہر مانا ہے جو نصوص قرآنیہ کے صریح خلاف ہے۔ ان لوگوں کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ جبریل علیہ السلام کی پھونک سے حمل کیونکر رہ گیا' ان لوگوں کو تابیر سے سبق لینا چاہیئے کہ نر کے پھول چھوانے سے مادہ کھجور کیونکر بار آور ہو جاتی ہے۔

غرض حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو تابیر سے نرم عنوان سے منع فرمایا کہ اگر تم یہ کام نہ کرو تو بہتر ہے۔ غالباً آپ کو ٹوٹکہ اور شگون کا احتمال ہوا کہ کہیں یہ عمل بطور شگون کے نہ کیا جاتا ہو۔ آپ کو یہ نہ معلوم تھا کہ اس میں یہ خاصیت فطرۃً رکھی ہوتی ہے اور کھجور پر زیادہ پھل آنے کا یہی طریقہ ہے۔ شاید کوئی یہاں یہ شبہ کرے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اتنی بات معلوم نہ تھی۔ میں کہتا ہوں کہ ہاں ہم فخر کے ساتھ کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تابیر کی خاصیت معلوم نہ تھی کیونکہ آپ سائنس داں نہ تھے کہ جڑی بوٹیوں کی خاصیتیں اور باغبانی کا فن بھی جانتے۔ آپ محض رسول و نبی (صلے اللہ علیہ وسلم) تھے آپ کے لئے یہی فخر ہے کہ آپ احکام الہٰی اور طرق وصول الی اللہ کے جاننے والے تھے اور دنیا کی صنعتوں کو نہ جانتے تھے۔

سائنس کی حقیقت علوم شرعیہ کے سامنے ایسی ہے جیسے پاخانہ کمانے کا فن کسی فن شریف کے سامنے ہے اب اگر ایک شخص کسی نواب کی تعریف میں یہ کہے کہ فلاں رئیس پاخانہ کمانے کے فن سے بھی ماہر ہیں اور دوسرا یہ کہے کہ وہ اس کام کو جانتے بھی نہیں ان کو اس سے مس بھی نہیں تو بتلایئے ان دونوں میں ادب والا کون ہے۔ پس جو لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف میں یہ کہتے ہیں کہ آپ بڑے سائنس داں تھے وہ ایسے ہی گستاخ ہیں جیسے وہ شخص سائنس کو آپ سے ایسی ہی نسبت ہے جیسے اُس فن کو کسی نواب سے پس حقیقت میں آپ کا ادب اور آپ کی تعظیم اسی میں ہے کہ ہم صاف صاف کہدیں کہ ہمارے رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم محض رسول و نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) تھے سائنس داں نہ تھے انبیاء تو ان کاموں سے منع کرتے ہیں کہ بلا ضرورت حقائق و خواص اشیاء عالم کے دریافت کرنے میں مشغول ہوں بلکہ اپنی آخرت کی اصلاح میں مشغول ہونا چاہیئے ؎

حدیث مطرب و مے گو و رازِ دہر کمتر جو
کہ کس نکشود و نکشاید بحکمت این معما را

(عشق و محبت الٰہی کی باتیں کرو زمانہ کے اسرار کی جستجو ترک کرو کہ کسی نے بھی اس معمہ کو حکمت سے حل نہیں کیا نہ آئندہ کر سکے گا۔)

رازِ دہر سے مراد زمانہ کے واقعات اور فنون طبعیہ ہیں جن میں خواص اشیاء و حقائق اجزاء عالم سے بحث کی جاتی ہے۔ فلاسفہ یونان خود اقرار کرتے ہیں کہ علوم طبعیہ تمام علوم میں ادنیٰ ہیں اور اشرف العلوم علمِ الٰہی ہے۔ پس انبیاء علیہم السلام اشرف العلوم میں مشغول ہوتے ہیں ادنیٰ علم کے پیچھے نہیں پڑتے جس کو اصلاح آخرت میں کچھ بھی دخل نہیں۔ غور کیجیے ایک شخص محبوب سے ملنے گیا اس کے محبوب نے اپنی ملاقات کے لئے ایک خاص میعاد مقرر کر رکھی ہے کہ جو شخص اسی میعاد میں میرے پاس آئے گا میں اس سے ملوں گا اور جو میعاد کے بعد آئے گا اس سے نہ ملوں گا۔ راستہ میں محبوب کا شہر اور قلعہ پڑا اس نے نہ شہر کے بازاروں کی سیر کی نہ قلعہ کے محلات کی سیدھا محبوب کے پاس چلا گیا اور دوسرا شخص بھی اسی کی ملاقات کو گھر سے نکلا لیکن جب محبوب کے شہر میں پہونچا تو بازاروں کا بھاؤ تاؤ معلوم کرنے اور قلعہ کے پتھروں کی قیمت دریافت کرنے لگا کہ یہ کہاں سے آئے ہیں، کیونکر آئے ہیں کس نے تراشے ہیں پورے مکان کی کیا لاگت ہے یہاں تک کہ اسی حساب و کتاب میں ملاقات محبوب کی میعاد نکل گئی جب وقت گذر گیا تو آپ محبوب کے سامنے پہونچے اس نے فوراً کان پکڑوا کر دربار سے باہر نکال دیا بتلایئے ان دونوں میں آپ کسے عاقل کہیں گے یقیناً اسی شخص کو عاقل کہیں گے جس نے کسی چیز کی طرف لقاء محبوب سے پہلے توجہ نہیں کی۔

اے صاحبو! اسی طرح حق تعالیٰ نے آپ کے لئے ایک میعاد مقرر کی ہے یعنی یہ عمر عزیز

پس جو شخص موت کے وقت تک حق تعالیٰ کی معرفت حاصل کرلے اس سے تو وہ ملتے ہیں اور جو ساری عمر خرافات میں گذار دے اس سے وہ کبھی نہ ملیں گے پس جو عاشق ہوگا وہ خرافات میں ہرگز نہ پڑے گا اسی لئے انبیاء علیہم السلام کبھی حقائق اشیاء عالم کے درپے نہیں ہوئے نہ انہوں نے اپنی امت کو اس کی تعلیم دی ہے بلکہ اس میں انہماک سے منع فرمایا ہے پس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ، تابیر کو نہ جاننا کوئی نقص نہیں ہے غرض آپ نے صحابہؓ سے فرمایا کہ اگر تم یہ نہ کرو تو اچھا ہے۔ صحابہؓ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عاشق تھے فوراً چھوڑ دیا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم ایسے جاں نثار تھے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مرضی کسی امر کے متعلق ان کو معلوم ہوجاتی فوراً اس کی تعمیل کرتے تھے نفع ونقصان کی ذرا پروا نہ کرتے تھے چنانچہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک صحابی کے مکان کی طرف گذرے حدیث میں آتا ہے فَرَأَی قُبَّۃً مُشْرِفَۃً" کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے وہاں کوئی قبہ بلند دیکھا، دریافت فرمایا کہ یہ مکان کس کا ہے صحابہؓ نے بتلادیا کہ فلاں صحابی کا ہے۔ بس اتنی بات ہوئی تھوڑی دیر میں وہ صحابی حاضر خدمت ہوئے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے منہ پھیر لیا، انہیں یہ کہاں گوارا تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا رُخ پھرا ہوا دیکھیں بس بے تاب ہوگئے۔ کسی نے خوب کہا ہے ؎

از فراق تلخ مے گوئی سخن
ہر چہ خواہی کن ولیکن ایں مکن

(فراق کی باتیں کرتے ہو اور جو چاہو سو کرو مگر یہ نہ کرو)

صحابہ سے دریافت کیا کہ آج حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا رُخ مجھ سے پھرا ہوا کیوں ہے کہ ہم کو اور تو کچھ معلوم نہیں البتہ آج حضور صلی اللہ علیہ وسلم تمہارے مکان کی طرف گذرے تھے بلند قبہ دیکھ کر دریافت فرمایا تھا کہ یہ کس کا گھر ہے۔ بس اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو وہ بلند قبہ ناگوار ہوا ہو تو ممکن ہے۔ باقی اور کوئی بات ہماری سمجھ میں نہیں آتی وہ بھی ایسے عاشق تھے کہ یہ بھی تحقیق نہ کیا کہ یہ سبب واقعی ہے یا محض احتمال ہی احتمال ہے اس وہم پر کہ اس قبہ ہی سے شاید آپ کو ناگواری ہوئی ہو فوراً جاکر اُسے

ڈہا دیا ؎

بہر چہ از دوست دامانی چہ کفر آں حرف و چہ ایماں
بہر چہ از یار دور افتی چہ زشت آں نقش و چہ زیبا

(یعنی جس چیز کی وجہ سے محبوب سے دوری ہو وہ قابل ترک ہے خواہ وہ کچھ ہی ہو)
اس کے چند روز بعد پھر آپ کا گذر اُس مکان کی طرف ہوا تو آپؐ نے وہ قبہ نہ دیکھا دریافت فرمایا کہ یہاں ایک بلند قبہ تھا اب کیا ہوا صحابہؓ نے عرض کیا کہ اس کے مالک کو آپؐ کی ناگواری کا احتمال ہوا اس لئے ڈھا دیا، سبحان اللہ خلوص اس کا نام ہے کہ مکان کو ڈہا کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع بھی نہیں کی کہ میں نے آپ کی رضا کے لئے یہ کام کیا ہے آجکل لوگوں کی یہ حالت ہے کہ اگر شیخ ان کو کسی ایسی بات کا حکم کرے جس میں بظاہر اُن کا دنیوی ضرر ہوتا ہو گو آخرت کا نفع ہی نفع ہو تو اول تو دنیوی ضرر کو گوارا کرنے والے ہی کم ہیں اور جو ہیں بھی وہ دس مرتبہ شیخ کو آکر سناتے ہیں کہ ہم نے آپ کے ارشاد کی تعمیل کر دی جس میں در پردہ شیخ پر احسان رکھنا ہوتا ہے۔ غرض صحابہ نے تابیر کو اس سال چھوڑ دیا تو اُس مرتبہ پھل کم آئے۔ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ اس سال پھل کم کیوں آئے معلوم ہوا کہ تابیر نہ کرنے سے ایسا ہوا۔ آپ نے فرمایا کہ اچھا تابیر کر لیا کرو۔ اس وقت آپ نے یہ بھی فرمایا اَنْتُمْ اَعْلَمُ بِاُمُوْرِ دُنْيَاكُمْ (تم دنیا کے کاموں کو زیادہ جانتے ہو) اس کا صاف مطلب یہی ہے کہ دنیوی کاموں کا طریقہ اور اسباب کے خواص تم زیادہ جانتے ہو یعنی مجھے اس خاصیت کی اطلاع نہ تھی۔ اور یہ مطلب ہرگز نہ تھا کہ دنیوی کاموں کے احکام میں تم خود مختار ہو۔ اگر یہ مطلب ہوتا تو آپ پہلے ہی سے منع کیوں فرماتے آپ نے ممانعت اس لئے کی ٹوٹکہ اور شگون کا آپ کو شبہ ہوا تھا جب یہ احتمال رفع ہو گیا اور معلوم ہوا کہ تابیر میں یہ خاصیت فطری ہے اس وقت آپ نے اجازت دیدی۔ باقی اس ارشاد کی حکمت کیا ہے سو میرے دل میں یہ بات القا ہوئی ہے کہ اس خاصیت کے معلوم نہ ہونے سے شاید کسی کو نبوت میں شبہ ہو جاتا کہ آپ کو اتنی بھی خبر نہیں اس لئے حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ بتلا دیا کہ یہ نہ جاننا کوئی نقص نہیں ہے کیونکہ ہم دین کے

واسطے آئے ہیں، دنیا کے کاموں کا طریقہ جاننا نبوت کے لئے ضروری نہیں اور اُن کا نہ جاننا نبوت میں نقص نہیں۔ آجکل تو پیری کے واسطے بھی لوگ علمِ محیط کو لازم سمجھتے ہیں اور بعض لوگ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے واسطے علمِ محیط کے قائل ہو گئے ہیں اب **وہ** لوگ دیکھیں کہ یہ حدیث کیا بتلا رہی ہے اس سے صاف معلوم ہو رہا ہے کہ نبوت کے لئے علم محیط ضروری نہیں۔ البتہ جو علوم لوازم نبوت سے ہیں یعنی علوم ضروریہ دینیہ ان کا حصول لازم ہے غرض یہ ثابت ہو گیا کہ مباحات میں بھی شریعت کو تصرف کا اختیار ہے چنانچہ اسی بنا پر ارشاد ہے وَأْتُوا الْبُيُوتَ مِنْ أَبْوَابِهَا کہ گھروں میں دروازہ سے آیا کرو۔ ظاہر ہے کہ یہ امر عبادات کے متعلق نہیں بلکہ عادات کے متعلق ہے اور اُس میں یہ تصرف کیا کہ بدون حکم شرعی کے کسی عادت کو ناجائز اور کسی کو باعثِ ثواب نہ سمجھو۔ اس آیت میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ انتظام بھی مطلوب شرعی ہے ہر کام میں خواہ دینی کام ہو یا دنیوی۔ چنانچہ گھر میں پیچھے سے آنا خلافِ انتظام ہے اس سے منع کیا گیا اور دروازہ سے آنے کا امر فرمایا گیا۔ اس میں رعایت انتظام کی تاکید ہے مگر ایک تاویل پر تو قاعدہ کلیہ کے طور پر یہ تعلیم کی گئی ہے وہ تاویل یہ کہ وَأْتُوا الْبُيُوتَ مِنْ أَبْوَابِهَا (گھروں میں دروازوں سے آیا کرو) میں بیوت عام ہو مقاصد کو اور ابواب عام ہو اُن طرق کو جو ہر کام کے لئے مقرر ہیں۔ مطلب یہ ہوا کہ سب کاموں کو ان کے طریقوں سے کیا کرو۔ اس میں گھروں میں دروازوں سے آنا بھی داخل ہے۔ اور ایک تاویل پر بطور قیاس کے اس پر دلالت ہوگی کہ جس طرح بیت میں باب سے داخل ہونا ایک انتظام ہے اسی طرح ہر مقصود میں اس کے طریق سے داخل ہونا ایک انتظام ہے۔

ایک بزرگ نے اس مضمون کو وَقَدِّرْ فِي السَّرْدِ (کڑیوں کے جوڑنے اندازے کا لحاظ رکھا کرو) سے اخذ کیا ہے۔

حق تعالےٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کو حکم فرمایا تھا کہ تم زرہ بنایا کرو مگر اس کی ساتھ یہ بھی تعلیم فرمائی وَقَدِّرْ فِي السَّرْدِ یعنی کڑیوں کے جوڑنے میں اندازہ کا لحاظ رکھو کہ سب متناسب اور متناسق ہوں یہ نہ ہو کہ ایک بڑی اور ایک چھوٹی ہو جاوے۔ اس سے

معلوم ہوا کہ انتظام مطلوب ہے ہر امر میں حتّٰی کہ دنیا کے کاموں میں بھی۔ مگر اتنا فرق ہے کہ دنیا کے کاموں میں انتظام مطلوب بالذات نہیں ہے کہیں آپ دنیا ہی کو قبلہ وکعبہ بنا لیں بلکہ مقصود بالذات دین کے کاموں میں انتظام ہے لیکن جب تک ہر کام میں انتظام کی عادت نہیں ہوتی اس وقت تک دین کے کاموں میں بھی انتظام نہیں ہوتا اس لئے دنیا کے کاموں میں اس واسطے سے انتظام مطلوب ہو گیا۔ بعض لوگ تو فطرتاً منتظم ہوتے ہیں وہ دنیا اور دین دونوں کے کام انتظام اور اصول کے ساتھ کرتے ہیں اور بعض لوگ فطرۃً غیر منتظم ہوتے ہیں ان کو بتکلف انتظام کا عادی بننا چاہیئے ہر کام کے لئے وقت مقرر کر لینا چاہیئے اور وقت پر ایک کام سے فارغ ہو کر دوسرا کام کرنا چاہیئے۔ جب آدمی اعتدال سے ہر کام کرتا ہے تو شدہ شدہ انتظام پیدا ہو جاتا ہے پھر اس کا دین بھی منتظم ہوتا ہے۔ پس دنیا کے کاموں میں اس کی ضرورت ہے کہ جس کی طبیعت میں انتظام نہیں ہوتا وہ دین کے کام میں بھی بے ڈھنگا ہوتا ہے۔ حضرات صوفیہ کو اس کا بڑا اہتمام ہے حضرت سلطان نظام الدینؒ کے یہاں دو شخص بیعت کیواسطے آئے آپس میں کہنے لگے کہ ہمارے یہاں کا حوض اس مسجد کے حوض سے بہت بڑا ہے سلطان جی نے سُن لیا، پوچھا کتنا بڑا ہے۔ کہنے لگے یہ تو معلوم نہیں، سلطان جی نے فرمایا کہ جاؤ ناپ کر آؤ۔ بے چارے مرتے کھپتے گئے اور جا کر اُسے ناپا تو ایک بالشت بڑا نکلا۔ بڑے خوش ہوئے کہ ہماری بات سچی رہی۔ مہینہ بھر کے بعد حاضر خدمت ہوئے تو سلطان جی نے پوچھا کہ حوض کو ناپ آئے کہا حضور ہاں، فرمایا کتنا بڑا ہے بتلایا کہ ایک بالشت بڑا ہے۔ سلطان جی نے فرمایا کہ تم تو یوں کہتے تھے کہ ہمارا حوض بہت بڑا ہے ایک بالشت بڑے کو بہت بڑا نہیں کہہ سکتے۔ تم میں تحقیق وانتظام کا مادہ نہیں ہے جاؤ تمہاری ہم سے موافقت نہ ہو گی ہم بیعت نہ کریں گے۔

اسی طرح ایک بزرگ کا معمول تھا کہ جب کوئی طالب ان کے یہاں آتا تو روٹی اور سالن معمولی خوراک سے مگر باہمی تناسب کی رعایت سے اس کے آگے بھیجتے کھانا بچنے کے بعد پھر دیکھتے سو اگر وہ مناسب انداز سے روٹی سالن چھوڑتا تب تو بیعت کر لیتے اور اگر سالن ختم کر دیا روٹی چھوڑ دی یا روٹی ختم کر گیا اور سالن چھوڑ دیا یا دونوں چیزیں چھوڑیں مگر مناسب انداز سے نہیں

بلکہ روٹیاں دو ہیں تو سالن ایک ہی روٹی کا ہے یا برعکس تو اسے بیعت نہ فرماتے تھے اور کہہ دیتے کہ تمہارے اندر سلیقہ اور انتظام نہیں ہمارا تمہارا نباہ نہ ہوگا۔ اگر آج کل کوئی شیخ ایسا برتاؤ کرے تو اس کو بدمزاج کہتے ہیں۔ بھلا ان ناقدروں سے کیا توقع کی جائے۔

ایک بزرگ سے ایک شخص نے اسم اعظم کی درخواست کی تھی، انہوں نے کہا کہ تمہارے اندر چھچھورا پن ہے تم سے ضبط نہ ہوگا ظاہر کر دوگے اس لئے تم اس کے قابل نہیں وہ کہنے لگا کہ حضور اب سے میں ضبط سے کام لیا کروں گا اور چھچھورا پن چھوڑ دوں گا۔ خاموش ہوگئے ایک دن انہوں نے ایک پیالہ سرپوش سے ڈھک کر دیا کہ فلاں بزرگ کو دے آؤ مگر راستہ میں کھول کر مت دیکھنا وہ لے کر چلا تھوڑی دیر تو اپنے نفس کو دبایا بہت ضبط کیا مگر پھر یہ خیال غالب ہوا کہ ایک نظر سے دیکھ لینے میں کیا حرج ہے۔ معلوم تو کرنا چاہیئے کہ اس میں کیا ہے آخر نہ رہا گیا اور سرپوش کھول کر دیکھا پیالہ میں سے ایک چوہا پھدک کر نکلا اور بھاگ گیا۔ اب یہ بڑے پریشان کہ اب کیا جواب دوں گا، مگر ساتھ ہی یہ حیرت کہ یہ معاملہ کیا ہے۔ کیا شیخ نے میری ساتھ ہنسی کی ہے یا اُن بزرگ کے ساتھ مذاق کیا ہے۔ آخر کار خالی پیالہ لیکر بزرگ صاحب کے پاس پہونچے کہ مجھے فلاں صاحب نے یہ پیالہ دے کر بھیجا تھا اور سارا واقعہ بیان کیا کہ مجھے حضرت نے منع کر دیا تھا کہ پیالہ کو کھولنا مت۔ میں نے اسے راستہ میں کھولکر دیکھ لیا مجھ سے رہا نہ گیا تو اس میں سے ایک چوہا نکل کر بھاگ گیا، اب میں شرمندہ بھی ہوں اور متحیر بھی۔ ان بزرگ نے پوچھا کہ کیا تم نے اپنے شیخ سے کوئی درخواست کی تھی۔ کہا ہاں میں نے اسم اعظم کی درخواست کی تھی، مگر انہوں نے یہ فرمایا تھا کہ تمہارے اندر چھچھورا پن ہے میں نے وعدہ کیا تھا کہ اب ضبط سے کام لیا کروں گا۔ اُن بزرگ نے فرمایا کہ یہ واقعہ تمہارے اسی دعوے کا جواب ہے کہ تم سے ایک چوہے کی نگہبانی تو ہو نہ سکی تم اسم اعظم کی نگہداشت اور اس کے حقوق کی رعایت کیسے کرو گے۔ وہ بیچارہ اپنا سا مُنھ لے کر رہ گیا۔

صاحبو! یہ حضرات اہل اللہ بڑے سمجھ دار ہوتے ہیں اور نازک مزاج بھی بہت ہوتے ہیں لوگوں نے بعض سلاطین کو نازک مزاج سمجھ رکھا ہے مگر وہ اہل اللہ کے سامنے کیا چیز ہیں، ہم نے بزرگوں کا مشاہدہ کیا ہے تم نے مشاہدہ نہ کیا ہو تو تکذیب کر سکتے ہو۔ اہل اللہ

یں ذکر کی وجہ سے بہت لطافت آجاتی ہے اس لئے ان کا مزاج بہت لطیف و نازک ہو جاتا ہے۔ حضرت مرزا مظہر جان جاناں رحمۃ اللہ ایک مرتبہ صبح کو سو کر اٹھے تو آنکھوں میں سرخی تھی لوگوں نے وجہ دریافت کی تو فرمایا کہ رات سردی لگی اس لئے نیند نہ آئی، ایک مریدنی ضعیفہ حاضر تھی حاضرین سے کہا کہ کوئی صاحب فکر نہ کریں اس کا اہتمام میں کروں گی۔ چنانچہ اُٹھ کر گئی اور دن بھر میں ایک دولائی تیار کر کے رات کو لائی آپ اس وقت لیٹ گئے تھے۔ فرمایا میرے اوپر ڈال دو وہ ڈال کر چلی گئی۔ صبح کو پھر آنکھیں سُرخ تھیں۔ لوگوں نے وجہ دریافت کی، فرمایا رات سردی تو نہیں لگی مگر نیند پھر بھی نہ آئی کیونکہ دولائی میں نگندے ٹیڑھے پڑے ہوئے تھے اس سے طبیعت کو بار بار اُلجھن ہوتی تھی۔ بھلا ایسا ادراک کہیں سلاطین کا بھی ہوا ہے کہ دُولائی اوڑھ کر اندھیرے میں نگندوں کا ٹیڑھا ہوتا معلوم ہو جاوے۔

ہمارے استاد علیہ الرحمۃ (مولانا محمد یعقوب صاحب) کا واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ آپ نانوتہ سے کہیں جانے والے تھے۔ مولانا کی سواری کے لئے چھکڑا لایا گیا یہ تو سادگی تھی یہ حضرات لطیف المزاج ہونے کی ساتھ سادے بھی ہوتے ہیں۔ تصنع اور تکلف کا نام لطافت نہیں ہے۔ یہ حضرات سادے تو غریبوں سے زیادہ تھے اور لطیف المزاج بادشاہوں سے زیادہ۔ چنانچہ یہ تو سادگی تھی کہ سواری کے لئے چھکڑا آیا اس کے بعد جو مولانا کا اسباب آیا تو رزائی اس طرح تہ کی ہوئی تھی کہ ابرہ اوپر اور استر اندر کسی نے یہ سمجھ کر کہ غلطی سے اس طرح طے ہو گئی ہو گی استر اوپر کر دیا اور ابرہ اندر۔ کیونکہ عموماً ابرہ کی حفاظت زیادہ کی جاتی ہے کہیں میلا نہ ہو جائے۔ مولانا نے جو آکر دیکھا فرمایا یہ کون عقلمند ہیں جنہوں نے استر اوپر کر دیا، اُن متصرف صاحب نے عرض کیا حضرت طریقہ اس کا یہی ہے تاکہ ابرہ گرد آلود نہ ہو جاوے۔ فرمایا خوب سمجھے جب سارا گرد و غبار استر پر پڑیگا تو رات کو اوڑھتے وقت وہ ہمارے دماغ میں نہ پہونچے گا ابرہ کو اوپر کرو۔ اس پر اگر گرد پڑے گی تو بہت سے بہت دیکھنے میں بُرا معلوم ہوگا مگر ہمارا دماغ تو گرد سے محفوظ رہے گا تم نے ہمارے دماغ سے زیادہ ابرہ کی حفاظت کی۔ اس وقت معلوم ہوا کہ حقیقت

یں حکماء یہ لوگ ہیں اور لطافت ان کے اندر ہے رؤساء اور نوابوں کو تو محض دعوے ہی دعوے ہے۔ اس وقت معلوم ہوا کہ اہل اللہ سے زیادہ سلیقہ دنیا والوں کو بھی نہیں ہوتا گو ان حضرات کو تجربہ نہ ہو۔ تجربہ اور چیز ہے سلیقہ اور چیز ہے۔ میں نے یہ اس واسطے کہہ دیا کہ کہیں آپ چارپائی بننے کے لئے ان کو نہ دیدیں کہ ہم نے سُنا تھا کہ اہل اللہ کو دنیا والوں سے زیادہ سلیقہ ہر کام کا ہوتا ہے۔ پس آپ چارپائی خوب بنیں گے۔ تو صاحبو! اہل اللہ کو سلیقہ تو ہوتا ہے مگر تجربہ نہیں ہوتا اور بعض کاموں کے لئے سلیقہ کافی نہیں ہوتا بلکہ تجربہ کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔

بجنور میں ایک شخص نے ایک عالم کا رد لکھا لوگوں نے اس سے کہا کہ تم تو جاہل ہو تم نے مولوی صاحب کا رد کیا خاک لکھا ہوگا وہ کہنے لگا کہ میں نے فارسی پڑھی ہے اور اس سے سب کچھ آجاتا ہے تو اس شخص نے چارپائی اس کے حوالہ کی کہ ذرا اس کو بھی بُن دو اس نے کہا کہ یہ کام تو مجھے نہیں آتا' وہ بولا کہ بس اس برتہ پر دعویٰ کرتے ہو کہ فارسی سے سب کچھ آجاتا ہے۔ تو مجھے ڈر ہے کہ میرے کلام کے بھی کہیں یہی معنے نہ سمجھے جائیں اس لئے میں نے بتلا دیا کہ تجربہ اور چیز ہے سلیقہ اور ہے۔ علماء و طلبہ کو واقعی تجربہ دنیا کے کاموں کا نہیں ہوتا جس کی وجہ ظاہر ہے کہ ان کو ان کاموں کی نوبت کم آتی ہے۔

کانپور میں ایک عربی خواں طالب علم سے ایک انگریزی خواں نے سوال کیا کہ بتلاؤ ثوابت کی شمار کیا ہے انہوں نے کہا کہ مرصودہ کا عدد تو لکھا ہے کہ ایک ہزار بائیس ہیں مگر غیر مرصودہ معلوم نہیں وہ بولا بس یہی ریاضی پڑھی ہے اُس نے سائل سے یہ سوال کیا کہ اچھا آپ بتلادیں کہ سمندر میں مچھلیاں کتنی ہیں اور یہ سوال زمین کا ہے اور آپ کا سوال آسمان کا ہے پہلے آپ زمین کا حال بتلا دیں تو میں بھی آسمان کا حال بتلا دوں گا۔ اب وہ خاموش ہیں طالب علم نے کہا بس یہی جغرافیہ پڑھا ہے آج کل یہ بھی ایک مرض ہے کہ مولویوں سے اینڈے بینڈے سوالات کرتے ہیں اور اگر ان سے جواب نہ آئے تو ان کے علم پر اعتراض کرتے ہیں کہ انہوں نے کیا خاک پڑھا ہے اتنی بات کا تو جواب نہ دے سکے۔ سبحان اللہ اسی لئے تو علماء نے پڑھا لکھا ہے کہ آپ کے واہیات سوالات کو حل کیا کریں اُن سے احادیث و آیات کا مطلب

پوچھو مسائل واحکام واقعات کا جواب لو الغرض دنیا کے کاموں کا تجربہ تو ان کو ضروری نہیں مگر سلیقہ اور تہذیب اور انتظام ان میں اس قدر ہوتا ہے کہ واللہ اہل دنیا کو اس کی ہوا بھی نہیں لگی جس کا امتحان اس طرح ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص ان کے پاس تھوڑے دن رہ کر دیکھ لے اور وہ شخص ایسا ہو جس کو اپنے مہذب اور سلیقہ دار اور منتظم ہونے کا دعویٰ ہو اور اپنے کو بڑا عاقل سمجھتا ہو ان شاء اللہ تعالیٰ وہ اپنے کو بے وقوف کہہ کر نہ اٹھے تو کوئی بات نہیں تھوڑے ہی عرصہ میں اس کو اپنی تہذیب کا بدتہذیبی ہونا اور اپنے انتظام کا غلط ہونا مشاہد ہو جائے گا۔

تمہید میں وقت زیادہ گذر گیا اب میں مقصود کی طرف عود کرتا ہوں میں نے شروع میں کہا تھا اور پھر عنقریب ہی ضمناً بھی اس کی طرف اشارہ کیا گیا تھا کہ اس آیت کے دو محل ہو سکتے ہیں ایک یہ کہ اس کا تعلق خاص رسم جاہلیت سے ہو جو حج کے متعلق تھی اور اس صورت میں ماقبل سے اس کا ارتباط ظاہر ہے کہ اوپر فوائد ہلال میں حج کا ذکر تھا اور اس رسم کا تعلق بھی حج سے ہے۔ دوسرا محل یہ کہ بطریق استعارہ کے اس میں مطلقاً ہر فعل کو صحیح طریق سے کرنے کی تعلیم ہو اور اس صورت میں ربط کے متعلق سوال ہوتا ہے کہ اس سے پہلے یَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ قُلْ هِيَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ ط (لوگ آپ سے چاند کے متعلق سوال کرتے ہیں آپ فرما دیجئے کہ اس کا گھٹنا بڑھنا لوگوں کے کاروبار اور حج کے اوقات کے لئے ہے) مذکور ہے تو اس سے وَلَيْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوْتَ (یہ کوئی نیک کام نہیں ہے گھروں میں تم پچھواڑوں سے آؤ) کو کیا ربط ہے۔ سو وہ ربط یہ ہے کہ ماقبل میں چاند کے متعلق یہ واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ صحابہؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا تھا کہ چاند کے گھٹنے بڑھنے کی کیا وجہ ہے اس پر یہ آیت نازل ہوئی جس میں وجہ اور علت نہیں بیان کی گئی بلکہ حکمت بتلا دی گئی۔ اس سے سائنس دانی کا فضول ہونا یقیناً ثابت ہو گیا۔ پہلے حافظؒ کے شعر سے اس کا فضول ہونا معلوم ہوا تھا اب خود قرآن سے معلوم ہو گیا۔ فرماتے ہیں کہ لوگ چاند کے گھٹنے بڑھنے کے متعلق آپ سے سوال کرتے ہیں کہ اس کی علت کیا ہے تو آپ اُن سے کہہ دیجئے کہ اس میں بہت سی حکمتیں ہیں۔ چنانچہ

اس سے لوگوں کو اپنے کاروبار کے لئے وقت کا اندازہ ہوتا ہے (یہ تو دنیوی نفع ہے) اور حج وغیرہ کے اوقات معلوم ہوتے ہیں یہ دینی نفع ہے۔ تو علت کو چھوڑ کر حکمت بتلانے میں اس پر تنبیہ کر دی گئی کہ علت کا دریافت کرنا فضول ہے حکمت کو معلوم کرنا چاہیئے اس کے بعد ارشاد ہے وَلَيْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا (اور گھروں میں پشت کی طرف سے آنا کچھ نیک کام نہیں بلکہ نیک کام تقوے کا اختیار کرنا ہے) پس اس کا تعلق سابق سے یہ ہوا کہ سوال برمحل اور بے محل کی مثال ایسی ہے جیسے گھر میں دروازہ سے داخل ہونا اور پشت کی طرف سے داخل ہونا۔ پس جس طرح گھر میں بغیر دروازہ کے آنا برا ہے اسی طرح سوال بے محل بھی برا ہے آگے فرماتے ہیں - وَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا اور گھروں میں دروازہ سے آیا کرو۔ یعنی سوالات بھی برمحل کیا کرو بے محل سوال نہ کیا کرو۔ پس اس صورت میں وَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا (گھروں میں دروازوں سے آیا کرو) حکم عام ہوگا اس کو خاص اس واقعہ ہی سے تعلق نہیں ہوگا جو اہل جاہلیت میں رائج تھا کہ وہ حالت احرام میں دروازہ سے گھر میں آنا برا سمجھتے تھے بلکہ ایک عام قاعدہ کا بیان ہوگا کہ ہر کام کو اس کے طریقہ سے کیا کرو جس میں وہ واقعہ بھی داخل ہوگیا اور تبعًا اس کا حکم بھی معلوم ہوگیا کہ احرام میں غیر دروازہ سے آنا نیک کام نہیں پس پہلی تفسیر پر تو وَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا (گھروں میں دروازہ سے داخل ہوا کرو) میں اہل جاہلیت کے خاص فعل کا حکم مذکور تھا اور دوسری تفسیر پر یہ حکم عام ہوگا اور میرا مقصود جس کو اس وقت بیان کرنا منظور ہے اس دوسری تفسیر پر تو آیت کا مدلول بلا واسطہ ہے اور پہلے تفسیر پر چونکہ بواسطہ قیاس اس سے مستنبط ہوتا ہے اس لئے مدلول بواسطہ ہے اور وجہ قیاس ظاہر ہے کہ اِتْيَانُ بُيُوْتٍ مِنَ الظُّهُوْرِ (مکانوں میں پشت سے آنا) ایک بے موقع فعل ہے اور اس لئے مذموم ہے پس ہر فعل بے موقع مذموم ہوگا اب مستدل کو اختیار ہے کہ جس تفسیر سے چاہے مقصود کو ثابت کر دے۔ ایک گدام بھرا ہوا ہے ہم کو اختیار ہے کہ جس چیز کو چاہیں کھانا شروع کر دیں مصری کی ڈلی ہے جدھر سے چاہو منہ مار لو۔ الغرض دونوں صورتوں میں باختلاف توجیہ

آیت سے مستفاد ہوا کہ بے طریقہ اور بے محل اور خلاف قاعدہ کام مت کرو بلکہ ہر کام کو اس کے طریقہ سے کرو اور دنیا کے معاملات میں تو سب لوگ اس قاعدہ کو تسلیم کرتے ہیں مگر مجھ کو یہ بتلانا ہے کہ دین کے بارہ میں لوگ اس قاعدہ کو بالکل چھوڑے ہوئے ہیں چنانچہ آجکل دیکھا جاتا ہے کہ اول تو لوگوں کو دین پر توجہ ہی نہیں حتیٰ کہ بعض لوگ تو دین کو مانع ترقی سمجھتے ہیں اس لئے اس سے آزاد ہونے کی رائے دیتے ہیں ان لوگوں سے تو مجھ کو خطاب نہیں نہ یہ قابل خطاب ہیں کیونکہ اس وقت مسلمانوں کو خطاب ہو رہا ہے بددینوں کو خطاب نہیں ہو رہا اور یہ لوگ مسلمان نہیں بددین ہیں اس لئے ان لوگوں کی میں شکایت نہیں کرتا کیونکہ شکایت اپنوں کی ہوا کرتی ہے غیروں سے کیا شکایت مجھے اصلی شکایت ان لوگوں سے ہے جو واقع میں مسلمان ہیں اور ان کو دین پر توجہ بھی ہے اور وہ دین پر توجہ کرنے کو ضروری بھی سمجھتے ہیں ان کی یہ شکایت ہے کہ یہ لوگ بھی دین کو اس کے طریقہ سے حاصل کرنا نہیں چاہتے بے قاعدہ حاصل کرنا چاہتے ہیں چنانچہ بعض لوگوں کو دیکھا جاتا ہے کہ وہ دین پر دنیا کے لئے توجہ کرتے ہیں۔ نمازیں پڑھتے ہیں، تہجد کو اٹھتے ہیں وظیفے پڑھتے ہیں اور مقصود یہ ہے کہ اسی ذریعہ سے ہمارے مقدمات میں آسانی ہو جائے ہم کو رزق میں فراخی حاصل ہو کیونکہ کسی مولوی سے سُن لیا تھا کہ گناہوں سے روزی میں تنگی ہو جاتی ہے، مصائب نازل ہوتے ہیں تو یہ لوگ محض اسی غرض سے دین دار بنے ہوئے ہیں کہ دنیا کے کام چلتے رہیں۔ جیسے ایک گنوار سے کسی مولوی صاحب نے کہا تھا کہ تو نماز کیوں نہیں پڑھتا۔ اس نے کہا کہ نماز سے مجھے کیا ملے گا۔ مولوی صاحب نے کہا کہ چالیس دن کے بعد تجھے ایک بھینس دونگا اس نے نماز شروع کر دی اور دن گننے لگا گویا بھینس ہی میں فنا ہو گیا اسی سے اس کی حالت معلوم ہو گئی کہ اس کو نماز مقصود نہ تھی۔ جب چالیس دن پورے ہو گئے تو مولوی صاحب کے پاس گیا کہ لاؤ وعدہ پورا کرو انہوں نے کہا کہ جا کیسی بھینس لئے پھرتا ہے میں نے تو اس واسطے کہدیا تھا کہ جو شخص چالیس دن تک نماز پڑھتا رہتا ہے اُسے شوق ہو جاتا ہے میں نے سوچا کہ اس بہانہ سے تجھے نماز کا شوق ہو جاوے گا یہ جواب سن کر وہ گنوار کیا کہتا ہے کہ جاؤ پھر یاروں نے بھی بے وضو ہی ٹرخائی بس پھر نماز چھوڑ دی۔ اور چونکہ اس ظالم نے بے وضو ہی ٹرخائی تھی اسی لئے اس کو شوق بھی نہ ہوا بھلا ایسی نماز کیا اثر کرتی اس حکایت پر تو لوگ ہنسے مگر صاحبو! ہم جیسے

بھی سب اسی میں مبتلا ہیں ہمارے اس ہنسنے کی ایسی مثال ہے ؎

حملہ برخود می کنی اے سادہ مرد ہمچو آں شیرے کہ برخود حملہ کرد

(بے وقوف اپنے ہی اوپر حملہ کرتا ہے جیسا کہ اس شیر نے اپنے اوپر حملہ کیا تھا)

غور کرکے ایسا شخص دیکھ لے کہ اس کو دین کے کاموں میں دنیا مقصود ہے یا نہیں بعض لوگ جب تک تنگیٔ معاش میں مبتلا رہتے ہیں اس وقت تک نمازی اور روزہ دار رہتے ہیں پھر جب فراخی میسر ہوئی اور انہوں نے ان کاموں کو بالائے طاق رکھا گویا دین کو محض دنیا کے لئے اختیار کیا تھا جب وہ حاصل ہوگئی پھر دین کی کیا ضرورت رہی۔ بعض لوگ دین کو اس لئے اختیار کئے ہوئے ہیں کہ ان کو اس کے ذریعے سے جاہ وعزت حاصل ہے لوگ دیندار اور مقتدا سمجھتے ہیں تعظیم وتکریم کرتے ہیں اگر وہ دین داری کے کام چھوڑ دیں تو یہ منافع فوت ہو جاویں گے۔ اس سے بڑھ کر ایک اور تماشا ہے وہ یہ کہ بعض لوگ دنیا کے قصد سے دین کا وہ جزو اختیار کرتے ہیں جس کو خود بھی دین نہیں سمجھتے، جانتے ہیں کہ یہ دین کے کام نہیں سراسر دنیا ہے مگر اپنی اغراض حاصل کرنے کے لئے دوسروں کو سمجھانا چاہتے ہیں کہ یہ دین ہے۔ یہ صورت پہلی صورت سے بھی بدتر ہے کیونکہ گو دونوں جگہ مقصود دنیا ہی ہے اور اس کے لئے دین کو ذریعہ بنایا گیا ہے۔ مگر پہلی صورت میں تو ایسے دین کو ذریعہ بنایا گیا تھا جس کو دین تو سمجھتے تھے تو نیت ہی میں فساد ہوا دین میں تو تغیر نہیں کی اور دوسری صورت میں ایسے دین کو ذریعہ بنایا گیا ہے جس کو خود بھی دین نہیں سمجھتے مگر مخلوق کو دھوکہ دینے کے لئے اُسے دین میں ٹھونسنا چاہتے ہیں تو اس میں فساد نیت اور تغییر دین دونوں ہیں۔ چنانچہ آجکل ایسے بہت کام کئے جاتے ہیں جن کو دین سے کچھ تعلق نہیں ایسے علماء خوب جانتے ہیں کہ یہ محض دنیا ہے مگر نہایت بے باکی کے ساتھ ان کو دین بنایا جاتا ہے۔

اب میں ان دنیا داروں کی شکایت چھوڑتا ہوں صرف مخلص دینداروں کی ایک حالت بیان کرنا چاہتا ہوں۔ آجکل بعضے لوگ جو دیندار ہیں ان میں یہ مرض ہے کہ وہ دین کے کام کرنا چاہتے ہیں مگر اس کا طریقہ معلوم نہیں کرتے۔ (باقی ان شاء اللہ آئندہ)

تو ان کی ایسی مثال ہے کہ مکان بنانا چاہتے ہیں مگر گارے اینٹ کی فکر نہیں۔ کاشت کرنا چاہتے ہیں مگر تخم وغیرہ سامان جمع کرنے کی تدبیر نہیں۔ یوں چاہتے ہیں کہ بے گارے اینٹ کے مکان بن جائے اور بدون تخم کے کاشت ہو جائے بلکہ اس سے بڑھ کر یہ کہ ایسا بے ڈھنگا طریقہ اختیار کرتے ہیں جس سے پہلا جمع کیا ہوا ذخیرہ بھی برباد ہو جائے۔ خدا تعالیٰ سے اگر ان کو کچھ تعلق ہوا بھی تھا وہ ان کی خرافات سے زائل ہو جاتا ہے ان کی بالکل ایسی مثال ہے جیسے ایک شخص نے قرض لیکر مکان بنایا تھا جب قرض خواہ نے تقاضا کیا تو اُس نے غصہ میں آکر سارا مکان ہی ڈہا دیا کہ جاؤ ہم نے تمہارے قرض کا مکان ہی نہیں رکھا اب لیلو کہاں سے لوگے قرضخواہ نے اس کی نالش کردی روپیہ بھی دینا پڑا اور گھر بھی برباد ہوا۔ غرض کام کا طریقہ نہ اختیار کرنے سے یہ لوگ اپنا پہلا سرمایہ بھی برباد کر رہے ہیں صاحبو! دنیا میں جو شخص ایسی بے اصولی کرتا ہے اس کو سب احمق کہتے ہیں مگر افسوس ہے کہ دین میں ایسی بے اصولی کرنے والے کو نہ کوئی دوسرا احمق کہتا ہے نہ وہ خود اپنے کو احمق سمجھتا ہے۔ حالانکہ وہ اس کا مصداق ہے کہ ؎

دماغ بیہدہ پخت وخیال باطل ست (دماغ بیہودہ پکایا خیال باطل باندھا)

افسوس کھیتی کی امید اور اسباب سے غفلت یہ کونسی عقلمندی ہے دنیا میں اگر کوئی کھیتی کی امید کرتا ہے تو وہ اسباب کو اختیار کرتا ہے اور یوں کہتا ہے کہ ؎

رزق ہر چند بیگماں برسد ۔۔۔ لیک شرط است جستن از درہا

(رزق بیشک ملے گا لیکن اس کو اسباب سے تلاش کرنا شرط ہے)

کہ رزق ہر چند بیگماں پہونچتا ہے مگر اس کا دروازوں پر تلاش کرنا شرط ہے۔ جستن از درہا سے بھیک مانگنا مراد نہیں بلکہ یہ وَأْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ أَبْوَابِهَا (گھروں میں دروازوں سے آؤ) کا ترجمہ ہے کہ اسباب عادیہ کا اختیار کرنا اور طریقہ سے کام کرنا شرط ہے یہ مطلب گلستاں پڑھانے والوں کے ذہن میں بھی نہ آیا ہوگا اور میری سمجھ میں بھی آج ہی آیا ہے مولانا بھی اسی مضمون کو فرماتے ہیں ؎

اُطْلُبُوا الْأَرْزَاقَ مِنْ أَسْبَابِهَا ۔۔۔ وَادْخُلُوا الْبُيُوْتَ مِنْ أَبْوَابِهَا

(روزی کو اس کے اسباب سے طلب کرو اور گھروں میں دروازوں سے داخل ہو)

اطلاع ضروری:۔ خط و کتابت کرتے وقت یا اپنا پتہ تبدیل کراتے وقت نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دیں۔

یعنی جس طرح روزی کو اسباب سے تلاش کیا جاتا ہے۔ اسی طرح ہر کام کو اس کے قاعدہ سے کرنا چاہیئے۔ افسوس آج کل اکثر دینداروں کی حالت یہ ہے کہ وہ دین کو دین کے قاعدہ سے نہیں حاصل کرتے ہر شخص اپنے اجتہاد پر عمل کر رہا ہے حالانکہ جب کام خلاف قاعدہ ہوتا ہے تو اس کے ثمرات حاصل نہیں ہوسکتے۔ دیکھئے اگر کھیتی کا قصد ہو اور اسباب اس کے اختیار نہ کئے جائیں تو ثمرہ حاصل نہیں ہوسکتا۔ اور اس حالت میں اس کا امیدوار ہونا کہ مجھے پیداوار ملے گی سراسر بیوقوفی ہے یہی حالت ان لوگوں کی ہے جو دین کے اسباب اختیار نہیں کرتے اور ثمرات کے امیدوار ہیں۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے احیاء العلوم میں رجاء و غرور میں بھی فرق بیان کیا ہے وہ لکھتے ہیں کہ جب اعمال کی اصلاح کرکے اور اعمال صالحہ پر مداومت کرکے خدا تعالیٰ سے امید رکھی جاوے تو یہ رجا ہے اور جو شخص بدون اکتساب اعمال کے بلکہ باوجود ارتکاب معاصی کے امیدوار ثواب کا ہو وہ غرور میں مبتلا ہے۔ پس رجاء صحیح وہ ہے جس کے ساتھ اعمال پر مداومت بھی ہو مگر افسوس ہے کہ لوگوں نے دین میں توکل و تقدیر بمعنی تعطل کا نام رجا رکھ لیا ہے کہ نہ نماز پڑھتے ہیں نہ اعمال صالحہ کی فکر کرتے ہیں نہ اُن کے بجالانے کا طریقہ دریافت کرتے ہیں نہ معاشرت و معاملات کی اصلاح کرتے ہیں۔ اور دعویٰ کرتے ہیں توکل کا کہ ہم کو خدا پر بھروسہ ہے اپنے اعمال پر بھروسہ نہیں خدا تعالیٰ سے امید ہے کہ وہ بخش دیں گے۔ اور دنیا کے کاموں میں جب ان سے توکل کو کہا جاتا ہے تو وہاں یوں کہتے ہیں کہ توکل برحق لیکن پہلے اسباب کو اختیار کرلینا چاہیئے اسباب کو اختیار کرکے پھر خدا پر توکل کرنا چاہیئے دنیا کے کاموں میں تو یہ شعر یاد کر رکھا ہے ؎

گفت پیغمبر بآواز بلند　　　بر توکل زانوئے اشتر ببند

(نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بآواز بلند فرمایا ہے توکل پر اونٹ کا پاؤں باندھ دو)

گر توکل میکنی در کار کن　　　کسب کن پس تکیہ برجبار کن

(اگر تم توکل کرتے ہو تو کاموں میں توکل کرو کسب کرو اور بھروسہ اللہ تعالیٰ پر کرو)

چنانچہ کوئی شخص بدون بیل خریدے اور ہل چلائے کھیتی نہیں کرتا یہاں ہر شخص اسباب کو اختیار کرنے کی رائے دیتا ہے اور جو اس کے بغیر ہاتھ پر ہاتھ رکھے ہوئے کھیتی کا

طالب ہو اُسے سب بیو قوف بناتے ہیں مگر اے اللہ ! دین کے بارے میں یہ ساری عقلیں کیوں مسخ ہوگئیں وہاں توکل بمعنی تعطل کیوں سوجھتا ہے بلکہ دنیا کے بارہ میں تو بعض لوگ اسباب کی ضرورت کے ایسے معتقد ہیں کہ اُن کے بعد خدا تعالیٰ کی بھی ضرورت نہیں سمجھتے ہمارے یہاں ایک شخص زمیندار ہے اس کا بیٹا نیک ہے نماز روزہ کا پابند ہے ایک دن وہ لڑکا نماز کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا کر رہا تھا تو اُس کا تایا کہنے لگا کہ یہ لڑکا نماز کے بعد ہاتھ پھیلا پھیلا کر خدا سے کیا مانگتا ہے اس کو کس چیز کی کمی ہے۔ ناج اُس کے گھر میں بھر رہا ہے، بیل اس کے یہاں ہیں، روپئے کی اسے کمی نہیں پھر خدا سے کیا مانگتا ہے۔ توبہ توبہ اس شخص کے نزدیک بس ان چیزوں کے بعد خدا کی بھی ضرورت نہیں رہی۔ بھلا اگر خدا تعالیٰ غلّہ میں آگ لگادے اور بیلوں کو ماردے اور رقم چوری ہو جائے تو یہ شخص کیا کرلے گا۔ اسی طرح ایک ہمارے ملنے والے ایک جنٹلمین کی حکایت بیان کرتے تھے کہ انہوں نے ایک شخص کو کسی کام کے لئے کہا اس نے کہا کہ یہ کام کل کو ان شاء اللہ تعالیٰ ہو جائے گا تو وہ جنٹلمین کہتے ہیں کہ اس میں خدا کے چاہنے کا (یہ انگریزی طرز کی تقلید ہے) کیا بات ہے بس تم کل کو یہ کام ضرور کر دینا۔ بخدا ان لوگوں کی عقلیں بالکل مسخ ہوگئی ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ اگر آج ہی کوئی دشمن کسی نزاع کی وجہ سے ایک گولی میں اس کا کام تمام کردے اور ایسے واقعات ہوتے رہتے ہیں چنانچہ ان صاحب کا یہی انجام ہوا اور سب سامان حفاظت رکھا رہ گیا تو اس وقت ان کو معلوم ہوا کہ ان شاء اللہ کہنے کی کیسی ضرورت ہے۔ پھر تو شاید وہ ہر بات میں ان شاء اللہ کہیں گے۔ یا دفعۃً پیٹ میں درد ہو اور ہیضہ سے رات ہی کو جان نکل جاوے یا سانس گھُٹ کر مرجاوے تو کیا ہو۔ بھلا انسان کی ہستی ہی کیا ہے جس پر یہ غرور کرتا ہے میاں کی ساری زندگی کا مدار ذرا سے سانس پر ہے جہاں سانس بند ہوئی اور قصہ ختم۔ اور سانس بند ہونے کے لئے کھانا پانی ہی کافی ہے۔ بعض لوگ کھانا کھاتے ہوئے لقمہ اٹک جانے سے مرگئے ہیں اگر ان جنٹلمین صاحب کو ایسا واقعہ پیش آجاوے تو پھر وہ ہر بات میں ان شاء اللہ کہنے لگیں گے۔ جیسے ایک شخص کا قصّہ ہے کہ وہ گھوڑا خریدنے جارہا تھا کسی

دوست سے راستہ میں ملاقات ہوئی پوچھا کہاں جا رہے ہو کہا گھوڑا خریدوں گا اس نے کہا ان شاء اللہ کہہ لو وہ بولا کہ اس میں ان شاء اللہ کہنے کی کیا ضرورت ہے۔ گھوڑا بازار میں ہے اور روپئے جیب میں ہے اب جاؤں گا اور تھوڑی دیر میں خرید لاؤں گا۔ چنانچہ آپ چلے تو راستہ میں کسی جیب کٹ نے جیب میں سے روپئے اڑا لئے۔ اب جو آپ گھوڑا خریدنے کے لئے دام نکالتے ہیں تو وہاں صفایا ہے نادم و پشیمان ہوکر واپس ہوا۔ راستہ میں پھر اُسی دوست سے ملاقات ہوئی۔ اُس نے پوچھا کہو گھوڑا خرید لائے تو آپ کہتے ہیں کہ ہم گھوڑا خریدنے گئے تھے ان شاء اللہ۔ جیب میں اتنے روپئے تھے ان شاء اللہ چور نے جیب کاٹ لی ان شاء اللہ۔ روپیہ چرا لیا ان شاء اللہ۔ اب ہم خالی ہاتھ لوٹ رہے ہیں ان شاء اللہ - اب آپ جوڑ جوڑ ہر بات میں ان شاء اللہ ہی کہنے لگے۔ اور یہ جو اُن جنٹلمین صاحب نے کہا تھا کہ اس میں خدا کے چاہنے کا کیا بات ہے یہ اثر سائنس کا ہے۔

آج کل مسلمانوں نے سائنس والوں کی کاسہ لیسی کی ہے کہ جس طرح وہ محض اسباب پر نظر کرتے ہیں یہ بھی اسباب پر نظر کرتے ہیں۔ مگر تھوڑا سا فرق ہے اسی لئے میں نے یہ کہا کہ ان لوگوں نے سائنس والوں کی کاسہ لیسی کی ہے وہ فرق یہ ہے کہ اہل سائنس تو خدا کے بھی منکر ہیں اور یہ لوگ خدا تعالیٰ کو خالق و مؤثر مانتے ہیں۔ اہل سائنس فطرۃً اور طبیعت کو مؤثر حقیقی جانتے ہیں یہ لوگ فطرۃ کو مؤثر حقیقی نہیں مانتے بلکہ فطرت کو خدا کی مخلوق سمجھتے ہیں مگر یوں کہتے ہیں کہ بس خدا نے فطرت کو پیدا کر کے اس میں تاثیر رکھدی ہے اب خدا کے تصرف کی کچھ ضرورت نہیں جو کچھ ہوتا ہے فطرت اور اسباب کے ذریعہ سے ہوتا ہے جیسے گھڑی کا چلنا کوکنے والے کا محتاج ہے مگر کوک بھر دینے کے بعد اب اس کو چوبیس گھنٹہ تک کوکنے والے کی ضرورت نہیں وہ خود بخود چلتی رہے گی بلکہ کوک بھر دینے کے بعد اگر تم اس کو روکنا بھی چاہو تو وہ رُک نہیں سکتی اسی طرح یہ لوگ خدا کی ضرورت محض کوکنے کے واسطے سمجھتے ہیں اور کوکنے کے بعد خدا کی ضرورت نہیں سمجھتے ان کا خیال یہ ہے کہ خدا نے فطرت اور اسباب کو پیدا کر کے ان میں تاثیر رکھدی اب سارے کام اسباب ہی سے ہوتے ہیں خدا کے تصرف کی کچھ ضرورت نہیں مگر یہ خیال

بالکل باطل ہے مشاہدہ اس کی تکذیب کرتا ہے اگر اسباب میں ایسی تاثیر ہوتی کہ خدا کے چاہنے کو اس میں کچھ دخل نہ رہتا تو اس کی کیا وجہ ہے کہ دوا سے بعض دفعہ نفع نہیں ہوتا بلکہ اُلٹا ضرر ہونے لگتا ہے۔ مولانا ایک حکایت میں فرماتے ہیں ؎

از قضا سرکنگبیں صفرا فزود　　روغن بادام خشکی مے نمود

از ہلیلہ قبض شد اطلاق رفت　　آب آتش را مدد شد ہمچو نفت

(قضا سے شہد نے صفرا بڑھایا اور روغن بادام خشکی کرتا تھا اور ہلیلہ سے قبض ہوا پانی مثل تارکول کے آگ کو تیز کرتا تھا)

اطبا رات دن اس کا مشاہدہ کرتے ہیں کہ ایک دوا ایک مرض کے لئے نافع ہے مگر بعض دفعہ وہی دوا اس مرض کو بڑھانے لگتی ہے نیز اس کی کیا وجہ کہ بعض لوگوں کو کسب سے معاش نہیں ملتی۔ دو شخص برابر سرمایہ سے تجارت کرتے ہیں اور ان میں ایک عاقل ہوتا ہے ایک بیوقوف مگر مشاہدہ ہے کہ بعض دفعہ عاقل کی تجارت نہیں چلتی بیوقوف کی چل جاتی ہے۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ اسباب محض برائے نام بہانہ ہیں ورنہ جو کچھ ہوتا ہے خدا کی مشیت سے ہوتا ہے۔

میں نے ایک شہر میں ایک رئیس کو دیکھا ہے کہ پہلے وہ چھ پیسے کے مزدور تھے پھر ریلوے میں نوکر ہوگئے۔ پھر ریلوے کے ٹھیکے لینے لگے حتیٰ کہ ترقی کرتے کرتے ہزاروں لاکھوں کے آدمی ہوگئے کہ بڑے بڑے بی۔ اے، ایم اے کی ڈگری پاس کرنے والے ان کے یہاں ملازم تھے اور وہ خود اپنے دستخط بھی نہ کرسکتے تھے اگر ترقی کا مدار محض اسباب پر ہے تو ذرا تم کسی دوسرے کو تو چھ پیسہ کی مزدوری سے لاکھوں ہزاروں کا آدمی بنادو۔ اور جس طرح اس رئیس نے ترقی کی ہے اس کو بھی وہی ذرائع بتلادو۔ یقینی بات ہے کہ ہر شخص اُن ذرائع سے ہرگز کامیاب نہیں ہوسکتا۔ اس کے علاوہ ہر شخص رات دن مشاہدہ کرتا ہے کہ آج وہ ایک کام کا ارادہ کرتا ہے جو پورا ہونا چاہا ہے کل کو پھر اُسی کام کا ارادہ کرتا ہے اور پورا نہیں ہوتا۔ اسی لئے ایک بزرگ فرماتے ہیں عَرَفْتُ رَبِّیْ بِفَسْخِ الْعَزَائِمِ کہ میں نے خدا تعالےٰ کو ارادوں کے ٹوٹنے اور ناکام رہنے

سے پہچانا کیونکہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے ارادہ سے کچھ نہیں ہوتا کوئی دوسرا کام کرنے والا ہے

الغرض یہ خیال جو بعض مسلمانوں میں سائنس والوں کی صحبت سے پیدا ہوا ہے کہ اسباب ہی سے سب کچھ ہوتا ہے غلط اور بالکل غلط ہے مگر مجھ کو یہ بتلانا ہے کہ یہ لوگ باوجودیکہ اسباب کے ایسے معتقد ہیں مگر دین کے بارہ میں یہ بھی اسباب کو اختیار نہیں کرتے پس صحیح راستہ یہ ہے کہ نہ اسباب کو مؤثر سمجھے نہ ان کو فضول خیال کرے عادۃ اللہ یہ ہے کہ اسباب گو مؤثر نہیں مگر جو ان کو اختیار کرتا ہے حق تعالیٰ اس کی امداد فرمادیتے ہیں اور جو شخص اسباب کو اختیار نہیں کرتا اس کی ناکامی کا یہ سبب نہیں کہ اسباب مؤثر تھے اور وہ نہیں پائے گئے بلکہ ناکامی کا راز یہ ہے کہ اکثر خدا کی اعانت اسباب اختیار کرنے کے بعد ہوا کرتی ہے اور بدون اس کے نہیں ہوتی۔ پس اس نے خدا کی اعانت کو حاصل نہیں کیا۔ خوب سمجھ لو۔ پس اسباب کو جمع کرکے ثمرات کی امید کرنا رجاء ہے اور بدون اسباب اختیار کئے امید رکھنا غرور ہے۔ جیسے ایک شخص کو اولاد کی خواہش ہو مگر نکاح کا قصد نہ ہو یا کنواں کھودنا چاہے اور ہاتھ نہ ہلائے یہ لوگ احمق کہلائیں گے۔ ان کے دماغ میں مالیخولیا سمجھا جائے گا۔ ہاں نکاح کرکے اولاد کی امید رکھنا، پھاوڑا چلا کر کنویں کے پانی کا انتظار کرنا یہ رجاء ہے۔ اب آپ دیکھ لیجئے کہ دین کے بارہ میں ایسے لوگ کتنے ہیں جو اسباب کو جمع کرکے امیدوار ہوئے ہیں، ایسے بہت ہی کم ہیں اکثر تو محض غرور میں مبتلا ہیں۔ سالکین کی حالت یہ ہے کہ بعض لوگ دین کے طالب بن کر شیخ کے پاس آتے ہیں اور کہتے ہیں کہ حضرت گناہوں سے نفرت نہیں ہوتی کچھ توجہ فرمادیجئے غنیمت ہے کہ یہ لوگ عمل کو کچھ تو ضروری سمجھتے ہیں۔ اسی لئے گناہوں سے نفرت کا اہتمام بھی ہے مگر یوں چاہتے ہیں کہ ہمیں خود کچھ نہ کرنا پڑے سارا کام توجہ سے چل جائے۔ اگر توجہ سے اس طرح کام چلا کریں تو پھر نکاح بھی نہ کیا ہوتا بس توجہ کرالی ہوتی اُسی سے پلا پلایا بچہ تم کو مل جاتا۔ واہیات۔ خوب سمجھ لو کہ

کام قاعدہ ہی سے ہوتا ہے نری توجہ سے کام نہیں چلا کرتا۔ سو قاعدہ کی رد سے گناہوں سے بچنے کے لئے ہمت کی ضرورت ہے، چند دنوں ہمت کر کے دیکھو ان شاء اللہ گناہ خود ہی کم ہو جائیں گے اور جب تم ہی ہمت نہ کرو تو توجہ کیا کرے گی اور اگر کسی کو شبہ ہو کہ ہمت بھی کی اور گناہوں سے اس وقت بچ بھی گئے مگر گناہوں سے نفرت نہیں ہوتی تو ہمت بھی اس کی تدبیر نہ نکلی تو اس کی حقیقت سمجھ لو وہ یہ کہ ہمت کے لئے گناہوں سے نفرتِ عقلی لازم ہے نفرتِ طبعی لازم نہیں اس غلطی میں بہت سے سالکین مبتلا ہیں کہ وہ گناہوں سے نفرت طبعی کو لازم سمجھتے ہیں کہ بس کبھی دل پر وسوسہ بھی نہ آئے اسی لئے ہمت کے بعد اپنے کو ناکام سمجھتے ہیں سو یہ بالکل غلط خیال ہے وسوسۂ گناہ کے مقتضا پر عمل نہ کرنا ضروری ہے۔ بلا قصد وسوسہ کا آنا یا میلان ہونا کچھ مضر نہیں اگر مقتضا پر عمل نہ ہو تو چاہے لاکھ خطرات آتے ہوں اور کیسے ہی گندے وسوسے آتے ہوں واللہ وہ شخص ولی کامل ہے۔ البتہ اگر وسوسہ کے ساتھ اس کے مقتضا پر عمل بھی ہوتا ہو تو یہ اس کی دلیل ہے کہ اس شخص کو گناہوں سے نفرت عقلی بھی نہیں، اس کے علاج کی بیشک ضرورت ہے اور وہ ہمت ہے جس کی تقویت کا طریقہ یہ ہے کہ آیات عذاب و وعید میں غور کرے اور وقت موت اور عذابِ قبر اور میدان حشر کا تصور کیا کرے پھر سوچے کہ گناہوں سے موت کے وقت سخت پریشانی ہو گی۔ قبر میں عذاب ہو گا۔ قیامت میں سب کے سامنے ذلت و رسوائی ہو گی اور دوزخ کا عذاب الگ بھگتنا ہو گا روزانہ ایک وقت میں یہ مراقبہ اور تصور کیا کرے اور روزانہ کے اعمال کا محاسبہ کر کے گناہوں سے سچی توبہ کیا کرے اس سے چند روز میں، ہمت میں قوت ہو کر نفس کی مخالفت سہل ہو جائے گی۔ اب تم اس کی فکر میں نہ پڑو کہ وسوسہ تو اب بھی آتے ہیں۔ وساوس کا آنا کچھ مضر نہیں اور ان کا قطع کرنا تمہارے اختیار سے باہر ہے تم اس کے مکلف نہیں ہو۔ رہا یہ سوال کہ یہ وساوس گو مضر نہیں مگر نہ آتے تو اچھا تھا یہ کیوں آتے ہیں اس کا جواب یہ ہے کہ یہ اس

واسطے آتے ہیں کہ حق تعالےٰ تم کو اجرِ عظیم دینا چاہتے ہیں اگر تم کو گناہوں کا خطرہ بھی نہ آیا کرتا تو پھر اُن سے بچنے میں تمہارا کیا کمال تھا۔ نامرد اگر زنا نہ کرے تو کیا کمال ہے اور اب گناہوں سے بچنے میں تمہارا کمال ظاہر ہوتا ہے کہ وسوسے آتے ہیں خیالات تنگ کرتے ہیں اور تم سب کی مخالفت کرتے ہو اور اسی لیئے انسان فرشتوں سے افضل ہے اگر اس میں گناہوں کا تقاضا بھی نہ ہوتا تو پھر اس میں اور فرشتوں میں فرق ہی کیا ہوتا۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

شہوت دنیا مثال گلخن است

کہ ازو حمام تقویٰ روشن است

(شہوت دنیا مثل کوڑے کرکٹ کے ہے کہ اس سے تقویٰ کا حمام روشن ہے)

سبحان اللہ کیا عجیب تعلیم ہے فرماتے ہیں کہ شہوت دنیا کی مثال ایسی ہے جیسے حمام کے لیئے خس و خاشاک کہ اگر خس و خاشاک کو حمام جلانے کے کام میں لگایا جاوے تو اُس سے حمام روشن ہوتا ہے اور اگر حمام کے کام میں نہ لگایا جاوے تو ظاہر ہے کہ اس سے گھر خراب ہونے کے سوا کچھ فائدہ نہیں۔ تو خدا تعالےٰ نے یہ تقاضا اور یہ وساوس تمہارے اندر اس لیئے پیدا کیئے ہیں تا کہ تم اس سے تقوے کے حمام کو روشن کرو یعنی ان کی مخالفت کر کے ہمت سے ان کے مقتضی پر عمل نہ کرو اگر تم نے ایسا کیا تو تمہارا تقویٰ نہایت لذیذ ہوگا اور اس واسطے یہ تقاضا تم کو نہیں دیا گیا کہ تم اسی سے اپنا گھر بھر لو کہ اس حالت میں تمہارے دل کی وہی حالت ہو جائیگی جو کوڑے کباڑ سے گھر کی حالت ہوتی ہے۔ بس تم کو چاہیئے کہ ان وساوس کے آنے سے دلگیر مت ہو اور ساتھ کے ساتھ تقوے کے حمام میں ان کو جلاتے رہو گھر میں جمع نہ کرو۔ دوسرا نفع یہ ہے کہ تقویٰ میں نشاط و سرور روحانی ان خطرات و وساوس ہی کے بعد حاصل ہوتا ہے اگر تم بازار میں جاؤ اور نہ کوئی عورت تمہارے سامنے سے نہ گذرے تو تم کو نہ گناہ ہوا نہ کچھ خاص نشاط روحانی حاصل ہوا۔ اور اگر کوئی عورت سامنے سے جاتی ہوئی ملی مگر تم نے اس کی طرف نظر نہ کی تو اس وقت اگرچہ تم کو ایک

کلفت ہوگی مگر تھوڑی ہی دیر کے بعد ایک خاص سرور و نشاط حاصل ہوگا جب چاہے تجربہ کرکے دیکھ لو اس وقت تم بزبان حال یوں کہو گے ؎

للّٰہ الحمد نمردیم و رسیدیم بدوست
آفریں باد بریں ہمت مردانۂ ما

(خدا کا شکر ہے کہ ہم نہ مرے اور دوست تک پہونچ گئے، ہماری اس ہمت مردانہ پر آفریں ہو جیو)

اس تقاضے کی مثال ایسی ہے جیسے کھانے میں نمک مگر تم اس سے ایسے گھبراتے ہو جیسے مثل مشہور ہے کہ گدھے کو دیا تھا نمک اس نے کہا میری آنکھیں ہی پھوڑدیں تو جس طرح نمک کھانے میں اعتدال کے ساتھ ہو تو کھانا لذیذ ہوتا ہے اسی طرح اس تقاضے سے بھی تقویٰ لذیذ ہو جاتا ہے بشرطیکہ اعتدال کے ساتھ ہو ورنہ زیادہ نمک سے کھانا کڑوا بھی ہو جاتا ہے۔ اور اسی لئے جوان کا تقویٰ بوڑھے کے تقوی سے زیادہ لذیذ ہوتا ہے جوان کو تقویٰ میں بوڑھے سے زیادہ نشاط و سرور روحانی حاصل ہوتا ہے۔ کیونکہ بوڑھے کو نہ خطرات آتے ہیں نہ وساوس تو اس کو تقوے کی لذت کی کیا خبر ہو اور جوان بیچارہ ہزاروں خطرات و وساوس کا مقابلہ کرکے اُن سے بچتا ہے تو اس کو تقوے کا مزہ معلوم ہوتا ہے جیسے ایک تو وہ شخص ہے جو دریا کے کنارہ پر کھڑا ہے کبھی دریا میں گرنے کی اسے نوبت ہی نہیں آئی اُسے کنارہ کی سلامتی کی کیا قدر ہو۔ اور ایک وہ شخص ہے جو دریا میں گر پڑا تھا۔ ڈوبنے کو ہوگیا تھا پھر وہاں سے ہاتھ پیر مار کر غوطہ کھا کر نکل آیا تو اس کی لذّت کا حال اب نہ پوچھو عارف شیرازی اسی کو فرماتے ہیں ؎

شبِ تاریک و بیم موج و گرد ابے چنیں ہائل
کجا دانند حالِ ما سبک ساران ساحل ہا

(حیرت میں ہماری حالت ایسی ہے جیسے اندھیری رات ہو اور موج کا خوف ہو اور ہولناک بھنور میں کشتی آگئی ہو ہمارے اس حال کی ان لوگوں کو کب خبر ہوسکتی ہے جو ہلکے پھلکے کنارے پر کھڑے ہیں دریا میں قدم نہیں رکھا)

پھر جب ایک شخص دریا سے نجات پاکر باہر آتا ہے تو یہ اپنے ہاتھ پیروں کو بوسہ دیتا ہے اور ان کی قدر کرتا ہے کہ ان کے ذریعہ سے میں ہلاکت سے بچ گیا۔

اسی طرح جب سالک مجاہدہ کر کے تقویٰ اختیار کرتا اور مقصود میں کامیاب ہوجاتا ہے تو بعد میں اس کو بھی اپنے جسم وجان سے محبت ہوجاتی ہے اور وہ ان کی بڑی قدر کرتا ہے کہ میں انہی کے ذریعہ سے محبوب تک پہونچا ہوں اب ان کی خدمت کرنی چاہیئے کیونکہ مجاہدات وریاضات میں یہ سب چکنا چور ہوگئے ہیں۔ پس وہ بزبانِ حال یوں کہتا ہے ؎

نازم بچشم خود کہ جمالِ تو دیدہ است ۔ اُفتم بپائے خود کہ بکویت رسیدہ است
ہردم ہزار بوسہ زنم دست خویش را ۔ کو دامنت گرفتہ بسویم کشیدہ است

(مجھے اپنی آنکھوں پر ناز ہے کہ انھوں نے تیرے جمال کو دیکھا ہے اور اپنے پاؤں پر رشک ہے کہ تیرے کوچہ میں پہونچے ہیں ہردم اپنے ہاتھوں کو ہزاروں بوسہ دیتا ہوں کہ انہوں نے تیرا دامن پکڑ کر میری طرف کھینچا ہے)

یہی وجہ ہے کہ مسلمان جنت میں پہونچکر کہیں گے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْٓ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ ط اِنَّ رَبَّنَا لَغَفُوْرٌ شَكُوْرُۨ الَّذِیْٓ اَحَلَّنَا دَارَ الْمُقَامَةِ مِنْ فَضْلِهٖ لَا یَمَسُّنَا فِیْهَا نَصَبٌ وَّلَا یَمَسُّنَا فِیْهَا لُغُوْبٌ ○ خدا کا شکر ہے کہ اس نے ہم سے مشقت ورنج کو دور کیا بیشک ہمارا پروردگار بہت بخشنے والا بڑا قدر دان ہے جس نے ہم کو ہمیشہ رہنے کے گھر میں پہونچا دیا (محض) اپنے فضل سے جہاں ہم کو نہ مشقت چھوسکتی ہے نہ خستگی۔ تو بات یہ ہے کہ مسلمان کو تو پوری راحت جنت میں ہی جاکر نصیب ہوگی دنیا میں تو وہ ہر وقت معصیت سے ڈرتا رہتا ہے کہ کہیں کوئی کام خلاف مرضئ حق نہ ہوجائے جب یہ مصائب جھیل کر وہ جنت میں پہونچیں گے تو ان کی زبان سے بے ساختہ یہ ثنا نکلے گی۔ اس وقت ان کو اپنے تمام اعضا کی پوری قدر ہوگی اور ان کو خوب راحت پہونچائیں گے کہ لو تم نے دنیا میں بہت مجاہدات وریاضات کئے ہیں اب آرام حاصل کرو۔ اور جس نے غم ہی نہ دیکھا ہو وہ جنت کی کیا قدر کرسکتا ہے حدیث میں آتا ہے کہ جب جنتی جنت میں اور دوزخی دوزخ میں پہونچ جائیں گے تو جنت ودوزخ دونوں حق تعالیٰ سے شکایت کریں گی کہ ہم تو خالی رہ گئے ہم کو پُر کیجیے تو اس وقت دوزخ

کو تو حق تعالیٰ اپنی قدرت سے ویسے ہی بھر دیں گے عجب نہیں کہ اس کے اجزا ر سمٹ جائیں اور جنت کے لئے ایک نئی مخلوق پیدا کریں گے تو میں نے اس حدیث کو پڑھ کر حضرت استاد سے عرض کیا کہ حضرت وہ بڑے مزے میں ہوں گے کہ نہ کچھ کیا نہ کرایا مفت میں جنت لے لی مولانا نے فرمایا کہ وہ کیا خاک مزہ میں ہوں گے وہ تو یہ سمجھیں گے کہ جس طرح کی راحت میں ہم ہیں راحت ایسی ہوتی ہوگی اس لئے بس اُن کو جنت کی کیا قدر ہوگی۔ اور ہم لوگ دنیا کے مصائب جھیل کر جب جنت میں جائیں گے تو ہم کہیں گے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ اِنَّ رَبَّنَا لَغَفُوْرٌ شَكُوْرٌ ط (اللہ کا شکر ہے جس نے ہم سے مشقت و رنج کو دور کیا بیشک ہمارا پروردگار بہت بخشنے والا قدر دان ہے) یہ بات ان کو کہاں نصیب۔

ایک مرتبہ مولوی فیض الحسن صاحب سہارنپوری کی دعوت دہلی کے ایک شہزادے نے کی ایسے ایسے کھانے پکائے جن کا نام بھی مولانا نے نہ سنا تھا پھر کھانے کے بعد وہ شہزادے مولوی صاحب سے پوچھنے لگے کہ مولانا یہ کھانے کیسے پکّے مولانا نے فرمایا کہ ہم کو کیا خبر کیسے پکّے ہم نے تو یہ کھانے آج ہی کھائے ہیں ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ اسی طرح پکتے ہوں گے، ہاں کئی بار دعوت کرو اور یہی کھانے کھلاؤ تو اس وقت فرق معلوم ہو کہ پہلی بار ایسے پکّے تھے دوسری بار ایسے پکّے۔ شاہزادے نے کہا اچھا آئندہ بھی دعوت کی جمالی بہتر ہے پھر بھی کھلاؤں گا۔ حقیقت میں راحت کی قدر مصیبت والا ہی سمجھ سکتا ہے۔ اسی طرح یہ لوگ مزہ میں ہیں جن کو خطرات و وساوس پیش آتے ہیں۔ ان کو جب دولت تمکین عطا ہوتی ہے تو ان کو اُس دولت کی قدر ان لوگوں سے زیادہ ہوتی ہے جن کو خطرات پیش نہیں آئے اور ان کو اُس وقت لذت و سرور روحانی بھی زیادہ حاصل ہوتا ہے۔ غرض گنا ہوں سے نفرت عقلی مطلوب ہے طبعی نفرت مطلوب نہیں اگر عقلاً تو نفرت ہوا و رطبعاً رغبت ہو جس کی علامت یہ ہے کہ تقاضہ کا ورود ہو لیکن مقتضی پر عمل نہ ہو تو یہ وسوسہ کا درجہ ہے اس سے پریشان نہ ہونا چاہیئے کیونکہ اس سے اجر بڑھتا ہے۔ حدیث میں یہ مضمون موجود ہے کہ صحابہؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، بعض دفعہ ہمارے دل میں ایسے خیالات آتے ہیں کہ ہم جل کر کوئلہ ہو جانا پسند کرتے ہیں حضور

صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ذَالِكَ صَرِيحُ الْإِيمَانِ یہ تو خالص ایمان کی علامت ہے۔ مگر آج کل لوگ درخواست کرتے ہیں کہ ہم سے وساوس قطع ہو جائیں اور ہم کو گناہوں سے طبعی نفرت ہو جائے حالانکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس کو صریح الایمان فرما رہے ہیں۔ اس میں ہزاروں سالک مبتلائے غم ہیں۔ بعض لوگ مشائخ کے پاس آتے ہیں کہ حضور دعا کیجئے ہم مقبول ہو جائیں مگر خود مقبول بننے کے کام نہیں کرتے تو بڑی غلطی ہے اور دین دار بکثرت اس مرض میں پھنسے ہوئے ہیں۔ صاحبو! پہلے تم بھی تو مقبول ہونے کی کوشش کرو اور ایسے کام کرو جو مقبولیت کا ذریعہ ہیں پھر شیخ کی دعا سے بھی نفع ہو گا مگر اب تو یہ اندھیر ہے کہ صرف دعا سے مقبول بننا چاہتے ہیں۔ کوئی مسلمان ایسا نہیں جو جنت کا طالب نہ ہو قربِ خداوندی کا طلبگار نہ ہو خدا کی محبت و معرفت کا خواہش مند نہ ہو مگر اس کے طرق کو اختیار نہیں کرتے۔ حق تعالیٰ نے اس غلطی پر اس آیت میں تو بطریق عموم متنبہ فرمایا ہے وَأْتُوا الْبُيُوتَ مِنْ أَبْوَابِهَا (گھروں میں دروازوں سے آؤ) اور دوسری جگہ بطریق خصوص بھی متنبہ فرمایا ہے یعنی خاص دخولِ جنت کے بارہ میں صراحۃً ارشاد ہے کہ تری تمنا اور آرزو سے کچھ نہیں ہوتا تم کو عمل کا اہتمام چاہیئے۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔ لَيْسَ بِأَمَانِيِّكُمْ وَلَا أَمَانِيِّ أَهْلِ الْكِتَابِ مَنْ يَعْمَلْ سُوءًا يُجْزَ بِهِ وَلَا يَجِدْ لَهُ مِنْ دُونِ اللَّهِ وَلِيًّا وَلَا نَصِيرًا ۝ وَمَنْ يَعْمَلْ مِنَ الصَّالِحَاتِ مِنْ ذَكَرٍ أَوْ أُنْثَى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَأُولَٰئِكَ يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُونَ نَقِيرًا ۝

شانِ نزول آیت کا یہ ہے کہ ایک مرتبہ یہود اور اہلِ اسلام میں قبلہ کے تقدم و تاخر پر تفاخر ہو رہا تھا۔ یہود کہتے تھے کہ ہمارا قبلہ مقدم ہے۔ مسلمان کہتے تھے ہمارا قبلہ مقدم ہے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ خدا کا قرب اور دخولِ جنت نہ تمہاری تمناؤں سے حاصل ہو سکتا ہے نہ اہلِ کتاب کی تمناؤں سے بلکہ ہمارے یہاں تو یہ قانون ہے کہ جو کوئی بڑا کام کرے گا اس کو اس کی سزا بھگتنی

پڑے گی اور جو نیک کام کرے گا اس کو جنت ملے گی تو ان باتوں سے کیا ہوتا ہے عمل کا اہتمام کرو۔

اس آیت سے صاف معلوم ہو گیا کہ نری تمنّا سے کام نہیں چل سکتا اور نری تمنا کا درجہ وہی ہے جس کی ساتھ عمل کا اہتمام نہ ہو۔ معلوم ہوا کہ مقصود اعمال ہیں ان کو اختیار کرنا چاہیئے اس کے بعد جو تمنّا ہو گی وہ رجار کا درجہ ہو گا. خلاصہ یہ کہ جب عمل کا مقصود ہونا ثابت ہو گیا تو اس کا اہتمام سب مسلمانوں کو کرنا چاہیئے۔ رہا اس کا طریق تو اس کے لئے ساری شریعت موجود ہے شریعت سے پوچھ پوچھ کر عمل کرو۔ اور اعمال پر مداومت و استقامت کی سہولت اور ان کی اصلاح و تکمیل یہ موقوف ہے اہل اللہ کی صحبت پر چنانچہ اسی آیت لَيْسَ بِاَمَانِيِّكُمْ الی اٰخرھا کے ساتھ یہ بھی ارشاد ہے وَمَنْ اَحْسَنُ دِيْنًا مِّمَّنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ وَّاتَّبَعَ مِلَّةَ اِبْرَاهِيْمَ حَنِيْفًا ط اور اس شخص سے اچھا کون ہے جو اپنی ذات کو خدا کے سپرد کر دے دراں حالیکہ وہ صاحب اخلاص ہو اور مِلّۃِ ابراھیم کا متبع ہو۔ جو کہ حنیف تھے یعنی ماسوائے اللہ سے یکسو تھے۔ یہاں اسلام وجہ سے مراد فنا ہے کیونکہ کامل سپردگی اسی سے ہوتی ہے. جس کے بعد نسبت احسان عطا ہو جاتی ہے، چنانچہ وَهُوَ مُحْسِنٌ میں نسبت احسان ہی کی طرف اشارہ ہے۔ مقام اخلاص جب کامل ہو جاتا ہے تو اُسی کو نسبت احسان سے صوفیہ کی اصطلاح میں تعبیر کیا جاتا ہے۔

آگے بتلاتے ہیں کہ یہ دولت کس طرح حاصل ہو گی ارشاد ہے وَاتَّبَعَ مِلَّةَ اِبْرَاهِيْمَ حَنِيْفًا ط یعنی جو شخص مِلّۃَ اِبْرَاهِيْمَ کا اتباع کرے گا اُسے یہ دولت عطا ہو گی۔ اس آیت میں یہ نہیں فرمایا کہ اتباع ابراھیم علیہ السلام سے یہ نعمت عطا ہو گی حتیٰ کہ یہ شبہ ہو کہ بس جو لوگ ابراہیم علیہ السلام کی امت میں نہیں اُن کو یہ دولت نہ ملے گی بلکہ اتباع ملۃ ابراھیم پر اس نعمت کو موقوف کیا گیا ہے۔

جس سے مراد ان کے مذاق کا اتباع ہے۔ اور ابراہیم علیہ السلام کا مذاق فنا تھا۔ چنانچہ دوسری جگہ ارشاد ہے وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ إِبْرَاهِيْمَ إِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهُ وَلَقَدِ اصْطَفَيْنَاهُ فِي الدُّنْيَا وَإِنَّهُ فِي الْآخِرَةِ لَمِنَ الصَّالِحِيْنَ إِذْ قَالَ لَهُ رَبُّهُ أَسْلِمْ قَالَ أَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۞

(ملتِ ابراہیم سے وہی روگردانی کرے گا جو اپنی ذات ہی سے احمق ہو ہم نے ان کو دنیا میں منتخب کرلیا ہے اور اسی کی بدولت وہ آخرت میں بڑے لوگوں میں سے شمار کئے جاتے ہیں اور جب ان سے ان کے رب نے فرمایا کہ تم اطاعت اختیار کرو تو انہوں نے عرض کیا کہ میں نے رب العالمین کی اطاعت اختیار کی)

اور یہ دولت ہر نبی کو عطا ہوتی ہے۔ چنانچہ ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں اس کا ظہور سب سے زیادہ کامل تھا پس ہمارے لئے ملّتِ ابراہیمیہ کے اتباع کا تحقق اتباع محمدی (صلے اللہ علیہ وسلم) کی صورت میں ہوگا۔ حاصل یہ ہوا کہ یہ دولت کسی فانی کے اتباع سے حاصل ہوگی۔ بدون کسی فانی کے اتباع کے تکمیل اعمال نہیں ہوسکتی۔ رہا یہ کہ پھر اتباع فانی کے بعد کیا ہوگا آیا صرف استقامت ہی عطا ہوجائیگی یا اس سے بھی زیادہ کچھ ملے گا۔ اس کی بابت ارشاد ہے وَاتَّخَذَ اللّٰهُ إِبْرَاهِيْمَ خَلِيْلًا ۞ کہ حق تعالےٰ نے ابراہیم علیہ السلام کو مذاق فنا کی بدولت خلیل بنالیا تھا تو سمجھ جاؤ کہ جو شخص کسی فانی کا متبع ہوگا اُسے دولت خُلّت عطا ہوگی میرے ذوق میں اس جملہ کے اندر اتباع فانی کی جزا کا ذکر ہے مگر صراحۃً نہیں بلکہ اشاروں میں بیان کیا ہے کیونکہ ؎

خوشتر آن باشد کہ سرِ دلبراں
گفتہ آید در حدیثِ دیگراں

(محبوب کے ایسے راز کا دوسروں کی حکایات اور تمثیلات میں بیان ہونا مناسب ہے)

حاصل یہ ہوا کہ جس کو مقاصد دینیہ کی طلب ہو وہ عمل کا اہتمام کریں اور تکمیل عمل کے لئے صحبت اہل اللہ کو لازم سمجھے یہ طریقہ ہے کامیابی کا یں نے قاعدہ کلیہ بتلا دیا ہے۔ جزئیات کی تفصیل مجالس عرفا ریں ہوتی رہتی ہے اگر صحبت عارفین میسر ہو جائے تو بسا غنیمت ہے ؎

مقام امن ومئی بیغش ورفیق شفیق
گرت مدام میسر شود زہے توفیق

(مقام امن اور خالص شراب محبت اور شفیق رفیق اگر تم کو ہمیشہ میسر ہو جائیں تو بہت ہی اچھی توفیق ہے)

ورمطالعہ ملفوظات کے متعلق فرماتے ہیں ؎

دریں زمانہ رفیقے کہ خالی از خلل است
صراحئ مے ناب وسفینۂ غزل است

(جو زمانہ شیخ سے خالی ہو اس میں اس کے مکتوبات اور ملفوظات سے مستفید ہو)

دیکھئے حضرت حافظ رح کتاب کو بھی رفیق فرما رہے ہیں اور شیخ کا رفیق ہونا اوپر کے شعر سے معلوم ہو چکا ہے نیز اس کا رفیق ہونا ہر اک کو معلوم ہے کہ وہ معین آخرت ہوتا ہے اور حضرت حافظ کے کلام سے کتاب کا بھی رفیق ہونا معلوم ہو گیا۔ باقی فضول مجلس آرائیوں کو چھوڑنا چاہیئے اس سے آخرت کا بہت ضرر ہوتا ہے اور اگر کسی شخص کو کسی موقع پر کسی عارف کی خدمت نصیب نہ ہو نیز اوراد وکتب بینی سے گھبرا جاوے اور کچھ دیر اپنا دل بہلانا چاہے تو بجائے چوپال اور مجالس میں بیٹھنے کے اس کو اپنے بیوی بچوں میں دل بہلانا چاہیئے اس میں باطن کا ضرر نہیں ہوتا کیونکہ اہل وعیال کی دلجوئی بھی سنت ہے۔ ایک عارف کہتے ہیں ؎

جہدے کن وبا مردم دانا بنشیں + باصدق وصفا
یا باصنم لطیف ورعنا بنشیں + باشرم وحیا

اس سے مراد زوجہ ہے یعنی یا تو شیخ کی صحبت میں رہو اگر شیخ میسر نہ ہو تو بیوی کے پاس بیٹھو اس سے بھی حفاظت رہتی ہے ؎

زیں ہر دو گرت یکے میسر نشود + از طالع خویش
اوقات مکن ضائع و تنہا بنشیں + در یادِ خدا
(اگر ان دونوں میں سے کوئی بھی میسر نہ ہو تو تنہا یادِ خدا میں بیٹھو)

یہ طریقہ ہے آجکل سلامتی کا اور اس کے سوا اور جو تدبیریں سلامتی کی جاتی ہیں سب میں فتنہ ہے ؎

گر گریزی بر امید راحتے
ہم ازانجا پیشت آید آفتے
(اگر کسی راحت یا آرام کی امید پر بھاگتا ہے تو اس جگہ بھی تجھ کو کوئی آفت پیش آئے گی)

واقعی آجکل جن لوگوں کو دوست سمجھا جاتا ہے ان ہی میں سے دشمن نکل آتے ہیں اس لئے اب مخلوق سے ملنے ملانے اور مجلس آرائی کرنے کا زمانہ نہیں رہا انسان اپنے کام میں لگا رہے دنیا کے یا دین کے اور اس کے بعد جو وقت بچے اُسے خدا کی یاد میں گذارے۔ کچھ دیر بال بچوں میں دل بہلائے۔ کچھ وقت کتب بینی کے واسطے نکال لے۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

ہیچ کنجے بے دو و بیدام نیست
جز بخلوت گاہ حق آرام نیست
(کوئی گوشہ بے دوڑ دھوپ اور بغیر دام کے نہیں ہے خلوت گاہ حق کے سوا کسی جگہ آرام نہیں ہے)

پس دنیا و آخرت کی راحت وچین کا طریقہ میں نے آپ کو بتلا دیا ہے۔ میں اس وقت حجت اللہ ختم کر چکا ہوں آگے عمل کرنا نہ کرنا سامعین کے اختیار میں ہے۔ اب خدا تعالیٰ سے دعا کیجئے کیونکہ بدون ان کی امداد کے کچھ نہیں ہو سکتا کہ خدا تعالیٰ ہم کو ظاہری و باطنی بیماریوں سے شفا دے اور ہماری اصلاح فرمائے اور ہم کو عمل کی توفیق دے آمین۔ والحمد للہ رب العلمین وصلی اللہ تعالیٰ وسلم علی سید المرسلین سیدنا و مولانا محمد وعلی آلہ واصحابہ اجمعین ؛

تمت

قال اللہ تعالیٰ

فبشر عباد الذین یستمعون القول فیتبعون احسنہ

سلسلہ

البشریٰ کا

وعظ

الجلاء للابتلاء

منجملہ ارشادات

حکیم الامۃ مجدد الملۃ حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی

رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

محمد عبد المنان غفرلہ

مکتبۂ تھانوی ـــــــ دفتر الابقاء

مسافر خانہ بندر روڈ کراچی ۱
ایم-اے-جناح روڈ

سلسلۂ البشریٰ کا

وعظ

الجلاء للابتلاء

این	متیٰ	کیف	کم	من ضبط	لم	من ای شان	المستمعون
کہاں	کب	کیسے	کس قدر	کس نے لکھا	کس لئے ہوا	کیا مضمون تھا	سننے والوں کی تعداد
جامع مسجد تھانہ بھون	جمعہ ۲۶ محرم سنہ ۱۳۳۷ھ	جالساً	۲ گھنٹے	ظفر احمد عفا اللہ عنہ	بوجہ عموم مرض و بلیات	اکثر مصیبتیں گناہوں کی وجہ سے آتی ہیں	۱۰۰ تقریباً

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

الحمد للہ نحمدہ و نستعینہ ونستغفرہٗ ونؤمن بہٖ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الہ الا اللہ وحدہٗ لا شریک لہ ونشھد ان سیدنا ومولانا محمدا عبدہٗ ورسولہ صلے اللہ تعالیٰ علیہ وعلےٰ اٰلہ واصحابہ وبارک وسلم۔ اما بعد

اس وقت مجھ کو تین مضمونوں کا بیان کرنا مقصود ہے چونکہ ان تینوں کی جمع کرنے والی کوئی حدیث یا آیت اس وقت میرے ذہن میں نہیں آئی اس لئے کوئی آیت وغیرہ نہیں پڑھی۔ اُن میں سے ایک مضمون تو یہ ہے کہ جس قدر مصیبتیں ہمارے

او پر آتی ہیں وہ اکثر ہمارے گناہوں کی وجہ سے آتی ہیں۔ چنانچہ قرآن مجید میں مصرح ہے۔ وما اصابکم من مصیبۃ فبما کسبت ایدیکم (جو کچھ تم کو مصیبت پہونچتی ہے وہ تمہارے گناہوں سے پہنچتی ہے) اس لئے ہم کو ایسے وقت میں توبہ و استغفار سے کام لینا چاہیئے اور اپنے اعمال کی اصلاح کا خیال کرنا چاہیئے اور یہ مضمون گو آپ حضرات بارہا سُن چکے ہیں مگر سننا اور چیز ہے اور گُننا اور چیز ہے۔ سو یہ بات کانوں میں اگرچہ پڑ چکی ہے مگر اب تک گُننا نہیں اور اس گُننے پر مجھے ایک حکایت یاد آئی جو حضرت مولٰنا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ سے سُنی ہے وہ یہ کہ ایک عالم ہدایہ کے حافظ تھے ایک دوسرے عالم ہدایہ کے تو حافظ نہ تھے مگر اس کو سمجھے ہوئے زیادہ تھے۔ ایک مسئلہ انہوں نے بیان کیا اور یہ کہا کہ یہ مسئلہ ہدایہ میں ہے۔ وہ حافظ ہدایہ بولے کہ ہدایہ میں یہ مسئلہ نہیں ہے۔ ان کو اپنے حفظ پر ناز تھا مگر دوسرے عالم نے ہدایہ کھول کر دکھلا دیا کہ فلاں جگہ سے یہ مسئلہ نکلتا ہے۔ وہ مقام ان حافظِ ہدایہ کو بھی یاد تھا مگر وہ یہ نہ سمجھتے تھے کہ اس مقام سے ایک دوسرا مسئلہ بھی نکلتا ہے۔ جب ان کو مسئلہ سمجھا دیا گیا تو وہ حافظ ہدایہ یہ دیکھ کر رہ پڑے۔

اس حکایت کے بعد مولانا نے فرمایا کہ اُن دونوں میں سے ایک تو ہدایہ کے صرف پڑھے ہوئے تھے اور ایک ہدایہ کو گُنے ہوئے تھے۔ سو دیکھ لو پڑھنے میں اور گُننے میں کتنا بڑا فرق ہے، اور یہی فرق ہے درمیان علمار حنفیہ کے اور دیگر علماء کے خصوصاً شافعیہ وحنبلیہ کے کہ شافعیہ اگرچہ کثیر الروایات ہیں اور حنبلیہ تو اس صفت میں شافعیہ سے بھی بڑھے ہوئے ہیں مگر فہم حنفیہ کو خدا نے ایسی دی ہے کہ دوسرے علمار اُن کی برابری نہیں کر سکتے۔ یہ بات ہیں سے بات ایسی نکالتے ہیں کہ حیرت ہو جاتی ہے گو ان کی نسبت سے قلیل الروایات ضرور ہیں اس کا انکار نہیں کیا جا سکتا اور یہ کمی ان میں ضرور رہ گئی مگر معانی کی خدمت لذت میں وہ الفاظ حدیث کی زیادہ خدمت کرنے میں دوسروں سے پیچھے رہ گئے اور یہ بات میں کوئی اعتقاداً نہیں کہتا بلکہ مخالفین بھی اس کو تسلیم کرتے ہیں مگر من حیث لایدرون (اس اعتبار سے کہ وہ نہیں جانتے) چنانچہ ابن خلکان کی طرف یہ قول منسوب کیا جاتا ہے کہ

انہوں نے امام ابو حنیفہ کی نسبت لکھا ہے کہ امام صاحب کو کل سترہ حدیثیں پہونچی ہیں یہ قول اگرچہ کسی درجہ میں بھی صحیح ماننے کے قابل نہیں کیونکہ امام صاحب کے واسطہ سے جس قدر روایات موطا محمد و آثار محمد وغیرہ میں اس وقت موجود ہیں اگر ان سب کو ہی جمع کرلیا جائے تو وہ اس سے بدرجہا زیادہ نکلیں گی اور یہ ظاہر ہے کہ ان حضرات نے مسندات ابو حنیفہ کے احاطہ کا قصد نہیں کیا تھا بلکہ طبعاً و ضمناً امام صاحب کی روایات کو بھی دیگر شیوخ کی روایات کے ساتھ ذکر کردیا تو اسی سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ امام صاحب کی روایات کس قدر ہوں گی۔ سترہ کا غلط ہونا تو بالکل بدیہی ہے مگر میں اپنے دوستوں سے کہا کرتا ہوں کہ تم ابن خلکان کے اس قول کی تردید کیوں کرتے ہو اس سے تو ہمارے امام کی منقبت نکلتی ہے منقصت نہیں نکلتی کیونکہ امام صاحب کا مجتہد ہونا تو سب کو مسلم ہے اس کا تو کسی کو انکار نہیں اور انکار ہو کیونکر سکتا ہے جبکہ ہر باب میں امام صاحب کے اقوال موجود ہیں اور ہر مسئلہ میں وہ دخل دیتے ہیں اور مخالفین بھی اکثر مسائل میں امام صاحب کے اختلاف کا ذکر کرتے ہیں۔ اس سے صاف معلوم ہوگیا کہ مخالفین گو امام صاحب کو محدث نہ تسلیم کریں مگر مجتہد ضرور مانتے ہیں علاوہ ازیں صراحت کے ساتھ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ ائمہ ومحدثین نے ابو حنیفہ کے فقیہ و مجتہد ہونے کا اقرار کیا ہے اور نہ صرف مجتہد ہونا بلکہ تمام فقہاء کا فقہ میں عیال ابو حنیفہ ہونا تسلیم کیا ہے تو ایک مقدمہ تو یہ لے لیا جائے اس کے ساتھ دوسرا مقدمہ یہ ملا لیا جائے کہ امام صاحب کو حدیثیں کل سترہ ہی پہونچی تھیں۔ اب دونوں مقدموں کو ملا کر دیکھو کہ نتیجہ کیا نکلتا ہے، وہ نتیجہ یہی ہے کہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی فہم بہت ہی عالی تھی کہ صرف سترہ حدیثوں سے اس قدر مسائل استنباط کئے کہ دوسرے ائمہ باوجود لاکھوں احادیث کے حافظ ہونے کے بھی ان کے برابر مسائل مستنبط نہ کرسکے اس سے زیادہ فہم کی کیا دلیل ہوگی معلوم ہوا کہ بہت ہی بڑے مجتہد تھے ہمارے احباب حنفیہ ابن خلکان کے اس قول سے فضول جیں بجبیں ہوتے ہیں۔ اس پردہ میں تو وہ امام صاحب کی اتنی بڑی مدح کر گئے جس کی کوئی حد نہیں، خواہ مخواہ ہم اس قول کی تردید کے درپے کیوں ہوں ہمیں مان لینا چاہیئے کہ اچھا صاحب امام صاحب کو سترہ

ہی حدیثیں ملی تھیں۔ مگر کس قدر عالی فہم تھے کہ چند حدیثوں سے لاکھوں جزئیہ اور مسائل سمجھ لئے۔ خیر یہ تو ایک لطیفہ تھا اس قول کے غلط ہونے کا تو خود محدثین کو بھی اقرار ہے مگر اس میں شک نہیں کہ روایت میں حنفیہ کا پلّہ دوسرے ائمہ و محدثین کے برابر نہیں مگر روایت میں یہ اس درجہ بڑھے ہوئے ہیں کہ اگر انصاف سے دیکھا جائے تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ حدیث و قرآن کو پڑھایا تو سب نے مگر گُنا حنفیہ ہی نے ایک عالم بالحدیث کا قصہ ہے کہ وہ مجھ سے اکثر معاملات کے متعلق مسائل پوچھا کرتے تھے میں نے ان سے کہا کہ تم اپنے علمار سے یہ مسائل کیوں نہیں پوچھتے۔ مجھ سے کس لئے پوچھتے ہو تو حالانکہ وہ اپنے مسلک میں بہت ہی پختہ ہیں مگر انصاف کی بات چھپی نہیں رہا کرتی زبان سے بے ساختہ یہی نکلا کہ ہمارے علمار تو آمین و رفع یدین کے سوا کچھ بھی نہیں سمجھتے۔ یہ مسائل ان کو نہیں آتے آپ ہی سے پوچھ کر تسلی ہوتی ہے۔ غرض معلوم ہو گیا کہ کسی بات کا پڑھنا سُننا اور ہے گُننا اور ہے۔ بس اسی طرح مَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ (جو کچھ تم پر مصیبت آتی ہے وہ تمہارے گناہوں سے آتی ہے) کو سُنا تو سب نے ہے مگر گُنا نہیں۔ یعنی سمجھا نہیں۔ اس لئے اس وقت پھر اس کے بیان کی ضرورت محسوس ہوئی کیونکہ آج کل ہر طرف بیماری کا زور ہے اور جا بجا لوگوں میں اس وقت اسی کا چرچا ہے مگر جو اس کی اصل تدبیر ہے اس سے سب غافل ہیں۔ اِلّاَ ماشاء اللہ۔ تو اس وقت میں اس مضمون کو مختصر طور پر بیان کرنا چاہتا ہوں تاکہ اب تک جو نہیں سمجھے تھے وہ اس وقت سمجھ لیں۔ اور یہ مضمون تو ایسا ہے کہ اکثر کانوں میں پڑ بھی چکا ہے مگر دوسرا تیسرا مضمون جو اس کے بعد مجھے بیان کرنا ہے اور وہ اس دعوے کے متعلق شبہات کے جواب ہیں وہ جس طرح آج بیان ہوگا اس طرح شاید کبھی کانوں میں نہ پڑا ہوگا۔

سو اول اصل مضمون سُنئے حق تعالیٰ صاف فرماتے ہیں کہ جو کچھ مصیبت تم پر آتی ہے وہ تمہارے گناہوں کی وجہ سے آتی ہے۔ مَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ (جو مصیبت تم کو پہنچتی تمہارے

گناہوں سے پہونچتی ہے اور اللہ تعالیٰ بہت سے گناہوں کو درگذر فرما دیتے ہیں)
معلوم ہوا کہ ہماری خطا پر مواخذہ نہیں فرماتے بلکہ بہت سے گناہوں سے درگذر بھی فرمادیتے ہیں۔ مگر جب ہم بہت ہی گناہوں میں منہمک ہوجاتے ہیں اس وقت مصائب کا نزول ہوتا ہے تاکہ ہم کچھ اپنی حالت پر توجہ کریں اور سنبھل جائیں مگر ہم اتنے غافل ہیں کہ تنبیہ سے بھی متنبہ نہیں ہوتے اور جب مصیبت آتی ہے تو سوچتے ہیں کہ ہم سے ایسا کیا قصور ہوگیا کہ جو یہ بلائیں ہمارے اوپر نازل ہوئیں مگر حق تعالیٰ کے ارشاد سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب بلائیں ہمارے گناہوں ہی کی بدولت ہیں۔
اس آیت میں تو سب کو خطاب ہے۔ دوسرے مقام پر خاص صحابہ رضی اللہ عنہم کو ارشاد ہوتا ہے اَوَلَمَّآ اَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةٌ قَدْ اَصَبْتُمْ مِّثْلَيْهَا قُلْتُمْ اَنّٰى هٰذَا قُلْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اَنْفُسِكُمْ کیا جس وقت تم کو ایسی ایک مصیبت پہنچی کہ جس سے دوچند تم کفار کو پہنچا چکے ہو تو (اَن جان بنکر) تم یوں کہنے لگے کہ یہ مصیبت کہاں سے آگئی۔ آپ اُن سے کہہ دیجیے کہ یہ تمہارے ہی پاس سے آئی ہے۔
تو یہ ایک آیت میں بطور قاعدہ کلیہ کے یہ بات معلوم ہوچکی کہ سب مصائب بوجہ گناہوں کے نازل ہوتے ہیں۔ دوسری آیت میں خاص حضرات صحابہ کو ارشاد ہوتا ہے کہ تم کو جو اس مصیبت کے آنے کے وقت یہ سوال پیدا ہوا ہے کہ یہ کہاں سے آگئی اس کا جواب یہ ہے کہ یہ تمہارے ہی سبب سے یعنی تمہارے اعمال کے سبب سے آئی جن کا منشا خود تمہاری ذات ہے اس دوسری آیت کے پڑھنے سے میرا مقصود آپ کا ایک عذر بھی بیان کرنا ہے اور یہ بات نذرانہ لے کر بیان کرنا چاہیئے تھی، کیونکہ عذر کا اثر تخفیف جرم ہے۔ سو اس سے آپ کو کتنا بڑا نفع پہونچا جس کی آپ کو خبر بھی نہ تھی سو خبر کرنا نذرانہ کا کام ہے یا نہیں؟ مگر لیجیے میں مفت ہی بتلائے دیتا ہوں۔ وہ بات یہ ہے کہ یہ تو سب جانتے ہیں کہ حضرات صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین امت میں سب سے زیادہ اعمق علماً ہیں اور اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہر صحابی ہر امتی سے باعتبار علم کے اعمق ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ فقہاء صحابہ کا علم تمام فقہاء امت سے عمیق ہے اور عوام صحابہ کا علم عوام امت کے

علم سے عمیق تر ہے، ورنہ یہ کیونکر کہا جا سکتا ہے کہ وہ صحابی بدوی جنھوں نے مسجد نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) میں آکر پیشاب کر دیا تھا ان کا علم امام ابوحنیفہؒ کے علم سے زیادہ عمیق تھا. ظاہر ہے کہ امام ابوحنیفہؒ کا علم ان سے بڑھا ہوا تھا ان کے علم کا حال تو اسی واقعہ سے معلوم ہو گیا کہ ایک نہ دو اکٹھے تین کام فقہ کے خلاف کئے اول تو پیشاب سب کے سامنے کیا بدن برہنہ ہوا پھر پیشاب بھی مسجد میں کیا اگر ان کو امام ابوحنیفہ سے زیادہ اعمق علماً کہا جائے تو اس میں امام ابوحنیفہ کی بھی تنقیص ہو گی اور خود ان کی بھی تنقیص ہو گی، شاید آپ تعجب کریں گے کہ ان صحابی کی تنقیص کس طرح لازم آئے گی سنئے ان صحابی کی تنقیص اس وجہ سے ہو گی کہ جس شخص میں جو کمال واقع میں نہیں اس کی طرف اس کمال کو منسوب کرنا اس کے ساتھ مسخراپن کرنا ہے ایک شخص جس میں حسن ظاہری نہیں ہے اگر آپ اس کو یوسف ثانی کہنے لگیں تو یہ مسخراپن ہوگا یا نہیں. کسی اَن پڑھ دیہاتی آدمی کو اگر کوئی مولانا یا مولوی صاحب کہکر پکارنے لگے تو یہ اس کا مذاق اڑانا ہے یا نہیں؟

اسی طرح اس کو بھی سمجھ لیجئے کہ ایک اعرابی صحابی کو افقہ الناس کہنا ان کی شان میں گستاخی کرنا ہے مگر اس سے کوئی یہ شبہ نہ کرے کہ امام ابوحنیفہؒ ان صحابی سے افضل ہو گئے. نہیں ہرگز نہیں. امام ابوحنیفہ ان سے افضل کبھی نہیں ہو سکتے اور وہ اس حالت میں بھی امام ابوحنیفہؒ سے بدرجہا افضل ہیں، اگرچہ ابوحنیفہ فقہ میں ان سے بدرجہا بڑھے ہوئے ہیں مگر مرتبہ اور فضیلت میں وہ صحابی تمام فقہ سے بڑھ کر ہیں کیونکہ امام صاحب کا علم اور فقہ ان کے لئے کمال تھا. مگر ان صحابی کا کمال فقہ میں نہ تھا ان کا کمال اس سادگی ہی میں تھا. ہر چیز کی ایک ادا ہوتی ہے جو اسی میں پھبتی ہے. دوسری جگہ وہ نہیں پھب سکتی.

دیکھو زیور عورتوں کے لئے باعث زیب و زینت ہے بھلا اگر کوئی مرد سر سے پیر تک زیور میں لد جائے تو اس میں کہیں وہ شان پیدا ہو سکتی ہے. اس پر مجھے ایک حکایت یاد آئی کہ ایک بیوقوف شخص نے کسی ولایتی کو دیکھا کہ وہ گھوڑے کو توبڑے میں دانہ کھلا رہا تھا اور گھوڑا شوخی میں آکر کبھی اِدھر کو مُنہ مارتا تھا کبھی اُدھر کو وہ ولایتی خوش

ہوکراس کو چمکارتا جاتا تھا اور کہتا جاتا تھا کہ بیٹا کھاؤ اور وہ شوخی میں منھ مارتا تھا ان حضرت کو خیال پیدا ہوا کہ یہ شخص اپنے گھوڑے کو بہت ہی چاہتا ہے کہ اس طرح اس کو دانہ کھلا رہا ہے، میری بیوی میری بہت ہی بے قدری کرتی ہے کہ میرے سامنے کھانا رکھ کر چلی جاتی ہے تو ہم سے گھوڑا ہی اچھا۔ اب ہم بھی گھوڑا بنیں گے، چنانچہ گھر پہونچے اور بیوی سے کہا کہ آج ہم گھوڑا بنیں گے. ہمارے لئے دانہ تو بڑے میں لاؤ اور ایک اگاڑی اور ایک پچھاڑی ہمارے باندھو اور دم کی جگہ ایک جھاڑو باندھو اور ہم کو دانہ کھلاؤ۔ اور جب ہم انکار اور اعراض کریں تو کہنا کھاؤ بیٹا کھاؤ۔ چنانچہ اس غریب نے ان کے سب حکموں کو تعمیل کی شام ہوئی تو وہ خود گھوڑے کی طرح جھک کر کھڑے ہوئے منھ میں توبڑہ اگاڑی پچھاڑی بندھی ہوئی تھی کبھی ادھر کو منھ ماردیا کبھی اُدھر کو منھ ماردیا اور وہ اسی طرح بیٹا کھاؤ بیٹا کھاؤ کہتی ہوئی کھلا رہی تھی وہ جو بہت اُچھلے کودے اور پیچھے تھا چراغ وہ جھاڑو میں لگ گیا اب لگے جلنے خود تو اس لئے نہ بُجھا سکے کہ ہاتھ پاؤں سب بندھے ہوئے تھے آخر وہ عورت محلہ کے مردوں کو چلاتی ہوئی پکارنے گئی کہ ارے دوڑیو میرا گھوڑا جلا، میرا گھوڑا جلا لوگ سمجھے کہ کمبخت جھوٹ بولتی ہے کھانے کو پیٹ بھر روٹی ملتی نہیں اس کو گھوڑا کب میسر ہوا تھا اتنی دیر میں وہ گھوڑے صاحب جل بھنکر سرد بھی ہوگئے۔ تو اس بیوقوف کو اتنی عقل نہ تھی کہ ہر چیز اپنی جگہ ہی بھلی معلوم ہوا کرتی ہے ہر جگہ نہیں گھوڑے کا دانہ کھاتے ہوئے منھ مارنا اچھا معلوم ہوا کرتا ہے ہر شخص کا تھوڑا ہی اچھا معلوم ہوسکتا ہے۔ سچ ہے ؎

نازرا روئے ببایدہمچو ورد　　　چوں نداری گرد بدخوئی مگرد

عیب باشد چشم نابینا و باز　　　زشت باشد روئے نازیبا و ناز

(ناز کرنے کے لئے گلاب جیسے چہرہ کی ضرورت ہے جب تم ایسا چہرہ نہیں رکھتے تو بدخوبی کے پاس نہ جاؤ۔ چشم نابینا کا کھلا ہونا عیب ہے بدصورت کے لئے ناز بُرا ہے۔)

یہ تو ایک ہنسی کی بات تھی مگر یہ بات ہے بالکل صحیح کہ جس چیز کی جو ادا ہے وہ اسی میں

پیاری معلوم ہوتی ہے دوسری چیز میں وہ بات پیدا نہیں ہو سکتی تو اب آپ سمجھئے کہ ہر شخص کے لئے فقیہ ہونے ہی میں کمال نہیں بعضوں کی یہی ادا پیاری ہوتی ہے کہ وہ اَن پڑھ ہیں۔ دیکھئے ہمارے حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ عالم نہ تھے مگر ان میں بدون پڑھے ہی ایک ایسی ادا تھی جس نے ہزاروں پڑھے لکھوں کو ان کے سامنے جھکا دیا تھا خوب فرماتے ہیں عارف شیرازی رحمۃ اللہ علیہ ؎

شاہد آں نیست کہ موئے و میانے دارد
بندۂ طلعت آں باش کہ آں نے دارد

(معشوق وہ نہیں کہ اچھے بال اور پتلی کمر رکھتا ہو حسین وہ ہے کہ اس میں کچھ آن ہو)

غرض صحابہ کا کمال یہ نہیں تھا کہ وہ امام ابوحنیفہ کی طرح اصول و فروع کی تحقیق کرتے ان کا تو کمال ہی دوسرا تھا اس کے سامنے یہ سارے علوم و فنون ہیچ ہیں ان کا کمال یہ تھا کہ انہوں نے ان آنکھوں سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم (رُوْحِیْ فِدَاہُ) (میری روح ان پر قربان ہو) کے جمال جہاں آرا کی زیارت کی تھی یہ وہ کمال ہے کہ اس میں اُن کی کوئی برابری نہیں کر سکتا۔ نہ عمر بن عبدالعزیز جو کہ اپنے زمانہ کے مجدد اور قطب وقت تھے اور بوجہ عدل کامل و اتباع سنت کے خَامِسُ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِیْنَ (خلفاء راشدین میں پانچویں شخص) شمار کیے جاتے ہیں نہ اویس قرنی جو افضل التابعین ہیں جن کے بارے میں علماء امت کا خیال یہ ہے کہ وہ گو صحابی نہیں مگر ثواب میں صحابہ کے قریب قریب ہیں مگر پھر بھی ان جیسے نہیں کیونکہ حضرت اویس قرنی کے پاس وہ دو آنکھیں کہاں تھیں جنھوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرۂ مبارک کی زیارت کی ہو، اگرچہ اُن کے فضائل بے شمار ہیں کہ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر رضی اللہ تعالےٰ عنہ و دیگر صحابہ کو ارشاد فرمایا تھا کہ ایک شخص یمن کا رہنے والا اویس قرنی نام آئے گا اگر ان سے ملو تو میرا اسلام پہونچا دیجیو اور اُن سے اپنے لئے دعا کرائیو، اللہ اکبر اتنے بڑے درجے کے شخص ہیں مگر صحابہ کے برابر پھر بھی نہیں۔ بس افضل التابعین ہیں۔

حضرت غوث اعظم رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے سوال کیا تھا کہ حضرت معاویہ کیسے ہیں، حضرت غوث اعظم کو اس سوال سے بہت جوش آیا، فرمایا کہ اگر امیر معاویہؓ گھوڑے پر سوار ہوں اور ایڑ مار کر اللہ کے راستے میں اس کو دوڑائیں تو جو خاک معاویہ کے گھوڑے کی ناک میں رینٹ سے ملی ہوئی ہو گی عمر بن عبدالعزیز اور اویس قرنی جیسے ہزاروں سے وہ خاک بھی افضل ہے۔ واقعی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت نے صحابہ کو وہ رتبہ بخشا ہے کہ بڑے سے بڑے ولی بھی حتیٰ کہ امام مہدی علیہ السلام بھی ایک ادنیٰ صحابی کے برابر نہیں ہو سکتے اور یہ حق تعالیٰ شانہٗ کا بہت ہی بڑا فضل و احسان امت محمدیہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے حال پر ہے کہ ہمارے خلف پر صحابہ کی فضیلت کو پوری طرح منکشف کر دیا کہ سب نے اس پر اجماع و اتفاق کر لیا کہ اَلصَّحَابَۃُ کُلُّھُمْ عُدُوْلٌ وَ اَفْضَلُ الْخَلْقِ بَعْدَ الْاَنْبِیَاءِ۔ اَصْحَابُ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ۔ یعنی صحابہ سب کے سب معتبر اور ثقہ ان میں کوئی شخص غیر معتبر نہیں اور تمام مخلوق میں بعد انبیاء علیہم السلام کے سب سے زیادہ افضل صحابہ ہیں رضی اللہ تعالیٰ عنہم اس مسئلہ کا انکشاف ہمارے حق میں بہت ہی بڑی رحمت ہے اور وہ رحمت یہ ہے کہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ واقعی حق تعالیٰ شانہٗ کو اس دین کی حفاظت ہی منظور رہے اگر حضرات صحابہؓ کے متعلق ہمارا یہ اعتقاد نہ ہوتا بلکہ خدا نخواستہ ان کے غیر معتبر ہونے کا یا ان کی نسبت خیانت کرنے کا کچھ بھی شبہ ہوتا تو شریعت کا سارا نظام درہم برہم ہو جاتا قرآن و احادیث کی بابت طرح طرح کے خیالات و شبہات پیدا ہوتے اور کسی طرح دل کو اطمینان نصیب نہ ہوتا اور صحابہ کی نسبت حضرات سلف صالحین کا یہ اجماع محض حسن اعتقاد ہی کی بنا پر نہیں بلکہ خود ان کے احوال و اعمال سے ان کی دیانت اور راست بازی و پرہیزگاری ایسی کھلی ہوئی نظر آتی ہے کہ موافق تو موافق مخالف تک اس کا اقرار کئے ہوئے ہیں جس پر تاریخ گواہ ہے جس کے بعد اس قول میں کچھ بھی شبہ کی گنجائش نہیں رہتی کہ اَلصَّحَابَۃُ کُلُّھُمْ عُدُوْلٌ (صحابہ سب کے سب عادل اور معتبر ہیں) حضرات صحابہ کی اس فضیلت کے انکشاف سے صرف یہی نہیں کہ دین کی حفاظت ہو گئی بلکہ سچ تو یہ ہے کہ

ان کی فضیلت کے اقرار کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ محبت بڑھ گئی جس قدر صحابہؓ کے ساتھ اعتقاد بڑھتا ہے اسی قدر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ محبت بڑھتی ہے اور جس قدر صحابہ سے کسی کو بے اعتقادی ہوتی ہے اسی قدر حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ محبت میں کمی ہو جاتی ہے۔ کیونکہ ظاہر ہے کہ جس مدرسہ کے سارے طلبہ بد استعداد ہوں وہاں مدرسین کی بد استعدادی کا بھی شبہ کیا جاتا ہے۔ سو اگر ہمارے اعتقاد صحابہؓ کے ساتھ اچھے نہ ہوں گے تو معاذاللہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بابت بھی اچھا خیال نہ ہو سکے گا' بلکہ یہ وسوسہ پیدا ہوگا کہ بس جی جیسی روح ویسے ہی فرشتے اور یہ حالت ہماری بہت ہی خراب و ناگفتہ بہ ہوتی چنانچہ اس زمانہ میں بھی کچھ لوگ ایسے موجود ہیں جن کو صحابہؓ کے ساتھ بے اعتقادی و بدگمانی ہے، سو ان کی دینی حالت دیکھ لی جلئے کہ کس قدر کمزور ہو رہی ہے۔ تو حضرت غوث اعظم رحمتہ اللہ علیہ نے اس سائل کو کیسا دنداں شکن جواب دیا کہ تو معاویہؓ کی بابت سوال کرتا ہے عمر بن عبدالعزیز و اویس کو حضرت معاویہ رضؓ کے گھوڑے کی ناک کی خاک سے بھی تو نسبت نہیں۔ آج کل بھی بعض لوگوں کو اس قسم کے سوالات کا خبط سوار ہوا کرتا ہے۔

چنانچہ ایک عالم سے کسی نے سوال کیا تھا کہ حضرت علی رضی اللہ تعالے عنہ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اِن دونوں میں سے کون حق پر تھے۔ انہوں نے خوب جواب دیا کہ میں بقسم کہتا ہوں کہ قیامت کے روز یہ مقدمہ تمہارے اجلاس میں نہیں بھیجا جائے گا، اور اگر بھیجا گیا تو میں تم کو مشورہ دیتا ہوں کہ مقدمہ خارج کر دینا اور کہہ دینا کہ مقدمہ میرے حدود اختیار سے باہر ہے۔ پھر میں واقعات سے بھی بے بہرہ ہوں اور میں نے علماء سے اس کی تحقیق بھی کرنی چاہی تھی مگر انہوں نے مجھ کو جواب نہیں دیا۔ تمہاری گردن تو اس جواب سے چھوٹ جائے گی۔ پھر اگر ہم سے سوال ہوا کہ تم نے اسے کیوں نہیں بتلایا تو ہم خود نپٹ لیں گے، واقعی اچھا جواب دیا بھلا اپنے حوصلہ سے زیادہ بڑھنا حماقت ہے یا نہیں؟ پہلے ہم اپنے گھر کا تو فیصلہ کرلیں

پیچھے ہی حضرت علی رضی اللہ عنہ و معاویہ رضی اللہ عنہ کے جھگڑے میں پڑیں۔ دنیا میں اس کی نظیر دیکھ لیجئے کہ اگر کوئی مقدمہ وائسرائے کی عدالت کے متعلق ہو جس کی بابت یقین ہے کہ تحصیلدار صاحب کی کچہری میں کبھی نہ آئے گا اور تحصیلدار اس کے فیصلہ و قوانین معلوم کرنے کے درپے ہو اور نہ معلوم ہونے سے پریشان ہو تو یہ حماقت ہے یا نہیں، ہر شخص یہی کہے گا کہ آپ کو اپنی تحصیل کے قواعد معلوم کرنے چاہئیں اُن میں اگر کوتاہی ہوگئی تو آپ سے باز پرس ہوگی۔ آپ سے یہ سوال کوئی نہ کرے گا کہ تم نے وائسرائے کے اجلاس کے قوانین کیوں نہیں یاد کئے۔

غرض میں یہ بیان کر رہا تھا کہ حضرات صحابہ کا کمال ان علوم و فنون سے نہیں تھا بلکہ ان کا کمال ایک دوسری چیز سے تھا تو فقہ میں امام ابو حنیفہ گو ان صحابی سے بڑھے ہوئے ہوں جنہوں نے مسجد میں پیشاب کر دیا، مگر درجہ میں اور مقبولیت عنداللہ میں وہ صحابی ہی بڑھے ہوئے ہیں۔ اور یہ عجیب قصہ ہے کہ بعض باتوں میں ایک تابعی صحابی سے بڑھا ہوا ہے اور اس سے اُن کی تنقیص بھی لازم نہیں آتی بعضے لوگ یہ بات سن کر گھبرا جاتے ہیں مگر اس سے وحشت کرنا بڑی بے عقلی کی بات ہے۔ دیکھئے اگر بادشاہ کی طرف سے وائسرائے کو حکم ہو کہ تم اپنے ہاتھ سے ہمارے واسطے انڈوں کا حلوا پکاؤ اور ظاہر ہے کہ وائسرائے بہادر کو اس کا کب اتفاق ہوا تھا تو اب اگر وہ انڈوں کے حلوے کی ترکیب کسی باورچی سے پوچھیں اور اس کام میں اس کی شاگردی اختیار کریں تو اس سے کوئی یہ سمجھ سکتا ہے کہ باورچی وائسرائے سے افضل ہو گیا۔ نہیں بلکہ ہر شخص یہی کہے گا کہ وائسرائے کا کمال انڈوں کا حلوا پکانے سے تھوڑا ہی ہے اُس کے کمالات دوسرے ہیں جن کی باورچی کو ہوا بھی نہیں لگی۔ اسی طرح اس کو سمجھ لیجئے کہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ جن صحابی سے فقہ میں بڑھے ہوئے ہیں اگر وہ امام صاحب کے زمانہ میں موجود ہوتے تو ان کے ذمہ فقہ میں امام ابو حنیفہ کے فتوے پر عمل کرنا واجب ہوتا اور امام صاحب کو ان سے یہ کہنے کا حق حاصل ہوتا کہ گو درجہ میں آپ مجھ سے بڑے ہیں مگر چونکہ آپ فقیہ نہیں ہیں اس لئے آپ کو میرے فتوے کی مخالفت جائز نہیں

اور اگر میرے کہنے کے خلاف کریں گے تو آپ کو گناہ ہوگا۔ امام صاحب کو یہ سب کچھ کہنے کا حق حاصل ہوتا۔ مگر بایں ہمہ فضیلت میں وہ صحابی ہی بڑھے ہوئے رہتے۔ تو کسی بات میں چھوٹوں کا بڑوں سے بڑھ جانا اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ مرتبہ کے اندر بھی ان سے بڑھ جائیں۔ اس اخیر زمانہ میں جن لوگوں نے حضرت مولانا رشید احمد صاحب قدس سرہٗ اور حضرت حاجی صاحب نور اللہ مرقدہم کو دیکھا ہے وہ خوب جانتے ہیں کہ حضرت حاجی صاحب مسائل میں مولانا سے پوچھ پوچھ کر عمل کرتے تھے۔ اور علوم باطنیہ میں مولانا حاجی صاحب کے محتاج تھے۔ مگر کیا اس سے مولانا حاجی صاحب کے مرید نہیں رہے، حاجی صاحب جب بھی شیخ ہی تھے اور مولانا مرید تھے۔ بعض مسائل میں حاجی صاحب کا عمل مولانا کے فتوے کے خلاف تھا جس سے بعض لوگوں کو مولانا پر اعتراض تھا کہ یہ اپنے پیر کے خلاف فتوے دیتے ہیں۔ مگر مولانا صاف فرمادیا کرتے تھے کہ ان مسائل جزئیہ میں حاجی صاحب کو ہمارے فتویٰ پر عمل کرنا واجب تھا، ہم کو ان کی تقلید جائز نہیں تھی ہم ان مسائل کی وجہ سے حاجی صاحب کے تھوڑا ہی مرید ہوئے ہیں وہ دوسرے کمالات ہیں جن کی وجہ سے ہم نے حاجی صاحب کے ہاتھ میں ہاتھ دیا ہے اس کی ایسی ہی مثال ہے جیسے کہ خلافت صدیقیہ و خلافت عمریہ کہ بعض ظاہر بیں لوگ خلافت عمریہ کو بوجہ کثرت فتوحات کے خلافت صدیقیہ سے افضل سمجھتے ہیں کیونکہ ان کے زمانۂ خلافت میں جدید فتوحات کچھ زیادہ نہ ہوئی تھیں بلکہ ان کی خلافت کا زیادہ زمانہ خود مسلمین کے سنبھالنے میں صرف ہوا۔ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد بعض قبائل مرتد ہوگئے تھے۔ کچھ لوگوں نے زکوٰۃ کی فرضیت کا انکار کر دیا تھا تو حضرت صدیق اکبرؓ کا زمانۂ خلافت اس فتنۂ ارتداد کے فرو کرنے اور مسلمانوں کی حالت سنبھالنے میں صرف ہوا مخالفین کے ملک فتح کرنے کی زیادہ نوبت نہ آئی اور حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالےٰ عنہ کے زمانۂ خلافت میں شاید کوئی دن بھی جدید فتوحات سے خالی نہیں رہا۔ روزانہ یہی خبریں آتی تھیں کہ آج فلاں شہر فتح ہوگیا اور کل فلاں شہر پر حملہ ہے یہاں تک

کہ دس سال کے عرصہ میں حکومت اسلامیہ شرقاً و غرباً پھیل گئی اس لئے بعض کم فہم خلافت عمریہ کو خلافت صدیقیہ سے افضل شمار کرتے ہیں مگر عقلاء خوب جانتے ہیں کہ مکان کی خوبصورتی میں زیادہ کمال اس شخص کا ہے جس نے کہ اول نقشہ تیار کیا تھا اور بنیادیں قائم کی تھیں کیونکہ اس کو بہت دماغ سوزی سے کام کرنا پڑا ہے۔ مکان کا خوبصورت نقشہ بنانا اور بنیاد کا مستحکم کرنا یہ بڑا کام ہے، دیواریں قائم کرنے والے کا اتنا بڑا کمال نہیں کیونکہ وہ تو اینٹ پر اینٹ رکھتا چلا گیا ہے اس کو کونسی دماغ سوزی کرنی پڑی، ظاہر بین لوگ دوسرے معمار کی تعریف کرتے ہیں کیونکہ مکان کو اسی نے مکمل کیا مگر حقیقت شناس سمجھتا ہے کہ اس مکان کی خوبصوتی میں بڑا کمال نقشہ بنانے والے اور بنیاد قائم کرنے والے کا ہے۔ اسی طرح جو اسرار شناس ہیں وہ جانتے ہیں کہ خلافت صدیقیہ سے خلافت عمریہ کو کوئی بھی نسبت نہیں کیونکہ حضرت صدیق اکبرؓ کو حکومت اسلامیہ اور خلافت کی بنیاد قائم کرنے میں جو تعب برداشت کرنا پڑا ہے اس کا عشرِ عشیر بھی حضرت عمرؓ کو نہیں پیش آیا یہ کام اسی عالی حوصلہ خلیفہ کا تھا کہ ایسے فتنے کے زمانہ میں جبکہ خود اپنی ہی جماعت قبضہ سے باہر ہوا چاہتی تھی تمام فتنوں کا مقابلہ کرکے اور ان کو ایک دم نیست و نابود کرکے ڈھائی سال کے عرصہ میں خلافت اسلامیہ کے کھونٹے گاڑ دیئے اور نظام حکومت کو ایسے مستحکم اصول پر قائم کر دیا کہ بعد کے خلیفہ کو کوئی پریشانی ہی پیش نہ آسکے حضرت عمرؓ کی خلافت میں وہ اصول جاری ہوگئے اور وہ نظام صدیقی شائع ہو گیا تو بڑا کمال حضرت صدیقؓ کا ہے اور جس قدر فتوحات حضرت عمرؓ کے زمانہ میں ہوئی ہیں ان سب کا ثواب حضرت صدیقؓ کے صحیفۂ اعمال میں داخل ہوگا، اہلِ تمدن و سیاست اس کو خوب سمجھتے ہیں کہ قانون جاری کرنے سے زیادہ مشکل قانون بنانا ہے۔ قانون بنانے والے کو جس مشقت کا سامنا ہوتا ہے جاری کرنے والے کو اس کا دسواں حصہ بھی پیش نہیں آتا اسی لئے میں کہا کرتا ہوں کہ یہ جو ہمارے فقہاء نے لکھا ہے کہ بعد چار سو برس کے اجتہاد نہیں رہا اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ چار سو برس کے بعد کسی کو اجتہاد کے قابل دماغ نہیں ملا کیونکہ اس پر کوئی دلیل قائم نہیں ۔

علاوہ ازیں یہ مطلقاً صحیح بھی نہیں ہوسکتا کیونکہ ہر زمانہ میں ہزاروں ایسی جزئیات نئی نئی پیش آتی ہیں جن کا کوئی حکم ائمہ مجتہدین سے منقول نہیں اور علماء خود اجتہاد کر کے ان کا جواب بتلاتے ہیں پس اگر اجتہاد کا باب بالکل بند ہوگیا ہے اور اب کسی کا دماغ اجتہاد کے قابل نہیں ہوسکتا تو کیا ایسے نئے نئے مسائل کا جواب شریعت سے نہیں ملے گا یا ان مسائل کے جواب کے لئے کوئی نیا نبی آسمان سے اترے گا، اگر یہی بات ہے تو خدا خیر کرے کہیں ق ذ ق والے نہ سن لیں کہیں یہ بات ان کے کانوں میں پڑ گئی تو مسیح موعود کی دلائل نبوت کی فہرست میں ایک اور دلیل کا اضافہ کرلیں گے۔ پھر اس آیت کے کیا معنی ہوں گے اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ (آج میں نے تمہارے لئے تمہارے دین کو کامل کردیا) جس سے معلوم ہوتا ہے کہ دین کی تکمیل ہوچکی سو دروازہ اجتہاد اگر بالکل بند کردیا جائے تو پھر شریعت کی تکمیل کس طرح مانی جائے گی کیونکہ ظاہر ہے کہ بہت سے ایسے مسائل ہیں کہ ان کا جواب کتب فقہ میں مذکور نہیں، نہ ائمہ مجتہدین سے کہیں منقول پچھلے دنوں میں ایک سوال آیا تھا کہ ہوائی جہاز میں نماز ہوسکتی ہے یا نہیں۔ اب بتلایئے اگر اجتہاد بعد چار سو برس کے بالکل جائز نہیں تو اس مسئلہ کا شریعت میں کوئی بھی جواب نہیں، پہلے زمانہ میں نہ ہوائی جہاز تھا نہ فقہاء اس کو جانتے تھے نہ کوئی حکم لکھا اب ہم لوگ خود اجتہاد کرتے ہیں اور ایسے نئے مسائل کا جواب دیدیتے ہیں تو فقہاء رحمہم اللہ کے اس قول کا یہ مطلب نہیں کہ چار سو برس کے بعد اجتہاد بالکل بند ہوگیا بلکہ مطلب یہ ہے کہ اجتہاد فی الاصول کا دروازہ بند ہوگیا اور اجتہاد فی الفروع اب بھی باقی ہے اور قیامت تک باقی رہے گا اگر اجتہاد فی الفروع بھی اب نہ ہوسکے تو شریعت کے نامکمل ہونے کا شبہ ہوگا جو کہ بالکل غلط ہے شریعت میں کسی قسم کی کمی نہیں۔ قیامت تک جس قدر صورتیں پیش آتی رہیں گی سب کا جواب علماء ہر زمانہ کے شریعت سے نکالتے رہیں گے کیونکہ یہ جزئیات اگر کتب فقہ میں نہیں تو اصول و قواعد تو سب پہلے مجتہدین بیان کرچکے جن سے قیامت تک کے واقعات کا حکم معلوم ہوسکتا ہے۔ البتہ قرآن و حدیث سے اصول استنباط کرنا یہ اب نہیں ہوسکتا۔

یہ خاص اجتہاد فی الاصول بعد چار سو برس کے ختم ہوگیا کیونکہ اول تو جس قدر اصول و قواعد شریعت کے تھے وہ سب ائمہ مجتہدین بیان کر چکے، انہوں نے کوئی قاعدہ چھوڑ نہیں دیا۔ دوسرے ان کے بعد اگر کسی نے اصول مستنبط بھی کئے تو وہ مستحکم نہیں۔ کہیں نہ کہیں ضرور ٹوٹتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اجتہاد فی الاصول کے لئے اب دماغ قابل ہی نہیں رہے۔ یہ حضرات مجتہدین ہی کا خاص حصہ تھا کہ انہوں نے نصوص سے اس خوبی سے اصول مستنبط کئے جو کہیں نہیں ٹوٹ سکتے۔

شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے ایک مقام پر لکھا ہے کہ ہدایہ کے اصول مسلم نہیں اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہدایہ غیر معتبر کتاب ہے اس میں اصول غلط نقل کر دیئے گئے ہیں بلکہ شاہ صاحب کی مراد یہ ہے کہ صاحب ہدایہ نے بعض اصول خود شریعت سے مستنبط کئے ہیں جن میں وہ ناقل نہیں ہیں سو وہ معتبر نہیں۔ باقی جزئیات اس کی سب معتبر ہیں تو اب دیکھئے کہ صاحب ہدایہ باوجودیکہ بہت ہی بڑے شخص ہیں۔ ان کی علمی شان ہدایہ ہی سے معلوم ہو سکتی ہے، واقعی اس کتاب میں بھی انہوں نے کمال کر دیا۔ ہر مسئلہ کی دو دلیلیں بیان کرتے ہیں ایک عقلی ایک نقلی کیا ٹھکانا ہے وسعتِ نظر کا کہ جزئیات تک کو حدیث سے ثابت کرتے ہیں پھر حدیثیں گو بلا سند بیان کرتے ہیں مگر تفتیش کرنے سے کہیں نہ کہیں ضرور ملتی ہیں چاہے مسند بزار میں ہوں یا مسند عبدالرزاق میں بیہقی میں ہوں یا مصنف ابن ابی شیبہ میں کہیں ضرور ملیں گی ایک دو اگر نہ ملیں تو ممکن ہے مگر جس شخص کی نظر اتنی وسیع ہو تو ایک دو حدیث جو ہم کو نہ ملی ہو اس سے یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ اس کی اصل ہی نہیں یہ تو وسعت نظر کا حال ہے فہم کا تو کیا ٹھکانا ہے مخالفین کے دلائل کو بیان کرنا ان کا جواب دینا پھر اپنے مذہب کی دلیل بیان کرنا یہ ان کا خاص حصہ ہے مگر باایں ہمہ جو اصول کہ وہ خود حدیث و قرآن سے نکالتے ہیں ان کی بابت شاہ ولی اللہ صاحب نے فیصلہ فرما دیا کہ وہ معتبر اور مسلم نہیں ہیں کہیں نہ کہیں ضرور ٹوٹتے ہیں تو آجکل جن لوگوں کی وسعت نظر و فہم کو صاحب ہدایہ سے کچھ بھی مناسبت نہیں وہ کیا حدیث و قرآن سے اصول مستنبط کریں گے۔ ہاں البتہ اجتہاد فی الفروع اب بھی باقی ہے مگر اس سے یہ لازم نہیں آ سکتا کہ ہم بھی امام ابو حنیفہ و امام شافعی کی طرح مجتہد ہو گئے۔

(باقی ان شاء اللہ آئندہ)

کیونکہ اصحاب سیاست خوب جانتے ہیں کہ قانون بنانا قانون جاری کرنے سے بہت زیادہ دشوار ہے، ہم لوگ سوا اس کے کہ اُن حضرات کے استنباط کردہ اصول کو حوادث الفتاوئ میں جاری کر دیں اور کیا کر سکتے ہیں کمال انہیں حضرات کا تھا کہ انہوں نے حدیث و قرآن میں سے غور کر کے ایسے اصول و قواعد سمجھے جو قیامت تک کے جزئیات کے لئے کافی ہیں۔ کوئی مسئلہ ایسا پیش نہیں آسکتا جس کا حکم جواز و عدم جواز اُن اصول سے نہ نکلتا ہو بلکہ اُن حضرات نے صرف اصول و قواعد ہی پر اکتفا نہیں کیا جزئیات بھی اس قدر نکال کر بیان کر گئے کہ بہت ہی کم کوئی مسئلہ ایسا ہوتا ہے جس کو وہ صراحۃً یا دلالۃً بیان نہ کر گئے ہوں اور اگر کوئی شاذ و نادر ایسا مسئلہ معلوم ہوتا ہے جو فقہا نے نہیں بیان کیا تو کبھی تو مفتی کی نظر کی کوتاہی ہوتی ہے کہ اس کو سب مواقع پر عبور نہیں ہوتا یا فہم کی کمی ہوتی ہے کہ وہ مسئلہ عبارت سے نکل سکتا ہے مگر مفتی صاحب کی سمجھ میں نہیں آیا اور اگر بالفرض جزئیہ انہوں نے نہیں بیان کیا تو اصول سے تو وہ ضرور ہی مستنبط ہوتا ہوگا پس آجکل یہ کسی کا منہ نہیں کہ اپنے کو ائمہ مجتہدین کے برابر کہہ سکے جو فرق کہ خلافت صدیقی و خلافت عمری میں ہے وہی فرق ائمہ مجتہدین و فقہا رمتاخرین میں سمجھنا چاہیئے۔ قانون کا جاری کرنا اور چیز ہے قانون کا بنانا کچھ اور ہی ہے اور ہم لوگوں کو تو اُن سے خاک بھی نسبت نہیں ہوسکتی۔ غرض میں یہ بیان کر رہا تھا کہ حضرات صحابہ کا کمال علوم و فنون کی تکمیل میں نہ تھا اُن کا بڑا کمال تو یہ تھا کہ انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا تھا جس کی وجہ سے کہ ان کے قلوب ہمارے قلوب سے زیادہ منور اور ان کا علم ہمارے علم سے اعمق تھا۔ تو اس تقریر سے تو یہ ثابت ہو گیا کہ صحابہؓ کا علم ہمارے علم سے بدرجہا بڑھا ہوا تھا۔

اب آگے وہ عذر سنئے پہلی آیت میں تو عام خطاب تھا اور اس آیت میں خاص حضرات صحابہ کو خطاب ہے، فرماتے ہیں اَوَلَمَّآ اَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةٌ قَدْ

ضروری اطلاع:۔ خط وکتابت کرتے وقت یا اپنا پتہ تبدیل کراتے وقت نمبر خریداری کا حوالہ ضرور تحریر کریں۔

اَصَبْتُمْ مِّثْلَيْهَا قُلْتُمْ اَنّٰى هٰذَا قُلْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اَنْفُسِكُمْ الآیہ۔

(کیا تم کو جس وقت ایک ایسی مصیبت پہونچی کہ جس سے دو چند تم کفار کو پہونچا چکے ہو تو تم (انجان بن کر) یوں کہنے لگے ہو یہ مصیبت کہاں سے آگئی آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) اُن سے یہ کہہ دیجئے یہ تمہارے ہی پاس سے آئی ہے)

شانِ نزول اس کا یہ ہے کہ غزوۂ احد میں مسلمانوں کو شکست ہوگئی تھی اور شکست بعد میں ہوئی پہلے مسلمانوں کو غلبہ حاصل ہوگیا تھا۔ قصہ اس کا یہ ہوا کہ غزوۂ احد میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم (روحی فداہ) نے پچاس صحابہ کی جماعت کو جو کہ تیرانداز تھے ایک درہ کوہ پر یعنی گھاٹی پر مقرر کیا تھا اور ان سے یہ فرما دیا تھا کہ تم یہاں سے ہرگز نہ ہٹیو چاہے ہم کو فتح نصیب ہو یا خدانخواستہ شکست ہو جاوے ہماری بوٹی بوٹی الگ ہو جائے مگر تم یہیں جمے رہیو۔ اس انتظام کے بعد جو مسلمانوں نے کفار پر حملہ کیا تو کفار کو شکست ہوگئی اور وہ ایسے بے تحاشا بھاگے کہ ان کی عورتوں کی پنڈلیاں بھاگتے ہوئے نظر آتی تھیں اس وقت حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ بھی کفار کی طرف تھے وہ اس وقت تک مسلمان نہ ہوئے تھے اس وقت تک وہ رضی اللہ عنہ بھی نہ تھے مگر ہم تو اس واقعہ کے تذکرہ کے وقت بھی رضی اللہ عنہ کہیں گے کیونکہ بعد میں بڑے جلیل القدر صحابی ہوئے سیف اللہ کا لقب پایا، غرض وہ اس وقت لشکر کفار کی کمان کر رہے تھے۔ بھاگتے بھاگتے اُن کے جاسوس نے ان کو اطلاع دی کہ گھاٹی خالی ہے۔ یہاں یہ قصہ ہوا کہ جب کفار کو شکست ہوگئی تو بعض نوجوان صحابہؓ نے اپنے افسر سے کہا کہ اب تو مسلمانوں کو غلبہ حاصل ہوگیا اور سب غنیمت کا مال لوٹ رہے ہیں ہم کو بھی لوٹنا چاہئے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا جو ارشاد تھا وہ مبالغہ کے طور پر تھا اور مقصود صرف یہ تھا کہ جب تک ہم کو فتح حاصل نہ ہو اس وقت تک تم یہاں سے نہ ہٹنا، کچھ صحابہ نے ان کی رائے کے خلاف کیا کہ نہیں مقصود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا کچھ بھی ہو مگر ہم کو صریح ممانعت کے بعد یہاں سے نہ ہٹنا چاہیئے غرض دو فریق ہو گئے کچھ تو لوٹنے میں مشغول ہوگئے اور کچھ دس پانچ اسی جگہ جمے رہے

جب گھاٹی پر تھوڑے سے آدمی رہ گئے تو خالد بن ولید نے اپنے بھاگنے کا رُخ گھاٹی کی طرف بدل دیا اور چند مسلمان جو وہاں جمے ہوئے تھے ان کو تہ تیغ کر کے پشت کی طرف سے مسلمانوں پر حملہ آور ہوئے، انہوں نے پشت کی طرف سے حملہ کیا اُس کے بعد جو کفار بھاگ رہے تھے وہ بھی پلٹ پڑے اور سامنے کی طرف سے اُنہوں نے مسلمانوں پر دوبارہ حملہ کر دیا۔ مسلمان بیچ میں آگئے بہت آدمی مارے گئے اور مسلمانوں کو شکست ہوگئی بہت سے صحابہ بھاگ گئے۔ تو یہ شکست اس وجہ سے ہوئی کہ گھاٹی والوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کی مخالفت کی اسی کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی۔ ترجمہ یہ ہے کہ کیا جب تم پر کوئی ایسی مصیبت آتی ہے جس سے دو چند تم (غزوہ بدر میں کفار کو) مصیبت پہونچا چکے ہو تو تم یوں کہتے ہو کہ یہ مصیبت کہاں سے آگئی۔ آپؐ فرما دیجئے کہ یہ تمہارے ہی نفسوں کی وجہ سے آئی۔ یعنی تم نے اپنے آپ اپنے سر مصیبت لی کہ ہمارے پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کے حکم کی مخالفت کی اور مال لوٹنے کی طمع کی یہ تمہید تھی۔ اب وہ غدر سنئے اس آیت میں جو حضرات صحابہ کا قول ہے انّٰی ھٰذا (یہ کہاں سے آئی) سے معلوم ہوا کہ کبھی حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کو بھی ایسا موقعہ پڑا ہے کہ ان کو یہ کہنے کی نوبت آئی کہ یہ بلا کہاں سے آگئی، حالانکہ ان کی بصیرت ہماری بصیرت سے بہت زیادہ بڑھی ہوئی تھی جیسا کہ اوپر مفصلاً ثابت ہوا۔ مگر اس کے باوجود وہ بھی کبھی اپنی کوتاہی کو بھول جاتے تھے اور یہ خیال ان کو بھی نہ ہوا کہ یہ مصیبت ہمارے فلاں فعل کی وجہ سے آئی تو اب اگر آپ لوگ بھی اپنی خطاؤں کو بھول جائیں تو کچھ زیادہ تعجب نہیں، لیجئے میں نے آپ کا عذر بھی بیان کر دیا۔ معلوم ہوا کہ مصیبت کے وقت علی التعیین کسی خطا پر نظر نہ ہونا طبعی بات ہے جو صحابہ کو بھی پیش آئی کہ وہ بھی نہ سمجھے کہ ہماری کونسی خطا پر یہ سزا مرتب ہوئی مگر پھر بھی صحابہ مطلقاً نفس مسئلہ سے غافل نہ تھے اور آپ کو تو خود مسئلہ ہی کی خبر نہیں کہ گناہ کو بھی مصیبت میں کچھ دخل ہے یہ تو دلیل نقلی تھی اس بات کی کہ جو کچھ مصیبت آتی ہے وہ گناہ کی وجہ سے آتی ہے۔

دوسری بات عقلی ہے گرچہ دلیل نقلی کے بعد اس کی حاجت نہیں رہی مگر آجکل عقل کا ہیضہ بہت پھیل رہا ہے اس لئے بعض لوگوں کو بدون دلیل عقلی کے تسلی نہیں ہوتی عورتوں کو حیض آتا ہی تھا مگر آجکل مردوں کو بھی ہیضہ ہوگیا عورتوں سے بھی بڑھ گئے۔ مگر اتنا فرق اب بھی کہ وہاں بڑی حا ء ہے اور یہاں چھوٹی ہا۔ وہ دلیل یہ ہے کہ سب جانتے ہیں کہ حق تعالےٰ شانہٗ بہت بڑے رحیم ہیں ان کی رحمت و رافت اپنی مخلوق کے ساتھ اس درجہ ہے کہ نہ کسی باپ کو اپنی اولاد سے ہوسکتی ہے نہ کسی ماں کو شاید آپ کہیں کہ یہ بھی تو دلیل نقلی ہوئی کیونکہ حق تعالیٰ کا اس درجہ رحیم و کریم ہونا یہ بھی تو نصوص ہی سے معلوم ہوا ہے تو لیجئے میں اس کو بھی عقل سے ثابت کئے دیتا ہوں میں کہتا ہوں کہ اگر خدا کی رحمت آپ کو محسوس نہیں ہوتی تو یہ تو آپ کو محسوس ہوتا ہے کہ ماں اپنی اولاد سے محبت کرتی ہے۔ جانور تک اپنے بچوں کو جان سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں خود آپ کو بھی کسی سے ضرور محبت ہوتی ہے، اور یہ ظاہر ہے کہ یہ ہماری ایک صفت جوکہ وجود کی فرع ہے۔ وجود ہی اگر نہ ہوتا تو یہ محبت کہاں سے پیدا ہوتی اور یہ ہر شخص جانتا ہے کہ وجود ہمارا اپنے گھر کا نہیں خدا کا دیا ہوا ہے تو یہ تمام صفات بھی اُسی کی عطا کردہ ہیں۔ اس کے بعد دوسرا مقدمہ یہ ملا لیجئے کہ یہ باتفاق عقلاء کے ایک کمال ہے۔ اور حق تعالیٰ کسی کمال سے خالی نہیں تو ان میں صفت محبت کا ہونا عقلاً ثابت ہوگیا۔ تو جب وہ اتنے بڑے رحیم ہیں اور پھر بندوں پر مصیبتیں بھیجتے ہیں تو یہ کب خیال ہوسکتا ہے کہ اتنا بڑا اچاہنے والا خواہ مخواہ اپنی مخلوق کو پریشان کرتا ہوگا، بلکہ ضرور کوئی قصور آپ کی طرف سے بھی ہوا جبھی تو اس رحیم و کریم نے یہ مصیبتیں آپ پر نازل کی ہیں۔ غرض عقلاً و نقلاً یہ بات ثابت ہوگئی کہ جو کچھ مصیبت آتی ہے ہمارے گناہوں کی وجہ سے آتی ہے اس کے بعد تعجب ہے کہ اب بھی بعض لوگ ایسے وقت میں یوں کہتے کہ اے اللہ کس گناہ میں پکڑے گئے۔ میں کہتا ہوں کہ اے اللہ کیا اب بھی آپ کو اپنے تقدس کا اعتقاد ہے، جو لوگ نماز روزہ کرتے رہتے ہیں اور گناہوں سے بچتے ہیں وہ اگر یہ بات کہیں تو ان کو

تو اس کہنے کا کچھ منہ بھی ہے مگر بے نمازی بھی تو یوں کہتے ہیں کہ ہائے کس گناہ میں پکڑے گئے۔ اب یا تو یہ لوگ اپنے گناہوں کو گناہ ہی نہیں سمجھتے مگر مسلمان کی نسبت یہ خیال تو نہیں کیا جا سکتا کہ وہ گناہ کو گناہ ہی نہیں سمجھتا کیونکہ یہ تو کفر ہے مگر میں اس کا منشاء آپ کو بتلانا چاہتا ہوں۔ اس کا منشاء یہ ہے کہ یہ لوگ خدا تعالیٰ کو اپنے اوپر قیاس کرتے ہیں اور اکثر باتوں میں جاہل لوگ خدا تعالیٰ کو اپنے اوپر قیاس کیا کرتے ہیں جیسا کہ ایک بوڑھیا نے کہا تھا کہ جب سارے آدمی اور جانور مرجائیں گے قیامت کو تو اللہ میاں کا اکیلے جی نہیں گھبرائے گا اور بہت سے واقعات ایسے ہیں جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انسان کا خاصہ ہے کہ وہ حق تعالےٰ کو اپنے اوپر قیاس کرتا ہے۔ اسی طرح جو لوگ کہ رات دن گناہوں میں مبتلا ہیں وہ اپنے آپ کو دیکھتے ہیں کہ پہلے پہل گناہ جب صادر ہوتا ہے تو دل کڑھتا ہے پھر کرتے کرتے عادت سی ہوجاتی ہے کہ اس سے دل بھی نہیں بُرا ہوتا تو وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ جن گناہوں کی ہم کو عادت ہوگئی ہے خدا تعالےٰ کو بھی نعوذ باللہ اُن کی تو عادت ہوگئی ہوگی۔ کیونکہ قاعدہ ہے کہ پہلی مرتبہ خطا پر زیادہ غصہ آیا کرتا ہے جب اس وقت سزا نہیں دی تو دوسری مرتبہ پر غصہ کم آیا کرتا ہے اور پھر جب بار بار ایک کام خلاف منشاء ہوتا ہے ایک مساوات سی ہوجاتی ہے جس طرح کسی کی بیوی بدمزاج ہو تو پہلے پہل تو اس کی باتوں پر غصہ آیا کرتا ہے جب دیکھتے ہیں کہ اس کی عادت ہی اس طرح کی ہے تو اچھے اچھے دنیا داروں کو بھی مساوات ہوجاتی ہے اور بے چارے اللہ والے تو پہلے ہی سے صبر کر لیتے ہیں مگر دنیا داروں سے صبر دشوار ہے وہ خوب مرمت کرتے ہیں اور انہی سے عورتیں سیدھی بھی ہوتی ہیں سچ کہا ہے کسی نے يَغْلِبْنَ الْحَازِمَ وَيَغْلِبُهُنَّ الْجَاهِلُ (ہوشیار مرد پر غالب ہوجاتی ہیں اور جاہل ان پر غالب ہوتا ہے)

لوگ یوں سمجھتے ہیں کہ مولوی بیویوں سے دبتے ہیں خیر کوئی یوں ہی سمجھ لے مگر وہ حقیقت میں دبتے نہیں بلکہ کمزور پر بہادری ظاہر کرتے ہوئے غیرت کرتے ہیں جس طرح دنیادار اپنی بیویوں کو کوٹتے ہیں اُن سے یہ نہیں ہوسکتا تو بعض تو غیرت کی وجہ سے اُس کی

کج خلقی کو نباہ تے ہیں اور بعضے اللہ کے بندے اس سے بھی آگے بڑھے ہوئے ہیں ایک بزرگ کی بیوی بہت کج خلق تھیں اوران کو اس کے ہاتھ سے بہت اذیت تھی۔ ایک مرتبہ کسی خادم نے عرض کیا کہ حضرت اس کا رستہ کیوں نہیں کاٹ دیتے جب یہ باز نہیں آتی تو طلاق دے کر الگ کر دیجئے۔ ان بزرگ نے فرمایا کہ ہاں بھائی سچ کہتے ہو واقعی خیال تو مجھے بھی ہوا تھا کہ اس کو طلاق دیدوں مگر پھر یہ خیال ہوا کہ اگر میں نے اس کو طلاق دیدی تو یا تو یہ دوسرا نکاح نہ کرے گی تو اس صورت میں اس کو تکلیف ہوگی اس کے نان نفقہ کی کون خبر لے گا۔ اور اگر اس نے دوسرا نکاح کسی سے کرلیا تو اس کے ساتھ بھی یہ اسی طرح رہے گی جس کے سر پڑے گی اس کے لئے وبالِ جان ہو جائے گی۔ اس لئے میں ہی سب مسلمانوں کی طرف سے تکلیف برداشت کرنا گوارا کرتا ہوں، دوسرے مسلمانوں کو اس سے تکلیف نہ پہونچے تو میں نے تو یہ سمجھ لیا ہے کہ میں مسلمانوں کے لئے وقایہ بنا ہوا ہوں کہ امت محمدیہ (صلی اللہ علیہ وسلم) میں سے کسی شخص کے پیچھے یہ بلا نہ پڑے۔ ماشاء اللہ ان حضرات کی کیسی نیتیں تھیں۔ دنیا داروں سے اول تو صبر نہیں ہوتا خوب مرمت کرتے ہیں اور جو اس سے باز نہ آئے کھانا کپڑا بند کر دیتے ہیں اور بعضے طلاق ہی دے ڈالتے ہیں مگر اللہ والوں سے تو یہ نہیں ہوسکتا اس لئے سب ان کو یہ کہتے ہیں کہ بیویوں سے دبتے ہیں کوئی کچھ ہی کہے مگر وہ تو اس تحمل و برداشت میں ثواب کی امید کرتے ہیں حضرت مرزا مظہر جانِ جاناں رحمۃ اللہ علیہ بہت ہی نازک مزاج تھے ان کا ایسا شاہانہ مزاج تھا کہ ایک مرتبہ آپ کو رات بھر نیند نہ آئی صبح کو جو تشریف لائے تو آنکھوں میں نیند نہ آنے کا اثر تھا سرخی ہوگی۔ خدام نے دریافت کیا کہ آج کیسا مزاج ہے۔ فرمایا رات بھر نیند نہیں آئی۔ لحاف میں نگندے ٹیڑھے پڑے ہوئے تھے اس سے رات بھر الجھن رہی۔ نہ معلوم رات کو لحاف میں منہ لپیٹ کر نگندوں کا ٹیڑھا ہونا کیسے معلوم ہوگیا ہوگا۔ نہایت لطیف المزاج تھے۔ آپ کی بیوی صاحبہ رحمۃ اللہ علیہا بہت ہی ٹیڑھے مزاج کی تھیں۔ مرزا صاحب کو کوری کوری سناتی تھیں۔ آپ کو

کشف میں بتلایا گیا تھا کہ فلاں عورت سے نکاح کرلو تمہارے درجے بلند ہوں گے اس لئے آپ نے ان سے نکاح کرلیا تھا۔ چنانچہ انہوں نے ساری نزاکت کی کسر نکال دی تھی (جامع) اور آپ نے ساری عمر ان کو نباہا اور کبھی ان کے کہنے کا برا نہیں مانا جب مرزا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا وصال قریب آیا تو آپ نے ان کو فرمایا کہ میرے بعد تم پانی پت قاضی ثناء اللہ صاحب کے پاس چلی جانا وہ تمہاری ناز برداری کریں گے اور کوئی تمہاری خدمت نہیں کرے گا چنانچہ وہ پانی پت چلی آئیں اور قاضی صاحب نے اُن کی ہمیشہ خدمت کی اور اپنے وصیت نامہ میں جہاں اور وصیتیں لکھی تھیں ان کے واسطے بھی کچھ زمین کی وصیت کردی تھی کہ اس کی آمدنی میرے بعد ان کو دی جائے غرض وہ بہت ہی سخت مزاج تھیں۔ مگر مرزا صاحب کا معمول تھا کہ روزانہ صبح کے وقت ایک خادم کو ڈیوڑھی پر بھیجتے تھے کہ بیگم صاحبہ کا مزاج پوچھ کر آؤ جب خادم مزاج پوچھنے جاتا وہ اس کو بھی اور مرزا صاحب کو بھی خوب سخت سخت سناتیں۔

ایک دفعہ آپ نے کسی ولایتی مرید کو مزاج پرسی کے لئے بھیجا انہوں نے پھر ویسی ہی سنانا شروع کیں اس ولایتی کو بہت ناگوار ہوا اور انتقام لینا چاہا مگر یاد آگیا کہ مرزا صاحب کی متعلقہ ہیں خاموش ہو کر منہ بنا کر آبیٹھے۔ مرزا صاحب سمجھ گئے ہنس کر فرمانے لگے کیا ہوا، ایسے کیوں ہو رہے ہو۔ انہوں نے عرض کیا حضرت کچھ پوچھئے نہیں اور سب قصہ بیان کیا اور اپنی ناگواری اور رنج کا اظہار کیا۔ آپ نے فرمایا بھائی بُرا نہیں ماننا چاہیئے وہ ہماری محسن ہے اس سے نفس کی اصلاح ہوتی رہتی ہے۔ غرض وہ ایسی تھیں۔ باقی ہماری تو وہ مخدومہ ہی ہیں ہم تو ان کے نام کے ساتھ رحمۃ اللہ علیہا ہی کہیں گے کیونکہ وہ ایک بزرگ کی بیوی ہیں۔ ان شاء اللہ حضرت کی برکت صحبت سے وہ بخش ہی دی جائیں گی۔ اگر کسی بزرگ کی اہل کا برتاؤ اُن بزرگ کے ساتھ اچھا نہ ہو تو چھوٹوں کو ان کی شان میں گستاخی نہ کرنا چاہیئے۔ تمہاری تو وہ بہرحال مخدومہ ہی ہیں۔ یاد رکھئے جس طرح آپ کو ان بی بی صاحبہ کی گستاخیاں ان بزرگ کے ساتھ ناگوار ہوتی ہیں اسی طرح ان بزرگ کو آپ کی گستاخی

ان کی بی بی کی شان میں ناگوار ہوتی ہے اور بزرگوں کو تکلیف پہنچانا تھوڑی بات نہیں اس لئے بزرگوں کی اہل کے ساتھ بھی گستاخی نہ چاہیئے یہ بزرگ اپنے متعلقین کو چھوڑیں گے نہیں ان شاء اللہ سفارش کر کے بخشوا ہی لیں گے کیونکہ اہل اللہ کے حوصلے بڑے ہوتے ہیں اگر اپنی بیوی سے یا کسی عزیز وغیرہ سے ان کو تکلیف پہونچی ہوگی تو وہ اس کا اثر دل میں نہ رکھیں گے فوراً سب معاف کر دیں گے اور آخرت میں حق تعالےٰ سے ان کے واسطے سفارش بھی کریں گے۔

ایک کفن چور کا قصہ ہے اس کی ایک بزرگ سے دوستی تھی ایک دفعہ ان بزرگ نے اس سے کہا کہ بھائی ہم کو اندیشہ ہے کہ تم ہمارا کفن بھی چراؤ گے اس نے کہا توبہ توبہ آپ سے ایسی گستاخی کبھی نہیں کروں گا۔ انہوں نے فرمایا ہم کو اطمینان نہیں۔ البتہ ایک صورت اطمینان کی ہے کہ ہم سے تم کفن کی قیمت لے لو اور وعدہ کر لو اس نے اس سے انکار کیا۔ انہوں نے اصرار کر کے قیمت سپرد کر دی اور فرمایا بس اصل مقصود تمہارا یہی روپیہ ہے سو تم کو یہ حاصل ہی ہو گیا، اب مت چرانا اس نے کہا اول تو اس کی حاجت نہ تھی مگر خیر اب تو کوئی احتمال ہی نہیں رہا۔ اتفاق سے ان بزرگ کا انتقال ہو گیا یہ صاحب وہاں پہونچے اور وہی حرکت شروع کی۔ ان بزرگ کی کرامت ظاہر ہوئی کہ اس کا ہاتھ پکڑ لیا کہ کیوں صاحب یہی ٹھہری تھی، یہ خوف سے وہاں ہی گر گیا اور دم نکل گیا۔ کسی خلیفہ نے ان بزرگ کو خواب میں دیکھا، فرماتے ہیں کہ ہم نے تو ہنسی میں اس سے یہ کہا تھا ورنہ کفن چرانے سے ہمارا کیا ضرر تھا مگر وہ ایسا بزدل نکلا کہ مر ہی گیا گو وہ فاسق ہے مگر ہم نے اس کا بازو پکڑ لیا ہے اس کی لاج آتی ہے اب میں اس کی سفارش کر کے بخشوانے کی کوشش کرتا ہوں اور تم اس کی تجہیز و تکفین کرو۔

غرض میں یہ بیان کر رہا تھا کہ عوام کا خیال یہ ہے کہ جس طرح ہم کو گناہ کرتے کرتے عادت ہو جاتی ہے اسی طرح معاذ اللہ حق تعالےٰ کو بھی ایک گناہ کو بار بار دیکھتے دیکھتے عادت سی ہو جاتی ہوگی، اس پر زیادہ غصہ نہ آتا ہوگا، ہاں جب کوئی نیا گناہ ہوتا ہوگا تب حق تعالےٰ کو غصہ آتا ہوگا۔ اسی لئے جب مصیبت آتی ہے تو عوام یہی کہتے ہیں کہ نہ معلوم

ہم سے کونسا گناہ ہو گیا تھا افسوس مہلت اور ڈھیل دینے کا یہ مطلب نکالا گیا کہ وہ گناہ گناہ ہی نہ رہا چاہیئے تو یہ تھا کہ یوں سمجھتے کہ ہم ہر وقت زمین میں گاڑ دیئے جانے کے قابل ہیں اور جو گھڑی سلامتی کے ساتھ گذر جاتی ہے خدا کی عنایت ہے کہ توبہ و استغفار کی مہلت اور ڈھیل دیدی مگر جب اُس مہلت کی یہ قدر کی گئی کہ اس کی وجہ سے وہ گناہ گویا گناہ ہی نہ رہے تو اب اُدھر سے جو کچھ بھی ہو تھوڑا ہے۔

صاحبو! میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ تم مصیبت کے آنے پر کیا تعجب کرتے ہو یہ تو کچھ تعجب کے قابل بات نہیں اگر ہم کو سزا ملے یہ تو قاعدہ کے موافق ہے مجرم کو سزا ملا ہی کرتی ہے اور ہم نے اپنے اوپر نہ معلوم تعزرات الٰہی کی کتنی دفعات قائم کر رکھی ہیں تو مصیبت کا آنا کوئی تعجب خیز نہیں بلکہ خدا کی قسم ہم کو ذرا سی راحت اگر مل جائے تو وہ تعجب کی بات ہے۔ آپ مصیبت آنے پر حیرت کرتے ہیں کہ یہ بلا کس گناہ کا بدلہ ہے میں کہتا ہوں کہ تم کھانا کھاتے ہوئے یہ سوچا کرو کہ آج ہم نے کون سی طاعت اور کون سا نیک کام کیا ہے جو یہ کھانا ہم کو مل گیا ۔ عشاق کا مذاق پیدا ہو جائے تو پھر منہ سے کبھی یہ بات نہ نکل سکے کہ یہ بلا کس گناہ کی وجہ سے آئی ۔ اُن کا تو مذاق یہ ہے ؎

وُجُوْدُكَ ذَنْبٌ لَا يُقَاسُ بِهٖ ذَنْبٌ

(تیرا وجود ہی گناہ اس پر اور گناہ کو قیاس نہیں کیا جا سکتا)

کہ خود ہمارا موجود ہونا ہی اتنا بڑا گناہ ہے کہ اس کی برابر کوئی گناہ نہیں موجود حقیقی کے سامنے ممکن معدوم کی ہستی کیا ہے کہ یہ بھی وجود میں اس کے ساتھ شریک ہو۔ یہ تو ہر وقت نیست و نابود کر دیئے جانے کے قابل ہے ۔ لیجئے عارفین تو آپ کے وجود ہی کو گناہ بتلا رہے ہیں جس سے آپ بچ ہی نہیں سکتے ، اس شعر کا یہ مطلب نہیں کہ وجود فی نفسہ گناہ ہے کیونکہ وجود فی نفسہ ہمارے اختیار میں کب ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ اپنے کو موجود سمجھنا اور اپنی ہستی پر نظر کرنا گناہ ہے سو واقعی جس کی نظر موجود حقیقی کی ہستی پر ہے وہ تو اس کے سامنے اپنے آپ کو موجود کہتے ہوئے

بھی شرمائے گا ؎

ہمہ ہرچہ ہستند ازاں کمترند
کہ با ہستیش نام ہستی برند

(تمام چیزیں جو موجود ہیں اس موجود حقیقی کے سامنے کمتر ہیں کہ اس کے
وجود کے سامنے اپنے وجود کا نام لے سکیں)

وحدۃ الوجود کے مسئلہ کو شیخ نے کتنی دو مختصر اور آسان لفظوں میں بیان کیا ہے کہ جتنی چیزیں ہست نظر آتی ہیں گو ہست تو ہیں مگر پھر بھی یہ سب موجود حقیقی کے سامنے اس سے بھی کمتر ہیں کہ ہستی کا نام بھی لے سکیں یعنی اس قابل بھی نہیں ہیں ان کا وجود اُس کے سامنے کچھ بھی نہیں۔ جب ان کے نزدیک وجود بھی گناہ ہے تو سارے نیک اعمال بھی ان کے نزدیک حسنات نہیں بلکہ ان کی نظر میں وہ بھی سئیات ہیں اور جو واقعی سئیات ہیں انکو تو نہ معلوم وہ کس درجہ میں شمار کرتے ہوں گے۔ اب آپ کو معلوم ہوا کہ یہ کہنا کہ ہم کس گناہ میں مارے گئے یہ اپنے کو مقدس سمجھنا ہے۔ یہی خود بہت بڑا گناہ ہے اور گناہوں کو تو کیا پوچھتے ہو پہلے اسی کی خبر لو کہ خود اسی وقت عجب و دعوے کے گناہ میں مبتلا ہو رہا ہے۔

صاحبو! سچ یہ ہے کہ حق تعالیٰ ہماری پردہ پوشی فرماتے رہتے ہیں ورنہ پہلی امتوں کی طرح اگر گھر کے دروازے پر گناہ لکھدیئے جایا کرتے جیسا کہ پہلے ہوا کرتا تھا کہ رات کے گناہ دن میں دروازہ پر لکھے ہوتے تھے اور دن کے گناہ تو سب دیکھتے ہی تھے اس وقت معلوم ہوتا کہ ہم کس قدر گناہ کرتے ہیں کتنے رسوا اور ذلیل ہوتے ہیں مگر اس نعمت کی ہم نے یہ قدر کی ہے کہ خدا تعالیٰ نے جو ہمارے گناہ چھپائے تو ہم خود بھی اپنے کو مقدس سمجھنے لگے۔ اے صاحبو! دوسروں ہی سے تو ہمارے گناہ چھپے ہوئے ہیں خود ہم سے تو نہیں چھپا دگئے۔ پس یہ کتنی حماقت ہے کہ دوسروں کے حسن ظن سے ہم نے خود بھی اپنے ساتھ حسن ظن کر لیا۔ ہم کو چاہیئے کہ جب طاعت کریں تو اس کو دیکھیں کہ ہم نے اس کو کس طرح ادا کیا پھر یہ سوچیں کہ ہم سے کیسی طاعت مطلوب تھی

اور ہم نے ادا کیسی کی ہے۔ ایسی ہی طاعت ہم سے مطلوب ہے جیسی ہم ادا کرتے ہیں ایک نماز ہی کو لے لو کہ ہم اس کی کیسی بری گت بناتے ہیں نہ طریقہ کے ساتھ وضو کیا جاتا ہے نہ قاعدہ کے موافق قرارت ہے نہ اطمینان سے رکوع اور سجدہ ہے ایسی ٹکریں مارتے ہیں جیسے کوئی بیگار سر سے ٹالتا ہوا اور خشوع و خضوع کا تو پتہ ہی کہیں نہیں ہوتا نہ معلوم دل کہاں کہاں ٹکریں مارتا پھرتا ہے پھر اس پر سمجھتے ہیں کہ ہم نمازی ہیں، نماز کے پابند ہیں اور اس طرح ہر کام کو دیکھئے اور سوچئے واللہ اگر ہم اس طرح کسی دنیا کے آقا کا کام کریں تو ہمارے سر پر سَو جوتے روز آ پڑا کریں یہی وجہ ہے کہ عارفین اپنی طاعات کو طاعات نہیں سمجھتے وہ تو یوں کہتے ہیں ؎

خود ثنا گفتن زمن ترک ثنا ست
کیں دلیل ہستی و ہستی خطا ست

(میرا تعریف کرنا خود ترکِ تعریف ہے کیونکہ یہ ہستی کی دلیل ہے اور ہستی گناہ ہے)

اور طاعات بھی ایک قسم کی ثنا ہے، فرماتے ہیں کہ میرا ثنا کرنا یعنی طاعلت بجالانا یہ خود ترک طاعت ہے یعنی وہ بھی ایک گناہ ہے کیونکہ ہم اس پر نظر عجب سے نگاہ کرتے ہیں۔ خشوع کے اوپر مجھے امام غزالی کا اور ان کے بھائی کا قصہ یاد آیا امام ابو حامد غزالی کے چھوٹے بھائی احمد غزالی جماعت سے نماز نہ پڑھتے تھے مغلوب الحال زیادہ تھے۔ ایک مرتبہ امام غزالی نے والدہ سے اس کی شکایت کی انہوں نے ان کو سمجھایا بجھایا خیر جماعت میں آکر کھڑے ہوئے۔ امام غزالی نے نماز پڑھنی شروع کی بس تھوڑی ہی دیر میں ان کے بھائی صاحب نیت توڑ جماعت سے علیٰحدہ ہو گئے۔ امام غزالی کو جو معلوم ہوا کہ نیت توڑ کر چلے گئے بہت ناگوار ہوا، آکر والدہ صاحبہ سے اس کی شکایت کی۔ والدہ نے پوچھا کہ یہ کیا حرکت تھی وہ کہنے لگے کہ اگر کسی کے کپڑے میں حیض کا خون لگ جاوے تو نماز نہیں ہوتی، ان کے قلب میں حیض کا خون لگ رہا تھا بس میں اقتدار سے جدا ہو گیا۔ اور ہوا یہ کہ یہ اس زمانہ میں ایک فقہ کی کتاب لکھ رہے تھے تو اس وقت ایک خاص جز یعنی اس باب کا ان کے قلب میں گذرا ان کو منکشوف ہو گیا اب دیکھئے ان کی والدہ صاحبہ کیا فیصلہ فرماتی ہیں آپ نے فرمایا کہ محمد (امام غزالی کا

نام ہے) واقعی تم نے نماز کا حق ادا نہ کیا. مسائل کے حل کے لئے دوسرا وقت ہے. نماز میں کیوں ادھر التفات کیا۔ اور دوسرے سے فرمایا کہ احمد تم نے بھی خطا کی تمہارا حضور بھی کامل نہ تھا تم کو حق تعالیٰ سے توجہ ہٹا کر ادھر کیوں التفات ہوا کہ امام کیا کر رہا ہے کیا سوچ رہا ہے۔ دونوں کے حضور میں نقصان ہے۔ واقعی کیا اچھا فیصلہ کیا گویا ان کا مطلب یہ تھا کہ نماز میں ایسی حالت ہونی چاہیئے

دلا رامے کہ داری دل درو بند
دگر چشم از ہمہ عالم فرو بند

(جس دلارام سے تمہارے دل کو بستگی ہو جائے تو پھر تمام جہان سے آنکھیں بند کرلو)

اے صاحبو! اگر ہم کو ہر وقت یہ حالت نصیب نہیں تو کم از کم نماز میں تو ایسا ہو جانا چاہیئے کہ تمام عالم سے آنکھیں بند کرلیں۔ جس نے نماز میں بھی عالم سے آنکھیں بند نہیں کیں وہ پھر اور کس وقت خدا کی طرف لگے گا. تب احمد سمجھے کہ واقعی ہم کچھ نہیں ہیں۔ خشوع و خضوع کا ہمارا محض دعویٰ ہی دعویٰ ہے۔ والدہ صاحبہ ہم سے بھی بڑھی ہوئی ہیں کتنی بڑی غلطی پر متنبہ کیا جس کو ہم غلطی بھی نہ سمجھتے تھے. ہم تو بھائی صاحب ہی کو الزام دیتے تھے کہ وہ نماز میں خشوع نہیں کرتے، اب معلوم ہوا کہ ہم خود بھی خشوع سے خالی ہیں۔ بلکہ اگر غور سے دیکھا جائے تو اس وقت امام غزالی کے خشوع میں پھر بھی بہت زیادہ نقصان نہ تھا کیونکہ ان کو تو ایک شرعی مسئلہ ہی کا خیال آیا تھا اور مسائل شرعیہ اگرچہ غیر خدا ہیں مگر پھر ان کو خدا کے ساتھ ایک گونہ تعلق ہے تو خدا کی طرف سے اگر دھیان ہٹا تھا تو اسی کے احکام میں لگا ہوا بھی تھا اور شیخ احمد کا دھیان خدا کی طرف سے ہٹکر امام کی حالت پر متوجہ ہوا اور ایک خاص واقعہ کا ان کو انکشاف ہو گیا، تو خدا کی طرف خیال رہا نہ خدا کے احکام کی طرف تو یہ تشتت ان کے تشتت سے ادون رکم تھا، اب اس واقعہ کو سنکر فرمایئے کہ ہم میں خشوع اور خضوع کے ساتھ نماز پڑھنے والے کے آدمی ہیں غرض نماز ہی کو دیکھ لو تو معلوم ہو جائے کہ ہماری کوئی طاعت طاعت کہنے کے قابل نہیں۔ اس جگہ بظاہر یہ ایک شبہ ہوتا ہے میں اس کو بھی دفع کر دینا چاہتا ہوں وہ یہ کہ

حدیث میں آیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں اُجَهِّزُ جَيْشِىْ وَ اَنَا فِى الصَّلوٰةِ کہ میں نماز کے اندر لشکر بھیجنے کا سامان کیا کرتا ہوں ۔ اس سے معلوم ہوا کہ حضرت عمر کے دل میں نماز کے اندر لشکر کا خیال آتا تھا اور ایک آن میں دو چیز دل کی طرف التفات نفس محال ہے تو یقیناً لشکر کے خیال کے ساتھ حق تعالیٰ کی طرف خیال نہ رہتا ہوگا یا کم رہتا ہوگا تو اب یا تو یہ مانا جائے کہ حضرت عمرؓ نماز میں خشوع نہ کرتے تھے یا یہ کہا جائے کہ خدا کے سوا دوسرے خیالات میں مشغول ہونا خشوع کے منافی نہیں اشکال ہے ظاہر میں سخت اسی لئے ہمارے حضرت حاجی صاحب کے پاس دو عالم جھگڑتے آئے تھے ایک تو خطرات آنے کو خشوع کے منافی سمجھتے تھے دوسرے اس کو خشوع کے منافی نہ سمجھتے تھے اور اس قصہ سے استدلال کرتے تھے ۔ پہلے شخص کو اس کی حقیقت نہ معلوم ہونے سے کوئی جواب نہ بن پڑا تھا اس لئے بعضے لوگ اس واقعہ سے خشوع کے عدم وجوب کے قائل ہوئے ہیں ۔ کیونکہ اُن پر حضرت عمرؓ کے اس واقعہ کی حقیقت واضح نہیں ہوئی حضرت حاجی صاحب نے اس کی حقیقت کو منکشف فرمایا ۔ آپ نے جواب دیا کہ حضرت عمرؓ کی تجہیز جیش خشوع کے منافی نہیں کیونکہ وزیر جب بادشاہ کے دربار میں آتا ہے تو اس کا خشوع یہی ہے کہ سرکاری کاغذات کو دیکھے اور بادشاہ کے سامنے پیش کرے اس سے احکام دریافت کرے اور اس کے موافق فرمان شائع کرے ۔ تو ایک شخص تو وہ ہے جو بادشاہ کے دربار میں محض حاضری دینے آتا ہے اس کا کام یہ ہے کہ بادشاہ کی عظمت و جلال ظاہر کرنے کے لئے دست بستہ اس کے سامنے کھڑا رہے ۔ چنانچہ دربار شاہی میں بہت سے خدمتگار صرف اس لئے ہوتے ہیں کہ ان کے سامنے دست بستہ کھڑے رہیں دوسرا کوئی کام ان کے ذمہ نہیں ہوتا سو اس کا خشوع تو یہی ہے کہ ہاتھ باندھے سر جُھکائے بادشاہ کے سامنے کھڑا رہے کسی چیز کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھے اور ایک وزیر ہے جس کا کام یہ ہے کہ سلطنت کا انتظام کرے اور بادشاہ کے حکم کے موافق فرمان نافذ کرے اس کا خشوع یہی ہے کہ تمام کاغذات کو دیکھے بھالے ، ڈاک کو پڑھے اُن کے جواب کو لکھ کر بادشاہ کو

سنائے پس ظاہر میں اگرچہ پہلے شخص کا خشوع بڑھا ہوا معلوم ہوتا ہے کہ اس کی نظر بادشاہ کے سوا کسی چیز پر نہیں اور وزیر بظاہر دوسری چیزوں کی طرف متوجہ معلوم ہوتا ہے وہ دست بستہ بادشاہ کے سامنے یکسو ہو کر نہیں کھڑا ہوتا مگر کون نہیں جانتا کہ وزیر کا مرتبہ پہلے شخص سے کس قدر بڑھا ہوا ہے اور اس کی اطاعت اور خشوع یہی ہے کہ دوسرے کاموں میں مشغول ہو جو بادشاہ نے اس کے سپرد کئے ہیں، اسی طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے وقت میں خلیفۃ اللہ تھے جن کے سپرد انتظام عام کا کام کیا گیا تھا اُن کا خشوع یہی تھا کہ نماز میں کھڑے ہو کر حق تعالیٰ سے لشکر وغیرہ کی بابت احکام دریافت کریں اور نماز میں جو بات ان کے دل پر القاء ہو اس کے موافق عمل کریں اسی لئے بزرگوں نے کہا ہے کہ نماز میں جو کچھ القاء ہوتا ہے وہ اکثر صحیح ہوتا ہے۔ پس حضرت عمرؓ کی تجہیز جیش کی وہی مثال ہے جو وزیر کی بادشاہ کے دربار میں حاضر ہو کر حالت ہوتی ہے، حضرت عمرؓ کو تجہیز جیش میں بھی حضور حق ہی حاصل ہوتا تھا اس لئے اُن کی یہ حالت کسی طرح خشوع کے منافی نہ تھی بلکہ عین خشوع تھی بلکہ مثال سے

لہ جامع عرض کرتا ہے کہ اس تقریر سے یہ لازم آتا ہے کہ امام غزالی کے واقعہ میں ان کا نماز میں مسائل فقہ کو عل کرنا بھی خشوع کے منافی نہ ہو کیونکہ وہ عالم تھے اور شرعاً عالم کے ذمہ استنباط مسائل لازم کیا گیا ہے تو وہ بھی نماز میں داخل ہو کر اپنا فرض منصبی انجام دیتے تھے۔ ہاں یہ فرق کیا جائے تو ممکن ہے کہ حضرت عمر نماز میں داخل ہو کر خود تو ہمہ تن حق تعالیٰ کی طرف متوجہ رہتے ہوں اور عمداً تجہیز جیش کا خیال دل میں نہ لاتے ہوں پھر خود بخود غیب سے تجہیز جیش کے متعلق ان کے قلب پر واردات القاء ہوتے ہوں اور امام غزالی سے اس واقعہ میں عمداً مسائل فقہ کی طرف التفات ہوا ہوگا اس لئے ان کی والدہ نے ان کے خشوع کو ناقص کہا اور غالباً حضرت عمر کے تجہیز جیش فی الصلوٰۃ کی صورت یہی تھی کہ وہ اپنی توجہ بالقصد حق تعالیٰ کی طرف رکھتے تھے پھر خود بخود اُدھر سے احکام متعلقہ جیش قلب پر وارد ہوتے تھے اسی کو حضرت عمرؓ نے اُجَهِّزُ جَيْشِيْ وَاَنَا فِي الصَّلٰوةِ (میں نماز کے اندر لشکر بھیجنے کا انتظام کرتا ہوں) سے تعبیر فرمایا اور نماز کی واردات کے صحیح ہونے کا بھی یہی مطلب ہے کہ جو اس صورت سے فایض ہوتے ہوں وہ واردات صحیح ہیں ورنہ از خود از یں کسی چیز کی طرف توجہ کرنا خشوع کے ضرور منافی ہوگا۔ واللہ اعلم ۱۲ ظفر

واضح ہوگیا کہ دوسروں کے خشوع سے آپ کا خشوع اس حالت میں بھی بڑھا ہوا تھا غرض معلوم ہوگیا کہ یہ حالت حضرت عمرؓ کے خشوع کی منافی کسی طرح نہیں اس سے ان لوگوں کی غلطی بھی معلوم ہوگئی جو اس واقعہ سے خشوع کی عدم وجوب کے قائل ہوئے ہیں اور خشوع ضروری کیونکر نہ ہو جبکہ حق تعالیٰ خشوع نہ کرنے پر بہت زور کے ساتھ شکایت کے طور پر فرماتے ہیں " اَلَمْ يَأْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ " کیا مسلمانوں کے لئے (ابھی) اس کا وقت نہیں آیا کہ ان کے قلوب خدا کی نصیحت کے سامنے اور جو (دین حق (منجانب اللہ) نازل ہوا ہے اس کے سامنے جھک جاویں، خشوع اگرچہ صحت صلوٰۃ کا موقوف علیہ نہ ہو یعنی نماز کی صحت اگرچہ خشوع پر موقوف نہیں اس کے بدون بھی نماز درست ہے اور فرض ذمہ سے ساقط ہو جاتا ہے مگر صاحب روح المعانی نے علماء کا اس پر اجماع لکھا ہے کہ خشوع قبول صلوٰۃ کا موقوف علیہ ہے کہ بدون اس کے نماز قبول نہیں ہوتی۔ اب آپ خود غور فرمالیں کہ نماز سے مقصود کیا ہوتا ہے، ظاہر ہے کہ قبول ہی مقصود ہوتا ہے جو طاعت قبول نہ ہوئی وہ طاعت ہی کیا ہے اس سے آپ کو خشوع کی ضرورت معلوم ہوگئی ہوگی، رہا فرض کا ذمہ سے ساقط ہوجانا یہ کوئی چنداں قناعت کی بات نہیں۔ دیکھئے دو شخص بادشاہ کی خدمت کرتے ہوں ایک تو اچھی طرح اس کی مرضی کے موافق کرتا ہو کہ بادشاہ اس کی خدمت سے خوش ہوتا ہو اور دوسرا بُری طرح کرتا ہو جس سے بادشاہ کو غصہ آتا ہو تو کیا کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ دربار میں حاضر ہوجانا اور غیر حاضر نہ ہونا ہی کافی ہے ہرگز نہیں سب عقلاً اتفاق کے ساتھ یہی کہیں گے کہ ایسی خدمت سے کچھ نفع نہیں بلکہ ہر روز چونکہ وہ بادشاہ کو ناراض کرتا ہے اندیشہ ہے کہ کہیں ایک دن دربار سے بالکل ہی نہ نکال دیا جائے۔ افسوس کہ بادشاہوں کی خدمت میں تو سب کا اس پر اتفاق ہے کہ بے ڈھنگی طرح کرنا بالکل فضول ہے اور خدا تعالیٰ کی عبادت میں آکر سب کی عقلیں مسخ ہوگئیں کہ بدون خشوع خضوع کے نماز پڑھ کر بھی خوش ہوتے ہیں کہ ہم نے بڑا کام مار لیا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہماری طاعت تو سزا کے قابل ہے اس کی بالکل وہی مثال ہے

جیسے کوئی غلام زور زور سے بادشاہ کو پنکھا جھلتا ہو کہ کبھی کان پر لگ جاتا ہے کبھی سر پر کبھی ٹوپی اڑ جاتی ہے کبھی ماتھے پر لگ جاتا ہے کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ بادشاہ کی خدمت کر رہا ہے، یہ خدمت نہیں یقیناً بے ادبی ہے۔ پھر اس طرح پنکھا جھلنے پر اگر وہ غلام ناز کرے کہ میں نے بڑی جانفشانی اور محنت سے بادشاہ کو پنکھا جھلا ہے میں انعام کا مستحق ہوں وہ احمق ہی نہیں وہ انعام کا مستحق تو کیا ہوتا اُلٹا میں باندھے جانے کے قابل ہے یعنی اس لائق ہے کہ چوپاؤں اور جانوروں کے ساتھ باندھا جاوے کہ اس کو خدمت شاہی کا کچھ بھی سلیقہ نہیں نہ آداب شاہی کا خیال ہے مگر اس کا کوئی یہ مطلب نہ سمجھے کہ جب خشوع کے بغیر نماز کوئی چیز نہیں تو اس سے فائدہ ہی کیا لاؤ آج سے نماز ہی کو طلاق دو یہ مطلب ہرگز نہیں بلکہ مطلب میرا یہ ہے کہ نماز پڑھتے رہو مگر ساتھ ساتھ خشوع حاصل کرنے کی بھی کوشش کرتے رہو پھر اگر خشوع نصیب ہوگیا اور ان شاء اللہ کوشش کرتے ۔سے حاصل ہو ہی جاوے گا ایسا ہوتا ہی نہیں کہ کوئی خدا کی طلب کر کے محروم رہ جاوے تب تو مقصود حاصل ہوگیا اور اگر فرض کر لو کہ تم نے خشوع حاصل کرنے کی باقاعدہ پوری کوشش کی پھر بھی حاصل نہ ہوا تو آپ بے فکر رہیں ان شاء اللہ قیامت میں خشوع کے نہ ہونے پر آپ سے مواخذہ نہ ہوگا۔ کیونکہ جو کام آپ کا تھا یعنی کوشش اور طلب وہ آپ کر چکے اب آگے کامیابی ہونا یا نہ ہونا یہ خدا کے قبضہ میں ہے۔ کوشش کے بعد ناکام رہنے سے مواخذہ نہیں ہوتا مواخذہ اسی پر ہوتا ہے کہ تم نے کوشش کیوں نہیں کی، مگر یہ بات میں نے فرض کے طور پر کہی ہے ورنہ عادۃ اللہ یہی ہے کہ طلب اور کوشش کے بعد انسان ناکام نہیں رہتا اور جو ناکام رہتے ہیں وہ کوشش ہی نہیں کرتے یا کم کرتے ہیں۔ پس جب تک خشوع نہ حاصل ہو آپ بلا خشوع ہی کے نماز پڑھتے رہیں اور خشوع حاصل ہونے کی طلب اور کوشش میں لگے رہیں اور ہر نماز کے بعد حق تعالٰے سے توبہ و استغفار کرتے رہیں اور دل سے یہ بھی دعا کرتے رہیں کہ یا اللہ ہم کو خشوع کامل عطا فرما دے۔ اس توبہ و استغفار کی برکت سے امید ہے کہ نماز میں خشوع نہ ہونے سے

جو کمی رہ گئی تھی حق تعالےٰ اس کو بھی پورا کردیں گے۔ اب تو آپ کو شریعت کی قدر ہوئی ہو گی دیکھئے کس قدر آسانی ہے کہ اول تو خشوع سے نماز پڑھو اگر خشوع حاصل نہ ہو تو بلا خشوع ہی پڑھو اور ہر نماز کے بعد دعا و استغفار کرتے رہو اگر ساری عمر کوشش کرنے سے بھی خشوع حاصل نہ ہو تو بلا خشوع ہی پڑھتے رہو مگر استغفار ضرور کرتے رہو ان شاءاللہ خشوع والوں کے برابر ہو جاؤ گے، یہ حق تعالیٰ کی کتنی بڑی رحمت ہے۔ غرض یہ کہ جب ہماری طاعات کی یہ حالت ہے تو پھر مصیبت آنے کے وقت یہ کہنا کہ ہائے کس گناہ میں پکڑے گئے سخت بے حیائی ہے گناہ سے ہمارا کون سا وقت خالی ہے ہم تو سرتا پا گناہ ہو رہے ہیں، ہم کو تو اس پر تعجب ہونا چاہئے کہ اب تک صحیح سالم کیسے بیٹھے ہیں جب یہ معلوم ہو گیا کہ مصائب کا سبب ہمارے گناہ ہیں۔ تو اب اس کا علاج کیا ہونا چاہئے اس لئے کوئی مرض ایسا نہیں جس کی دوا نہ ہو گناہوں کا علاج بھی ہے۔ حدیث میں ہے كُلُّكُمْ خَطَّاؤُنَ وَخَيْرُ الْخَطَّائِيْنَ اَلتَّوَّابُوْنَ (تم سب خطاکار ہو اور خطاکاروں میں بہتر وہ ہے جو بہت توبہ کرنے والے ہیں) کیا تسلّی آمیز علاج فرماتے ہیں کہ گناہوں کی وجہ سے ناامید نہ ہو مایوس نہ ہو خطا ہو جانا انسان سے کچھ بعید نہیں خطاوار تم سب ہو ملائکہ انبیاء علیہم السلام کے سوا گناہوں سے معصوم کوئی نہیں اپنے اپنے درجے کے موافق گناہ ہر شخص سے ہوتے ہیں مگر خَيْرُ الْخَطَّائِيْنَ التَّوَّابُوْنَ یعنی خطاکاروں میں اچھے وہ ہیں جو بہت توبہ کرتے رہیں، خطا ہو جانا کچھ زیادہ تعجب نہیں مگر اس کے بعد ندامت اور انفعال بھی نہ ہو اپنی اصلاح کی فکر بھی نہ ہو یہ زیادہ محل شکایت ہے اگر خطا کے بعد ندامت اور انفعال ہوتا رہے اور اصلاح کی کوشش جاری رہے تو پھر دن میں سو بار بھی خطا ہو تو حق تعالیٰ معاف فرمادیں گے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خطاؤں کے مقابلہ میں تَوَّابُوْنَ فرمایا جس میں باعتبار صیغہ کے اشارہ اس طرف ہے کہ جتنی بار خطائیں کرتے ہیں اتنی ہی بار توبہ کرتے ہیں غرض جو ہر گناہ سے توبہ کرتے رہتے ہیں وہ دوسرے خطاکاروں سے اچھے ہیں۔ مگر توبہ کے یہ معنی نہیں کہ صرف زبان سے توبہ توبہ کہہ لیا جائے نہیں توبہ یہ ہے کہ دل میں شرمندگی اور ندامت

ہوا ور آئندہ کے لئے اصلاح کا عزم ہوا ور پچھلے حقوق کے ادا کرنے کا اہتمام شروع کردیں ورنہ زبانی توبہ سے کیا ہوتا ہے۔ اس تقریر پر یہ شبہ ہوگا کہ جب مصائب گناہوں کے سبب سے آتے ہیں تو ہم تو بعضے اولیاء اللہ کو بھی مصائب میں مبتلا ہوتے دیکھتے ہیں تو کیا وہ بھی گناہ گار ہیں۔ اس کے چند جواب ہیں، اول تو یہ کہ اولیاء اللہ ہی کہاں کے معصوم ہیں ان کے درجہ کے موافق گناہ ان سے بھی ہوتے ہیں۔ یوں کہئے کہ وہ بھی اندھوں میں کانے راجہ ہیں، وہ دوسروں کے اعتبار سے نیک ہیں ولی ہیں سب کچھ ہیں مگر خدا کے عظمت وجلال کے سامنے تو وہ بھی خطاکار ہیں خدا کے لائق اطاعت کوئی نہیں کرسکتا ان کی بھی کشتی استغفار اور توبہ ہی سے پار ہوسکتی ہے۔ حضرت شیخ شیرازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں ؎

بندہ ہماں بہ کہ ز تقصیر خویش　　عذر بدرگاہ خدا آورد
ورنہ سزاوار خداوندیش　　کس نتواند کہ بجا آورد

(بندہ وہی بہتر ہے جو اپنی کوتاہی کا عذر درگاہ الٰہی پیش کرے جو شخص درگاہ الٰہی میں اپنا عذر پیش نہ کرسکے وہ اس کی خداوندی کے لائق نہیں ہے)

اگر کوئی یہ چاہے کہ دین کا پورا حق ادا کردے اور سرمو شریعت سے تجاوز کسی بات میں بھی نہ ہو تو یہ عادۃً ہرگز نہیں کرسکتا۔ بڑے بڑے ولی خطا سے معصوم نہیں کبھی نہ کبھی کوئی لغزش خطا سے یا سستی سے ہو ہی جاتی ہے۔ حدیث میں ہے لَنْ يُّشَادَّ الدِّيْنَ اَحَدٌ اِلَّا غَلَبَہٗ اِسْتَقِيْمُوْا وَلَنْ تُحْصُوْا کہ کوئی شخص کبھی دین کا مقابلہ نہ کرے گا مگر وہ مغلوب ہو جاوے گا اور دین ہی غالب رہے گا۔ بس سیدھی راہ پر چلتے رہو اور تم ہرگز پورا حق ادا نہیں کرسکتے۔ اس پر بظاہر یہ اشکال ہوگا کہ جب احصار نہیں ہوسکتا تو پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم استقامت کا حکم کس لئے فرماتے ہیں۔ جواب یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مطلب یہ ہے کہ استقامت کا حق تو ادا نہیں ہوسکتا مگر جس قدر ہوسکے اور جتنا اپنی وسعت میں ہے استقامت کی کوشش کرنی چاہیئے مگر کسی وقت یہ مت سمجھو کہ استقامت کا حق ہم سے ادا ہوگیا۔ رہی یہ بات کہ ہماری ہمت میں کتنی

استقامت ہے اس کو فرماتے ہیں ؎

سرمد گلہ اختصار می باید کرد — یک کار ازیں دو کار می باید کرد

(سرمد گلہ شکایت کم کرو — دو کاموں سے ایک کام کرو)

یا تن برضائے دوست می بایدداد — یا قطع نظر ز یار می باید کرد

(یا تن و بدن محبوب کی رضامندی میں دیدو یا محبوب سے بالکل تعلق قطع کرلو)

فرماتے ہیں کہ گلہ اور شکایت چھوڑو بس دو کام میں سے ایک کام کرو یا تو دوست کی رضا میں جان و تن کھپا دو یا محبوب سے قطع نظر کرلو۔ اگر جان و تن عزیز ہے اور اس کا کھپانا منظور نہیں تو اور کہیں جاؤ یہ خدا تو ایسے ہی ہیں وہ تو یہی چاہتے ہیں کہ بس اپنے کو مٹادو۔ ان[مه] اقتلوا انفسکم (کہ اپنے کو قتل کردو) کا یہی مدلول ہے بس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی یہی مطلب ہے کہ اپنی جان کھپادو خدا کے راضی کرنے میں مگر پھر بھی یہ مت سمجھو کہ تم نے حق ادا کردیا۔ بس اسی طرح چلتے رہو تم حق ادا نہیں کرسکتے اپنی سی کوشش میں لگے رہو، اس کے بعد اپنا معاملہ خدا کے حوالہ کردو کہ یا اللہ جتنا مجھ سے ہوسکتا تھا وہ میں نے کیا اب آپ میرے ساتھ لطف و کرم کا معاملہ فرمایئے میری کوتاہیوں اور لغزشوں کو معاف فرمایئے پھر میں کہتا ہوں کہ خدا کو چھوڑکر کوئی کہاں جاسکتا ہے، کوئی دوسرا در ہو تو کہیں جائے ان کی تو یہ شان ہے ؎

عزیزیکہ از درگہش سر بتافت

بہر در کہ شد ہیچ عزت نیافت

(حق تعالیٰ ایسے غالب ہیں کہ جس شخص نے ان کی درگاہ سے منہ پھیرا جس دروازہ پر گیا کچھ عزت نہ پائی۔)

مه اس آیت میں لو انا بینک سے معلوم ہوتا ہے کہ قتل نفس مطلوب نہیں پھر یہ دلالت مذکورہ فی المتن کیسی جواب یہ ہے کہ ظاہر تو یہی معلوم ہوتا ہے مگر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اصل امر تو یہی تھا مگر رعایت کے سبب تخفیف فرمادی گئی کہ اس کی ہمت نہ کریں گے ورنہ اگر مکلفین میں اس کی ہمت دیکھی جاتی تو اس کو ضرور مشروع فرماتے کیونکہ قابل مشروعیت کے ہے تو اس طرح مطلوب ہونا اس کا مدلول آیت ہوا ۱۲ اشرف

خدا کا دروازہ چھوڑ کر کہیں عزت حاصل نہیں ہو سکتی اس پر ایک بزرگ کی حکایت یاد آئی۔
حضرت شیخ شیرازیؒ نے گلستان میں لکھا ہے کہ ایک شیخ رات کو ہمیشہ تہجد کے لئے اٹھتے تھے۔ ایک رات غیب سے آواز آئی کہ یہاں کچھ قبول نہیں کچھ بھی کرتے رہو اور یہ آواز ایک مرید نے بھی سُنی، دوسری رات کو اس نے دیکھا کہ شیخ پھر لوٹا بدھنا لے کر نماز کو اٹھے اور جانماز پر کھڑے ہو گئے۔ مرید نے عرض کیا کہ جب وہاں کچھ قبول نہیں تو آپ ہی کیوں سر مارتے ہیں پڑ کے سو رہیئے اس محنت سے کیا فائدہ۔ شیخ نے جواب دیا کہ بھائی یہ تو سچ ہے کہ وہاں قبول نہیں مگر کوئی دوسرا دروازہ تم بتلادو جہاں قبول ہو، میرا تو ایک ہی دروازہ ہے چاہے وہ قبول کریں یا نہ کریں میں تو اس در کو نہیں چھوڑ سکتا اپنی سی کرتا رہوں گا اور کہا ؎

تو دانی ازاں دل برداختن
کہ دانی کہ بے او تواں ساختن

(تو اس سے دل اٹھا سکتا کہ اس کے موافقت کسی سے موافقت کرلیگا)

پس یہ کرنا تھا کہ دریائے رحمت جوش میں آیا اور غیب سے دوسری آواز آئی ؎

قبول است گرچہ ہنر نیستت
کہ جز ما پناہے دگر نیستت

یعنی اگرچہ عبادت قابلِ قبول تو نہیں تھی مگر چونکہ کوئی دوسری پناہ بھی نہیں اس لئے سب قبول ہے کیے جاؤ۔ دیکھئے یہ مذاق ہوتا ہے عشاق کا کہ ان کو طلب سے کام ہوتا ہے اپنی طرف سے طلب میں کمی نہیں کرتے اور قبول و ناقبول کی کچھ پروا نہیں کرتے بادشاہ کے دروازہ پر بھیک مانگنے جانا چاہیئے، ہر دن جاتا رہے اگر سو بار دھکے ملیں گے کسی دن تو رحم آجاوے گا کہ اس غریب کے واسطے یہی ایک دروازہ ہے، آخر اسے چھوڑ کر کہاں جائے لاؤ اس کی مراد پوری کردیں۔ چنانچہ خسرو فرماتے ہیں ؎

خسرو غریب است و گدا افتادہ در کوئے شما
باشد کہ از بہر خدا سوئے غریباں بنگری

(خسرو غریب وگدا آپ کے کوچہ میں پڑا ہوا ہے خدا کے لئے غریبوں کی طرف بھی نظر فرمایئے)
اور اگر ایک دن بھی کچھ نہ ملے تو ہمارا کوئی حرج تو نہیں عبادت کرنے میں طلب کرنے میں دروازہ پر ناک رگڑنے میں کیا نقصان ہے۔ اجی جب وہ پوچھتے ہی نہیں کرو جب اور نہ کرو جب دونوں حالتوں میں محرومی ہے تو کرتے رہنا اور محروم رہنا یہ اس سے اچھا ہے کہ سب کچھ چھوڑ کر بیٹھ جاؤ پھر محروم رہو کیونکہ چھوڑ کر بیٹھ جانے میں ہماری طرف سے بے رخی ہوگی اور عاشق کی شان سے بیرخی مستبعد ہے اور نہ محبوب بے رخی کرے یہ اس کا ناز ہے اگر ہم کو بھیک نہ ملے تو ہمارا کوئی قرض تو نہیں تھا۔ غرض حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مطلب یہ ہے کہ تم اپنی طرف سے کمی نہ کرو۔ جان کھپا دو اور پھر یہی سمجھتے رہو کہ ہم سے کچھ حق ادا نہیں ہوسکتا اپنے کو قبول اور قرب کے لائق ہرگز مت سمجھو آخر تم کو حضرت حق سے مناسبت ہی کیا ہے۔ جو تم اس کے قرب کے لائق ہو وہ بالکل مبرّا اور منزہ اور تم سراپا عیوب و نقصان پھر جب اتنا بعد ہے تو تم کسی حال میں قرب کے لائق نہیں ہو سکتے۔ اور اگر وہ اپنا قرب عطا فرمادیں یہ محض ان کی عنایت و رحمت اور فضل ہے اسی کو ایک مجذوب فرماتے ہیں، خدا وہ ہے جو سمجھ میں نہ آوے اور سمجھ وہ ہے جو خدا کو پاوے۔ یہ مجذوب ایسے ہی آزاد ہوتے ہیں ان کے الفاظ ظاہر میں بے ربط ہوتے ہیں، ان کے مطلب کو ہر شخص نہیں سمجھ سکتا اور چونکہ ہدایت کا کام ان کے سپرد نہیں ہوتا اس لئے ان کو اس کی پروا بھی نہیں ہوتی کہ ہماری بات کا مطلب کوئی سمجھا یا نہیں۔ مطلب ان مجذوب صاحب کا یہ ہے کہ خدا وہ ہے جس کی کنہ ذات تک کسی کی سمجھ نہیں پہنچ سکتی، اس کی حقیقت کا ادراک کوئی نہیں کر سکتا اس مضمون کو حدیث میں ان الفاظ سے ظاہر کیا گیا ہے مَا عَرَفْنَاکَ حَقَّ مَعْرِفَتِکَ لَا اُحْصِی ثَنَاءً عَلَیْکَ اَنْتَ کَمَا اَثْنَیْتَ عَلٰی نَفْسِکَ یا اللہ ہم نے آپ کو پوری طرح (جیسا کہ آپ کے شایانِ شان ہے) نہیں پہچانا ہم آپ کی پوری طرح تعریف نہیں کر سکتے آپ ویسے ہی ہیں جیسی کہ آپ نے خود اپنی تعریف فرمائی ہے۔ اسی لئے عارفین فرماتے ہیں کہ خدا کے متعلق جس قدر علم ہم کو حاصل ہوتا ہے خدا

اس سے بھی بالا و برتر ہے۔ اس کو کسی کا علم احاطہ نہیں کر سکتا اور یہاں سے بھی معلوم ہوا
کہ جب ہم کو خدا تعالیٰ کا علم بھی کامل طور پر حاصل نہیں ہو سکتا تو ہم قرب خداوندی کے خود
کیسے لائق ہو سکتے ہیں ہمارے میں اور خدا تعالیٰ میں بہت زیادہ بعد ہے بس انسان کی
بڑی معرفت اور منتہائے قرب یہ ہے کہ اس کو یہ بات منکشف ہو جائے کہ ہم خدا کے علم
وادراک سے عاجز ہیں یہ بات عقیدہ کے طور پہ ہر شخص جانتا ہے مگر اس کا انکشاف ہر
شخص کو نہیں ہوتا جب عارفین کو حق تعالیٰ کی عظمت وجلال کا حسب قابلیت مشاہدہ
ہوتا ہے اس وقت ان کو اپنا عجز اور ضعف اور اپنی عبدیت کا انکشاف ہوتا ہے اسی
مطلب کو ان حضرت مجذوب صاحب نے ان لفظوں سے ظاہر کیا ہے کہ خدا وہ ہے
جو سمجھ میں نہ آوے اور جو تمہاری سمجھ میں آجائے وہ خدا نہیں۔ خدا اس سے پاک اور بالا برتر
ہے۔ مگر باوجود اس کے عقل سے کام یہ لینا چاہیئے کہ خدا کو معلوم کرے پس اس جملہ میں اور
پہلے جملہ میں بظاہر تعارض ہے کیونکہ جب خدا تعالیٰ تک عقل کی رسائی نہیں ہو سکتی تو پھر
اس کے کیا معنی کہ سمجھ وہ ہے جو خدا کو پاوے اس سے لازم آتا ہے کہ سمجھ سے خدا کو پا سکتے
ہیں سو اس جملہ کا یہ مطلب ہے کہ سمجھ وہ ہے جو خدا کو پانے کی کوشش کرے جیسا کہ ہم کہا
کرتے ہیں کہ چاند دیکھا تھا اس کے دو معنی ہوتے ہیں ایک تو یہ کہ چاند دیکھا تھا اور اس
کو دیکھ بھی لیا دوسرے یہ کہ چاند دیکھا تھا مگر نظر نہیں آیا۔ اس وقت چاند دیکھنے کے معنی
یہ ہیں کہ دیکھنے کی کوشش کی تھی اسی طرح پانے کے دو معنی ہیں ایک یہ کہ پا لیا دوسرے
یہ کہ پانے کی کوشش کی پس مطلب مجذوب کا یہ ہے کہ سمجھ وہ ہے جو خدا کی طلب
میں رہے اگرچہ اس کی ذات تک رسائی نہیں ہو سکتی پس حدیث میں جو آتا ہے
اِسْتَقِیْمُوْا لَنْ تُحْصُوْا (پس سیدھی راہ چلتے رہو اور اس کا پورا حق ادا نہیں کر سکتے)
اس کا بھی یہی مطلب ہے کہ اپنی سی کوشش کرتے رہو اگرچہ تم سے پورا حق ادا نہیں
ہو سکتا اور یہ مسئلہ عقلاً بالکل سچ ہے کیونکہ خدا کی عظمت کا مطلب یہ ہے کہ اس کے
کمالات کا حق ادا کیا جائے اور کمالات الٰہی غیر متناہی ہیں تو ہم سے ان کا حق کیونکہ
ادا ہو سکتا ہے متناہی غیر متناہی کے حقوق کو کب ادا کر سکتا ہے کیونکہ ہماری زندگی

اگر ہزار سال کی بھی ہو تب بھی محدود ہے اگر ہزار سال تک کوئی شخص ہر دم عبادت کرتا رہے کسی وقت راحت و آرام میں مصروف نہ ہو جب بھی وہ ایک محدود زمانہ ہے جس میں غیر متناہی کمالات کے حقوق ادا نہیں ہو سکتے اور جس صورت سے ہم لوگ عبادت کرتے ہیں کہ دن کے چوبیس گھنٹوں میں سے تین چار گھنٹے عبادت میں اور باقی دنیوی مشاغل یا راحت و آرام میں صرف ہوتے ہیں اس صورت سے تو ہمارا کیا منہ ہے کہ ادائے حقوق الٰہی کا دعویٰ کریں۔ غرض جب حق تعالیٰ کے حقوق کا ادا ہونا محال ہے تو کوئی ولی چاہے کتنا ہی بڑا ولی ہو اس سے بھی اپنے درجہ کے موافق گناہ ہوتے ہیں اس لئے اگر نیک لوگوں پر بھی مصائب آئیں تو اشکال کیا ہے۔ پس یہ مسئلہ کہ بیماری گناہوں سے آتی ہے یہ تو صاف تھا کیونکہ بار بار بیان ہو چکا ہے اور جن تین مضمونوں کا میں بیان کرنا چاہتا ہوں ان میں کا یہ ایک ہے اب میں دو مسئلے اور بیان کرتا ہوں جو کہ درحقیقت اسی تقریر کے متعلق شبہات کے جوابات ہیں اور وہ دوسرا تیسرا مضمون یہی ہے۔ ایک تو یہی شبہ ہے جو ابھی مذکور ہوا تھا کہ نیک لوگوں کو بیماری وغیرہ کیوں آتی ہے حالانکہ آیت سے اور بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ بیماری گناہوں سے آتی ہے اور اس کا جواب میں ابھی دے چکا ہوں اور اس وقت اسی کے متعلق ذرا کسی قدر تفصیل کرنا چاہتا ہوں۔ اور ایک دوسرا سوال ہے جو اس سے بھی سخت ہے اس کو میں بعد میں حل کروں گا تو پہلے شبہ کا جواب تو یہ ہے جو ابھی گذرا کہ گناہ ان سے بھی ہوتے ہیں گناہوں سے خالی کوئی نہیں اور قاعدہ یہ کہ علاج بالضد ہوتا ہے۔ جب بیماری اور وبا اور تمام مصائب گناہوں کے سبب سے ہیں تو ان کا علاج بھی بس یہی ہے کہ آئندہ کے لئے تو گناہوں کو چھوڑ دو۔ اور پہلے گناہوں کی توبہ و استغفار اور معافی حقوق وغیرہ سے تلافی کرو۔ مگر آجکل ہماری عجب حالت ہے کہ بجائے اپنی اصلاح کے اس بیماری اور مصیبت کو بھی ایک مشغلہ بنا لیا ہے۔ چنانچہ بعضے لوگ اموات گنتے پھرتے ہیں اور اس میں آپس میں جھگڑتے بھی ہیں کوئی کہتا ہے کہ آج دس اموات ہوئی ہیں۔ دوسرا کہتا ہے کہ میاں کو خبر تو ہے ہی نہیں بارہ تو میں نے گنی ہیں اور بھی دو ایک ہوگئی ہوں گی کیونکہ فلانے کی حالت بھی خطرناک تھی۔ فلانے کا سانس چل رہا تھا۔

صاحبو! یہ حالت اور بھی زیادہ خطرناک ہے کہ گناہوں کی سزا دی جائے اور اس کو سزا نہ سمجھا جاوے بلکہ اس کو ایک تفریح کا مشغلہ بنایا جائے۔ اپنی اصلاح کرو۔ دنیا بھر کی فہرست گننے سے کیا نفع۔ میرے پاس بھی بعض خطوط اس مضمون کے آتے ہیں کہ یہاں بیماری کا بہت زور ہے۔ آپ کے وطن میں کیا حال ہے تو میں سب کے جواب میں ایک شعر لکھدیا کرتا ہوں ؎

ما قصۂ سکندر و دارا نخواندہ ایم

از ما بجز حکایت مہر و وفا مپرس

(ہم نے سکندر اور دارا کے قصے نہیں پڑھے ہیں ہم مہر و وفا کی باتوں کے علاوہ اور کچھ نہ دریافت کرو)

کہ ہمیں ان قصوں کی خبر نہیں اور واقعی مجھے بعض دفعہ خبر بھی نہیں ہوتی کہ آجکل بیماری کم ہے یا زیادہ، کیونکہ اپنے مشاغل سے ہی فرصت نہیں اس کی تحقیق و تفتیش کون کرے اس لئے میں لکھدیتا ہوں کہ بستی کے حالات کسی نامہ نگار سے پوچھو۔ مجھ سے تو شریعت کی اور خدا کی باتیں دریافت کرو۔ بعض لوگوں کو فضول سوالات کرنے کا مرض ہوتا ہے بھلا ان لوگوں سے کوئی پوچھے کہ تمہیں ساری دنیا کی خبروں سے کیا لینا کہ وہاں بھی بیماری ہے یا نہیں جو کام تمہارے ذمہ ضروری ہے پہلے اس کو تو انجام دو۔ میں سچ کہتا ہوں کہ اگر لوگوں کو ضروریات کا اہتمام ہو جائے تو ان فضولیات کے لئے وقت ہی نہ ملے۔

چنانچہ میں نے ابھی یہ قصہ بیان کیا ہے کہ ایک عالم کے پاس ایک شخص حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی نسبت سوال کرنے آیا کہ دونوں میں سے کون حق پر تھے۔ انہوں نے فرمایا کہ بھائی میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ قیامت کے دن حق تعالیٰ تم سے اس کی بابت کچھ دریافت نہ فرمائیں گے اور نہ اس پر مواخذہ فرمائیں گے کہ تم نے اس کی تحقیق کیوں نہیں کی کہ ان دونوں میں سے کون حق پر ہے نہ یہ مقدمہ فیصلہ کے لئے تمہارے پاس آئے گا اور اگر بالفرض آئے بھی تو میں تم کو اجازت دیتا ہوں کہ مقدمہ خارج کر دینا اور کہدینا کہ مجھے کچھ تحقیق نہیں اور اگر کسی نے وہاں تم سے یہ سوال کیا کہ تم نے تحقیق کیوں

نہ کیا تو صاف کہہ دیا کہ میں نے علماء سے پوچھا تھا انہوں نے نہیں بتلایا پھر ہم جانیں اور خدا تعالیٰ تم تو یہ کہکر چھوٹ جاؤ گے پھر اگر ہم سے سوال ہوا ہم جو چاہیں گے جواب دیدیں گے۔ واقعی خوب جواب دیا۔ مجیب کو چاہیئے کہ سائل کا تابع نہ ہو بلکہ اس کو اپنا تابع بنائے اول تو ہر شخص ہر بات کا جواب نہیں سمجھ سکتا دوسرے جواب دینا اُسی بات کا ضروری ہے جس پر کوئی دین کا کام اٹکا ہوا ہو اور جس بات پر دین کا کوئی کام اٹکا ہوا نہیں اس کا جواب دینا وقت کا ضائع کرنا ہے اور وقت ایسی چیز نہیں کہ اس کو اس طرح فضول کھویا جائے انسان کو اپنے اندر غور کرنا چاہیئے اگر کوئی اپنے اندر غور وفکر کیا کرے تو اس کو معلوم ہو کہ انسان خود ایک عالم ہے۔ ایک پوری اقلیم ہے جس میں کچھ زندہ ہوتے ہیں کچھ مرتے ہیں، کچھ بیمار ہوتے ہیں، کچھ تندرست ہیں کہیں بہار ہے کہیں خزاں ہے غرض ایک عجیب دنیا آپ کے اندر بسی ہوئی ہے جس کے عجائبات کے سامنے اس عالم کے عجائبات ہیچ ہیں اگر ایسا ہی سیر اور تفریح کا شوق ہے تو اپنے دل کی سیر کیجیے۔

ایک صوفی موسم بہار میں جنگل کی سیر کرنے آئے اور سر جھکا کر مراقب بیٹھ گئے۔ ایک شخص نے کہا فَانْظُرُوْا اِلٰی اٰثَارِ رَحْمَتِ اللّٰہِ یعنی گردن جھکائے کیا بیٹھے ہو ذرا آنکھیں اوپر اٹھا کر خدا کی قدرت و رحمت کے آثار کا مشاہدہ کرو۔ اُن صوفی نے جواب دیا کہ میں آثارِ رحمت ہی کو دیکھ رہا ہوں اور جن کو تم آثارِ رحمت سمجھتے ہو وہ آثار الآثار ہیں آثار رحمت وہ نہیں ہیں کیونکہ در اصل رحمت کا منشا ایمان ہے اور غضب کا منشا کفر ہے اور ایمان وکفر کا تعلق قلب سے ہے۔ پس اصل مقام رحمت کا قلب ہے پھر مومن کو ایمان کے صلہ میں جنت دی جائے گی جو کہ ایمان کا ثمرہ ہے اور دنیا کی نعمتیں اور لذتیں جنت کا نمونہ ہیں اس لئے ان کو بھی آثار رحمت کہدیتے ہیں۔ مگر حقیقت میں وہ آثار الآثار اصل آثار رحمت تو باطن میں ہیں جس کو سنائیؒ فرماتے ہیں ؎

آسمانہاست در ولایت جاں　　　کار فرمائے آسمان جہاں

(ولایت جان بہت سے آسمان ہیں جو اس ظاہری آسمان کا رفرما ہیں)

مولانا فرماتے ہیں ؎

غیب را ابرے و آبے دیگر ست
آسمانے آفتابے دیگر ست

عالم غیب کا بادل اور پانی دوسرا ہے اس کا آسمان بھی جدا ہے آفتاب بھی جدا ہے جب قلب پر سکینہ نازل ہوتا ہے اور انوار و تجلیات چمکتی ہیں اس وقت اس بادل کا اور بارش کا اور آسمان و آفتاب کا مشاہدہ ہوتا ہے۔ ایک دوسرے صاحب فرماتے ہیں ؎

ستم است اگر ہوست کشد کہ بہ سیر سرو سمن درآ
تو ز غنچہ کم نہ دمیدہ در دل کشا بچمن درآ

(تمہارے اندر خود چمن ہے اس کا پھاٹک تمہارے ہاتھ میں جب جی چاہے سیر کرلو)
ایک اور صاحب فرماتے ہیں ؎

خلوت گزیدہ را بتماشا چہ حاجت است
چوں کوئے دوست ہست بصحرا چہ حاجتست

(خلوت نشین کو تماشہ کی کیا حاجت ہے جب محبوب کے دربار ہے تو جنگل کی کیا ضرورت ہے)
محبوب کے ہوتے ہوئے جنگل کے سیر کی کیا ضرورت ہے خلوت میں بیٹھ کر اس کا تماشا دیکھو۔ کوئے دوست سے مراد قلب ہے کہ وہ محل نزول انوار الٰہیہ ہے۔ اسی کو کہتے ہیں۔

اے برادر عقل یک دم باخود آر
دمبدم در تو خزان ست و بہار

(اے بھائی تھوڑی دیر کے لئے ذرا عقل کو درست کرکے دیکھو خود تمہارے اندر دمبدم خزان و بہار موجود ہے)
حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے۔ کہ لوگ طائف جاتے ہیں کہ وہاں ذرا سبزی اور سردی ہے مگر طائف میں کیا رکھاہے ذرا قلب سے زمہریر کی طرف توجہ کرو سردی معلوم ہونے لگے گی تو طائف آگیا۔ ذرا قلب سے حرارت کا تصور کرو گرمی

معلوم ہونے لگے گی اور یہ کلام حضرت کا تنزل کے طور پر تھا کہ اگر کسی کو ایسا ہی سرزی گرمی کا شوق ہو تو جب یہ چیزیں اس کے اندر موجود ہیں۔ ورنہ کیا رکھا ہے زمہریر کے تصور میں جتنی دیر زمہریر کا تصور کیا جائے محبوب کا تصور کیوں نہ کیا جائے اسی لئے محققین نے تصور شیخ کو بھی منع کیا ہے وہ فرماتے ہیں کہ تصور شیخ میں کیا رکھا ہے ہمہ تن شیخ کے تصور میں مشغول ہونا ان کو غیرت کے خلاف معلوم ہوتا ہے وہ فرماتے ہیں کہ ایسا تصور حق تعالے کا حق ہے غیر کی طرف کیوں توجہ کی جائے اتنی دیر عیوب ہی کا تصور کیوں نہ کیا جائے۔

مولانا محمد اسمٰعیل صاحب شہیدؒ تصور شیخ کے بارے میں فرمایا کرتے تھے مَا هٰذِهِ التَّمَاثِيْلُ الَّتِيْٓ اَنْتُمْ لَهَا عٰكِفُوْنَ (کیا یہ مورتیں ہیں جن پر تم جمے بیٹھے ہو) گویا تصور شیخ کو بتوں کے ساتھ تشبیہ دیتے تھے اور وجہ اس کی یہ تھی کہ اول تو عوام اس میں حد سے بڑھنے لگے تھے وہ شیخ کو حاضر و ناظر سمجھنے لگے تھے جو کہ عقیدہ شرک ہے۔ دوسرے بالکل مشابہ مورت پرستی کے ہے اس لئے آپ نے اس کو بتوں کے ساتھ تشبیہ دی۔ بس محققین کا مسلک یہ ہے کہ از خود تکلف کے ساتھ شیخ کا تصور کرنا نہ چاہیئے۔ البتہ شیخ کے ساتھ محبت و عشق کامل ہونا چاہیئے۔ جب محبت ہوگی تو بلا تکلف خود بخود اس کا خیال دل پر جم جائے گا تو جس طرح محبوب کا حال خود بخود بارہا دل میں آتا ہے اسی طرح شیخ کا خیال دل میں آنے لگے گا۔ یہ حالت اگر نصیب ہو جائے تو یہ مفتاح طریق ہے کیونکہ مربی کی محبت سے جلدی کامیابی ہو جاتی ہے۔ اور اگر کسی کو خود بخود یہ حالت پیدا نہ ہو تو کوشش کر کے اس کا پیدا کرنا اور تکلف کے ساتھ تصور جمانا کچھ ضرور نہیں البتہ بعض دفعہ مگر بہت کم اس کی بھی ضرورت پڑ جاتی ہے جبکہ مرید کی طبیعت پلید ہے کہ اس کو ترقی نہ ہوتی ہو خیالات پریشان رہتے ہوں یکسوئی حاصل نہ ہوتی ہو تو اس کے لئے یکسوئی پیدا کرنے کے لئے تصور شیخ کی تعلیم کی جاتی ہے اور وہ بھی صرف اس لئے کہ مبتدی کو ابتداء میں حق تعالیٰ کا تصور آسانی کے ساتھ حاصل نہیں ہوتا کیونکہ ان کو دیکھا نہیں ہے اور شیخ کو چونکہ دیکھا ہے اور اس کے ساتھ محبت بھی ہے اس کا

تصور آسانی سے جم جاتا ہے اور اس سے یکسوئی جلدی نصیب ہو جاتی ہے پھر جب یکسوئی قلب کو حاصل ہو جائے گی اس کے بعد پھر اس کا امالہ تصور حق کی طرف آسان ہوگا۔ اور حق تعالیٰ کے ساتھ یہ حالت ہو جائے گی ۔ ؏

ہر چہ بینم در جہاں غیر تو نیست
یا توئی یا خوئے تو یا بوئے تو

(تمام عالم آپ کی صفات کا مظہر ہے ہر چیز کو آپ سے تعلق ہے غیر کا وجود ہی نہیں ہر جگہ آپ کا ظہور ہے)

پس اصل مقصد تو یہی ہے کہ تصور حق میں یکسوئی حاصل ہو جائے اس کے لئے بعض اوقات تصور شیخ کو آلہ بنایا جاتا ہے ورنہ غیر کی طرف توجہ کرنا خود کوئی مقصود نہیں نہ اس پر مقصود موقوف ہے اگر کوئی شخص عمر بھر بھی تصور شیخ نہ کرے اس کو ذرا بھی نقصان نہ ہوگا بلکہ بعض طبائع کو اس سے نقصان ہوتا ہے۔ یہ حقیقت ہے تصور شیخ کی مگر بعد میں لوگوں نے اس میں بہت غلو کر دیا کہ اس کو مقصود سمجھنے لگے چنانچہ اب بھی بعض اہل سلسلہ اس کو ضروری سمجھتے ہیں ان کا خیال ہے کہ بدون رابطہ یعنی تصور شیخ کے مقصود حاصل نہیں ہو سکتا بس جو ان کے یہاں پہنچتا ہے اول اس کو رابطہ کی تعلیم ہوتی ہے یہ نہیں دیکھتے کہ اس کو ضرورت بھی ہے یا نہیں فہم سلیم بھی ہے یا نہیں ہر کس و ناکس کو اس کی تعلیم کر دیتے ہیں جس سے بعض لوگوں میں گمراہی پیدا ہوتی ہے۔ حق تعالیٰ نے بعد میں محققین کو پیدا کیا اور ہر زمانہ میں کوئی نہ کوئی محقق ایسا پیدا ہوتا ہے جو طریق کی اصلاح کرتا ہے۔ چنانچہ مولانا رومی نے اپنے زمانہ میں طریق کی بہت اصلاح کی اور میں تَحَدُّثًا بِنِعْمَۃِ اللّٰہِ (اللہ تعالیٰ کی نعمت بیان کرنے کے طور پر) کہتا ہوں کہ اس اخیر زمانہ میں حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ اپنے زمانہ میں مجدد تھے ہم لوگ ان کے دیکھنے والے تھے اس لئے یہ جو کچھ علوم ہم بیان کرتے ہیں سب حاجی صاحب کا صدقہ ہے یہ بھی حاجی صاحب ہی کے علوم کی برکت ہے کہ ہم ان چیزوں کو کچھ نہیں سمجھتے ورنہ اور لوگ تو اس کو کمالات میں شمار کرتے ہیں۔ حاجی صاحب کی تحقیق ہے کہ تصور

شیخ اور وحدۃ الوجود کا شغل آجکل اکثر طبائع کو مضر ہوتا ہے تصور شیخ میں تو اکثر نا سمجھ اسکو حاضر و ناظر سمجھنے لگتے ہیں اور وحدۃ الوجود کے تصور میں جب اس کا انکشاف ہوتا ہے کہ تمام خیر و شر اور مصیبت اور راحت حق تعالیٰ کی طرف سے ہے حقیقت میں وجود ایک ہی ہے، دوسری چیزوں کا وجود محض مضمحل اور فانی ہے تو جب اسباب ظاہری سے نظر اٹھ جاتی ہے اور ہر چیز میں بلاواسطہ حق تعالیٰ کا فعل نظر آتا ہے تو اگر حق تعالیٰ کی محبت کم ہو چنانچہ اکثر قلوب میں کم ہے تو اس سے حق تعالیٰ کی جانب سے ناگوار واقعات میں انقباض پیدا ہو جاتا ہے اور یہ حالت سخت مضر ہے اس لئے حاجی صاحبؒ فرماتے تھے کہ محققان حال نے وحدۃ الوجود کے شغل کو منع فرمادیا ہے اور سچ تو یہ ہے کہ حاجی صاحب اس فن کے امام تھے ہر چیز کی حقیقت خوب سمجھتے تھے اور اس زمانہ کے قلوب کی کیفیت کا حال اچھی طرح جانتے تھے اس لئے ان چیزوں کو چھوڑ دیا تھا۔ کیونکہ یہ تو محض وسائل ہیں مقصود نہیں اگر ایک وسیلہ مضر ہونے لگے اس کو چھوڑ کر دوسرا طریقہ اختیار کرنا ضروری ہوتا ہے الغرض ان صوفی صاحب نے فرمایا کہ یہ سبزہ اور بہار در حقیقت آثار رحمت نہیں ہیں بلکہ آثار الآثار ہیں حقیقی آثار رحمت قلب کے اندر ہیں مولانا فرماتے ہیں ؎

حسن تَجْرِیْ تَحْتَهَا الْاَنْهَارُ ہیں   رو برسلطان و کار و بار ہیں

یعنی اپنے اندر نظر کرو باغ اور نہریں نظر آئیں گی اور فرماتے ہیں ؎

ستم است اگر ہوست کشد کہ بسیر سرو سمن درآ
تو زغنچہ کم نہ دمیدۂ در دل کشا بچمن درآ

(تمہارے اندر خود چمن ہے اس کا پھاٹک تمہارے ہاتھ میں ہے جب جی چاہے سیر کرلو)

موسیٰ و فرعون در ہستی تست

یعنی جیسے ظاہر میں ایک موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کا مقابلہ تھا اسی طرح تمہارے باطن میں بھی ایک موسیٰ (یعنی روح) اور ایک فرعون (یعنی نفس) موجود ہے اور ان دونوں میں جنگ رہتی ہے ان کا تماشا دیکھو۔ صاحبو! تم بھی اس مضمون سے کام لو، دنیا بھر کی لڑائیوں کو کیا دیکھتے ہو ذرا اپنے اندر بھی نظر کرو دیکھو کتنا قتال عظیم ہو رہا ہے نفس چاہتا ہے کہ روح کو مغلوب کردے۔

اس مضمون میں ہمارے حاجی صاحب کا بھی ایک رسالہ ہے جس کا نام جہاد اکبر ہے کمال کردیا ہے آپ نے باطن میں ایک جنگ قائم کی ہے روح اور نفس کو دو بادشاہ مانا ہے اور ہر ایک کے لئے ایک ایک وزیر اور لشکر تیار کیا ہے یہ رسالہ نظم میں ہے۔ مگر بہت ہی عجیب ہے کوئی یہ نہ سمجھے کہ محض شاعری مضمون ہے کسی شاعر کی کیا طاقت ہے کہ ایسے مضامین سوچ بھی سکے۔ نہیں اس کا مضمون بالکل سچا مضمون ہے اس سے کام لو۔ پھر اس کا یہ فائدہ ہوگا کہ جب آپ کو اپنے اندر ایک معرکہ عظیم نظر آئیگا تو دنیا کی لڑائیوں اور بیماریوں کے قصوں میں آپ نہ پڑیں گے آپ کو خود اپنی ہی بیماری سے فرصت نہ ہوگی نفس اور روح کی جنگ میں وہ لطف آئے گا کہ روم و روس کی جنگی کہانیوں میں بھی نہ آیا تھا۔ غرض اس میں کیا فائدہ کہ یہاں بیماری ہے یا وہاں بیماری ہے آج کتنے مرے کل کتنے مرے بلکہ ان خبروں کی وحشت سے تو بعض آدمی بیمار ہو گئے تو ان باتوں سے کچھ نفع نہیں بلکہ دوسرے معنی کر یہ لوگ چھری مار ہیں کہ ان خبروں سے لوگوں کو پریشان کرتے ہیں حتیٰ کہ بہت سے انہی خبروں سے بیمار بھی ہو جاتے ہیں اس پر شاید کسی کو شبہ ہو کہ یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ بیماری شہر میں ہو اور اس کا تذکرہ نہ ہو، نہ مرنے والوں کا حال معلوم کیا جائے۔ یہ تو اس وقت ہو سکتا ہے جب ان واقعات کا نہ خوف ہو نہ غم حالانکہ یہ امور طبعی ہیں پھر جس چیز کا خوف ہو گا اس کا تذکرہ بھی ضرور ہو گا۔ میں کہتا ہوں کہ اہل اللہ کو ایک دوسرا خوف اور غم ایسا ہے جس کی آپ کو ہوا بھی نہیں لگی ان کے دل پر ہر وقت آرے چلتے رہتے ہیں جن کی آپ کو خبر بھی نہیں پھر ان کو اتنی مہلت کہاں جو وہ ان باتوں میں پڑیں ان کو اس غم سے فرصت ہو تو یہ غم لے کر بیٹھیں ؎

اے ترا خارے بپا نہ شکستہ کے دانی کہ چیست

حال شیرانے کہ شمشیر بلا بر سر خورند

(تمہارے پاؤں کو تو کانٹا بھی نہیں لگا ہے تم ان لوگوں کی حالت کو کیا سمجھ سکتے ہو جن کے سروں پر بلا و مصیبت کی تلوار چل رہی ہے)

اور اگر آپ کو وہ غم نصیب ہو جائے تو واللہ سارے قصوں سے چھوٹ جاؤ وہ غم کیا ہے۔

فراق محبوب یعنی حق تعالیٰ کی جدائی یہ وہ غم ہے جس نے ان کو موت کا مشتاق بنا دیا ہے۔ پھر ان کو بیماری یا موت سے خوف یا غم کیوں ہوگا کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ اس دنیا میں رہ کر حق تعالیٰ کا دیدار نصیب نہیں ہوسکتا۔ اس عالم میں وہ حق تعالیٰ کو بے حجاب نہیں دیکھ سکتے اس حجاب کا ان کو وہ صدمہ ہے جس کے سامنے تمام تکالیف ہیچ ہیں اب آپ سمجھے ہوں گے کہ وہ کس قدر رنج و غم میں مبتلا ہیں۔ آپ سمجھتے ہیں کہ وہ بے فکر ہیں مگر ان کے دل کا حال معلوم ہو تب پتہ لگے کہ بے فکر کون ہے۔ اسی کو کہتے ہیں ؎

گفت مکشوف و برہنہ گو کہ من   می نہ گنجم با صنم در پیرہن

(کہا کہ کھول کر اور کھلم کھلا بیان کرو میں محبوب کے ساتھ پیرہن نہیں سما سکتا)

انسان جب تک اس ہیکل ہیولانی میں ہے حجاب میں ہے غرض یہاں حجاب نہیں ہوسکتا اور وہ جو کہا جاتا ہے ؎

بے حجابانہ درآ از درِ کاشانۂ ما
کہ کسے نیست بجز دردِ تو در خانۂ ما

(بے دھڑک اندر آجا میرے اس کاشانہ (دل) میں تیرے سوا کوئی موجود نہیں ہے)

اس کا یہ مطلب نہیں کہ بالکل بے حجاب ہوکر یہاں دیدار حق کی تمنا کرتے ہیں بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ لاکھوں حجابات میں سے کسی قدر حجابات کم ہونے کی وہ تمنا کرتے ہیں ورنہ یہاں بالکل بے حجاب ہونا دشوار ہے اس کی تائید جبرئیل علیہ السلام کے واقعہ سے ہوتی ہے کہ ایک بار جبرئیل علیہ السلام حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے آپؐ نے ان سے ایک مسئلہ کی تحقیق فرمائی وہ واپس ہوگئے کہ حضرت حق سے تحقیق کرکے بیان کروں گا دوبارہ آئے تو بہت خوش تھے کہ آج مجھ کو حق تعالیٰ سے جس قدر قرب عطا ہوا کہ اتنا قرب کبھی نصیب نہ ہوا تھا، آج صرف ستر ہزار پردے باقی رہ گئے۔ لیجئے ستر ہزار پردے باقی رہ جانے پر وہ خوش تھے کہ بہت قرب نصیب ہوگیا بس اسی کو اس شعر میں کہا ہے ؎

بے حجابانہ درآ از درِ کاشانۂ ما

(ہمارے کاشانہ (دل) بے دھڑک آجا)

یعنی تمنا یہ کرتے ہیں کہ کسی قدر حجابات کم ہو جائیں یہ مقصود نہیں کہ اس عالم میں بالکل بے حجاب ہونا ممکن ہے بالکل بے حجاب دیدار تو آخرت ہی میں نصیب ہوگا تو اہل اللہ اور عشاق موت سے نہیں ڈرتے وہ تو اس کے مشتاق اور متمنی ہوتے ہیں اور موت کی تمنا اشتیاق لقاء اللہ میں جائز ہے بلکہ عین ولایت ہے پھر وہ بے فکر کیونکر ہو سکتے ہیں ان کو تو وہ ذکر ہے جس نے موت جیسی چیز کو جس کو آپ تلخ زہر سمجھتے ہیں ان کے لئے خوشگوار بنادیا ہے۔ عارف شیرازی فرماتے ہیں ؎

خرم آں روز کزیں منزل ویراں بروم — راحت جاں طلبم وز پئے جاناں بروم

نذر کردم کہ گر آید بسر ایں غم روزے — تا در میکدہ شاداں و غزلخواں بروم

(وہ دن مبارک ہے جس روز میں اس دنیائے فانی سے کوچ کروں راحت جان طلب کروں محبوب حقیقی کی طرف جاؤں میں نے نذر کی ہے کہ جس دن یہ غم تمام ہو جائے یعنی موت کا وقت آئے تو محبوب کے دربار تک خوش وخرم اور شعر پڑھتا ہوا جاؤں)

دیکھیے غم حجابات کے ختم ہونے کے لئے وہ نذریں مانتے ہیں کہتے ہیں کہ اگر کسی دن یہ غم ختم ہو تو میں نذر کرتا ہوں کہ دربار محبوب کی طرف خوش وخرم غزل پڑھتا ہوا جاؤں گا چنانچہ ایک بزرگ نے مرتے ہوئے وصیت بھی کی ہے کہ ہمارے جنازہ کے ساتھ یہ شعر پڑھتے ہوئے چلیں ؎

مفلسانیم آمدہ در کوئے تو — شیئاً للہ از جمال روئے تو

دست بکشا جانب زنبیل ما — آفریں بر دست و بر بازوئے تو

(آپ کے دربار میں مفلس ہو کر آئے ہیں اپنے جمال کے صدقہ میں کچھ عنایت کیجیے ہماری زنبیل کی طرف ہاتھ بڑھائیے آپ کے دست و بازو پر آفریں ہے)

وہ قبر کی طرف کیا جاتے ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی عید میں جا رہا ہو۔ گویا موت کیا آئی تمنائے دلی پوری ہو گئی جیسے ساری عمر اسی کے اشتیاق میں بیٹھے تھے۔ صاحبو! یہ مستیاں اہل اللہ ہی کو سوجھ سکتی ہیں اگر آپ بھی یہ چاہتے ہیں کہ موت آسان ہو جائے اور اس سے وحشت نہ رہے اس کا اشتیاق ہو جائے تو خدا کی محبت اور اطاعت حاصل کیجئے بھلا کسی مجرم کو یہ مستیاں سوجھ سکتی ہیں؟ ہرگز نہیں!

ان کو لقاء اللہ کا اشتیاق ہوتا ہے اس لئے ان کو موت خوشگوار ہو گئی تو بدون محبت واطاعت کے یہ بات نصیب نہیں ہو سکتی اکثر طبائع پر تو موت کا خوف ہی غالب ہے اس سے طبعاً وحشت ہوتی ہے اور اس طبعی وحشت میں کوئی گناہ بھی نہیں مگر اس کی ضرور کوشش کرنی چاہیئے کہ یہ طبعی وحشت موت کے وقت نہ رہے اس وقت اشتیاق کی کیفیت غالب ہو جائے اس وقت اگر شوق غالب یا تو موت کی ذرا بھی تکلیف نہ ہوگی غرض اہل اللہ بے فکر نہیں ہیں ان کے دلوں پر فکر و غم کا ایک پہاڑ ہے جس نے ان کو تمام افکار سے جدا کر دیا ہے اور دوسرے تعلقات سے گھبراتے ہیں۔ مولانا فرماتے ہیں

؎ خود چہ جائے جنگ و جدل نیک و بد

کایں دلم از صلحہا ہم می رمد

(جنگ و جدل اچھا برا تو کیا میرا دل تو صلح سے بھی گھبراتا ہے)

یعنی عداوت اور دشمنی اختلاف سے تو ہر شخص گھبراتا ہی ہے، مولانا فرماتے ہیں کہ میرا دل تو صلح سے بھی گھبراتا ہے یعنی اس سے بھی وحشت ہوتی ہے کہ ہمارے احباب اتنے ہیں وہ تو یہ چاہتے ہیں کہ بس دنیا میں اس طرح بسر کر جائیں کہ نہ کوئی ان کو ئی ان کو جانتا ہو نہ پوچھتا ہو ایک گوشہ میں پڑ کر محبوب کے خیال میں ختم ہو جائیں۔ یہاں اس سے بھی طبیعت گھبراتی ہے کہ فلاں آپ کا معتقد ہے لوگ اس کی کوشش کیا کرتے ہیں کہ معتقدوں کی جماعت بڑھے اور بعض لوگ فخر کیا کرتے ہیں کہ ہمارے اتنے مرید ہیں۔ بعض جگہ مریدوں کی فہرست اور رجسٹر بنے ہوئے ہیں جس میں سب کے نام لکھے جاتے ہیں مگر یہ اس کی دلیل ہے کہ ان کے دل میں حضرت حق کی طلب اور اس کی دھن نہیں ہے ورنہ ان جھگڑوں سے وحشت ہوتی۔ ہمارے ایک دوست ہیں عالم ہیں مگر یکمن علم را دہ من عقل باید (ایک من علم کے لئے دس من عقل چاہیئے) انہوں نے ایک خط میں کچھ بے عنوانی کی تھی میں نے اس پر دار و گیر کی تو آپ دوسرے خط میں اپنا اعتقاد و محبت جتانے بیٹھے کہ ہم تو آپ کے

معتقد ہیں آپ سے محبت رکھتے ہیں محبین و معتقدین کے ساتھ یہ برتاؤ نہیں ہونا چاہیئے میں نے ان کو لکھدیا کہ اگر آپ کو محبت و اعتقاد اپنی کسی مصلحت سے ہے تو پھر مجھ پر کیا احسان اور اس کے جتلانے کی کیا ضرورت تھی مصلحت تو اپنی اور اپنا فائدہ بدنظر اور دباؤ ڈالا جائے میرے اوپر اور اگر میری مصلحت کے واسطے اعتقاد و محبت پیدا کی ہے تو چھوڑ دو کیونکہ میری اس میں کوئی مصلحت نہیں بلکہ مجھے تو اور اس سے وحشت ہوتی ہے۔ اس پر ان کا دوسرا خط معافی کا آیا۔ اس پر میں نے ایک چرکہ یہ لگا دیا کہ ان کو لکھا کہ معاف تو کر دیا مگر دل میں دکھن باقی ہے اس کو میں اپنے اختیار سے دور نہیں کر سکتا کچھ دنوں تہذیب سیکھو جب تمہاری تہذیب سے دل کو خوشی اور راحت پہونچے گی اس وقت یہ دکھن خود بخود جاتی رہے گی۔ باقی جتنا میرے اختیار میں ہے میں نے پہلے ہی معاف کر دیا تھا میں دل میں کسی کی بات نہیں رکھتا اور دل میں وہ رکھے جو زبان سے نہ کہے میں تو زبان سے بہت کچھ کہہ لیتا ہوں دل میں کچھ نہیں رکھتا ؂

کفرست در طریقت ما کینہ داشتن

آئین ماست سینہ چو آئینہ داشتن

(ہمارے طریق میں کسی سے کینہ رکھنا کفر ہے سینہ کو آئینہ کی طرح حسد و کینہ سے صاف رکھنا ہمارا دستور ہے۔)

تو واللہ ہم تو ان قصوں سے گھبراتے ہیں کیسا اعتقاد کیسی محبت حق تعالےٰ نے پردہ پوشی کر رکھی ہے کہ لوگوں کو ہمارے عیوب نظر نہیں آتے جو محبت و اعتقاد رکھتے ہیں اگر اصلی حالت دیکھ لیں تو ہزار کوس دور بھاگیں۔ اس لئے بس جی یہ چاہتا ہے کہ سب سے الگ ہو کر حق تعالےٰ کے ساتھ لو لگائی جائے اور سب جھگڑوں کو حذف کیا جائے۔

ایک مرتبہ کا نپور میں ایک قصہ ہوا کہ ابتدا ابتدا میں قانون طاعون کا جاری ہوا اس وقت چند آدمی میرے پاس جمع ہو کر آئے اور کہا کہ اس کے متعلق ہم جلسہ کرنیوالے ہیں تم بھی چلو میں نے انکار کیا کہ ہم طالب علموں کو جلسہ سے کیا تعلق لوگوں نے زیادہ اصرار کیا میں نے کہا اچھا ذرا ٹھہر جاؤ میں حضرت حافظ کا دیوان کھولتا ہوں دیکھئے وہ کیا فرماتے

ہیں۔ بسم اللہ کہکر جو دیوان کھولا تو سرورق پر یہ شعر نکلا ؂

گدائے گوشہ نشینی تو حافظا مخروش
رموزِ مملکت خویش خسرواں دانند

(حافظ تو گدائے گوشہ نشین ہے شور و شغب مت کر سلطنت کے اسرار کو بادشاہی جانتے ہیں)

میں نے کہا لو بھائی یہ تو یوں کہتے ہیں کہ شور نہ مچاؤ گوشہ میں بیٹھے رہو لوگوں کو بڑی حیرت ہوئی کہ عجب مضمون مناسب وقت نکلا۔ میں نے کہا کہ صاحبو! میں تو ان قصوں سے پہلے ہی گھبراتا ہوں۔ مگر میری رائے یہ ہے کہ آپ لوگ بھی اس قصہ میں نہ پڑیں بلکہ اس مصیبت کی تدبیر دوسری کریں ابن ابی الدنیا نے روایت کی ہے کہ بادشاہوں کو بُرا مت کہو فَاِنَّ مَلِكُ الْمُلُوْكِ وَ بِيَدِيْ قُلُوْبُهُمْ (میں بادشاہوں کا بادشاہ ہوں ان کے دل میرے قبضہ میں ہیں) او کما قال۔ بادشاہوں کے دل خدا کے ہاتھ میں ہیں۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ مجھے راضی کر دیں سب کو ٹھیک کر دوں گا سب سے بڑے بادشاہ وہ ہیں ان چھوٹے بادشاہوں کے پیچھے کیوں پڑتے ہو یہ سب اس کے مقرر کئے ہوئے ہیں، ہم نے خدا کو ناراض کر رکھا ہے تو اس نے بادشاہوں کے دل بدلدیئے اس کو راضی کرلو وہ ان کے دلوں کو درست کر دے گا۔ اور اللہ تعالیٰ نے اس کارخانہ ظاہری کو ایک باطنی کارخانہ کے ساتھ وابستہ کر رکھا ہے۔

حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب کے زمانہ میں ایک مرتبہ انتظام خراب ہوگیا تھا لوگوں نے حضرت سے اس کی وجہ دریافت کی آپ نے فرمایا کہ آجکل صاحب خدمت ایسے ہی ایک حضرت ہیں جو بالکل ڈھیلے ہیں اور جن کے یہاں کچھ ڈھنگ نہیں لوگوں نے پوچھا وہ کون ہیں فرمایا کہ ایک کنجڑا ہے جو جامع مسجد کے نیچے بیٹھتا ہے۔ ایک شخص ان کا امتحان کرنے گئے وہ خربزے بیچ رہے تھے، انہوں نے بھاؤ کیا اور کہا کہ کاٹ کر چکھ کرلیں گے بولے بہت اچھا۔ انہوں نے قصداً سب خربزے کاٹ ڈالے اور چکھ چکھ کر کہدیا سب خراب ہیں ہم نہیں لیتے کہنے لگے بہت اچھا۔ یہ منظر دیکھ کر چلے آئے پھر ایک مرتبہ دیکھا گیا کہ انتظام بہت عمدہ ہوگیا تمام عملہ ٹھیک چل رہا تھا۔ ہر شخص

ڈرتا تھا کہ کام میں خرابی نہ آنے پائے سب لوگ ٹھیک ٹھیک خدمتیں انجام دیتے تھے۔ پھر اس شخص نے حضرت شاہ صاحب سے دریافت کیا کہ آجکل تو انتظام بہت عمدہ ہے آپ نے فرمایا کہ جی ہاں آجکل صاحب خدمت دوسرے مقرر ہوئے ہیں وہ بڑے تیز اور منتظم ہیں دریافت کرنے پر فرمایا کہ ایک سقہ ہے چاندنی چوک میں پانی پلاتا پھرتا ہے۔ وہ صاحب اُن کا بھی امتحان کرنے چلے شاہ صاحب نے فرمایا کہ ایک دمڑی ساتھ لیجانا ایک دمڑی کا پیالہ دیتے ہیں۔ یہ دمڑی لے کر گئے دیکھا کہ کٹورا بجاتے ہوئے سبیل سبیل پکار رہے ہیں یہ بھی پہونچے اور ایک پیالہ پانی کا مانگا انہوں نے پوچھا کہ دمڑی بھی ساتھ لایا ہے انہوں نے دمڑی پیش کردی انہوں نے ایک پیالہ دیدیا، اس نے پانی پھینک دیا کہ یہ تو خراب تھا۔ ایک پیالہ اور دو، انہوں نے کہا کہ دمڑی اور ہے کہا نہیں انہوں نے ایک طمانچہ رسید کیا کہ کنجڑا سمجھا ہوگا جا ایک دمڑی اور لا تب پیالہ ملے گا۔ یہ بڑے گھبرائے کہ واقعی ابھی حضرت نے سارے عملے کو بیچار رکھا ہے تو صاحبو احکام کے دل اہلِ خدمت کے تابع ہوتے ہیں، یہ ظاہری حکام بھی درست ہو سکتے ہیں جب وہ ان کی درستی کی طرف متوجہ ہوں اور وہ بالکل مثل سکہ کے مشیت الٰہی کے تابع ہیں بس خدا کو خوش کرلو وہ اصحابِ خدمت کو متوجہ فرمادے گا پھر یہ سارا ظاہری عملہ درست ہو جائیگا۔ تو میں نے ان لوگوں سے کہا کہ توبہ و استغفار کرو اور ہر روز پانچسو مرتبہ کم از کم لَاحَوْلَ وَلَاقُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْمِ کا وظیفہ مقرر کرلو ان شاء اللہ تعالیٰ ایک ہفتہ میں سب مصیبت دور ہو جائے گی۔ یہ میں نے کوئی کشف سے نہیں کہا تھا بلکہ حدیث میں آیا ہے کہ لَاحَوْلَ وَلَاقُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ کَنْزٌ مِّنْ کُنُوْزِ الْجَنَّۃِ وَھُوَ دَوَاءٌ لِّسَبْعِیْنَ دَاءً اَیْسَرُھَا اَلْھَمُّ کہ یہ جنت کا ایک خزانہ ہے اور ستر بلاؤں کی دوا ہے جس میں سے ادنیٰ فکر و غم ہے (رواہ فی الحصن جامع ۱۲)

اس بھروسہ پر میں نے کہہ دیا ہے اور عدد کی تعیین اتفاق سے میرے منہ سے نکل گئی ان لوگوں نے اس رائے کو پسند کیا اور عمل شروع کیا واقعی ایک ہفتہ گذرنے نہ پایا تھا کہ وہ حکم منسوخ ہوگیا اور امن چین ہوگئی پھر ان لوگوں کو اس عمل سے

ایسا اعتقاد ہوا کہ کانپور کی جامع مسجد میں اب تک نماز عصر کے بعد اس کا ورد چلا جا رہا ہے۔ غرض مصائب سے نجات چاہتے ہو تو ایک ذات[1] سے تعلق پیدا کرو وہ کون ہے ؂

مصلحت دیدمن آنست کہ یاراں ہمہ کار
بگذارند و خم طرۂ یارے گیرند

(سارے جہان کی مصلحتوں کو چھوڑ کر محبوب حقیقی کی طرف متوجہ ہو جائیں)

یعنی حق تعالےٰ شانہٗ سے تعلق پیدا کرو اُس کے سوا سب سے نظر قطع کرو کیونکہ راحت و کلفت سب اسی کے ہاتھ میں ہے اس کو راضی کرو ان شاء اللہ وہ تمام مصائب کا انتظام فرما دینگے اَمَّنْ یُّجِیْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَ یَكْشِفُ السُّوْٓءَ وَ یَجْعَلُكُمْ خُلَفَآءَ الْاَرْضِ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ قَلِیْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ۔ ہاں وہ کون ہے جو کہ مضطر کی دعا قبول کرتا ہے اور مصیبت کو

---

[1] جامع عرض کرتا ہے کہ اس وقت جو مسلمانوں کو مصائب پیش آ رہے ہیں جن کے دفع کرنے کے لئے بہت لوگ خلافت کی حمایت میں سرگرم ہیں ان کو چاہیئے کہ سب سے پہلے خدا کو راضی کرنے کی فکر کریں پھر اور کوئی تدبیر کریں بدون خدا کو راضی کئے اور اس کے ساتھ تعلق پیدا کئے کامیابی دشوار ہے مگر افسوس اب بھی مسلمانوں کو ہوش نہیں آیا وہ یہ نہیں سمجھتے کہ گناہوں ہی کی وجہ سے یہ روز بد دیکھنا نصیب ہوا ہے تو اس کا علاج خدا کی اطاعت سے کرنا چاہیئے وہ اب بھی ایسی تدابیر کر رہے ہیں جو خدا کی ناراضی کا پہلے سے زیادہ سبب ہو رہی ہیں۔ ہندوؤں کے جوش اتحاد میں مسلمانوں نے اپنے ہاتھوں پر قشقے لگانے شروع کر دیئے جو کہ سراسر کفر ہے قربانی گاؤ کو جو کہ شعار اسلامی ہے بند کرنا چاہتے ہیں، ہندوؤں کی دوستی میں ان پر آیات و احادیث کو نثار کرتے ہیں افسوس جس بات کی وجہ سے یہ مصائب پیش آ رہے ہیں اسی کو کامیابی کا ذریعہ بنانا چاہتے ہیں۔ یعنی خدا کی نافرمانی سے یہ بلائیں آئی ہیں تو نافرمانی ہی کے ذریعہ سے ان کو دفع کرنا چاہتے ہیں۔ ایں خیال است و محال است و جنوں (یہ خیال محال ہے اور جنون ہے)

ترسم نرسی بکعبہ اے اعرابی
کیں رہ کہ تو میروی بترکستان است

(مجھے خوف ہے اے اعرابی کہ تو کعبہ نہ پہنچے گا جو راستہ تو نے اختیار کیا وہ ترکستان کا ہے)

(ظفر احمد عفا اللہ عنہ)

دور کرتا ہے اور تم کو زمین میں یکے بعد دیگرے قائم مقام بناتا ہے (وہ صرف خدائے عزوجل ہے) کیا (اب بھی) خدا کے ساتھ کوئی اور معبود ہے (ہرگز نہیں مگر پھر جو بعض لوگ خدا کی طرف نہیں جھکتے اس کا یہ سبب نہیں کہ وہ اس مضمون کو جانتے نہیں بلکہ (وہ لوگ (محض کورانہ تقلید سے) خدا کے ساتھ دوسروں کو برابر کرتے ہیں، صاحبو! خدا کے ساتھ تعلق ہو جائے تو اول تو مصیبت آوے ہی گی نہیں اور اگر آوے گی تو وہ مصیبت مصیبت نہ رہے گی حتیٰ کہ جس موت سے آپ کو اب وحشت ہے اس وقت اس سے محبت ہو جائے گی اور معلوم ہو جاوے گا کہ موت وحشت کی چیز نہیں پھر وحشت ایک تو موت سے ہوتی ہے خیر یہ تو کسی قدر ظاہراً معقول بھی ہے کہ مرنے والا تمتعات سے محروم ہو جاوے گا۔ دوسرے اس سے وحشت ہوتا کہ ایک دم سے بہت سے آدمی مر جاویں گے یہ تو بڑی ہی بیوقوفی کی بات ہے کیونکہ ایک مرنے والے پر دوسروں کے مرنے کا کیا اثر ہوگا۔ غرض اول تو خود موت ہی کوئی بری چیز نہیں خدا کے وصال کا ذریعہ ہے اس کے بغیر خدا سے ملنا نصیب نہیں ہو سکتا۔ پس حیرت ہے کہ ایک شخص کو فراق کی مصیبت سے چھوٹ کر وصال حبیب سے مشرف ہوتا ہے اور تم یہ چاہتے ہو کہ یہ ہمارے ہی پاس رہتا اسی رنج فراق میں گرفتار رہتا جس میں تم گرفتار ہو۔ سچ ہے اگر سلامت فہم نہ ہو تو یہی ہوتا ہے کہ جب قیدخانہ میں سے کسی قیدی کو رہائی ہوتی ہے تو دوسرے قیدیوں کو رنج ہوا کرتا ہے کہ یہ کیوں چھوٹ گیا۔ یہ بھی ہماری طرح یہیں رہتا۔ گنجا یہ چاہتا ہے کہ سارا جہان گنجا ہو جائے مگر کوئی اس چھوٹنے والے کے دل سے پوچھے واللہ جو لوگ مر گئے ہیں ان کو دوبارہ اگر دنیا میں جانے کو کہا جاوے تو وہ کبھی اس کو منظور نہ کریں جیسا کہ قیدی چھوٹ جانے کے بعد پھر قیدخانہ میں جانا خوشی کے ساتھ کبھی نہیں چاہا کرتا۔ دوسرے یہ کہ جب ان کو مرنا ہی ہے تو اکٹھے مرے تو کیا منفرق مرے تو کیا بلکہ یہ تو اور بھی اچھا ہے کہ بہت سے ساتھ مل کر جاویں۔ مرگ انبوہ جشنے دارد (گروہ کا مرنا جشن رکھتا ہے) یہ تو حدیث میں بھی آیا ہے کہ مرنے کے بعد روحیں آپس میں جمع ہوتی ہیں تو اچھا ہے کہ یہیں سے سب مل کر جائیں لوگ سمجھتے ہیں کہ مردہ یہاں سے جاکر

قبر میں اکیلا گھبراتا ہوگا۔ توصاحبو ! یہ قبر تو لغوی قبر ہے ورنہ حقیقی قبر تو عجیب چیز ہے
یعنی عالمِ برزخ وہ اتنا تنگ اور چھوٹا نہیں وہ خود ایک مستقل عالم ہے۔ حدیث سے
معلوم ہوتا ہے کہ جب کوئی مرتا ہے اور اس کی روح آسمان پر جاتی ہے تو اس سے
ملنے کو اس کے اعزا و اقربا' دوست احباب کی روحیں آتی ہیں اور خوش ہوتی ہیں
اور دنیا کی باتیں پوچھتی ہیں کہ فلاں شخص کس حال میں ہے وہ کیسا ہے، پھر ایک کہتا
ہے کہ بس ابھی اس کو زیادہ بات چیت میں نہ لگاؤ یہ تھکا ہوا آیا ہے ذرا راحت
لینے دو، غرض وہاں وحشت نہیں نہ وہاں تنہائی ہے گو لوگ اس کو وحشت کدہ گمان
کرتے ہیں مگر خلاف گمان وہ ایسا نہیں جیسے مولانا آگ کے متعلق فرماتے ہیں ؎

اندر آ اسرار ابراہیم بیں
کو در آتش یافت در دو یاسمیں

(تو بھی اندر چلی آ اور دیکھ تو یہ آگ نہیں گلزار ابراہیمی ہے تو اس میں
گلاب اور چنبیلی پائے گی)

یہ ایک قصہ میں مولانا فرمارہے ہیں۔ قصہ یہ ہے کہ ایک کافر بادشاہ نے بہت
سی آگ جلا کر مسلمانوں کو مجبور کیا کہ بت کو سجدہ کریں ورنہ آگ میں ڈال دیئے جائیں گے
چنانچہ انہیں مسلمانوں میں ایک عورت بھی تھی جس کی گود میں شیرخوار بچہ تھا اس کو بت کے آگے
سجدہ کرنے کے لئے کہا گیا اور انکار کرنے پر ظالموں نے اس کی گود میں سے بچہ کو چھین کر آگ
میں ڈال دیا اس وقت قریب تھا کہ اس کی ماں کا قدم لڑکھڑا جائے کہ حق تعالیٰ نے اس کی
امداد کی اور بچہ کو گویائی دی اس نے اپنی ماں کو پکارا کہ ؎

اندر آ اسرار ابراھیم بیں — کو در آتش یافت در دو یاسمیں

(تو اندر آ اور گلزار ابراھیمی دیکھ کہ آگ میں گلاب و چنبیلی پائے گی)

یعنی اندر آ کر دیکھ یہ آگ نہیں ہے گلزار ہے۔ اسی طرح عالمِ برزخ بہت دلچسپی کا مقام ہے۔

؎ روبرو سلطان و کاروبار بیں — حسن تَجْرِیْ تَحْتَهَا الْاَنْهَارُ بیں
(اس کے نیچے نہری بہتی ہیں)

یعنی بادشاہ کے پاس جاکر کاروبار دیکھو۔ تجری تحتہا الانہار کا حسن دیکھو ؎

خواہرانت ساکن چرخ سنی
تو بمردارے چہ سلطانی کنی

تو موت سے وحشت اس واسطے ہے کہ لوگوں نے اس گڑھے کو قبر سمجھ لیا ہے وہ عالم برزخ کے عجائبات سے ناواقف ہیں۔ شوق وطن میرا ایک رسالہ ہے اس کو دیکھو موت کا شوق ہو جائے گا۔ بیماری اور مصائب کے وقت اس رسالہ سے بہت سکون ہوتا ہے۔ میں اس وقت اس کی کوشش نہیں کرتا کہ ایک دن میں یہ کیفیت پیدا ہو جائے اور نہ یہ ایک دن میں پیدا ہو سکتی ہے ؎

صوفی نہ شود صافی تا در نکشد جامی
بسیار سفر باید تا پختہ شود خامی

(صوفی جب تک بہت سے مجاہدے نہ کرلے خام ہی رہتا ہے پختگی مجاہدات کے بعد حاصل ہوتی ہے)

پختہ ہونے کے لئے تو بہت خاک چھاننی پڑتی ہے میرا مقصود اس وقت یہ ہے کہ آپ اس کیفیت کے حاصل کرنے کی کوشش کریں جس دن یہ کیفیت نصیب ہو جائیگی آپ کی زندگی اور موت (دونوں پُر لطف ہو جاویں گی) واللہ ثم واللہ ثم باللہ یہ سب باتیں بنائی ہوئی نہیں ہیں یہ سب حقائق ہیں لیکن اگر عنین مادر زاد کو جماع کی لذت نہ آوے تو کیا سارے ہی نامرد ہو جاویں گے۔ ہرگز نہیں بلکہ اُسی کو کہا جاوے گا کہ قوت مردانگی سے محروم ہے سارا جہان نامرد نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح اگر آپ کو یہ حقائق نہ معلوم ہوں تو کیا یہ ساری باتیں بنی ہوئی ہو جاویں گی۔ اگر آپ بے خبر ہوں تو کیا خبر کہنے والے بھی ان حقائق کو نہ کہیں وہ بھی اپنی آنکھیں پھوڑ لیں اہل اللہ کے سامنے عوام کی وہی حالت ہے جو عنین کی مرد کے سامنے ہوتی ہے۔ اگر نامرد کسی مرد کے سامنے لذت جماع کا انکار کرنے لگے تو اس کو جوش نہ آئے گا، بُرا نہ مانے گا بلکہ اس کے حال پر اُسے ترس آئے گا کہ یہ غریب اس لذت سے کیسا بے خبر ہے۔ اسی طرح اہل اللہ کے علوم کو اگر کوئی ناسمجھ

بنی ہوئی باتیں کہنے لگے تو اس سے وہ برا نہیں مانتے۔ ان کی مثال تو کیمیا گر جیسی ہے اگر تمام دنیا کیمیا گر سے کہنے لگے کہ تجھے خاک نہیں آتا، تو کچھ نہیں جانتا یہ کیمیا کی باتیں ہی باتیں ہیں تو وہ اس سے برا نہیں مانے گا بلکہ یہی کہے گا کہ تم مجھے ایسا ہی سمجھتے رہو تم خود ہی محروم رہو گے۔ اسی کو فرماتے ہیں ؎

یا مدعی مگوئید اسرار عشق و مستی
بگذار تا بمیرد از رنج خود پرستی

فرماتے ہیں کہ مدعی سے اسرار عشق بیان نہ کرو اس کو خود رائی اور خود پرستی ہی کے رنج میں رہنے دو، آنکھوں پر پردہ پڑا ہے اس لئے یہ حقائق نظر نہیں آتیں لیکن اگر یہ باتیں محض بنائی ہوئی ہیں تو پھر اہل اللہ کے کلام میں اثر اور درد کہاں سے آگیا۔ جھوٹی باتوں میں بھی کہیں اثر ہوا کرتا ہے آخر کوئی تو بات ہے جس نے اہل اللہ کو تمام لذات و شہوات سے الگ کر دیا کہ جن چیزوں کے لئے عام لوگ مرتے کھپتے ہیں وہ ان سے بالکل بے زار اور مستغنی ہیں۔ نہ ان کو طلب مال کی ہے نہ لباس کی فکر ہے نہ عزت و جاہ کی خواہش ہے، آخر کوئی چیز تو ان کے پاس ہے جس کی لذت میں وہ ان چیزوں کو چھوڑ کر الگ ہو گئے کوئی تو آگ ان کے سینے میں ہے جو پاس بیٹھنے والوں کو بھی بے قرار کر دیتی ہے۔ یہ خود اس کی دلیل ہے کہ ان کے یقیناً وہ حقائق ہیں جن کی مخلوق کو خبر نہیں، اسی کو مولانا فرماتے ہیں ؎

گر نہ بودے نالۂ نے را اثر
نے جہاں را پُر نہ کردے از شکر

(اگر نالہ نے میں اثر نہ ہوتا تو نے جہاں کو شکر سے نہ بھرتا)

عارفین کے یہ علوم قرآن و حدیث میں موجود ہیں مگر کوئی سمجھنے والا بھی ہو نمونہ کے طور پر سنئے۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں:۔

اِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِہٖ وَلٰکِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ کہ ہر چیز حق تعالیٰ

کی تسبیح و حمد کرتی ہے مگر تم ان کی تسبیح کو نہیں سمجھتے ۔ لوگ قرآن و حدیث کو سمجھے نہیں بس تاویل کرنے لگے کہ مراد تسبیح حالی ہے ۔ عارفین کہتے ہیں کہ یہ حقیقت پر محمول ہے کیونکہ وہ کھلی آنکھوں ہر چیز کو تسبیح کرتے دیکھتے ہیں اور کانوں سے ان کی تسبیح سنتے ہیں لیکن اہلِ ظاہر کی آنکھیں چونکہ بند ہیں وہ اس میں تاویل کرنے لگے ۔ مولانا اس کی شکایت کرتے ہیں ؎

بر ہوا تاویل قرآں می کنی
پست و کج شد از تو معنی سنی

(ہوا پر قرآن میں تاویل کرتے ہو جس سے اس کے روشن معنی پست و کج ہو جاتے ہیں)

چوں نہ دارد جاں تو قندیل ہا — بہر بینش می کنی تاویل ہا
کردہ تاویل لفظ بکر را — خویش را تاویل کن نے ذکر را

(یعنی تمہارے اندر قرآن سمجھنے کا فہم ہی نہیں اس لئے تاویلات کرتے ہو قرآن کے سمجھنے کا فہم پیدا کرو اور تاویلات کو چھوڑو)

عارفین اپنی رائے سے تاویل نہیں کرتے وہ قرآن و حدیث کی تمام باتوں کو حقیقی سمجھتے ہیں ان کا تو یہ مذہب ہے ؎

فکر خود و رائے خود در عالم رندی نیست
کفر ست دریں مذہب خود بینی و خود رائی

(اپنی رائے و فکر کو راہ سلوک میں کچھ دخل نہیں ہے اس طریق میں خود بینی اور خود رائی کفر ہے)

اگر آنکھیں ہوں تو سارا جہاں ذکر اللہ سے پُر نظر آتا ہے پس اگر آپ بھی ان حقائق کو سمجھنا چاہتے ہیں تو اہل اللہ کا دامن پکڑ لیجئے وہ بخیل نہیں ہیں البتہ مستغنی ضرور ہیں جو ان سے اعراض کرتا ہے وہ ہزار بار اُس سے اعراض کرتے ہیں اور جو اُن کی طرف آتا ہے وہ اس کے نفس سے زیادہ اس پر شفیق ہیں بشرطیکہ طلب صادق ہو کیونکہ بدون سچی طلب کے کامیابی مشکل ہے دوا وہیں اثر کرتی ہے جہاں بیماری ہو ، پانی وہیں جاتا ہے جہاں پستی ہو اونچے پہاڑ پر پانی نہیں چڑھا کرتا ؎

ہر کجا مشکل جواب آنجا رود — ہر کجا پستی ست آب آنجا رود

ہر کجا دردے دوا آنجا رود ہر کجا رنجے شفا آنجا رود

(پانی وہیں جاتا ہے جہاں پستی ہو جواب اسی جگہ دیا جاتا ہے جہاں اشکال پیش آئے۔ دوا اسی جگہ اثر کرتی ہے جہاں بیماری ہو شفا وہیں پہونچتی جہاں تکلیف ہو)

تو پہلے طلب کا درد اپنے اندر پیدا کیجئے۔ اس کے بعد اپنے آپ کو ان کے سپرد کر دیجئے اور خود رائی اور خود بینی کو طاق پر رکھئے جس طرح وہ چلائیں اس طرح چلئے اپنی عقل کو دخل نہ دیجئے محض عقل سے مقصود حاصل نہیں ہو سکتا۔ دیکھئے فلاسفہ یونان کیسے کیسے عقلا تھے مگر مقصود تک نہ پہونچ سکے ہزاروں ٹھوکریں کھائیں عقل نے ان کو مقصود سے بہت ہی دور ڈال دیا اس طریق میں صرف عقل سے کام نہیں چلتا حال کی بھی ضرورت ہے۔ جب حال نہ ہو تو تنہا عقل سے قساوت بڑھ جاتی ہے دل کا قفل نہیں کھل سکتا۔ فلاسفہ یونان کو **عقل** ہی کا ہیضہ ہو گیا تھا اسی لئے ان میں سے بعضوں نے انبیا کو بھی پایا مگر اتباع نہ کیا یہ کہدیا کہ بیشک یہ نبی ہیں مگر جاہلوں کے واسطے ہیں ہم عقلا ہیں ہم کو نبی کی ضرورت نہیں تو بات کیا تھی کہ ان میں حال نہ تھا اگر حال ہوتا تو مقصود کا پتہ چل جاتا اور سمجھ جاتے کہ اس مقصود کو ہم اپنی عقل سے نہیں پا سکتے اس کے لئے کسی مقبول بندہ کی دستگیری بھی شرط ہے پھر انبیا کی حقانیت اور مقبولیت دیکھ کر ضرور ان کا اتباع کرتے مگر ان کے دل میں محبت کی آگ نہ تھی عشق کا حال غالب نہ تھا اس لئے وصال محبوب کی خواہش نہ ہوئی ورنہ ایسا کہیں ہو سکتا ہے کہ محبوب کے وصال کی طلب ہو اور ایک پہونچانے والا سامنے ہو اور وہ خود بلا رہا ہو کہ آؤ میں تم کو محبوب سے ملا دوں اور پھر بھی عاشق کو اس کی رہبر کی اتباع سے انکار رہو ہاں عشق ہی نہ ہو تو سب کچھ ممکن ہے۔ غرض بدون طلب کے کام نہیں چل سکتا ؎

فہم و خاطر تیز کردن نیست راہ
جز شکستہ می نگیرد فضل شاہ

(راہ سلوک میں فہم و خاطر کا تیز کرنا مقصود نہیں شکستگی اور خاکساری کی ضرورت ہے۔

بغیر شکستہ دلی کے فضلِ الٰہی نہیں ہوتا)

اور **شکستگی عشق و طلب** ہی کی بدولت پیدا ہوتی ہے اگر شکستگی پیدا ہوجائے تو مطلوب بہت نزدیک ہے۔ حدیث میں ہے اَنَا عِنْدَ الْمُنْكَسِرَةِ قُلُوْبُهُمْ کہ میں دل شکستہ لوگوں کے پاس ہوں۔ اس لئے اگر وصال محبوب کی تمنّا ہے تو اول یہ شکستگی پیدا کیجئے پھر کسی کے ہاتھ میں اپنے آپ کو سپرد کر دیجئے بتلائیے آخر صحابہ کس چیز سے راہ پر لگے ہیں اسی سپرد کر دینے سے انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں اپنے کو سپرد کر دیا تھا اسی سے ان کا کام بن گیا علم عقل سے ان کا کام نہیں بنتا چنانچہ بعض متاخرین فقہ وغیرہ میں صحابہ سے بہت آگے ہیں مگر کیا وہ اس سے صحابہ پر فوق ہو گئے ہرگز نہیں صحابہ میں ایک ایسی بات ہے جو کسی امتی کو نصیب نہیں وہ یہ کہ انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں اپنے آپکو سپرد کر دیا۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت سے وہ وہاں پہونچے جہاں ہزار برس کے مجاہدوں سے بھی کوئی نہیں پہونچ سکتا اور سپردگی بھی ایسی کامل تھی کہ ایک بار ابی بن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پکارا وہ نماز پڑھ رہے تھے اس لئے نہ بولے نماز سے فارغ ہو کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنا عذر بیان کیا کہ میں نماز میں تھا آپؐ نے فرمایا اَلَمْ تَسْمَعْ قَوْلَ اللّٰهِ تَعَالٰى اِسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ کیا تم نے حق تعالیٰ کا ارشاد نہیں سُنا کہ جب رسول صلی اللہ علیہ وسلم) تم کو پکاریں فوراً جواب دو تو صحابہؓ کے ذمہ نماز میں بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جواب دینا ضروری تھا۔ آگے اس میں علماء کا اختلاف ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جواب دینے سے نماز فاسد ہو جاتی تھی یا نہیں، بعضوں نے کہا ہے کہ فاسد نہ ہوتی تھی۔ خیر نماز کا جو بھی حکم ہو مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بات کا جواب دینا نماز میں بھی ان کے ذمہ فرض تھا، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کے لئے اس میں تفصیل ہے کہ فرض نماز کا توڑنا تو کسی حال میں جائز نہیں بجز اس صورت کے کہ کسی مسلمان پر جان کا خطرہ ہو تو لازم ہے کہ نماز توڑ کر اس کی امداد کرے یا اپنا نقصان ایک درہم سے زیادہ کا ہوتا ہو تو جب بھی نماز توڑ دینا

جائز ہے، باقی اگر جان کا خطرہ نہ ہو تو فرض نماز نہ توڑے۔ رہی نفل نماز تو اس کا توڑنا غیر والدین کے لئے تو جائز نہیں اور والدین کے لئے اس وقت جائز ہے کہ ان کو یہ معلوم نہ ہو کہ نماز پڑھ رہا ہے اور اگر یہ معلوم ہو گیا پھر بھی پکاریں تو نماز توڑنا جائز نہیں کیونکہ اب وہ پکارنے والا خود گنہگار ہے اس کی بات نہ مانی جائے گی۔ یہ تفصیل میں نے اس لئے بیان کر دی کہ بعض لوگ پیروں کے پکارنے پر اب بھی نماز کا توڑنا مطلقاً جائز سمجھتے ہیں مگر یہ غلط ہے پیر کا درجہ شرعاً باپ سے زیادہ نہیں، غرض میں یہ کہہ رہا تھا کہ اپنے کو کسی عارف محقق کے ہاتھ میں سپرد کرو اور اپنی رائے اور عقل کو بالائے طاق رکھو اور اس سے مت ڈرو کہ وہ بڑے بڑے مجاہدے کرائیں گے کیونکہ محقق ہر شخص کے مناسب دستور العمل تجویز کرتا ہے سب کو ایک لاٹھی سے نہیں ہانکتا، جو لوگ ضعیف ہیں مجاہدات کے متحمل نہیں ہیں ان کی پرورش جمال سے کرتے ہیں کہ خوب کھاؤ خوب پیو، اچھا پہنو راتوں کو سوؤ اور مختصر کام بتلا دیتے ہیں جس کا وہ تحمل کر سکیں اور کسی کی تربیت جلال سے کرتے ہیں کہ تمام شہوات و لذات جو ضروریات سے زیادہ ہوں چھوڑا دیتے حضرت عارف شیرازیؒ ان مشائخ کی شکایت کرتے ہیں جو ضعفاء کے حال پر رحم نہیں کھاتے ہے

خستگاں را چو طلب باشد و قوت نبود
گر تو بیداد کنی شرط مروت نہ بود

(کمزوروں کو جب طلب ہو اور قوت نہ ہو اگر قوت سے زیادہ کام تو ظلم ہے مروت کے خلاف ہے)

یعنی مروت اور شفقت سے یہ بات دور ہے کہ ضعیف و ناتواں لوگ جن میں طلب ہے اور قوت نہیں ان کو بھی تم محنت و مشقت کے طریق سے پرورش کرو۔ مولانا فرماتے ہیں

چار پارا قدر طاقت بار نہ ۔۔۔ بر ضعیفاں قدر ہمت کار نہ
طفل را گر نان دہی بر جائے شیر ۔۔۔ طفل مسکیں را ازاں نامردہ گیر

(چوپاؤں پر طاقت سے زیادہ بوجھ نہ رکھو، کمزوروں سے ہمت سے زیادہ کام نہ لو

شیر خوار بچہ کو بجائے دودھ کے روٹی دو تو بیچارہ بچہ اس روٹی سے مرجائے گا۔)
ظاہر ہے کہ شیر خوار بچہ کو اگر دودھ کے بجائے روٹی کھلانے لگو تو چار دن میں اس کا خاتمہ ہے۔ آج ضعیف کو اگر وہ کام بتلا دیا جائے جو اقویا کے مناسب ہے تو دو چار دن میں تمام ہو جائے گا پس اہل اللہ ہر شخص سے اس کے مناسب معاملہ کرتے ہیں ضعیف کے حال پر وہ بہت شفقت کرتے ہیں، ہاں مگر حرمزدگی کے وہ ساتھی نہیں کہ ایک شخص اچھا خاصہ ہو اور پھر کم ہمت بن جائے تو اس کے لئے وہ سخت بھی بہت ہیں۔ پس اگر اہل اللہ پر اعتماد ہے تو ان کو اپنے سے زیادہ واقف طریق اور خیر خواہ سمجھ کر ان کے قدموں سے لگ جاؤ، ہاں اگر ان کی تشخیص پر اعتماد نہ ہو تو چھوڑ دو مگر جب ایک بار کسی کو محقق سمجھ کر اپنے اوپر اختیار دیدیا تو پھر اس کی رائے میں دخل نہ دو کہ یہ خود رائی سدّ راہ ہے۔ اس طریق میں اعتماد بہت ضروری ہے بلکہ اسی طریق میں کیا ہر علم میں اعتماد کے بغیر کام نہیں چل سکتا پھر اس تفویض میں آپ ہی کا نفع ہے کیونکہ اپنے آپ کو دوسرے کے سپرد کر دینے سے بڑی راحت ہوتی ہے اور دوسرے کو پوری توجہ ہوتی ہے۔ اور بدون تفویض کے نہ اپنے آپ کو جمعیت نصیب ہوتی ہے نہ دوسرے کو توجہ ہوتی ہے غرض جب آپ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی طرح اپنے آپ کو کسی کے سپرد کر دیں گے اس وقت معلوم ہوگا کہ یہ باتیں بنائی ہوئی نہیں ہیں بلکہ حقائق ہیں پھر آپ کو موت سے وحشت نہ ہوگی بلکہ اس کا اشتیاق پیدا ہو جائے گا اور یہی حسن خاتمہ کی دلیل ہے کہ خدا سے ملنے کا اشتیاق پیدا ہو جائے گا۔
عارفین کی موت کے قصے سن کر معلوم ہوتا ہے کہ واقعی ان لوگوں کی موت پر ہزار زندگی قربان ہے۔
ایک مرتبہ شیخ نجم الدین کبریٰ کے سامنے کسی نے ایک غزل گائی جس کے ایک شعر کے آخیر میں یہ تھا۔

جاں بدہ وجاں بدہ وجاں بدہ (جان دے جان دے جان دے)

آپ کے اوپر کیفیت شوق کا غلبہ ہوا فرمایا کہ محبوب جان مانگ رہا ہے اور کوئی اپنی جان نہیں دیتا اس کے بعد فرمایا کہ

جاں دادم وجاں دادم جاں دادم (میں نے جان دی میں نے جان دی میں نے جان دی)

پس یہ کہہ کر ختم ہو گئے۔

ایک اور صوفی کا قصہ ہے کہ وہ حج کو جارہے تھے شوق میں ناچتے کودتے اشعار پڑھتے جاتے تھے کسی کو معلوم نہ تھا کہ کس درجہ کا عاشق ہے لوگ اُن کو معمولی آدمی بلکہ مسخرہ سمجھتے تھے مگر جس وقت مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے ہیں اور بیت اللہ پر نظر پڑی ہے اور مطوف نے کہا کہ یہی بیت اللہ ہے بس ان پر ایک حالت طاری ہو گئی اور بے ساختہ زبان سے نکلا ؎

چو رسی بکوئے دلبر بسپار جان مضطر
کہ مبادہ بار دیگر نرسی بدیں تمنّا

(جب محبوب کے کوچہ پہونچ جاؤ تو جان مضطر کو فدا کر دو شاید پھر اس تمنا کے حصول کا موقع نہ ملے)

پھر گرتے ہی جان دیدی۔ صاحبو! کیا ایسی موت تمنا کے قابل نہیں کیا اس کے لئے کوشش نہ ہونی چاہیئے۔ شاید کوئی یہ کہے کہ صاحب یہ تو حکایات ہی حکایات ہیں پہلے زمانہ میں موت کا ایسا اشتیاق ہوتا ہوگا آج کل ایسا نہیں ہو سکتا تو میں کہتا ہوں کہ نہیں صاحب اب بھی ایسے لوگ موجود ہیں اور نہ ہونے کی کیا وجہ جس طریقہ سے ان کو یہ حالت نصیب ہوتی تھی وہی طریقہ اب بھی اگر اختیار کیا جائے تو یہ حالت پیدا ہو جائے گی اور وہ طریقہ کیا ہے کثرت ذکر اور کثرت طاعت اور اجتناب معصیت بس ان تین چیزوں کو اختیار کر لیجئے۔ ان شاء اللہ موت کا اشتیاق اور خدا سے ملنے کی تمنا پیدا ہو جائے گی۔ اگر آپ یہی چاہتے ہیں کہ اس زمانہ میں ایسے نمونے دکھلا دوں تو لیجئے میں بتلاتا ہوں کہ اب بھی ایسے لوگ موجود ہیں۔ ہمارے مدرسہ میں دو شخصوں کا انتقال ہوا جو کہ ذاکر و شاغل تھے، ایک بوڑھے تھے ایک جوان تھے۔ بوڑھے کا قصہ تو یہ ہوا

کہ وہ رات کو حسب معمول تہجد کے لئے اٹھے اور مٹی کا لوٹہ تیمم یا وضو کے لئے لینا چاہتے ہوں گے بس لوٹے پر دونوں ہاتھ رکھے ہوئے اسی طرح ختم ہو گئے۔ دوسرے صاحب کا یہ قصہ ہوا کہ ان کو بخار میں سرسام ہو گیا تھا کیونکہ جوان آدمی تھے حرارت غالب تھی اور سرسام میں عقل نہیں رہا کرتی مگر ذکر اثر دیکھئے کہ موت کیسی اچھی ہوئی رات کو وہ بھی خود ہی اکیلے ختم ہو گئے کسی کو خبر نہیں ہوئی جب صبح کے قریب ان کو دیکھا گیا تو ہاتھ پر تسبیح لپیٹے ہوئے مراقبہ کی شکل میں گردن جھکائے بیٹھے ہیں لوگ سمجھے کہ زندہ ہیں مگر وہ کہاں تھے، نہ معلوم کب کے ختم ہو چکے تھے تو دیکھئے یہ ثمرہ ہے ذکر کا جو دنیا ہی میں نصیب ہوتا ہے کہ موت کے وقت خدا کا اشتیاق ہو جاتا ہے اس کی یاد کو جی چاہتا ہے آخر وہ کیا چیز تھی جس نے ان کو اخیر وقت میں بھی جس میں انسان بالکل عاجز اور کمزور ہو جاتا ہے تسبیح اٹھانے اور مراقبہ کرنے کی ہمت دیدی اور دوسرے صاحب کو اخیر وقت تک تہجد کا خیال رہا اس کے لئے اپنی ہمت کے موافق کوشش بھی کی اور نماز ہی کے اہتمام میں ختم ہو گئے وہ محض اشتیاق لقاء اللہ کی کیفیت تھی جو اخیر وقت میں ان پر غالب ہو گئی تھی، لیجئے اب تو میں نے بالکل پتہ بتلا دیا اب تو آنکھیں کھولو اور اس حالت کے حاصل کرنے کی کوشش کرو، سچ بات یہ ہے کہ ایسی موت قابل رشک ہے اس پر ہزار زندگی قربان ہے۔ عارف شیرازی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ؎

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدہ عالم دوام ما

(جس شخص کو عشق حقیقی سے روحانی حیات حاصل ہو گئی وہ اگر مر بھی جائے تو واقع میں بوجہ اس کے کہ لذت قرب کامل درجہ کی حاصل ہو جاتی ہے اس لئے اس کو زندہ کہنا چاہیئے۔)

جس کا دل عشق سے زندہ ہو وہ مرا نہیں کرتا جریدہ عالم پر ہمارا دوام لکھا ہوا ہے۔ واقعی بات یہ ہے کہ ان لوگوں کا مرنا صرف ظاہری ہے حقیقت میں ان کو بہت اعلیٰ درجہ کی

حیات نصیب ہوگئی اور اسی حیات کا ایک اثر یہ ہے کہ اہل اللہ کا تذکرہ بعد موت کے بھی باقی رہتا ہے ورنہ ہزاروں مرتے ہیں کوئی چند دن کے بعد نام بھی نہیں لیتا اور یہ حیات برزخیہ اگرچہ ہر شخص کو مرنے کے بعد نصیب ہوتی ہے مگر اہل اللہ کی حیات دوسروں کی حیات سے قوی ہوتی ہے اسی کو فرماتے ہیں "ثبت است بر جریدہ عالم دوام ما" (جریدہ عالم پر ہمارا دوام ثابت ہے) اور اس میں ایک راز ہے اور وہ یہ کہ حق تعالیٰ کی صفات ہمیشہ باقی رہتی ہیں اور یہ حضرات مظہر صفات الٰہی ہیں اس لئے ان کو بھی کسی قدر دوام و بقا سے حصہ ملتا ہے اور حق تعالیٰ کی صفات پر مجھے ایک بات یاد آئی جو بہت ہی کام کی بات ہے۔ ایک علم عظیم ہے جو حق تعالیٰ نے آج عطا فرمایا ہے اس کی قدر وہ جانے جس پر گذرتی ہے۔ مجھ سے اگر پوچھئے تو لاکھوں کی بات ہے وہ یہ کہ بعض سالکوں کو یہ بات پیش آتی ہے کہ ان میں تاثر کم ہوتا ہے نہ خوف نہ غلبہ شوق نہ زیادہ غلبۂ محبت بس ان کی طبیعت خالی خالی معلوم ہوتی ہے اور بعضوں پر احوال ومواجید کا بہت غلبہ ہوتا ہے۔ ذرا ذرا سی بات پر رقت اور خوف طاری ہوجاتا ہے، گریہ غالب ہوجاتا ہے کبھی شوق و محبت میں سکر کی سی کیفیت رہتی ہے تو جن سالکوں پر ان احوال کا غلبہ نہیں ہوتا وہ پریشان رہتے ہیں کہ ہم کو ذکر سے کچھ فائدہ نہیں ہوا لیجئے آج میں اس کی حقیقت بتلاتا ہوں اور وہ علم ایک نیک بی بی کے خط کے آنے سے حاصل ہوا۔

انہوں نے لکھا ہے کہ یہاں موت کثرت سے ہو رہی ہے جس سے یہ تمام آپ کاموں کو طبیعت چاہتی ہیں، مگر مجھے خوف نہیں معلوم ہوتا نہ کچھ رقت طاری ہوتی ہے یہ حالت کیسی ہے۔ ان کو تو میں نے یہی لکھدیا کہ حالات مقصود نہیں ہیں بلکہ اعمال مقصود ہیں اگر اعمال میں کوتاہی نہ ہو تو ان حالات کے ہونے یا نہ ہونے کی کچھ بھی پروا نہ کرنی چاہیئے۔ مگر اس کی حقیقت جو اسی وقت میرے دل پر منکشف ہوئی وہ ان کو نہیں لکھی کیونکہ وہ بات ان کی فہم سے زیادہ تھی۔ اور اس حقیقت کے سمجھنے سے پہلے دو مقدمے سمجھ لیجئے ایک یہ کہ تمام سلوک کا

مقصود حضرت حق میں فنا ہے یعنی اپنی صفات کو صفات حق میں فنا کر دینا اور متخلق باخلاق اللہ ہونا یہ مقصود ہے۔ دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ حضرت حق میں جو صفات ہیں ان سے مراد غایات ہیں مبادی نہیں۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ ہماری صفات کے دو درجے ہیں ایک مبدا ایک منتہا۔ مبدا انفعال ہوتا ہے مثلاً ہمارے اندر رحمت و شفقت کا مادہ ہے تو اس کا ایک مبدا ہے ایک منتہا ہے۔ مبدا یہ کہ کسی کی حالت اور مصیبت کو دیکھ کر دل دکھتا ہے دل پر اثر ہوتا ہے یہ انفعال ہے اور منتہا یہ کہ ہے کہ دل دکھنے کے بعد ہم نے اس شخص کے ساتھ ہمدردی کی اس کی اعانت کی یہ فعل ہے، اور یہی مقصود بھی ہے صفت رحمت سے۔ اسی طرح حیا اور علم و رغبت وغیرہ تو حق تعالیٰ چونکہ انفعال اور تاثر سے پاک ہیں اس لئے ان کو جو رحمٰن الرحیم عفو غفور وغیرہ کہا جاتا ہے تو ان کی صفات میں صرف غایات مراد ہیں مبادی مراد نہیں ایک مقدمہ یہ ہوا۔ اب سمجھئے کہ خوف اور محبت وغیرہ جو صفات ہیں ان کے اندر بھی دو درجے ہیں ایک مبدا منتہا مبدا وہی تاثر اور انفعال ہے کہ خدا کی عظمت وجلال کے خیال سے دل پر اثر ہوا رقت طاری ہوئی اور منتہا یہ ہے کہ خدا تعالےٰ کی نافرمانی سے رک گئے یہ فعل ہے محبت کا مبدا یہ ہے کہ دل میں عشق کی دھن پیدا ہو اور محبوب کے خیال میں محو ہو جائے یہ انفعال ہے اور منتہا یہ ہے کہ محبوب کی رضا جوئی اور خوشنودی کی طلب میں لگ جائے تو جس شخص کے اوپر خوف اور محبت کی کیفیت غالب نہ ہو مگر استقامت حاصل ہو کہ معاصی سے پوری طرح بچنے والا اور طاعات کا بجا لانے والا ہو اس میں صفات کے مبادی نہیں پائے گئے بلکہ صرف غایات پائے گئے تو یہ شخص اصل متخلق باخلاق اللہ ہے اور جس پر ان کیفیات کا غلبہ ہو اس میں اول مبادی پائے گئے پھر غایات پائے گئے تو یہ شخص اس درجہ کا متخلق باخلاق اللہ نہیں ہے۔ اس حقیقت کے انکشاف کے بعد سالکین کو معلوم ہو گیا ہو گا کہ جن احوال و کیفیات کے فقدان سے وہ پریشان ہوتے ہیں ان کا فقدان کوئی نقص نہیں بلکہ کمال یہی ہے کہ بدون غلبہ

احوال کے استقامت حاصل ہو جو کہ مقصود ہے اس لئے اب ان چیزوں کی خواہش اور تمنا میں نہ پڑنا چاہیئے بلکہ جس حال میں محبوب نے رکھا ہے اسی میں خوش رہنا چاہیئے۔ اس میں حق تعالے کی حکمت ہے کہ کسی کو غلبۂ احوال عطا فرمایا اور کسی کو بدون اس کے ہی استقامت عطا فرمادی، کسی پر خوف کا غلبہ ہے وہ رو رہا ہے، کسی پر رجاء کا غلبہ ہے وہ ہنس رہا ہے کسی پر طرب اور شوق کا غلبہ ہے وہ بے چین ہے اور کسی پر کوئی حال غالب نہیں وہ سادگی کے ساتھ اعمال مقصودہ میں لگا ہوا ہے۔ یہ سب خدا ہی کے بنائے ہوئے ہیں ایک کو دوسرے کے حال کی طلب نہ کرنا چاہیئے

بگوش گل چہ سخن گفتہ کہ خندان است

بعندلیب چہ فرمودہ کہ نالان است

(گل سے کیا کہدیا ہے کہ خنداں ہو رہا ہے اور بلبل سے کیا فرمادیا ہے کہ نالاں ہے)

اگر حق تعالے نے صاحبِ اضطراب بنایا ہے تو سکون کے طالب نہ بنو اور صاحبِ سکون بنایا ہے تو اضطراب کے طالب نہ بنو اب جو لوگ کام کرتے ہیں اُن سے پوچھو کہ یہ علم کس قدر عظیم ہے اس سے اُن کی آنکھیں کھل گئی ہوں گی اور پریشانی اور غم کا پہاڑ دل سے ہٹ گیا ہوگا کیونکہ سالکین کو ذرا ذرا سی بات سے رنج و غم ہونے لگتا ہے اگر کچھ بھی شبہ اس کا ہو جائے کہ ان کی محبت میں یا طلب میں کمی ہے تو بس ان پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑتا ہے ؎

بر دل سالک ہزاراں غم بود

گر ز باغِ دل خلالے کم بود

(عارف کے دل پر ہزاروں غم چھا جاتے ہیں اگر اس کے باغ دل سے ایک تنکا بھی کم ہو جاتا ہے)

یہ علوم اور حقائق وہ چیزیں ہیں کہ سالکین ان کے سامنے ہفت اقلیم کی بھی حقیقت نہیں سمجھتے۔ اب میں غور کرتا ہوں اگر میرے پاس ہزار گاؤں ہوتے تب بھی جو مسرت اس وقت مجھ کو اس علم کے حاصل ہونے سے ہوئی

میں سچ کہتا ہوں کہ ہزار گاؤں کی اس کے سامنے کچھ حقیقت نہیں۔ خلاصہ یہ کہ اگر کسی پر خوف و شوق کا غلبہ نہ ہو مگر استقامت اعمال نصیب ہوگئی ہے اس کو بے فکر رہنا چاہیئے مگر سامان کرنے کے بعد کیونکہ اگر اعمال کے اہتمام کا سامان نہ کیا تو پھر استقامت فوت ہو جائے گی۔ مثلاً ایک شخص کی یہ کیفیت ہے کہ اس کی آنکھ تہجد کے وقت بلا ناغہ کھل جاتی ہے اس کے دل میں کیفیت شوقیہ ایسی ہے کہ دقت پر مجبوراً اٹھا کر بٹھا دیتی ہے اور دوسرے شخص پر یہ کیفیت غالب نہیں مگر وہ ہر روز تہجد کا سامان کر کے لیٹتا ہے لوٹا و جا نماز پاس رکھ لیتا ہے، شام کو کھانا بھی کم کھاتا ہے تاکہ اٹھنے میں اعانت ہو، عشا کے بعد فوراً ہی سو بھی رہتا ہے، اذکار ادعیہ پڑھ کر سوتا ہے اگر اس کی نماز تہجد کی کسی دن قضا بھی ہو جائے تو یہ استقامت کے خلاف نہیں اور نہ یہ شخص پہلے شخص سے کچھ ثواب میں کم ہے کیونکہ ہمیشہ بلا ناغہ اٹھنا اس کے اختیار سے نہیں ایک۔ کیفیت شوقیہ اس پر مسلط ہے۔ وہ اٹھا دیتی ہے۔ اور یہ شخص کیفیت سے خالی ہے مگر جتنا سامان کرنا اس کے قبضہ میں تھا وہ سب کر لیتا ہے پھر بھی اگر کسی دن تہجد اس کا ناغہ ہو جاوے تو یہ اس کے اختیار سے باہر ہے امید یہ ہے کہ اس کو اس دن بھی تہجد کا ثواب ملے گا اور کبھی کبھی تہجد کا ناغہ ہو جاتا بشرطیکہ سامان اٹھنے کا ہمیشہ کرتا ہو استقامت کے منافی نہیں بلکہ میں ترقی کر کے کہتا ہوں کہ اگر ایک شخص جاگنے کا سامان کر کے سو جائے یا اس کی فرض نماز بھی قضا ہو جائے تب بھی اس پر ملامت نہیں نہ یہ بات استقامت کے خلاف ہوگی۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کون صاحب استقامت ہوگا لیلۃ التعریس میں خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی فجر کی نماز قضا ہو گئی تھی۔ واقعہ یہ ہوا کہ ایک بار قافلہ رات کو چل رہا تھا اور گرمیوں کے موسم میں اہل عرب اکثر رات کو سفر کرتے ہیں، اخیر شب میں آپ منزل پر پہنچے اور اس وقت تک صبح ہونے میں ذرا دیر تھی۔ آپ نے فرمایا کہ کوئی شخص ایسا ہے جو صبح کی نماز کے لئے ہم کو

جگادے اور ہم سورہیں۔

حضرت بلال رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے وعدہ کیا آپ جاگنے کا پورا سامان کرکے بے فکر سورہے۔ حضرت بلال رضی اللہ تعالےٰ عنہ اپنے کجاوہ سے پشت لگاکر مشرق کی طرف منہ کرکے بیٹھے رہے کہ صبح ہوتے ہی اذان دوں گا کہ حق تعالےٰ نے ان پر بھی نیند غالب کردی وہ بھی بیٹھے بیٹھے ہی سوگئے۔ یہاں تک کہ آفتاب نکل آیا اور کوئی نہ جاگا۔

سب سے پہلے حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی آنکھ کھلی آپؐ نے سب کو جگایا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم کو صبح کی نماز قضا ہونے کا قلق ہوا مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو قلق نہیں ہوا کیونکہ آپ جانتے تھے کہ جتنا کام ہمارے قبضہ کا تھا وہ ہم کرچکے تھے کہ ایک معتبر شخص کو جگانے کے لئے مقرر کردیا اس پر بھی اگر نماز قضا ہوگئی اور اتفاق سے وہ شخص بھی سوگیا تو یہ محض تقدیری امر ہے، اب اس پر قلق کرنا مشیت الٰہی کا مقابلہ کرتا ہے، ہاں اگر طبعی قلق ہے تو مضائقہ نہیں تو حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے ان کی یہ فرماکر تسلّی کی لَا تَفْرِيْطَ فِي النَّوْمِ اِنَّمَا التَّفْرِيْطُ فِي الْيَقْظَةِ کہ نیند میں اگر کچھ کوتاہی ہوجائے وہ کچھ کوتاہی نہیں، کوتاہی وہی ہے جو کہ بیداری میں ہو اور یہ نماز تمہاری بیداری میں قضا نہیں ہوئی سوتے ہوئے بس قضا ہوئی اس پر کوئی ملامت نہیں کیونکہ سونے کی حالت میں انسان بے اختیار ہوجاتا ہے البتہ سونے سے پہلے جاگنے کا سامان اپنی وسعت کے موافق کرنا ضرور تھا سو وہ تم کرچکے تھے سامان کرنے کے بعد بھی جب نماز قضا ہوگئی تو اس پر تسلق کی ضرورت نہیں یہ تقدیری امر تھا۔

شاید کسی کو شبہ ہو کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی نیند تو اونگھ کے مشابہ تھی آپ کو گہری نیند نہ آتی تھی حتیٰ کہ آپ کا وضو بھی سونے سے نہ ٹوٹتا تھا کیونکہ آپ کی آنکھیں سوتی تھیں اور دل جاگتا تھا، تو پھر آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی نماز کیسے قضا ہوگئی۔

جواب یہ ہے کہ ممکن ہے اس روز حق تعالٰے نے قضا نماز کے احکام مشروع فرمانے کے لئے آپؐ کے اوپر کوئی کیفیت استغراقیہ غالب فرمادی ہو کہ مشاہدۂ جمال حق میں وقت کی خبر نہ ہوئی اور آپؐ کی نماز قضا ہو جانے میں بہت سی حکمتیں تھیں۔ ایک تو یہی حکمت ہوئی کہ آپ نے قضا نماز کے احکام مقرر فرمادیے دوسرے بعد والوں کو تسلّی ہوگئی کہ اگر کسی کو اتفاقی طور پر امت میں ایسی صورت پیش آجائے تو وہ غم سے ہلاک نہ ہوجائیں، اس واقعہ سے ان کو تسلّی ہوجاویگی کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی ایسا اتفاق پیش آیا ہے۔

غرض اس طریق میں ناامیدی اور مایوسی کا نام نہیں۔ قدم قدم پر تسلّی موجود ہے۔ اور مولانا تو دل کھول کر فرماتے ہیں ؎

کوئے نومیدی مرو کامیدہاست
سوئے تاریکی مرد خورشیدہاست

(ناامیدی کی راہ نہ جاؤ بہت سی امیدیں ہیں تاریکی کی طرف نہ چلو بہت سے آفتاب ہیں یعنی اللہ تعالٰے سے ناامید مت ہو، بہت سی امیدیں رکھو)

بار جہل کا کچھ علاج نہیں کہ کوئی خواہ مخواہ اس غم میں پڑے کہ ہائے میرے اندر خوف کا غلبہ نہیں، شوق اور اضطراب نہیں۔ بس مقصود یہ ہے کہ اعمال میں مشغول ہونا چاہیئے ان میں کمی نہ کرو پھر اس کی کچھ پرواہ نہیں کہ رونا آتا ہے یا نہیں، خوف کا غلبہ ہے یا نہیں۔ بس کام میں لگو اور زیادہ کاوش مت کرو۔ اب لوگ یہ تو کرتے نہیں فضول کاوشیں کرتے ہیں جن سے کوئی فائدہ نہیں بلکہ اور پریشانی بڑھتی ہے

اب میں اصل اشکال کے جواب کی طرف عود کرتا ہوں۔ اشکال یہ تھا کہ گناہ نہ کرنے والوں کو بھی بلاء اور مصیبت پیش آتی ہے اور آیت مَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ (جو کچھ تم کو مصیبت پہونچتی ہے تمہارے گناہوں سے پہونچتی ہے) سے معلوم ہوتا ہے کہ مصیبت گناہوں سے آتی ہے۔ اس کا ایک جواب تو میرے پہلے بیان سے معلوم ہوچکا کہ گناہ سب کرتے

ہیں جن کو تم بے گناہ سمجھتے ہو ان سے بھی ان کے درجہ کے موافق گناہ ہوتے ہیں۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ جو گناہ بھی نہیں کرتے وہ مداہنت کرتے ہیں کہ دوسروں کو گناہ کرتے دیکھتے ہیں اور ان کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر نہیں کرتے اگر ان سے اور کوئی گناہ نہیں ہوا تو مداہنت بھی ایک گناہ ہے جس میں نیک لوگ اکثر مبتلا ہوجاتے ہیں الا ماشاء اللہ نصیحت اور صاف گوئی کا مادہ آجکل نیک لوگوں میں بھی بہت کم ہوگیا ہے، اور جو ایسے بھی نہ ہوں تو ان کے لئے تیسرا جواب یہ ہے کہ وہ مَا اَصَابَکُمْ مِنْ مُّصِیْبَۃٍ میں داخل ہی نہیں ہیں جس کو آپ مصیبت سمجھتے ہیں، وہ اس کو مصیبت ہی نہیں سمجھتے اس میں ان کو وہ لذت آتی ہے کہ انہی کا دل جانتا ہے بس ان کیلئے صورت مصیبت ہوتی ہے حقیقت مصیبت نہیں ہوتی کیونکہ مصیبت کی حقیقت یہ ہے کہ دل میں الجھن اور پریشانی ہو اور ایسے لوگوں کو تکلیف میں بھی سکون و اطمینان اور روحانی لذت حاصل ہوتی ہے۔ چنانچہ اگر محبوب چٹکی لے تو عاشق کے دل سے پوچھو کہ وہ کیا چاہتا ہے وہ تو اس کی چٹکی کی لذت میں ایسا مست ہوگا کہ یوں چاہے گا یہ بار بار چٹکی لئے جائے تو اہل اللہ کو دیکھ لو کہ ان کو مصائب میں ذرا بھی پریشانی نہیں ہوتی وہ تو زبان حال سے کہتے ہیں۔ ؎

درد از یار ست و درماں نیز ہم
دل فدائے او شد و جاں نیز ہم

(بیماری بھی دوست کی طرف سے اور اس کا علاج بھی اسی کی طرف سے ہے دل و جان میری اس پر فدا ہے)

بس اس آیت کے مخاطب گنہگار لوگ ہیں اور مطلب یہ ہے کہ جہاں مصیبت ہے وہاں گناہوں کی وجہ سے ہے اور جہاں گناہ نہیں وہاں مصیبت بھی نہیں گو ظاہر میں دیکھنے والوں کو مصیبت نظر آوے مگر خود اس شخص کو وہ نعمت اور لذت معلوم ہوگی اس اعتراض کا جواب تو بخوبی ہوگیا اور یہ دوسرا مضمون تھا۔ اب ایک اور اعتراض کا جواب دینا چاہتا ہوں اور وہ تیسرا مضمون ہے اور یہ

اعتراض بظاہر سخت ہے وہ یہ کہ تم دعویٰ کرتے ہو کہ بیماری و مصیبت گناہوں سے آتی ہے۔ اگر یہ بات ہے تو پھر مسلمانوں میں بیماری زیادہ کیوں ہے کیونکہ سنا جاتا ہے کہ اس سال مسلمانوں میں بیماری زیادہ ہے ہندوؤں میں کم ہے۔ ہمیں تو خبر نہیں مگر سُنا ہے ممکن ہے کسی نے شمار کیا ہو کہ مسلمانوں میں زیادہ ہے، اس کا جواب اگرچہ یہ بھی ہوسکتا تھا کہ ثبوت بیان کرو اور جس نے شمار کیا ہو اس سے پوچھو کہ کیا تو نے تمام شہروں میں جا کر شمار کیا ہے کہ مسلمان اس بیماری میں زیادہ مرے ہیں مگر ہم ایسا جواب دیتے ہیں جس کے لئے شمار کی ہم کو ضرورت ہی نہیں ہے مگر جواب سے پہلے میں یہ ضرور کہوں گا کہ جو لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں ان کو خدا کے معاملات کی تو کیا خبر ہوگی معلوم ہوتا ہے کہ ان کو اپنے معاملات کی بھی خبر نہیں۔ کیا آپ نہیں دیکھتے کہ ایک شخص تو وکیل ہے اگر وہ کچہری میں پیشاب کردے تو سخت معتوب ہوگا کچھ بعید نہیں کہ وکالت سے معزول کردیا جائے اور ایک عامی شخص ہے وہ اگر پیشاب کردے تو بہت سے بہت حاکم دو روپیہ جرمانہ کردے گا مگر وکیل کی برابر معتوب نہ ہوگا آخر کیا وجہ ہے کہ ایک ہی فعل وکیل نے بھی کیا اور اجنبی شخص نے بھی کیا مگر وکیل پر اس درجہ عتاب اور اجنبی پر اس کا آدھا بھی نہیں، فرق یہ ہے کہ وہ حاکم کا مقرب اور خاص تھا یہ حرکت اس کی شان سے بہت نازیبا تھی وہ حاکم کے مزاج سے اور قوانین سے بخوبی واقف تھا اور دوسرا ایک اجنبی، بے خبر اور بے ادب تھا وہ تو رات دن میں اس قسم کی بدتہذیبی دن میں بیسیوں دفعہ کرتا ہے اور اس پر اتنا عتاب نہیں ہوتا تو اس سے اگر کوئی یہ سمجھنے لگے کہ وکیل بہت بڑا مجرم ہے اور دیہاتی مجرم نہیں تو یہ سراسر حماقت ہے۔ مجرم تو وہ دیہاتی وکیل سے بہت زیادہ ہے کیونکہ اس کمبخت کو حاکم کی عظمت و وقعت کا حال کچھ معلوم نہیں یہی اس کی بڑی خطا ہے اور اس معرفت و تعظیم کے وصف میں وکیل اس سے افضل ہے مگر خصوصیت کی وجہ سے اس پر عتاب زیادہ ہوا اسی طرح یہاں سمجھئے کہ اگر بیماری اور مصیبت مسلمانوں میں زیادہ بھی ہو تو اس سے یہ لازم نہیں آسکتا کہ مسلمان ان سے زیادہ گنہگار ہیں ہرگز نہیں کفار کا سب سے بڑا جرم ایک یہی ہے کہ ان کو حق تعالیٰ کی عظمت کی خبر نہیں مگر بیماری اور

مصیبت مسلمانوں پر اس لئے زیادہ آئی کہ یہ خدا کے خاص بندے ہیں پھر خاص ہو کر اگر کوئی کام خلاف مرضی کریں گے تو ان پر عتاب زیادہ ہوگا لیکن مسلمانوں کی اس خصوصیت سے یہ شبہ نہ کیا جائے کہ ان کو یا ان کے بزرگوں کو خدائی کارخانہ میں بھی کچھ تصرف کرنے کا حق ہوگا جیسا کہ دنیاوی حکام کے خاص دوستوں کو ان کے مزاج میں دخل ہوا کرتا ہے کہ وہ حاکم سے بعض دفعہ کہہ سن کر جو چاہے کرا لیتے ہیں۔ سو بات یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی محبت اور عنایت سب اختیار سے ہے اضطرار سے نہیں ہے اس لئے ان پر کسی کی خصوصیت اور تقرب کا اثر نہیں ہو سکتا کہ وہ جو چاہیں تصرف کرالیں اور دنیوی حکام کو بعض دفعہ اپنے مخصوصین سے اضطراری تعلق ہوجاتا ہے۔ اس لئے وہ مزاج میں دخیل ہوجاتے ہیں پس یہاں سے ان لوگوں کی غلطی ظاہر ہوگئی جو بعض بزرگوں کو یوں سمجھتے ہیں کہ وہ حق تعالیٰ سے کہہ کر جو چاہے کرا لیتے ہیں اور معاذ اللہ اولاد یا رزق وغیرہ ان کے اختیار میں ہے یہ بالکل غلط ہے خدا پر کسی کو کچھ اختیار نہیں یہ بھی حق تعالیٰ کی عنایت ہے کہ وہ کسی کو اپنا مقرب بنالیں۔ ورنہ اس پر بھی کسی کا کچھ زور نہیں۔

انبیاء سے زیادہ کون مقبول و مقرب ہوگا حق تعالیٰ نے بعض دفعہ ان کی بھی دعا قبول نہیں فرمائی۔ ایک جواب اس کا اور بھی ہے کہ کفار کے لئے بہت سخت مصیبت تجویز کی گئی ہے مگر ان کو مہلت دیدی گئی ہے یہاں ان کو راحت و آرام میں چھوڑ دیا گیا ہے تاکہ اچھی طرح پیٹ بھر کے نافرمانی اور گناہ کرلیں پھر اکٹھی سزا ہوگی مگر مسلمانوں کو مہلت نہ دینا اور کفار کو مہلت دیدینا بھی اس کی دلیل نہیں کفار مسلمانوں سے اچھے ہیں دیکھئے ایک بچے سے استاد کو محبت ہوتی ہے اس کی ذرا ذرا سی بات پر تنبیہ اور روک ٹوک کرتا رہتا ہے اور جس سے محبت نہیں ہوتی اس کی ہر بات پر روک ٹوک نہیں کرتا غصہ آتا ہے مگر خاموش رہتا ہے کہ کسی دن اکٹھی خبر لے لوں گا۔ اب اگر یہ بے وقوف یوں سمجھے کہ میاں جی فلاں کو تو روز دھمکاتے رہتے ہیں اور میں اتنی خطائیں کرتا ہوں مجھے کچھ نہیں کہتے تو مجھ سے ان کو زیادہ محبت ہے یہ اس کی حماقت ہے کیونکہ جب یہ اس سے زیادہ جرم

کرنا ہے تو زیادہ محبوب کیسے ہو سکتا ہے یقیناً اسے کچھ نہ کہنا اس کی دلیل سمجھی جائے گی کہ اس سے میاں جی کو محبت نہیں اس لئے ہر بات پر روک ٹوک نہیں کرتے تاکہ عین وقت پر اس کے جرائم زیادہ ثابت ہوں اور اس کی پوری خبر لیں۔

حدیث میں آیا ہے کہ مسلمان کی ایسی مثال ہے جیسے گیہوں وغیرہ کا درخت کہ وہ اول اول کمزور ہوتا ہے پھر بڑھتا ہے تو باریک تنہ پر کھڑا ہو جاتا ہے ہواؤں کے جھونکے سے کبھی گر بھی جاتا ہے پھر سیدھا ہو جاتا ہے اسی طرح مسلمان پر طرح طرح کے مصائب آتے رہتے ہیں جن سے اس کو تنبیہ ہوتی رہتی ہے تاکہ وہ توبہ و استغفار کر کے پھر سیدھا ہو جائے اور کافر کی مثال درخت صنوبر جیسی ہے کہ وہ جب سے پیدا ہوتا ہے مضبوطی کے ساتھ سیدھا رہتا ہے یہاں تک کہ لمبا ہو جاتا ہے مگر جب کبھی گرتا ہے تو جڑ تک اکھڑ جاتی ہے پھر نہیں اٹھ سکتا اسی طرح کافر کو دنیا میں مصائب کم پیش آتے ہیں اس لئے اس کو توبہ و استغفار کی نوبت نہیں آتی پھر جب آتی ہے تو ایسی آتی ہے کہ اٹھنا نصیب نہیں ہوتا اوندھے منہ جہنم میں پہونچتا ہے۔

اہل سیر نے لکھا ہے کہ فرعون کو چار سو برس کی عمر میں ایک دن درد سر بھی نہیں ہوا ہمیشہ راحت و آرام میں رہا کمبخت کو خدا کی یاد کا ایک دن بھی خیال نہ آیا کیونکہ اکثر خدا کو مصیبت ہی میں یاد کیا جاتا ہے۔ پھر حق تعالےٰ نے اس کو ایک دم سے پکڑا اور تمام قوم کو مع فرعون کے دریا برد کر دیا۔ اس کو فرماتے ہیں :-

وَكَذٰلِكَ اَخْذُ رَبِّكَ اِذَآ اَخَذَ الْقُرٰى وَهِىَ ظَالِمَةٌ ۚ اِنَّ اَخْذَهٗٓ اَلِيْمٌ شَدِيْدٌ ۔ تمہارے پروردگار کی پکڑ جب کہ وہ کافر بستیوں کو پکڑتا ہے ایسے ہی دفعۃً ہوتی ہے بیشک خدا کی پکڑ بہت دردناک اور سخت ہوتی ہے۔

دوسری جگہ فرماتے ہیں اِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيْدٌ ۔ تیرے رب کی پکڑ سخت ہے تو مسلمانوں کے اوپر جو زیادہ مصیبتیں آتی ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ حق تعالےٰ ان کو دفعۃً پکڑنا نہیں چاہتے، بلکہ منظور یہ ہے کہ وہ اپنی غلطیوں پر باربار متنبہ ہو کر اپنی اصلاح پوری کر لیں اور کافروں کو ایک دم سے پکڑنا منظور ہے اس لئے ان پر مصائب

کم آتے ہیں ایک راز کفار پر کم مصیبتیں آنے کا یہ بھی ہے کہ ان کے لئے آخرت میں کفر کی وجہ سے دائمی عذاب جہنم کا تیار ہے تو ان کے واسطے کفر ہی کی سزا اتنی سخت ہے کہ اب ان کی دوسری خطاؤں پر سزا دینے کی ضرورت نہیں۔ دیکھئے ایک شخص سرکاری باغی ہو جس کے لئے پھانسی کا حکم تجویز ہو گیا ہو اور کسی مصلحت سے چند روز کے لئے اس کو قید خانہ میں بھیج دیا جائے اور وہاں جاکر وہ قیدیوں سے لڑے کسی کو گالی دے کسی کو مارے پیٹے تو اس کو جس وقت پھانسی دی جائے گی اسی وقت قیدیوں سے لڑنے کی الگ سزا نہ دی جائے گی اور نہ جرم اس پر قائم کیا جائے گا کیونکہ اس کے اوپر بغاوت ہی کا جرم اتنا سنگین ہے کہ اس کی سزا میں جان لی جاوے گی تو اس کے ان چھوٹے چھوٹے جرائم پر نظر نہیں کی جاتی اسی لئے اکثر باغی لوگ قید خانہ میں جاکر بڑے فرعون بے سامان ہو جاتے ہیں اور یہی راز ہے علماء حنفیہ کے اس قول کا کہ کفار مخاطب بالفروع نہیں یعنی کفار کو آخرت میں نماز نہ پڑھنے اور زکوٰۃ نہ دینے اور زنا وغیرہ کرنے کے سبب سے مستقل عذاب نہ ہوگا اس کا یہ مطلب نہیں کہ خدا ان کے زنا وغیرہ سے راضی ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ ان کی ساری خطائیں کفر کے اندر داخل ہیں۔ ایک کفر ہی کا عذاب اتنا سخت ہے کہ اسی میں سب خطاؤں کی سزا ہو جائے گی ان کے عوض میں جداگانہ سزا نہ ہوگی۔

اور مسلمانوں کے لئے چونکہ ایمان کی وجہ سے آخرت میں ہمیشہ کے لئے جنت اور راحت لکھی ہوئی ہے اس لئے دوسرے احکام میں کوتاہی کرنے کی وجہ سے ان کو دنیا ہی میں سزا دیدی جاتی ہے تاکہ ان سے توبہ کرکے پاک صاف ہو کر جنت میں چلا جاوے اور اگر کسی مسلمان کو باوجود گناہوں کے دنیا میں مصیبت پیش نہ آئے تو یہ حالت اندیشہ ناک ہے اس کے واسطے خوف ہے کہ کچھ عذاب جہنم کا بھی ہو لیجئے اب تو آپ تمنا کرتے ہوں گے کہ جو کچھ سزا ہونی ہو دنیا ہی میں مصیبتیں آجادیں آخرت میں جہنم کا عذاب نہ ہو۔

حدیث میں ہے کہ آخرت میں جب مصیبت والوں کو بڑے بڑے درجے ملیں گے تو اس وقت راحت و آرام والے تمنا کریں گے کاش دنیا میں ہماری کھال قینچیوں سے کاٹی جاتی تاکہ آج ہم کو بھی یہ درجے ملتے۔ الحمدللہ کہ سب اشکالات کا جواب کافی طور پر ہوگیا اب میں بیان ختم کرنے والا ہوں اور چند باتیں خلاصے کے طور پر بیان کرتا ہوں سارے بیان کا خلاصہ یہ باتیں ہیں۔

نمبر۱ گناہوں کی وجہ سے مصائب آتے ہیں جس کا بیان اس آیت میں کیا گیا ہے مَآ اَصَابَکُمْ مِنْ مُّصِیْبَۃٍ فَبِمَا کَسَبَتْ اَیْدِیْکُمْ (جو مصیبت تم کو پہنچتی ہے تمہارے گناہوں سے آتی ہے) جس سے میں نے بیان شروع کیا تھا۔ نمبر۲ گناہوں کا علاج توبہ و استغفار ہے مگر ہر گناہ کا طریقہ استغفار جدا ہے جو خوف شدہ طاعات ہیں ان کی قضا کریں جیسے کسی کے ذمہ قضا نماز یا قضا روزے ہوں یا پچھلے سالوں کی زکوٰۃ ذمہ ہو ان کو ادا کریں اور جو ذنوب ہیں ان سے خالص توبہ کریں اور آئندہ کے لئے چھوڑ دینے کا پختہ ارادہ کریں اور حقوق العباد اگر ضائع ہوئے ہوں تو ان کو ادا کریں یا اہل حق سے معافی چاہیں اور خدا سے بھی ان کے بارے ۔ سچی توبہ کریں اور یہ پہلا مضمون تھا۔ نمبر۳ گناہوں سے مصیبت آنے پر دو شبہات تھے ان کے جواب دیئے گئے تھے۔ ایک شبہ یہ تھا کہ نیک لوگوں پر کیوں مصائب آتے ہیں اس کے چند جواب دیئے گئے۔ ایک یہ کہ گناہ ان سے بھی ہوتے ہیں۔ دوسرے اگر گناہ بھی نہ ہوں تو ان سے مداہنت ہو جاتی ہے۔ تیسرے اگر یہ بھی نہ ہو تو پھر وہ مصیبت ان کے حق میں صورۃً مصیبت ہوتی ہے حقیقت میں مصیبت نہیں ہوتی کیونکہ اس سے ان کو پریشانی لاحق نہیں ہوتی جسم کو گو تکلیف محسوس ہو مگر روح کو لذت اور دل کو سکون ہوتا ہے اور یہ دوسرا مضمون تھا۔ نمبر۴۔ ایک شبہ یہ تھا کہ کفار کو مصیبت کیوں نہیں آتی یا کم کیوں آتی ہے۔ اس کا جواب یہ دیا گیا کہ ان کے لئے ایک سخت مصیبت تیار ہے مگر سردار ان کو مہلت دی گئی ہے اور یہ تیسرا مضمون تھا۔ اب حق تعالےٰ سے دعا کیجئے کہ مسلمانوں کے اوپر سے سب بلاؤں اور مصیبتوں کو دفع فرمائیں اور ہم کو پچھلے گناہوں سے توبہ و استغفار کی توفیق عطا ہو اور آئندہ کے لئے اتباع احکام اور ترک معاصی کی ہمت نصیب ہو آمین ثم آمین

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰی سَیِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ صَلٰوۃً تُنْجِیْنَا بِهَا مِنْ جَمِیْعِ الْاَهْوَالِ وَالْاٰفَاتِ وَتَقْضِیْ لَنَا بِهَا جَمِیْعَ الْحَاجَاتِ وَتُطَهِّرُنَا بِهَا مِنْ جَمِیْعِ السَّیِّاٰتِ وَتَرْفَعُنَا بِهَا عِنْدَکَ اَعْلَی الدَّرَجَاتِ وَتُبَلِّغُنَا بِهَا اَقْصَی الْغَایَاتِ مِنْ جَمِیْعِ الْخَیْرَاتِ فِی الْحَیٰوۃِ وَبَعْدَ الْمَمَاتِ اِنَّکَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ۔ وَعَلٰی اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ کَمَا یُحِبُّ وَیَرْضٰی رَبُّنَا اٰمین۔

جامع وعظ ہذا احقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ عرض کرتا ہے کہ یہ وعظ جن ایام میں بیان ہوا تھا اس وقت موسمی بخار بلائے عام کی طرح تمام ہندوستان میں پھیلا ہوا تھا اور جس ہفتہ میں یہ بیان ہوا اسی ہفتہ میں حضرت حکیم الامۃ دامت برکاتہم کی بھتیجی محترمہ زبیدہ خاتون مرحومہ کا انتقال ہوگیا تھا اس وقت حضرت کے دل پر بھی ایک خاص صدمہ تھا اس لئے سامعین پر بھی اس بیان کا بہت گہرا اور اچھا اثر ہوا گویا موت کا سب کو اشتیاق معلوم ہوتا تھا بعض احباب نے اسی وقت تقاضا کیا تھا کہ یہ وعظ جلد صاف ہو جائے تو اس مصیبت عام میں مسلمانوں کے لئے باعث سکون ہو چنانچہ میں نے اسی وقت اس کو صاف کرنا شروع کردیا تھا اور قریب نصف کے صاف بھی کرلیا تھا مگر بعض عوارض کی وجہ سے پورا نہ ہوسکا۔ پھر میں ہمشیرہ مرحومہ مذکورۃ الصدر کا حج بدل کرنے چلا گیا خدا اس کو ان کے لئے قبول فرمائے۔ اس لئے زیادہ تاخیر ہوگئی۔ چنانچہ اب ذالحجہ ۱۳۳۸ھ میں اس کو پورا کیا اور اتفاق بات کہ اس وقت بھی مسلمانوں کو عام مصائب کا سامنا ہو رہا ہے اس لئے امید ہے کہ موجودہ مصائب میں بھی ان شاء اللہ یہ وعظ مسلمانوں کے لئے بہت کچھ سکون و اطمینان کا باعث ہوگا اور جو طریقہ مصائب کے دفع ہونے اور بلیات سے بچنے کا اس میں بتایا گیا ہے امید ہے کہ سب مسلمان اس کو اپنا نصب العین بنائیں گے اور اس پر کاربند ہوں گے کیونکہ جو تدبیر اس میں بتلائی گئی ہے وہ ہمارے اختیار میں ہے اور دوسری جن تدابیر میں مسلمان اس وقت مشغول ہو رہے ہیں وہ ان کے اختیار سے باہر ہیں۔ اور حدیث میں آیا ہے۔ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ۔ لَا یَنْبَغِیْ لِلْمُؤْمِنِ اَنْ یُّذِلَّ نَفْسَهٗ قَالُوْا یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَکَیْفَ یُذِلُّ نَفْسَهٗ قَالَ تَحَمُّلُ مِنَ الْبَلَاءِ مَا لَا یُطِیْقُهٗ فَیُذِلُّ نَفْسَهٗ حضور

صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مسلمان کو یہ نہ چاہیئے کہ اپنے آپ کو (خوامخواہ) ذلیل کرے صحابہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم آدمی اپنے آپ کو (خود) کیونکر ذلیل کیا کرے ہے۔ آپ نے فرمایا کہ وہ (بعض دفعہ) ایسی بڑی بلا اپنے اوپر لادلیتا ہے جس کی برداشت کی اس میں طاقت نہیں ہوتی تو (خوامخواہ) اپنے آپ کو ذلیل کر دیتا ہے پس جو تدابیر آجکل عام مسلمان مسائب کے دفع کرنے کے لئے کر رہے ہیں ذرا غور کر لیا کریں کہ یہ باتیں ان کے اختیار میں بھی ہیں جو وہ تجویز کر رہے ہیں اور جن بلاؤں کو اپنے اوپر لادرہے ہیں ذرا سوچ لیں کہ ان کے تحمل کی بھی طاقت ہے یا نہیں اگر تحمل کی طاقت نہ ہو تو خوامخواہ اپنے آپ کو ذلت میں نہ ڈالیں اور اس وعظ کی تدابیر کو جو کہ اختیاری ہیں حرز جان بنائیں اخیر میں یہ درخواست ہے کہ حضرت حکیم الامۃ کی بھتیجی مرحومہ کے لئے سب ناظرین دعا فرمائیں کہ حق تعالیٰ انکی مغفرت کاملہ فرمائیں اور لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائیں۔

مغفرت ہو اور حسنا طر خواہ ہو — قرب ازواج رسول اللہ ہو

وہ ہوں اور نعمائے جنت بالدوام — وہ ہوں اور آغوش رحمت والسلام

اور اس احقر کے لئے بھی دعا حسن خاتمہ و تاحیات توفیق مرضیات و استقامت علے الطاعات واجتناب معاصی کی دعا فرمائیں اور نیز یہ کہ حق تعالےٰ ہم سب کو اپنی کامل محبت اور کامل اتباع شریعت اور شرور و فتن سے حفاظت دنیا میں اور سیدنا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی معیت آخرت میں اور حضرت حکیم الامۃ مولانا اشرف علی اور تمام مشائخ کرام کا سایہ عاطفت ہمارے سروں پر ہمیشہ رہے۔ آمین

والحمد للہ رب العالمین والسلام علے المرسلین

قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ اٰیَۃً
(رواہ البخاری)

وعظ مسمّٰی بہ

مراقبۃ الارض

حکیم الامّۃ مجدد الملّۃ حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب
تھانوی رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ

محمد عبد المنّان غفرلہٗ

مکتبہ تھانوی ——— دفتر الابقاء
مسافرخانہ بندر روڈ / ایم۔ اے جناح روڈ کراچی ۱

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الوعظ الملقب بہ

مراقبة الارض

این	متی	کم	کیف	لم	ما	من المخاطب	من ضبط	من السامعین	الاشتات
کہاں ہوا	کب ہوا	کتنا ہوا	کس طرح ہوا	کیوں ہوا	کیا مضمون تھا	کن لوگوں سے خطاب تھا	کس نے لکھا	سامعین کی تعداد تقریباً	متفرقات
تھانہ بھون در مکان حاجی محمد یوسف نجار	۲ جمادی الاول ۱۳۳۲ھ	دو گھنٹے	تخت پر بیٹھ کر	صاحب خانہ کے بیان پر ایک عزیز کا انتقال ہوا تھا ان کی درخواست پر ہوا	انسان کی غفلت کا سبب اس کا معاد سے بے خبری ہے اس کا علاج کرنا چاہیئے جس کی صورت یہ ہے کہ زمین پر چلتے پھرتے یہ سوچے کہ ایک دن اس کے اندر رکھا جاؤں گا۔	سب مسلمان مرد عورت	احقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ وعن والدیہ	تقریباً ۶۰ مرد اور کچھ مستورات پردہ میں اس کے علاوہ تھا	اس وعظ کی تصحیح ۱۰ رجب ۱۳۳۲ھ کو شروع ہو کر ۲۰ رجب ۱۳۳۲ھ کو ختم ہوئی۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ ونشھد ان سیدنا ومولانا محمداً عبدہ ورسولہ صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ واصحابہ وبارک وسلم۔ اما بعد فاعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم۔ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔ مِنْهَا خَلَقْنَاكُمْ وَفِيهَا نُعِيدُكُمْ وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً أُخْرَىٰ۔ یہ ایک آیت ہے سورہ طٰہٰ کی۔ اس میں

حق تعالےٰ نے مخاطبین کی بعض حالتیں یاد دلا کر ان کو متنبہ فرمایا ہے اور وہ تین حالتیں ہیں جو اس آیت میں یاد دلائی گئی ہیں۔

(۱) مبدأ کی حالت ہے۔ (۲) معاد کی حالت ہے (یعنی معاد اول کی جس کو موت کہتے ہیں۔ (۳) ایک حالت معاد اول کے بعد اور ہونے والی ہے جو معاد حقیقی ہے۔ چنانچہ ترجمہ سے یہ بات معلوم ہوجائے گی۔ فرماتے ہیں کہ ہم نے تم کو اس زمین سے نکالا ہے اور اسی زمین میں تم کو لوٹا دیں گے۔ اور اسی زمین سے دوبارہ تم کو نکالیں گے۔ پس مِنْهَا خَلَقْنَاكُمْ میں تو مبدأ کو یاد دلایا ہے۔ کہ تم کو اسی زمین کی اجزاء خاک وغیرہ سے پیدا کیا گیا ہے **اور** فِيهَا نُعِيدُكُمْ میں معاد اول کو یاد دلایا ہے کہ ایک وقت میں تم کو پھر اسی زمین کا پیوند کر دیا جائے گا۔ ظاہر ہے کہ انسان مرنے کے بعد زمین میں ہی مل جاتا ہے (خواہ دفن کیا جائے یا جلا یا جائے دونوں صورتوں میں خاک ہو کر یا راکھ ہو کر زمین ہی کا پیوند ہو جاتا ہے ۱۲) اور مِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً أُخْرَىٰ میں معاد حقیقی کو یاد دلایا گیا ہے کہ جس طرح پہلے زمین سے تمہارا مادہ نکالا تھا۔ اسی طرح دوبارہ نکلے گا۔ گو دونوں کی کیفیت میں فرق ہے (کہ پہلی مرتبہ عناصر اربعہ سے بواسطہ غذا اور ہضم کے مادہ منویہ کو اول نکالا گیا پھر اس کو رحم میں پرورش کر کے تدریجاً بڑھایا گیا حتیٰ کہ ایک دن جیتا جاگتا انسان ہو گیا۔ اور دوسری دفعہ یہ تدریجی کیفیت نہ ہو گی بلکہ دفعۃً سب اجزاء سمٹ کر جمع ہو جائیں گے اور پورا انسان بنکر کھڑا ہو جائے گا۔ اس وقت یہ نہ ہوگا کہ پہلے نطفہ ہو پھر رحم میں پرورش ہو پھر ماں کے پیٹ سے پیدا ہو بلکہ حکم ہوتے ہی دفعۃً کامل انسان بن جائیگا ۱۲) اس کے بعد پھر دوام و بقا ہے اس کے بعد پھر کوئی اور حالت نہ ہو گی بلکہ یہی وجود ہمیشہ کے لئے باقی رہے گا اسی لئے یہاں کوئی اور حالت ذکر نہیں کی گئی اگر اس کے بعد بھی کچھ تغیر حال ہوتا تو اس کو بھی بیان کیا جاتا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بس معاد حقیقی کے بعد پھر تغیر نہ ہوگا اور میں اسی اشارہ پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ دوسری نصوص اور

الحمدللہ۔ اللہ تعالیٰ نے ملفوظات کمالات اشرفیہ تیار کرا دی
عام قیمت -/48 رعایتی -/35 روپے رجسٹری خرچہ ڈاک چھ روپے۔

بھی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ معاد ثانی کے بعد پھر دوام و بقا ہی ہے چنانچہ اہل جنت کے متعلق ارشاد ہے وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ اور کفار کے بارہ میں ہے وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ غرض دونوں کے لئے خلود ہے یعنی فنا نہیں بلکہ بقا ہے اور بعض آیات میں دونوں فریق کے متعلق خالدین کے ساتھ ابدا بھی مذکور ہے جس میں دوام کی زیادہ تصریح ہوگئی۔ بہرحال یہ تین حالتیں ہیں جو اس جگہ ہم کو یاد دلائی گئی ہیں۔ اس مضمون کے اختیار کرنے کی یہ وجہ ہے کہ انسان جو بعض دفعہ خدا کی نافرمانی کرنے لگتا ہے تو اس کا زیادہ سبب یہی ہے کہ وہ اپنی اصلی حالت سے اور اس حالت سے جو اس کو آئندہ پیش آنے والی ہے غافل ہے۔ غفلت ہی تمام نافرمانیوں کی جڑ ہے اور غفلت اس لئے ہے کہ وہ ان حالات سے یا تو ناواقف ہے اور یا اس کا استحضار نہیں کہ میں پہلے کیا تھا اور ایک دن کیا سے کیا ہو جاؤں گا۔ خیر مستقبل کا استحضار نہ ہونا تو چنداں عجیب نہیں کیونکہ اس کو ابھی دیکھا ہی نہیں چکھا ہی نہیں گو دوسرں کا انجام تو روزانہ نہیں تو مہینہ میں یا سال بھر میں آنکھ کے سامنے سے ضرور گذر جاتا ہے اور اس کا سب کو یقین ہے کہ ایک دن ہمارا بھی یہی انجام ہوتا ہے مگر خیر پھر بھی یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ تو دوسروں کا انجام دیکھا تھا ہم پر تو ابھی نہیں گذرا اس لئے اس سے غفلت ہو جاتی ہے مگر میں اس سے بڑھ کر ایک اور بات کہتا ہوں وہ یہ کہ انسان کی عادت ہے کہ وہ ماضی کو بھی بھول جاتا ہے یعنی جو حالت اس پر گذر چکی ہے اس کو بھی یاد نہیں رکھتا بتلایئے یہاں کیا عذر ہے۔ صاحبو! ماضی کو تو ہر شخص دیکھ چکا ہے اور چکھ چکا کیا آپ جیسے اس وقت بیٹھے ہیں ہمیشہ سے ایسے ہی تھے ہرگز نہیں بلکہ ایک وقت وہ بھی تھا کہ آپ میں چلنے پھرنے کی بھی طاقت نہ تھی۔ بستر ہی پر ہگتے موتتے تھے کسی نے اٹھا دیا تو اٹھ گئے بٹھا دیا تو بیٹھ گئے کہیں رال بہہ رہی تھی کبھی سنک چاٹ رہے تھے خیر اس کو بھی جانے دیجئے کیونکہ آپ کہیں گے اس وقت ہم کو ہوش ہی نہ تھا اس لئے یہ باتیں کس کو یاد ہیں۔ گو یہ عذر اس لئے قابل قبول نہیں کہ دوسرے خبر دینے والے بکثرت موجود ہیں جو آپ کے سارے اترے پترے کھول سکتے ہیں۔ علاوہ ازیں بچوں کی حالت کا روزانہ آپ خود مشاہدہ کرتے ہیں کہ وہ کیونکر پیدا ہوتے اور کس طرح

بڑھتے ہیں اور ابتداء میں ان کی کیسی قابلِ رحم حالت ہوتی ہے اور یہ بات یقینی ہے کہ آپ بھی ماں کے پیٹ سے اسی طرح پیدا ہوئے تھے اور یوں ہی گودوں میں پالے گئے تھے پھر اس کا استحضار دشوار کیوں ہے مگر میں کہتا ہوں کہ اچھا سات آٹھ برس کی عمر کے واقعات تو اکثر لوگوں کو یاد ہوتے ہیں اور اس دس گیارہ سال کے حالات تو ضروری یاد ہوتے ہیں۔ اور ان ہی کو یاد کر لیجئے کہ اس وقت آپ کی حالت تھی اور اب کیا حالت ہے اس وقت کھانے پگنے کے سوا کسی بات کی بھی حس نہ تھی۔ لڑکوں میں واہی تباہی پھرا کرتے تھے کہیں اینٹوں کا گھر بناتے تھے کبھی گلی ڈنڈے سے کھیلتے تھے۔ نہ سر کی خبر تھی نہ پیر کی۔ جانوروں کی طرح پھرتے تھے بھلا آج ہر شخص کی جو حالت ہے کہ کوئی ڈپٹی ہے کوئی تحصیلدار ہے کوئی رئیس ہے کوئی زمیندار ہے کوئی شیخ ہے کوئی مدرس کوئی واعظ ہے کوئی مفتی کوئی کاریگر ہے کوئی انجینیر کوئی فلسفی ہے کوئی معقولی کیا اس وقت کسی کو یا خود اس کو یہ گمان وخیال ہوسکتا تھا کہ میری ایک دن یہ حالت ہو جائے گی۔ ہرگز نہیں حضرت اس حالت میں اور اس حالت میں زمین و آسمان کا فرق نظر آئے گا مگر انسان کی حالت یہ ہے کہ وہ مستقبل سے تو غافل ہے ہی زمانہ ماضی کو بھی بھول جاتا ہے اگر یہ ماضی کو بھی یاد رکھتا تو اس کی اصلاح کے لئے یہ بھی کافی تھا مگر یہ تو ابن الحال ہے۔ صرف حال ہی کو یاد رکھتا ہے اور اسی میں مست ہو جاتا ہے شاید آپ کہیں کہ یہ تو اچھی حالت ہے کہ ماضی ومستقبل دونوں کو الگ کر کے ابن الحال ہو گیا اور ابن الحال تو صوفی کو کہتے ہیں۔ صاحب میں نے یہاں ابن الحال لغت کے اعتبار سے کہا ہے اصطلاحی معنی کے اعتبار سے نہیں کہا جو صوفیہ کی عبارت میں مستعمل ہے اگر ہم ویسے ابن الحال ہوتے تو قسمت ہی اچھی ہو جاتی صوفیہ تو ابن الحال اسے کہتے ہیں حقوق وقت کو ادا کرتا ہو اور ہم ابن الحال ایسے ہیں جو وقت کو ضائع کرتے ہیں۔ گویا ابن تو ہیں مگر عاق ونافرمان مگر میں اس ایہام ہی کو قطع کئے دیتا ہوں اور ابن الحال کے بجائے عبد الحال کہتا ہوں کہ انسان ماضی ومستقبل سب کو بھلا کر بندۂ حال ہو گیا ہے۔ اس کی حالت یہ ہے کہ اس وقت اگر راحت ہے تو اسی میں مست ہے اور اگر کلفت ہے تو خدا سے شکایت ہے ذرا سی بات میں وہ ان تمام انعامات کو بھول جاتا ہے جو زمانہ ماضی سے اب تک ان پر ہو چکے ہیں بھی

نہیں دیکھتا کہ پہلے میں کیا تھا اور اب کیا ہو گیا ہوں۔ خدا کا کتنا بڑا انعام ہے کہ اس نے مجھے جانور سے آدمی کیا اور آدمی بھی عاقل سمجھدار ہوشیار اور اس نے مجھے اب تک کیسی راحت سے رکھا ایک دن اگر کلفت بھی ہو گئی تو کیا ہوا ساری عمر تو آرام سے گذاری ہے مگر تو بران گذشتہ واقعات کا تو خطرہ بھی نہیں آتا اس کی نظر تو صرف حال پر ہوتی ہے۔ اگر کھانے کو مل گیا تو خوش ہے مست رہے ورنہ گویا ان تلوں تیل ہی نہ تھا بس یہ شان ہے۔ ؎

چوں گرسنہ میشوی سگ میشوی چونکہ خوردی تند و بدرگ می شوی

(جب بھوکا ہوتا ہے تو کتا ہو جاتا ہے اور جب پیٹ بھرا ہوتا ہے بدخو اور ظالم ہو جاتا ہے)

بھوک میں کتے کی طرح بھونکتا ہے اور پیٹ بھر کے کتے کی طرح غراتا ہے کسی حال میں راہ پر نہیں آتا اسی کو حق تعالےٰ فرماتے ہیں اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوْعًا وَّاِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوْعًا۔ انسان بڑا ہی کم ہمت ہے اگر اس کو کلفت پہونچے تو ہائے واویلا مچا دے اور مال مل جائے راحت نصیب ہو جائے تو بخل کرنے لگے اس وقت بھی چین نہیں اب یہ سمجھتا ہے کہ نہ معلوم پھر بھی ملے گا یا نہیں لاؤ اس کو جمع کر لو۔ دوسری جگہ فرماتے ہیں۔ فَاَمَّا الْاِنْسَانُ اِذَا مَا ابْتَلٰهُ رَبُّهٗ فَاَكْرَمَهٗ وَنَعَّمَهٗ فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَكْرَمَنِ ۝ وَاَمَّآ اِذَا مَا ابْتَلٰهُ فَقَدَرَ عَلَيْهِ رِزْقَهٗ فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَهَانَنِ۔ یعنی انسان کی یہ حالت ہے کہ جب حق تعالےٰ اس کو (نعمت سے) آزماتے ہیں اس پر بخشش و انعام فرماتے ہیں۔ تو کہتا ہے کہ میرے پروردگار نے میری خاطر کی مجھ پر کرم کیا اور جب (تکلیف سے) آزماتے ہیں پھر اس پر روزی کی کھینچ کر دیں۔ تو کہتا ہے کہ میرے پروردگار نے مجھے ذلیل کر دیا۔ ذرا سی پریشانی میں پچھلے سارے انعامات بھول جاتا ہے اور روزی ہی کے ملنے پر مقبولیت و قدر کا مدار سمجھتا ہے کہ خدا تعالےٰ کو میرے حال پر توجہ نہیں روز و شب اسی دھندے میں رہتا ہے کہ کسی طرح کھانے کو ملے چاہے کسی طرح ملے پھر جو کچھ اس کو ملتا ہے اس کو خدا پر اپنا حق سمجھتا ہے حالانکہ حق تعالےٰ نے اس کو محض اپنے فضل سے عدم محض سے اس کو ہست کیا اور ایسے وقت میں اس پر احسان کیا جبکہ یہ کچھ بھی نہ تھا ؎

ما نبودیم وتقاضا ما نبود لطف تو ناگفتۂ ما می شنود

(ہم پیدا بھی نہ ہوئے تھے اور سوال بھی نہ کرسکتے تھے مگر بدون سوال ہی ان کی رحمت نے ہماری فریاد سُن لی اور ایمان کی دولت عطا فرمادی وہ اس طرح کہ مسلمان گھرانے میں پیدا کردیا۔)

حق تعالیٰ فرماتے ہیں هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْئًا مَّذْكُوْرًا۔ (انسان پر ایک ایسا وقت آچکا۔ ہے جس میں یہ کچھ بھی قابل ذکر نہ تھا ۱۲) پھر اس کو اس حال میں پرورش کیا کہ یہ بالکل عاجز و کمزور تھا چلنے پھرنے کے قابل نہ تھا جانوروں سے بھی عاجز تھا وہ ماں کے پیٹ سے نکلتے ہی اپنے پیروں سے چلنے پھرنے لگتے اور منہ مارنے لگتے ہیں، یہ اتنا بھی نہ تھا۔ پھر ایسے کمزور و عاجز کو خدا نے اتنا پالا ایسا پالا کہ آج بزعم خود خدا کے مقابلہ کے قابل ہوگیا اب کھا کھا کر معصیت پر کمربستہ ہوگیا گویا خدا کوئی چیز ہی نہیں گو اعتقاداً ایسا نہ سہی مگر حالاً تو ہے ہی اور بعض نے تو اعتقاداً و قولاً بھی ایسا ہی کر دکھایا اپنی ہستی کو انھوں نے ایسا برقرار کیا کہ ہستی خدا کی نفی کردی۔ چنانچہ نمرود اور فرعون خدا کی ہستی کی نفی کرتے تھے۔ اسی لئے فرعون کہتا ہے مَا عَلِمْتُ لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرِيْ۔ کہ اپنے سوا میں کسی کو تمہارا معبود نہیں سمجھتا اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ خدا کا قائل ہی نہ تھا کیونکہ یہ تو کوئی بے وقوف سے بے وقوف بھی نہیں کرسکتا کہ خدا کو موجود مان کر پھر اپنے کو اس سے بڑا سمجھے اور اس نے جو اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى کہا ہے اس سے شبہ نہ کیا جائے کہ وہ تو اپنے کو بڑا خدا کہتا تھا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا کا قائل تھا پھر اپنے آپ کو رب اعلیٰ کہتا تھا۔ بلکہ منشا اس قول کا یہ ہے جو قاضی ثناء اللہ صاحب نے تفسیر مظہری میں لکھا ہے کہ

فرعون دہری تھا وہ کہتا تھا کہ خدا کوئی چیز نہیں بس جو جس کو تربیت کرتا ہے وہی اس کا رب ہے۔ اولاد کو ماں باپ پالتے ہیں تو والدین ان کے رب ہیں، حاکم رعایا کی تربیت کرتا ہے وہ رعایا کا رب ہے اور بادشاہ سب سے بڑا حاکم ہے تو وہ سب سے بڑا رب ہے۔ اس لئے وہ اپنے کو ربِّ اعلیٰ کہتا تھا یعنی میں دنیا میں سب تربیت کرنے والوں سے

بڑا ہوں تو میں سب سے بڑا رب ہوں، یہ مطلب تھا اس کے قول کا یہ نہیں کہ وہ خدا کا قائل تھا اور پھر اپنے کو خدا سے بڑا سمجھتا تھا بلکہ وہ تو سرے سے خدا ہی کا منکر تھا اسی لئے اس نے موسیٰؑ سے کہا تھا و ما رب العالمین (رب العالمین کیا چیز ہے خدا کون ہوتا ہے) وہ کمبخت خدا کی کنہ پوچھتا تھا اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ منکر صانع تھا۔ پھر موسیٰ علیہ السلام کا جواب قابل دید ہے۔ آپ چونکہ عارف تھے بلکہ عارف کہنا بھی آپ کی کسر شان ہے۔ اعرف العارفین تھے (بلکہ یہ بھی کسر شان ہے رسولؑ اور نبی تھے جو منتہائے کمالات بشریہ ہے ۱۲) آپ نے جواب دیا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَیْنَهُمَا اِنْ كُنْتُمْ مُّوْقِنِیْنَ ۝ خدا وہ ہے جو آسمان اور زمین کا اور جو کچھ ان کے درمیان ہے سب کا تربیت کرنے والا ہے۔ اگر تم یقین کرنا چاہتے ہو تو علم باری کے لئے اتنا جان لینا کافی ہے) آپ نے اس جواب میں اس مسئلہ پر متنبہ کر دیا کہ کنہ ذات باری مدرک نہیں ہو سکتی بلکہ اس کا ادراک ہمیشہ بالوجہ ہوگا پس تیرا کنہ سے سوال کرنا حماقت ہے اور یہ تنبیہ اس طرح ہوئی کہ اگر کنہ ذات کا ادراک ہو سکتا تو موسیٰ علیہ السلام جواب میں کنہ ہی کو بیان فرماتے کیونکہ سوال اسی سے تھا۔ اور جواب کا مطابق سوال ہونا ضروری ہے۔ اگر سوال صحیح ہو خصوصاً ایسے موقع میں جہاں غیر مطابق جواب دینے سے مجیب کا عجز سمجھا جائے اور حق پر تمسخر کیا جائے جیسا کہ یہاں ہوا کہ فرعون نے جواب بالوجہ کو سنکر تمسخر کیا اور قَالَ لِمَنْ حَوْلَهٗٓ اَلَا تَسْتَمِعُوْنَ. اپنے پاس والوں سے کہنے لگا کہ تم سنتے بھی ہو کیسا جواب دیا یعنی میں تو کنہ پوچھتا ہوں آپ وجہ بیان کر رہے ہیں۔ مگر موسیٰ علیہ السلام نے اس پر بھی کنہ بیان نہیں کی بلکہ ایک وجہ اور بیان کر دی۔ قَالَ رَبُّكُمْ وَرَبُّ اٰبَآئِكُمُ الْاَوَّلِیْنَ۔ فرمایا خدا وہ ہے جو تمہارا رب ہے اور تمہارے گذشتہ باپ دادوں کا بھی رب ہے۔ فرعون اس پر جھلا کر کہنے لگا۔ اِنَّ رَسُوْلَكُمُ الَّذِیْٓ اُرْسِلَ اِلَیْكُمْ لَمَجْنُوْنٌ کہ اے لوگو! تمہاری طرف جو رسول بھیجا گیا ہے وہ تو دیوانہ ہے (کیونکہ ان کو سوال کے مطابق جواب دینا بھی نہیں آتا) میرا سوال کچھ ہے ان کا جواب کچھ ہے۔ اس سے صاف معلوم ہو گیا کہ کنہ باری کا ادراک ممتنع ہے ورنہ موسیٰ علیہ السلام اس واقعہ پر ضرور بیان فرماتے مگر آپ نے بار بار وجہ ہی بیان کی (اور ایسی وجہ بیان کی جو

اثبات وجود صانع کے لئے بالکل کافی تھی چنانچہ اول تو یہ فرمایا کہ وہ آسمان و زمین اور ان کے مابین جو اشیاء ہیں سب کا رب ہے اس پر فرعون پر اس خیال کی غلطی نمایاں کردی کہ بس جو جس کی تربیت کرے وہی اس کا رب ہے کیونکہ اگر یہی بات ہے کہ تربیت علت ہے الوہیت کی تو بتلاؤ زمین و آسمان کو کس نے پیدا کیا، آسمان میں سورج اور چاند اور ستارے اور زمین میں پانی، ہوا، آگ وغیرہ کس نے پیدا کی ظاہر ہے کہ تو یہ دعوٰی نہیں کرسکتا کہ میں ان چیزوں کا خالق ہوں کیونکہ یہ چیزیں کسی کے تابع نہیں ہیں اور مخلوق کا خالق کے لئے تابع ہونا ضروری ہے جب ان کا رب نہیں اور کسی نہ کسی رب کا ہونا ضروری ہے اور ضرور کوئی اور ہی رب ہے۔ علیٰ ہذا زمین میں جو درخت اور نباتات پیدا ہوتے ہیں یہ کون پیدا کرتا ہے۔ اگر کہو کاشتکار پیدا کرتے ہیں تو یہ بداہتہً غلط ہے اور کاشتکار کا زمین کے درست کرنے اور پانی دینے اور بیج ڈالنے کے سوا کسی بات میں دخل نہیں اگر دخل ہے تو چاہیئے کہ جتنا وہ چاہے اور جب چاہے فوراً پیداوار ہو جایا کرے حالانکہ اس کی مرضی کے موافق پیدا رہا پیداوار نہیں ہوتی۔ معلوم ہوا کہ کوئی ایسی ہستی ضرور ہے جس کے قبضہ میں یہ تمام چیزیں ہیں اور وہی سب کا خالق ہے۔ جب فرعون اس سے لاجواب ہو کر تمسخر کرنے لگا تو آپ نے دوسری وجہ بیان کی جس میں صراحۃً اس کے قول سابق کا ابطال تھا فرمایا کہ وہ رب ہے تمہارا اور تمہارے پہلے بزرگوں کا اس میں بتلادیا کہ تو جو ماں باپ کو اولاد کا رب اور حاکم کو رعیت کا رب کہتا ہے تو بتلا کہ باپ ماں کے مرنے کے بعد اولاد کیونکر زندہ رہتی ہے۔ یہ عجیب تماشا ہے کہ رب تو مرجائے اور مربوب زندہ رہے۔ اسی طرح حاکم بھی مرتے رہتے ہیں تو ان کے مرنے سے رعایا کیوں نہیں مرجاتی خالق کے بغیر مخلوق کیونکر زندہ رہتی ہے۔ پھر اگر باپ ماں اولاد کے خالق ہیں تو جو سب سے پہلا باپ تھا اس کا خالق کون تھا اگر وہ خود اپنا خالق تھا تو مر کیوں گیا اس نے اپنے باپ کو زندہ کیوں نہ رکھا جب وجود اس کے اختیار میں تھا تو اس نے اپنے وجود کو باقی کیوں نہ رکھا کیونکہ موت کسی کو مرغوب نہیں طبعاً ہر شخص کو اس سے کراہت ہے اور اگر پہلا باپ کوئی نہیں تو تسلسل مستحیل لازم آئے گا۔ علاوہ ازیں یہی گفتگو ہر باپ کے متعلق ہے کہ اگر وہ اولاد کے

خالق ہیں اور وجود ان کے اختیار میں ہے جس کو چاہیں دیدیں تو خود کیوں فنا ہو جاتے ہیں پس معلوم ہوا کہ جب تمہارا اور تمہارے آباؤ اجداد کا وجود اپنے قبضہ میں نہیں تو یہ نہ اپنے خالق ہوسکتے ہیں نہ کسی غیر کے تو ضرور تمہارا سب کا رب کوئی اور ہے۔ وہی رب العٰلمین ہے) جب فرعون اس پر بھی لاجواب ہوا اور وہی مرغی کی ایک ٹانگ ہانکتا رہا کہ یہ تو جواب بالکل نہ ہوا تو موسیٰ علیہ السلام نے تیسری وجہ اور بیان فرمائی۔ قَالَ رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَمَا بَيْنَهُمَا إِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُونَ۔ فرمایا کہ تربیت کرنے والا ہر مشرق کی اور مغرب کی اور جو کچھ ان کے درمیان ہے اس کی بھی اگر تم کو عقل ہو (تو اسی سے سمجھ لو کہ کیونکہ یقیناً طلوع شمس و غروب شمس پر اور تبدل و تغیر مواسم و فصول پر کسی انسان کی قدرت نہیں۔ انسان تو چاہتا ہے کہ بارہ مہینہ ایسی حالت رہے نہ گرمی زیادہ ہو نہ سردی اور بہت دفعہ جب کوئی کام پورا نہیں ہوتا تو چاہا کرتا ہے کہ ابھی رات نہ آئے تو اچھا ہے مگر ان باتوں میں اس کے اختیار کو کوئی دخل نہیں معلوم ہوا کہ ان کا کوئی رب ضرور ہے وہی رب العٰلمین ہے ۱۲) غرض موسیٰ علیہ السلام دبے نہیں کیونکہ صاحب حق دبا نہیں کرتا۔ ان پر علم کا رعب تو کیا ہوتا سلطنت کا رعب بھی نہ ہوا صاحب حق اظہار حق میں کسی سے مرعوب نہیں ہوا کرتا۔ اس لئے آپ نے اسی جواب بالوجہ کو مختلف پہلوؤں سے اعادہ کیا (اور ہر دفعہ ایسی جچتی ہوئی بات کہی جس کا فرعون کے پاس کچھ جواب نہ تھا ۱۲) یہاں سے معلوم ہوا کہ صاحب حق کو کسی مخاطب سے مرعوب ہو کر اپنا طرز نہ بدلنا چاہیے بلکہ حق بات ہی کو بار بار کہنا چاہیے یہ آجکل ہی کا طرز ہے کہ مجیب سائل کا اتباع کر کے اپنا طرز بدل دیتا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام نے ایسا نہیں کیا بلکہ اخیر تک اپنی بات پر جمے رہے کہ جتنی دفعہ بولو گے جواب وجہ ہی سے ملے گا پھر ؎

چو حجت نماند جفا جوئے را ۔۔۔ بہ پرخاش در ہم کشد روئے را

(جب ظالم کو ظلم کرنے کے لئے کوئی وجہ معقول نہیں ملتی ہے تو عداوت سے چہرہ ہی بغض والا بنا لیتا ہے)

جب کوئی بات نہ چلی تو اب اس نے قوت سلطنت سے کام نکالنا چاہا۔ قَالَ لَئِنِ اتَّخَذْتَ

الھا غیری لاجعلنک من المسجونین۔ کہنے لگا کہ بس بس زیادہ نہ بولو۔ اگر میرے سوا کسی کو خدا بتاؤ گے تو میں تم کو جیل خانہ بھیج دوں گا۔ موسیٰ علیہ السلام یہاں بھی نہیں دبے قَالَ اَوَلَوْ جِئْتُكَ بِشَيْءٍ مُّبِيْنٍ۔ فرمایا کیا اگر میں کوئی صریح دلیل پیش کر دوں (جس سے رب العلمین کی قدرت اور میری رسالت کی حقانیت علانیہ ظاہر ہو جائے) تب بھی (تو نہ مانے گا اور خواہ مخواہ ہی اپنی بات پر اڑا رہے گا) اس کے بعد اس نے معجزات ظاہر کرنے کا مطالبہ کیا۔ آپ نے معجزات دکھلائے عصا کو زمین پر ڈال دیا وہ نمایاں اژدہا بن گیا جس کو دیکھ کر فرعون ڈر کر بھاگنے لگا اور ساری خدائی ڈھیلی ہو گئی۔ غرض فرعون کی ان تمام باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ دہری تھا۔ خدا کو مانتا ہی نہ تھا۔ اسی طرح نمرود بھی منکر صانع تھا۔ اس نے ابراہیم علیہ السلام سے مناظرہ کیا تھا کہ تم جو خدا کی ہستی کے مدعی ہو بتلاؤ خدا کیسا ہے۔ قَالَ رَبِّيَ الَّذِيْ يُحْيِيْ وَيُمِيْتُ۔ ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا کہ میرا رب ایسا ہے کہ وہی جلاتا ہے اور مارتا ہے (یعنی مارنا اور جلانا اس کے خاص کمالات میں سے ہے کوئی دوسرا ایسا نہیں کر سکتا اور عالم میں ان دونوں فعلوں کا وقوع مشاہد ہے پس خدا کا وجود بھی ضروری التسلیم ہے) وہ کوڑھ مغز جلانے اور مارنے کی حقیقت تو سمجھا نہیں کہنے لگا کہ یہ کام تو میں کر سکتا ہوں یہ کوئی خدا کی خاص صفت نہیں جس کے وجود سے خدا کا وجود تسلیم کرنا لازم آجائے کیونکہ میں بھی جلاتا ہوں اور مارتا ہوں چنانچہ جس کو چاہوں قتل کر دوں یہ تو مارنا ہے اور جس واجب القتل کو چاہوں چھوڑ دوں یہ جلانا ہے۔ پھر جیل خانہ میں سے دو واجب القتل قیدیوں کو بلا کر ایک کو رہا کر دیا اور ایک کو مار ڈالا۔ ابراہیم علیہ السلام نے دیکھا کہ یہ تو بالکل ہی بھدی عقل کا ہے اسے جلانے اور مارنے کی حقیقت بھی معلوم نہیں۔ حالانکہ جلانے کی حقیقت یہ ہے کہ بے جان چیز میں جان ڈالے نہ یہ کہ جان دار کو چھوڑ دے اسی طرح مارنا یہ ہے کہ زندہ کی جان اپنے اختیار سے نکال لے اور گردن کاٹنے میں قاتل کے اختیار سے جان نہیں نکلتی اس کا کام تو صرف گردن کاٹنا ہے۔ اس کے بعد بدون اس کے اختیار کے جان نکلتی ہے ورنہ پھر یہ بھی اختیار ہونا چاہیئے کہ گردن الگ کر دے اور جان نہ

نکلنے دے اور یہ گفتگو حضرت ابراہیم نے اس لئے نہ چھیڑی کہ قرائن سے معلوم ہو گیا کہ یہ جِلانے اور مارنے کی حقیقت تو سمجھے گا نہیں یا سمجھ بھی گیا تو تسلیم نہ کریگا اور خوانخواہ بحث میں اُلجھے گا اس ضرورت سے دوسری دلیل کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا کہ اچھا اللہ تعالےٰ آفتاب کو روز کے روز مشرق سے نکالتا ہے تو (اگر بزعم خود خالق ہے تو ایک ہی دن) مغرب سے نکال کر دکھلا) دے۔ فَبُھِتَ الَّذِیْ کَفَرَ۔ اس پر وہ کافر اُن کا مُنہ تکنے لگا اور کچھ جواب بن نہ آیا پھر اس نے بھی وہی کیا جو فرعون نے کیا تھا کہ سلطنت کے زور سے کام لینے لگا اور حضرت ابراہیم کو آگ میں ڈلوا دیا جس کی گرمی سے خدا تعالےٰ نے ان کو بچا لیا اور آگ کا مطلق اثر نہ ہوا۔ اس جگہ دو سوال وارد ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ نمرود کو یہ کہنے کی تو گنجائش تھی کہ اگر خدا موجود ہے تو وہی سورج کو مغرب سے نکال دے۔ پھر اس نے یہ کیوں نہ کہا جواب اس کا یہ ہے کہ اس کے قلب میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تقریر سے بلا اختیار یہ بات پڑ گئی کہ خدا ضرور ہے اور یہ مشرق سے نکالنا اُسی کا فعل ہے اور وہ مغرب سے بھی نکال سکتا ہے۔ اور یہ بھی بے اختیار اس کے دل میں آگیا کہ یہ شخص پیغمبر ہے اس کے کہنے سے ضرور ایسا ہو جائے گا۔ اور ایسا ہونے سے جہان میں انقلاب عظیم پیدا ہوگا۔ کہیں لینے کے دینے نہ پڑ جائیں کہ یہ لوگ اس خارق عادت کو دیکھ کر مجھ سے منحرف ہو کر ان کی راہ پر ہولیں اور ذرا سی حجت میں سلطنت ہاتھ سے جاتی رہے۔ یہ جواب تو اس لئے نہ دیا اور کوئی دوسرا جواب تو تھا نہیں اس لئے حیران ہو کر منہ دیکھتا رہ گیا۔ دوسرا سوال یہ ہے کہ یہاں حضرت ابراہیمؑ نے اپنی حجت کیوں بدلی یہ تو آداب مناظرہ کے خلاف ہے کیونکہ اس طرح تو گفتگو کا سلسلہ کبھی ختم نہیں ہو سکتا۔ بس جہاں مدعی کی دلیل پر نقص وارد ہوا ہو وہ اس دلیل کو چھوڑ کر دوسری بیان کرنے لگے گا پھر اس پر نقص وارد ہوگا تو تیسری دلیل پیش کر دے گا وعلیٰ ہذا القیاس یوں تو سلسلہ غیر متناہی ہو جائے گا۔ اسی لئے اہل مناظرہ نے مدعی کے لئے تبدیل حجت کو منع کیا ہے اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ اہلِ مناظرہ کے لئے اس قول کا مطلب یہ ہے کہ مدعی کو اپنی مصلحت سے

تبدیل دلیل کی اجازت نہیں باقی خصم کی مصلحت سے کہ مثلاً وہ غبی ہے اور دلیل اول کو غموض کی وجہ سے نہیں سمجھ سکتا۔ حجت کا بدلنا اور دوسری صحیح دلیل بیان کرنا جائز ہے بلکہ جہاں سمجھانا مقصود ہو وہاں ایسا کرنا واجب ہے۔ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کو سمجھانا ہی مقصود تھا وہاں ایسا کرنا دلیل غامض کو بدل کر سہل دلیل اختیار کی اور گو اہلِ مناظرہ نے اس کی تصریح نہیں کی مگر ان کے قول کو اس پر محمول کرنا ضروری ہے کیونکہ جس طرح ایک مصلحت عقلیہ تبدیل کی عدم جواز کو مقتضی ہے اسی طرح ایک مصلحت عقلیہ بھی تفہیم مخاطب اس کے جواز کو مقتضی اور ظاہر ہے کہ ہم نے پہلے قاعدہ کو محض اقتضار عقل کی وجہ سے تسلیم کیا ہے ورنہ محض اہل مناظرہ پر کوئی وحی تھوڑا ہی نازل ہوئی ہے پھر کیا وجہ ہے کہ اقتضاء عقل کی وجہ سے اس قاعدہ میں استثناء کا قائل نہ ہو جائے یہ گفتگو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے واقعہ کے متعلق تھی اب میں یہاں سے ایک فائدہ جدیدہ پر متنبہ کرتا ہوں جو طلبہ کے کام کی بات ہے وہ یہ کہ ابھی قریب زمانہ میں حیدرآباد سے ایک عالم نے جو میرے دوست بھی ہیں مجھے ایک خط میں لکھا تھا کہ میں ایک رسالہ میں یہ مضمون لکھنا چاہتا ہوں کہ وجود صانع کا اعتقاد فطری ہے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے توحید پر دلائل قائم کئے ہیں مگر اثبات وجود صانع پر براہین و دلائل نہیں قائم کئے جیسا کہ قرآن کے مضامین سے واضح ہے جن میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دلائل توحید کی تعلیم کی گئی ہے کہ ان میں اثبات صانع پر کوئی دلیل نہیں ہے پھر مجھ سے دریافت کیا تھا کہ اس مضمون کے متعلق تیری کیا رائے ہے میں نے لکھا کہ اس مدعی پر اس دلیل سے استدلال کرنا غلط ہے کیونکہ اگر تسلیم بھی کر لیا جائے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اثبات صانع پر دلائل قائم نہیں کئے مگر دوسرے انبیاء نے تو قائم کئے ہیں اور وجہ اس کی یہ ہے کہ حضرات انبیاء علیہم السلام طبیب کے مثل ہیں کہ مرض کو دیکھ کر دوا دیتے ہیں سو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مخاطب دہری نہ تھے بلکہ مشرک تھے۔ اس لئے آپ نے اثبات صانع پر دلائل قائم نہیں کئے کیونکہ مخاطبین کو اس سے انکار نہ تھا ہاں توحید سے منکر تھے تو آپ نے اس پر دلائل قائم کئے اور دیگر انبیاء کو بعض دہریوں سے بھی سابقہ پڑا ہے اس لئے

انھوں نے توحید کے ساتھ اثبات صانع پر بھی دلائل قائم کئے بس گو یہ مسئلہ فی نفسہ صحیح ہے کہ وجود صانع کا اعتقاد فطری ہے مگر اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عدم استدلال سے استدلال کرنا صحیح نہیں کیونکہ اس پر خصم یہ کہہ سکتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی ضرورت نہیں پڑی اگر ضرورت پڑتی تو آپ اس پر بھی دلائل قائم کرتے جیسا کہ اور انبیاء نے کئے ہیں مثلاً حضرت ابراہیم علیہ السلام نے نمرود کے مقابلہ میں اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کے مقابلہ میں اثبات صانع پر ادلہ قائم کئے جیسا کہ اوپر بہ تفصیل کے ساتھ میں نے ابھی بیان کیا ہے اور گو اس میں یہ احتمال بھی ہے کہ بطور دلیل علی النظنی کے ہوں اور نہ استدلال کے لئے احتمال بھی و... ادح. اس لئے میں نے لکھا کہ اس مضمون کو رسالہ میں تو آپ شائع نہ کریں گو اپنے خیال میں صحیح سمجھتے رہیں ریہ تنبیہ اس لئے کردی گئی کہ شاید کسی کو دیگر انبیاء کے دلائل میں جو قرآن کے اندر مذکور ہیں اثبات صانع پر دلیل دیکھ کر اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دلائل میں نہ دیکھ کر یہ شبہ ہو کہ اگر اثبات صانع پر دلیل کرنا ضروری تھا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کیوں نہیں قائم کی اور غیر ضروری تھا تو اور انبیاء نے کیوں قائم کی پھر وہ ایک دوسرے کی ترجیح اور مزیت ثابت کرتا اس لئے یہ بتلادیا گیا کہ یہ اختلاف دلائل مخاطبین کے اختلاف پر مبنی ہے پس اب کچھ شبہ نہ رہا ۱۲) غرض انسان کی غفلت اس حد تک پہنچی ہوئی ہے کہ بعضے منکر صانع بھی تھے۔ اس پر مجھے ایک لطیفہ یاد آیا کہ ایک بزرگ نے جو صاحب ادلال تھے اور ادلال کے معنے ناز کے ہیں بھی یہ ایک مقام ہے ولایت کا جو بعض اہل اللہ کو نصیب ہوتا ہے وہ صاحب ادلال ہوتے ہیں یعنی بطور ناز کے حق تعالےٰ سے ایسی باتیں عرض کر دیتے ہیں جو دوسرا نہیں کر سکتا گو بعض دفعہ وہ ادلال دوسروں کے لئے اضلال ضاد کے ساتھ ہو جاتا ہے کیونکہ وہ موٹی عقل کے ہوتے ہیں۔ ان کو دال سے مناسبت نہیں ہوتی ضاد ہی سے مناسبت ہوتی ہے تو وہ بزرگوں کی ایسی باتوں سے گمراہ ہو جاتے ہیں۔

خیر ایک ایسے ہی بزرگ نے حق تعالےٰ سے سوال کیا کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ منصور نے بھی انا الحق کہا تھا اور فرعون نے بھی انا الحق کہا تھا (کیونکہ انا ربکم

الاعلیٰ کا بھی وہی حاصل ہے جو انا الحق کا ہے ۱۲) تو بات ایک ہی تھی مگر منصور تو مقبول ہو گیا اور فرعون مردود ہو گیا۔ وہاں سے جواب عطا ہوا کہ تم سمجھتے نہیں دونوں میں بڑا فرق تھا۔ منصور نے اپنے کو مٹا کر انا الحق کہا تھا اور فرعون نے ہم کو مٹا کر انا الحق کہا تھا۔ یعنی منصور نے ایسی حالت میں انا الحق کہا تھا کہ اپنی ہستی ان کی نظر سے غائب تھی اور ہستی خداوندی کے سوا کسی پر اُن کی نظر نہ تھی تو وہ اپنی نفی کر کے انا الحق کہتے تھے اور فرعون نے ایسی حالت میں انا ربکم الاعلیٰ کہا تھا کہ اس وقت خدا کی ہستی اس کی نظر سے غائب تھی محض اپنی ہی ہستی پیشِ نظر تھی تو وہ ہستی خداوندی کی نفی کر کے اپنی ہستی کو ثابت کر رہا تھا۔ دونوں میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ منصور کے انا الحق کے یہ معنی تھے کہ میں اور تمام عالم کچھ نہیں صرف خدا ہی کا وجود ہے اور فرعون کے انا الحق کا یہ مطلب تھا کہ خدا کوئی چیز نہیں بس میں ہی ہوں جو کچھ ہوں۔ واقعی یہ جواب ایسا عجیب ہے کہ حق تعالیٰ ہی دے سکتے ہیں۔ اسی کو مولانا فرماتے ہیں ؎

گفت فرعونے انا الحق گشت پست — گفت منصورے انا الحق گشت مست

(فرعون نے انا الحق کہا اور ذلیل ہوا اور حضرت منصورؒ نے انا الحق کہا اور عاشق حق ہوئے)

فرعون تو اس بات سے مردود اور پست ہو گیا اور منصور مجذوب اور مست شمار ہوئے

؎ لعنت اللہ آں انا را در قفا — رحمت اللہ ایں انا را در وفا

(اللہ تعالیٰ کی لعنت فرعون کے اَنا پر غدّاری سے ہوئی اور اللہ تعالیٰ کی رحمت حضرت منصورؒ کے انا پر ہوئی بسبب وفاداری کے)

اس انا کے عقب میں تو لعنت ہے جو فرعون نے کہا تھا اور اس انا پر رحمت ہے جو منصور نے کہا تھا کیونکہ اس کا منشا وفا تھی وہ خدا کی ہستی کا حق ادا کر کے کہہ رہے تھے۔ اور یہ گفتگو بہت طویل ہو گئی میں یہ کہہ رہا تھا کہ انسان کی عادت یہ ہے کہ وہ ماضی کو بھول جاتا ہے اور اپنے اس ضعف و عجز کو یاد نہیں رکھتا جو ایک زمانہ میں اس پر گذر چکا ہے گویا حالاً یوں سمجھتا ہے کہ (نعوذ باللہ) حق تعالیٰ کو ماضی پر اب قدرت نہیں رہی جو حالت گذر گئی اب دوبارہ مجھے پیش نہیں آسکتی چنانچہ ایک

مقام پر حق تعالیٰ نے انسان کی اسی عادت پر کہ وہ ماضی کو بھول جاتا ہے متنبہ فرمایا ہے ارشاد ہوتا ہے ربکم الذی یزجی لکم الفلک فی البحر لتبتغوا من فضلہ انہ کان بکم رحیما ہ تمہارا رب ایسا (منعم) ہے کہ تمہارے (فائدہ کے) لئے کشتی کو دریا میں لے چلتا ہے تاکہ تم اس کے رزق کو تلاش کرو۔ بیشک وہ تمہارے حال پر بہت مہربان ہے۔ واقعی دریا میں جہازوں اور کشتیوں کا چلنا بڑی رحمت ہے۔ اس سے سفر میں کتنی آسانی ہوگئی ورنہ بس ہندوستان والے تو حج سے محروم ہی رہتے یہ تو دینی ضرر تھا اور دنیوی ضرر یہ تھا کہ دوسرے ممالک کی چیزوں سے محروم رہتے یہ جہازوں ہی کی تو برکت ہے کہ آج قسم قسم کی چیزیں اور راحت کے سامان دوسری ولایتوں سے یہاں آتے ہیں اور یہاں کی چیزیں باہر جاتی ہیں جس سے تجارت کو ترقی ہوگئی اور سمندر پر جہازوں کا چلنا محض خدا کی رحمت ہی ہے ورنہ بڑے سے بڑا جہاز پانی میں ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے تنکا بہ رہا ہو۔ سمندر کی ایک موج بھی اس کے ڈبونے کے لئے کافی ہے اور اس وقت ساری مشینیں بیکار ہوجاتی ہیں۔ مگر اللہ تعالے اپنی رحمت سے حفاظت فرماتے ہیں۔ ہاں کبھی بطور تنبیہ وامتحان کے طوفان میں بھی مبتلا کردیتے ہیں جیسے خشکی میں بعض دفعہ اسی حکمت سے مصائب بھیجدیتے ہیں آگے اس امتحان کے متعلق ارشاد ہے وَاِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فِي الْبَحْرِ ضَلَّ مَنْ تَدْعُوْنَ اِلَّآ اِيَّاهُ ۚ فَلَمَّا نَجّٰىكُمْ اِلَى الْبَرِّ اَعْرَضْتُمْ ۭ وَكَانَ الْاِنْسَانُ كَفُوْرًا ط اور جب تم کو دریا میں کوئی تکلیف پہنچتی ہے (جیسے موج اور ہوا کا طوفان) تو اس وقت بجز خدا کے اور جن جن کی تم عبادت کرتے تھے سب غائب ہوجاتے ہیں۔ طوفان کے وقت کافر ملحد بھی خدا کا قائل ہوجاتا ہے۔ جہاز کے کپتان بھی کہنے لگتے ہیں کہ حاجی بابا خدا سے دعا کرو۔ واقعی خدا کا وجود ایسا فطری ہے کہ طوفان کے وقت اضطراری طور پر ملحد کو بھی اس کا قائل ہونا پڑتا ہے اور کافر مشرک موحد ہوجاتا ہے۔ اس وقت سارے دیوتا اور مہا دیو وغیرہ دل سے نکل جاتے ہیں اور خدا ہی خدا رہ جاتا ہے اور مسلمانوں کو اس وقت توبہ اور

انابت الی اللہ نصیب ہو جاتی ہے۔ ہر شخص گناہوں سے استغفار کرنے لگتا اور آیندہ کے لئے متقی بننے کا قصد کر لیتا ہے آگے فرماتے ہیں۔ پھر جب تم کو خشکی کی طرف بچا لاتا ہے تو تم پھر خدا سے پھر جاتے ہو بس جہاں جہاز سے کنارہ پر اترے پھر بدستور سابق وہی حالت ہو جاتی ہے۔ مشرک شرک میں مبتلا ہو جاتا ہے اور ملحد خدا کا منکر ہو جاتا اور مسلمان گناہوں کا ارتکاب کرنے لگتا ہے حق تعالےٰ اس کی شکایت فرماتے ہیں۔ وکان الانسان کفورا ۵ کہ واقعی انسان ہے بڑا ناشکرا کہ ایسی جلدی منعم کا انعام اور اپنا عجز و نیاز سب بھول جاتا ہے۔ یہی ہے ماضی سے غفلت کہ ایک مصیبت سے بچنے کے بعد انسان یہ سمجھ لیستا ہے کہ بس اب میں ہمیشہ کو بچ گیا۔ دریا ہی تک مصیبت تھی اب گھر پہونچکر سلامتی ہی سلامتی ہے۔ حق تعالےٰ آگے اس خیال کی غلطی ظاہر فرماتے ہیں۔

اَفَاَمِنۡتُمۡ اَنۡ یَّخۡسِفَ بِکُمۡ جَانِبَ الۡبَرِّ اَوۡ یُرۡسِلَ عَلَیۡکُمۡ حَاصِبًا ثُمَّ لَا تَجِدُوۡا لَکُمۡ وَکِیۡلًا ۵ (یعنی دریا سے نکل کر) کیا تم اس بات سے بھی بے فکر ہو بیٹھے ہو کہ اللہ تعالےٰ تم کو خشکی کی جانب میں لاکر زمین میں دھنسا دے یا کوئی تند ہوا تم پر بھیجدے پھر تم کسی کو اپنا کارساز نہ پاؤ۔ چنانچہ قارون کو خشکی ہی میں دھنسایا گیا تھا اور اب بھی ایسے واقعات ہو جاتے ہیں، کہیں زلزلہ سے آدمی زمین میں دھنس گئے کہیں ریلیں ٹکرا گئیں کہیں گھر کی دیواریں گر پڑیں اور دب کر مر گئے۔ بعض دفعہ ایسی سخت ہوا آئی جس سے درخت اکھڑ گئے آدمی تلف ہو گئے کبھی ندی اور نالے چڑھ گئے جیسے خشکی ہی میں طوفان آگیا ہو۔ چنانچہ ابھی ایسے واقعات ہو چکے ہیں۔ گنگا اور جمنا کے طوفان سے ہزاروں گاؤں تباہ و برباد اور سیکڑوں جانیں تلف ہو گئیں، پھر کس بات سے بے فکری ہے ارے جو خدا سمندر میں ڈبو سکتا ہے وہ ہر جگہ تم کو ہلاک کر سکتا ہے۔ آگے بڑے مزے کی بات فرماتے ہیں اَمۡ اَمِنۡتُمۡ اَنۡ یُّعِیۡدَکُمۡ فِیۡهِ تَارَةً اُخۡرٰی فَیُرۡسِلَ عَلَیۡکُمۡ قَاصِفًا مِّنَ الرِّیۡحِ فَیُغۡرِقَکُمۡ بِمَا کَفَرۡتُمۡ ثُمَّ لَا تَجِدُوۡا لَکُمۡ

عَلَیۡنَا بِہٖ تبیعًا ۔ یا تم اس سے بے فکر ہو گئے ہو کہ خدا تعالیٰ پھر تم کو دریا ہی میں دبا کر لے جاوے (جس کا مزہ ایک بار چکھ چکے ہو) اور یہ کچھ دشوار نہیں کیونکہ ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ کوئی ضروری کام ایسا نکال دیں جس کی وجہ سے دریا کا سفر پھر کرنا پڑ جائے۔ انسان کے ارادہ کا بدلنا خدا کو کیا مشکل ہے رات دن مشاہدہ ہوتا ہے کہ آج ہم ایک ارادہ کرتے ہیں اور پھر اس کے خلاف کرنا پڑتا ہے۔ میں خود اپنی حالت کہتا ہوں کہ ابھی قریب زمانہ میں جب ریلوں کے بند ہونے کا قصہ میں نے سنا تو یہ قصد کر لیا تھا کہ اس سال کہیں سفر نہ کروں گا مگر جناب سفر کرنا ہی پڑا اور اسی حال میں کرنا پڑا کہ ابھی تک بعض اطراف کی ریلیں رکی ہوئی تھیں صورت ہی ایسی پیش آئی کہ میں رک نہ سکا۔ وہ یہ کہ الہ آباد میں میرے ایک دوست سخت بیمار تھے ان کے بچنے کی امید نہ رہی تھی انہوں نے ایک صاحب کو یہاں بھیجا اور ان کی زبانی یہ پیام دیا کہ میری حالت نازک ہے اور تم سے ملنے کو جی بے اختیار چاہتا ہے جس طرح جانو فوراً چلے آؤ نہ معلوم پھر ملنا ہو یا نہ ہو۔ قاصد نے ان کا اشتیاق کچھ اس طرح ظاہر کیا کہ مجھ سے نہ رہا گیا اور سفر کرنا ہی پڑا۔ پھر خدا نے ایسا کیا کہ میں نے جا کر مریض زندہ ہی پایا اور مجھ سے مل کر ان کو بہت ہی خوشی ہوئی یہاں تک کہ طبیب نے بھی یہ کہہ دیا کہ ان کا آدھا مرض جاتا رہا (پھر واپسی کے چند روز بعد بیچارے کا انتقال ہو گیا، خدا تعالیٰ مغفرت فرمائے اور ان کو اپنی رحمت سے نوازے آمین ۱۲)

اور میں اس کو رحمت سمجھتا ہوں کہ حق تعالیٰ ہمارے ارادے توڑتے رہتے ہیں۔ جس سے بار بار اپنا عجز اور ضعف مشاہدہ ہوتا رہتا ہے۔ اسی لئے ایک بزرگ فرماتے ہیں۔ عرفت ربی بفسخ العزائم۔ کہ میں نے اپنے خدا کو ارادوں کے ٹوٹنے سے پہچانا کہ ہم لاکھ ارادے کرتے ہیں اور پختہ قصد کرتے ہیں مگر ایک قدرت ہے جو ان کو توڑ دیتی ہے واقعی وجود صانع کے لئے یہ کافی دلیل ہے مگر انسان ایسا غافل ہے کہ پہلی حالت کو بہت جلد بھول جاتا ہے۔ چنانچہ میں اپنی ہی کہتا ہوں کہ ایک بار فسخ

ارادہ کا نمونہ دیکھ چکا ہوں۔ مگر سفر سے واپس آکر پھر بھی قصد کرلیا ہے کہ اب نہ جاؤنگا استغفر اللہ بلکہ یہ خیال ہے کہ اگر مجبوری پیش نہ آئی تو نہ جاؤں گا اور جو مجبوری پیش آئی تو میں سمجھوں گا کہ اب خدا تعالے ہی کو سفر منظور ہے اس وقت ضرور جاؤں گا بلکہ اب تو میں ارادہ کرنے سے بھی ڈرتا ہوں پس خدا کے سپرد کر دیا ہے کہ وہ جیسے چاہیں تصرف فرمائیں۔ بندہ کا کام تفویض ہی ہے اور اسی میں راحت ہے۔ غرض حق تعالیٰ کو یہ کیا دشوار ہے کہ تم کو پھر دریا ہی میں بھیجدیں اور پہلے کی طرح پھر ہوا کا طوفان آجائے جو غرق ہی کر کے چھوڑے بس یہ نادانی ہے کہ انسان ایک بلا کے ٹلنے سے بے فکر ہو جائے مگر کچھ غفلت کا پردہ ایسا پڑا ہوا ہے کہ ماضی کو انسان بہت جلد بھول جاتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ بس وہ تو رفتہ وگذشتہ ہوا اسی لئے محاورہ میں کہا کرتے ہیں کہ الماضی لایذکر حق تعالے اس پر بھی قادر ہیں کہ حالت ماضیہ کو پھر لوٹا دیں اور ان کو ترکیب کی بھی ضرورت نہیں جس میں کچھ دیر لگے ترکیب کی ضرورت تو اس کو ہو جسے قدرت نہ ہو وہ تو پورے قادر ہیں جب چاہیں پہلی ہی سی حالت کر دیں مگر آدمی اپنی غفلت سے ایسا بے فکر ہو جاتا ہے کہ گو یا خدا کو ماضی پر قدرت ہی نہیں رہی (نعوذ باللہ منہ) لیکن اگر انسان ماضی کے ساتھ انسان کو اپنے مستقبل کا ہی خیال رہے تو بھی اتنی غفلت نہ ہو مگر یہ تو ماضی اور مستقبل دونوں سے آنکھیں بند کر کے عبدالحال ہو گیا ہے پھر مستقبل میں بھی صرف موت کا خیال کافی نہیں کیونکہ اس کے قائل تو دہری اور مشرک بھی ہیں مگر اس سے تو ان کو کچھ نفع نہیں ہوا کیونکہ وہ موت کے بعد حیات ثانیہ کے قائل نہیں بس یوں سمجھتے ہیں کہ مر کر مٹی میں مل جائیں گے پھر نہ ثواب ہے نہ عذاب تو اس حالت میں خیال موت سے کیا نفع ہو سکتا ہے اسی لئے حق تعالےٰ نے مبدأ اور معاد اول کے بعد معاد ثانی کو یاد دلایا ہے۔ چنانچہ "مِنْهَا خَلَقْنَاكُمْ" میں مبدأ کا ذکر ہے اور "وَفِيهَا نُعِيدُكُمْ" میں معاد اول کا اور "وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً أُخْرَىٰ" میں معاد ثانی کا اور تینوں کا اس لئے جمع فرمایا کہ ملحدین تو مبدأ کا یعنی خدا کے خالق ہونے ہی کا انکار کرتے تھے۔ ان کے نزدیک تو موت و حیات کا مدار زمانہ کی گردش پر ہے۔ چنانچہ

قرآن میں بھی دہریوں کا یہ خیال نقل کیا گیا ہے مگر دہریوں کہتے ہیں وما یھلکنا الا الدھر کہ ہم کو زمانہ کی گردش ہلاک کرتی ہے۔ سو مبدا کا ذکر تو اس لئے فرمایا کہ ان کی اصلاح ہو اگر چہ یہ ضروری ہے کہ قرآن میں دہریوں سے تو زیادہ تعرض نہیں کیا گیا کیونکہ مخاطبین اس خیال کے بہت کم لوگ تھے زیادہ تر مشرکین ہی تھے۔ اور یہ مشرکین خدا کے قائل ہیں مگر حیات ثانیہ کے قائل نہیں وہ موت و حیات میں خدا کا دخل تو مانتے ہیں مگر مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونے کے قائل نہ تھے اور اس کو مستبعد و محال سمجھتے تھے۔ معاد ثانی کا اس لئے ذکر فرمایا اور اس مقام کے علاوہ بھی حق تعالے نے قرآن میں جابجا ان کے استبعاد کا جواب دیا ہے اور بہت اہتمام سے معاد ثانی کو ثابت فرمایا ہے۔ چنانچہ ایک جگہ ارشاد ہے وَ هُوَ اَهْوَنُ عَلَيْهِ کہ معاد ثانی خدا تعالیٰ کو پہلی بار زندہ کرنے سے زیادہ آسان ہے کیونکہ پہلے تو یہ اجسام بقابلیت قریبہ قابل حیات نہ تھے اور اب تو ان میں حیات کی قابلیت قریبہ ہو گئی ہے کیونکہ زمانہ دراز تک اس سے تلبس ہو چکا ہے۔ پس دوبارہ زندہ کر دینا پہلی بار زندہ کرنے سے زیادہ عجیب نہیں اگر غور سے کام لیا جائے تو انسان کی حیات اولی ایسی عجیب ہے کہ اگر ہر روز اس کا مشاہدہ نہ ہوا کرتا تو لوگ اس کو نہایت مستبعد سمجھتے واقعی انسان کی پیدائش کا جو طریقہ رکھا گیا ہے وہ ایسا عجیب و غریب ہے کہ اگر کسی حکیم و فلسفی دماغ والے کو بچپن سے کسی تہ خانہ میں بند رکھا جائے اور وہاں اس کو ہر قسم کے علوم و فنون میں ماہر کر دیا جائے مگر یہ مسئلہ نہ پڑھایا جائے کہ انسان کیونکر پیدا ہوتا ہے نہ کوئی اس سے یہ تذکرہ کرے نہ وہ آنکھ سے اس منظر کو دیکھنے پائے پھر وہ جب تمام علوم و فنون میں کامل و ماہر ہو جائے اس وقت اس سے کہا جائے کہ خبر بھی ہے کہ تم کس طرح پیدا ہوئے تھے پھر اس کے سامنے یہ صورت پیدائش بیان کی جاوے کہ تم پہلے نطفہ کی شکل میں باپ کی پشت کے اندر تھے پھر وہ اس طرح تمہاری ماں سے ملا اور وہ نطفہ مائیہ رحم مادر میں پہونچا جہاں علقہ اور مضغہ بنا پھر اس کے اندر جان پڑی اور خون حیض سے پرورش پاتا رہا پھر نو ماہ کے بعد جیتا

جاًلتا ماں کے پیٹ سے نکلا پھر خدا نے خون کو بشکل دودھ ماں کے پستان میں پہونچادیا وہ تم کو پلایا گیا۔ دوسال تک تم کو دودھ سے غذا دی گئی پھر دودھ چھوڑاکر تدریجاً روٹی کا عادی کیا گیا اس طرح بڑھتے بڑھتے تم جوانی کے قریب پہونچے اس وقت تم کو خدا نے ایسی عقل دی جو پہلے نہ تھی واللہ وہ فلسفی اور حکیم اس صورت کو سنکر فوراً رد کردے گا اور قسمیں کھائے گا کہ ایسا ہو نہیں سکتا بھلا چند قطرات مائیہ سے کہیں ایسا جسم بن سکتا ہے جس میں گوشت پوست، ہڈیاں اور آنکھیں اور حواس ظاہرہ حواس باطنہ ایسے ایسے موجود ہوں۔ نیز جان پڑجانے کے بعد ایک ذی روح کا پیٹ کے اندر پرورش پانا کیونکر ممکن ہے۔ جہاں نہ ہوا کا گذر ہے نہ ایسی جگہ ہے جو حفظ صحت کے لئے کافی ہو ذی روح کا رحم مادر میں زندہ رہنا محالات سے ہے۔

حضرت میں سچ کہتا ہوں کہ اگر ہم لوگوں نے پیدائش کا طریقہ جانوروں میں اور بعض انسانوں میں دیکھا نہ ہوتا تو محض سن کر ہرگز یقین نہ آتا۔ سو حیات اولی اس قدر عجیب ہے بخلاف حیات ثانیہ کے کہ وہ اس قدر مستبعد نہیں کیونکہ آجکل بعض ڈاکٹروں نے تحقیق کیا ہے کہ موت کے بعد کچھ دیر تک جسم میں حیات کا اثر باقی رہتا ہے اور اس مدت کے اندر اندر کوئی مقوی دوا مردہ کے جسم میں داخل کردی جائے تو حیات کا اثر پیدا ہوجاتا ہے اور مردہ کو حرکت ہونے لگتی ہے اور بعض دفعہ ایک دو گھنٹے کے لئے وہ بات چیت بھی کرسکتا ہے۔ چنانچہ بعض مقامات پر ڈاکٹروں کو کامیابی بھی ہوئی ہے تو وہ نہ خانہ دالا حکیم اس پر زیادہ حیرت نہ کرے گا اور نہ ہم اور آپ اس پر حیرت کرتے ہیں یہ تحقیق عجیب ضروری مگر ایسی موجب حیرت و استبعاد نہیں جیسے حیات اولی ہے۔ اب تو آپ کو مشاہدہ ہوگیا "هُوَ اَهْوَنُ عَلَيْهِ" کا کیونکہ جب ڈاکٹروں کو جن کی قدرت وحکمت خدا تعالے کی قدرت وحکمت کے سامنے کچھ بھی نہیں اس میں کامیاب ہوگئی کہ جس انسان کو عام طور پر سب لوگ مردہ سمجھ چکے تھے وہ خاص

میعاد کے اندر مقوی دواسے اس کو مثل زندہ کے کردیتے ہیں تو حق تعالٰے اگر ہزار دو ہزار برس کے بعد زندہ کردیں تو کیا عجیب ہے۔ ممکن ہے کہ ڈاکٹروں کو جتنی دیر تک جسم میں اثر حیات کا ہونا معلوم ہوا ہے اس کے بعد بھی حیات کا اثر جسم میں رہتا ہو مگر وہ نہایت ضعیف و قلیل اثر ہو جو آلات سے مدرک نہیں ہوسکتا۔ پس حق تعالٰے اسی ضعیف اثر کو کسی بے حد مقوی شے سے بڑھادیں اور مردہ ہزاروں برس کے بعد زندہ ہو جائے تو کیا عجب ہے اور یہ بھی تقریب الی الفہم کے لئے کہہ دیا گیا ورنہ خدا تعالٰے کو ان ترکیبوں کی کیا ضرورت ہے ان کا تو حکم دینا اور ارادہ کرنا ہی کافی ہے۔ بہر حال حق تعالٰے نے معاد ثانی کے بیان میں بہت اہتمام فرمایا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف موت کا علم اصلاح حال کے لئے کافی نہیں بلکہ اس کے لئے علم معاد ثانی کی بھی ضرورت ہے اور انسان کی غفلت کی وجہ یہی ہے کہ وہ اس سے غافل ہے اگر اس کا استحضار ہو تو غفلت نہ رہے ہم گو اعتقاداً معاد کے قائل ہیں مگر پھر غفلت اس لئے ہے کہ ہم کو معاد کا استحضار نہیں کسی وقت اس کو سوچتے نہیں بلکہ اگر کبھی خود بخود اس کی طرف خیال چلا بھی جاتا ہے تو جلدی سے دھکے دیدیتے ہیں اس کے خیال سے بھاگتے اور گھبراتے ہیں۔ اور ہر چند کہ پوری اصلاح تو حیات ثانیہ ہی کے استحضار سے ہوتی ہے لیکن اگر انسان معاد اول (یعنی موت) کو بھی یاد رکھے تو زیادہ غافل نہیں ہوسکتا بلکہ کچھ نہ کچھ اصلاح ضرور ہو جائے کیونکہ جس گھر سے نکلنا اور جانا مستحضر ہو اس میں دل نہیں لگ سکتا۔ دیکھو ملازمت کی حالت میں پردیس میں آدمی کرایہ پر مکان لے کر رہتا ہے تو اس مکان سے اس کو زیادہ دلبستگی نہیں ہوتی بس بقدر ضرورت اس کی مرمت کرلیتا ہے مگر یہ نہیں ہوتا کہ سارا سرمایہ اسی کی زینت و آرائش میں لگادے کیونکہ ایک دن اس سے نکلنے کا ہر وقت خیال لگا ہوا ہے کہ نہ معلوم کس وقت تبدیلی کا حکم ہو جائے اور اس کو چھوڑ کر کہیں اور جانا پڑے تو خوامخواہ اس کے اندر ساری رقم کیوں

لگائے۔ ہاں ملازمت کے وقت اپنے وطن کے مکان کا ضرور خیال رہتا ہے، اس کی مرمت و استحکام کے لئے ہر سال روپیہ صرف کرتے ہیں اور تعطیل میں آکر اس کی تعمیر شروع کرتے ہیں۔

اب اگر کسی شخص کو ہر دم موت کا دھیان رہے کہ ایک دن وطن کا گھر بھی ہم سے چھوٹنے والا ہے۔ تو یقیناً وہ اس گھر سے بھی زیادہ دل نہ لگائے گا اور یہ بھی انسان کی اصلاح کے لئے کافی ہے کیونکہ اصل ضرر دنیا سے دل لگانے کا ہے طبعی طور پر احتیاج کے سبب اس کی طرف میلان میں چنداں ضرر نہیں۔ چنانچہ حیات دنیا سے اس درجہ میں خوش ہونے پر حق تعالیٰ نے ملامت نہیں کی بلکہ اس پر مطمئن ہونے اور دل لگانے پر ملامت فرمائی ہے۔ اسی لئے ایک مقام پر کفار کے بارہ میں فرماتے ہیں اِنَّ الَّذِیْنَ لَا یَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا وَرَضُوْا بِالْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَاطْمَاَنُّوْا بِھَا وَالَّذِیْنَ ھُمْ عَنْ اٰیٰتِنَا غٰفِلُوْنَ" کہ وہ لوگ حیات دنیا سے راضی اور اسی کے ساتھ مطمئن ہیں تو یہاں حق تعالیٰ نے "رضوا بالحیٰوۃ الدنیا" پر اکتفا نہیں فرمایا بلکہ "واطمأنوا بھا" بھی فرمایا معلوم ہوا کہ صرف رضا بالحیٰوۃ سبب غفلت نہیں بلکہ اس سے دل بستگی ہو جانا سبب غفلت ہے نیز سورۂ توبہ کی آیت میں ارشاد ہے وَمَسٰکِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَیْکُمْ جس میں صاف دلالت ہے کہ مساکن مرضی ہونا مذموم نہیں اس کی احبیت مذموم ہے۔ چنانچہ اس کی تفصیل عنقریب آتی ہے۔ پس موت کے استحضار سے گو "رضا بالحیٰوۃ" کا ازالہ نہ ہو مگر اطمینان و دل بستگی تو ضرور زائل ہو جائے گی۔ اور جب زندگی سے دل بستگی نہ رہے گی تو کسی وقت تو غفلت میں کمی آئے گی۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ موت کا دھیان رہتے ہوئے آدمی بالکل ہی غافل رہے اور اتنا بھی اصلاح کے لئے کافی ہے۔

صاحبو! اس پر ملامت نہیں ہے کہ ہم کو بیوی بچوں سے یا اپنے گھر سے محبت کیوں ہے اس کا تو مضائقہ نہیں میں آپ سے بیوی بچوں کو اور گھر بار کو نہیں چھڑاتا

بلکہ ملامت اس پر ہے کہ ہم کو انہوں سے ساری محبت کیوں ہے خدا کے ساتھ تعلق کیوں نہیں دیکھئے حق تعالیٰ ایک مقام پر فرماتے ہیں، قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ ِۨاقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ؕ فرما دیجئے کہ اگر تمہارے باپ اور بیٹے اور بیویاں اور برادری اور وہ مال جن کو تم نے کمایا ہے اور وہ تجارت جس کے مندا پڑ جانے کا تم کو خطرہ رہتا ہے اور وہ گھر جن کو پسند کرتے ہیں تم کو اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اور اللہ کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ محبوب ہیں تو منتظر رہو یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اپنا کوئی حکم (تمہاری سزا کے متعلق) بھیجیں اور اس میں بیوی بچوں اور مال و دولت کی مطلق محبت پر وعید نہیں فرمائی بلکہ احبیت پر وعید ہے کہ یہ چیزیں اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ محبوب نہ ہونی چاہئیں اور ان کی محبت اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت سے مانع نہ ہونا چاہیئے۔ چنانچہ "مَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ" فرمانے کے بعد اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ فرمانا اس کا صریح قرینہ ہے جس سے معلوم ہوا کہ رضا بالمسکن پر وعید نہیں بلکہ اس کے بعد احبیت من اللہ و رسولہ پر ملامت ہے جیسا کہ اوپر والی آیت میں "رضا بالحیٰوۃ الدنیا" پر وعید نہ تھی بلکہ اطمینان و دل بستگی پر وعید تھی اور اس اطمینان و احبیت کا منشا وہی موت سے غفلت ہے اگر موت کا خیال رہے تو ان چیزوں کے ساتھ اطمینان اور دل بستگی اور احبیت کا درجہ تو ہرگز نہ پیدا ہوگا اسی لئے اہلِ طریق فرماتے ہیں کہ معاد اول کا حاضر فی الذہن ہونا بھی دنیا سے دل برداشتہ ہو جانے اور کسی قدر اصلاح پر متوجہ کر دینے کے لئے کافی ہے مگر ستم یہ ہے کہ انسان اس سے بھی غافل ہے اور موت کے ساتھ ما بعد الموت یعنی قیامت کا استحضار بھی ہو اور دوبارہ زندہ ہونے اور ثواب و عذاب اور حساب و کتاب ہونے کا بھی خیال ہو پھر تو کیا کہنا

ورنہ کم از کم موت کا دھیان تو ضرور ہونا چاہیئے جس سے کوئی ملحد یا دہریہ اور مشرک بھی انکار نہیں کر سکتا۔ اسی لئے حق تعالیٰ نے موت کو یقین سے تعبیر فرمایا ہے۔ وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ واقعی یہ ایسی یقینی ہے کہ اس کا کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا۔ پس لذات کو مکدر کرنے اور غفلت کو کم کرنے کے لئے اس کا استحضار بہت ہے اور اس کے استحضار میں کچھ دشواری بھی نہیں کیونکہ اس کا نمونہ بھی اور مشاہدہ ہے اور اس وقت کی بے بسی اور بے کسی کی حالت بہت دفعہ آنکھوں کے سامنے سے گزرتی رہتی ہے تو اس کا سمجھنا بہت آسان ہے کہ جس طرح دوسرا شخص مر کر بیکس و بے بس ہو گیا اور اس کا سارا مال و دولت دوسرا لے گیا اور بیوی بچے جائیداد و مکانات سب اس سے چھوٹ گئے اسی طرح ایک دن ہم کو بھی یہ سانحہ پیش آئے گا اور یہ خیال ایسا ہے جو انسان کو بے فکر بیٹھنے نہ دے۔

دیکھئے فلاسفہ یونان معاد ثانی کے قائل نہ تھے اور جس معاد کا ہم لوگ تمام ان کو اعتقاد تھا وہ کالعدم ہے کیونکہ ان کی معاد کا حاصل یہ ہے کہ جو شخص علوم حقہ کو حاصل کر لے اور وہ علوم کیا ہیں ؟ یہ ہیں کہ افلاک نو ہیں اور وہ کروی ہیں اور ان میں ترتیب یہ ہے کہ سب کرات میں اسفل کرۂ ارض ہے اس کے اوپر کرۂ ماء اور اس کے اوپر کرۂ ہوا پھر کرۂ نار ہے اور ان سب کو نو افلاک محیط ہیں جو ہر وقت متحرک ہیں پس جس کو یہ ترتیب عالم صحیح معلوم ہو اور اخلاق اچھے ہوں اس کے دل کو مرنے کے بعد راحت ہو گی یہ تو جنت ہے اور جس کو اس ترتیب سے جہل ہو اور اخلاق برے ہوں اس کو اپنے اصل سے مرنے کے بعد تکلیف ہو گی یہ دوزخ ہے۔ سبحان اللہ علوم کیا عالی ہیں جن کے جاننے اور نہ جاننے پر مدار راحت و الم کا رکھا ہے۔ پس وہی مثال ہے

چوں کرمے کہ در سنگے نہاں است — زمین و آسمان وے ہماں است

(مثل اس کیڑے کے جو پتھر کے اندر پوشیدہ ہے اس کا زمین و آسمان وہی پتھر کا

جو چھوٹا سا سوراخ ہے

جو کیڑا ابھی تک پتھر کے اندر ہو اس کا تو وہی آسمان ہے اور وہی زمین جیسے ماں کے پیٹ میں جب بچہ ہوتا ہے تو اسی کو بڑا مکان سمجھتا ہے اور وہاں سے دنیا میں آتے ہوئے روتا ہے یہی حال ان فلاسفہ کے علم کا ہے کہ بس ان کے یہاں ترتیب عالم کے جان لینے پر راحت کی انتہا اور اس کے نہ جاننے پر الم کا مدار ہے نہ کمالات حقیقیہ سے بحث ہے نہ علوم مقصودہ سے اس حقیقت معاد پر خود حکماء ہی کی جماعت نے یہ اعتراض کیا ہے کہ وہاں تو سب کو حقیقت منکشف ہو جائے گی۔ مرنے کے بعد تو کوئی بھی جاہل نہ رہے گا پھر صاحب جہل کو رنج و تکلیف کیوں ہو گی اس کا کچھ جواب نہیں دیا جا سکا غرض یا ابہمہ کہ یہ لوگ معاد ثانی کے صحیح طور پر قائل نہ تھے اور جس معاد کے قائل تھے وہ محض مہمل تھی مگر موت کے قائل تھے اور تھے عاقل تو اس کے استحضار سے ان کی یہ حالت تھی کہ حکماء کے ایسے ایسے واقعات منقول ہیں جیسے ہمارے اہل اللہ کے۔ چنانچہ یہ لوگ خلوت نشین عزلت گزیں رہتے تھے۔ ریاضات اور مجاہدات بہت کرتے تھے۔ لذات دنیا و سامان عیش و عشرت سے بہت بچتے تھے۔ یہ آجکل ہی کی نئی حکمت ہے جس میں خلوت نشینی پر اعتراض کیا جاتا ہے۔ اس کا نام حکمت نہیں بلکہ حکومت ہے۔ آج کل ساری حکمت کا خلاصہ یہ ہے کہ جس طرح ہو تمام دنیا کو مسخر کر لیا جائے چنانچہ بعضے کرۂ مریخ تک پہونچنے کی کوشش کر رہے ہیں تاکہ وہاں کی مخلوق کو بھی مسخر کیا جائے۔ چنانچہ جس قدر ترقی صنعتوں میں ہو رہی ہے سب کا یہی خلاصہ ہے بس مادہ پرستی غالب ہے، روحانیت کا پتہ بھی نہیں تو اس کو حکمت کہنا حکمت کے نام کو بدنام کرنا ہے جس کو حکمت و دانائی سے ذرا بھی مس ہو گا وہ موت کا خیال کر کے دنیا سے ضرور دل برداشتہ ہو گا اور ترقی روحانیت کا ساعی ہو گا چنانچہ حکمائے یونان کو گو صحیح حکمت تو حاصل نہ تھی مگر خیر وہ آجکل کی جدید حکمت سے بدرجہا اچھی تھی اس کا یہ اثر تھا کہ وہ لوگ تزکیہ روح اور صفائی نفس کی بہت کوشش کرتے تھے۔ اس کے لئے خلوت نشینی

اختیار کرتے تھے۔ دنیا سے ان کا دل بجھ گیا تھا لذات کو ترک کرتے تھے۔

افلاطون کی حکایت ہے کہ سالہا سال ایک پہاڑ پر رہا کرتا تھا کسی سے ملتا نہ تھا خدمت کے لئے صرف ایک شاگرد پاس رہتا تھا۔ جب کوئی افلاطون سے ملنا چاہتا تو اسی شاگرد کو حکم دیتا کہ اس شخص کی تصویر ہمارے سامنے پیش کرو ظالم کو علم قیافہ ایسا صحیح حاصل تھا کہ تصویر سے پہچان لیتا تھا کہ اس شخص کے اخلاق و عادات کیسے ہیں یہ ملنے کے قابل ہے یا نہیں اگر ملنے کے لائق ہوتا تھا تو اندر آنے کی اجازت دیتا ورنہ صاف کہدیتا کہ تم ملنے کے قابل نہیں ہو چاہے کوئی بادشاہ ہوتا یا وزیر مالدار ہوتا یا رئیس کسی کی پروا نہ کرتا تھا حکماء کے استغنا کے واقعات بکثرت ویسے ہی ہیں جیسے ہمارے اہل اللہ کے ہیں حتیٰ کہ اگر وہ واقعات لکھ کر نام نہ ظاہر کیا جائے تو دیکھنے والے یہی سمجھیں گے کہ یہ کسی ولی اللہ اور بڑے بزرگ کے واقعات ہیں۔ تو بات کیا تھی کہ موت کے خیال نے ان عقلاء کے دل کو دنیا سے سرد کر دیا تھا۔ دنیا کی طمع و حرص ان کے دل میں نہ رہی تھی اسی کا یہ اثر تھا کہ اہل دنیا سے ان کو پورا استغنا رہتا وہ کسی کی بھی پروا نہ کرتے تھے۔

صاحبو! قاعدہ کی بات ہے کہ جب دنیا سے دل خالی ہو جاتا ہے تو پھر آخرت ہی ذہن میں آئے گی کیونکہ دل کا بالکل خالی رہنا تو ممکن نہیں کچھ نہ کچھ اس میں ضرور رہیگا تو موت کے استحضار سے جب دنیا قلب سے نکل جائے گی تو آخرت کا خیال ضرور پیدا ہوگا۔ اس لئے اہل طریق کا قول صحیح ہے کہ فی الجملہ اصلاح کے لئے استحضار معاد اول بھی کافی ہے۔ اس پر شاید کسی کو یہ سوال ہو کہ حکماء کو تو ان کے دل سے تو دنیا نکل گئی تھی پھر ان کے ذہن میں آخرت کیوں نہ آئی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ آئی تھی مگر تام کیونکہ صرف عقل سے تو آخرت کا علم ناقص ہی ہو سکتا ہے بس جو ٹوٹی پھوٹی معاد عقل سے معلوم ہو گئی تھی اسی پر جمے رہے علم تام وصحیح کے لئے انبیاء کے اتباع کی ضرورت تھی اور ان لوگوں نے انبیاء علیہم السلام کا اتباع نہیں کیا گو تکذیب بھی نہیں کی بلکہ یہ کہتے تھے کہ "نحن قوم قد ہذبنا نفوسنا فلا حاجۃ لنا الی نبی یہذبنا" یعنی ہم لوگ اپنے نفوس کو مہذب بنا چکے ہیں

اس لئے ہم کو کسی مہذب بنانے والے کی ضرورت نہیں) ان لوگوں نے انبیاء کو محض جہلاء کے واسطے مانا تھا جیسا کہ یہود نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارہ میں کہا تھا کہ آپ نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) تو ہیں مگر امیین کے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) ہیں (یعنی جہلاء عرب کے) ہمارے واسطے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) نہیں ہیں ہم تو خود صاحب کتاب ہیں ہم کو نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی کیا ضرورت ہے۔ ہمارے علماء نے اس کا خوب جواب دیا ہے کہ تم کو یہ تو تسلیم ہے کہ آپ نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) ہیں اور نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) سے صدور کذب محال ہے تو اب جبکہ خود اس نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) ہی سے پوچھ لو نا کہ آپ فقط امیوں کے واسطے مبعوث ہوئے ہیں یا تمام عالم کے واسطے پس جو وہ فرمادیں اسی پر فیصلہ ہے۔ اس کا جواب یہود کے پاس کچھ نہیں تو ایسے ہی بعض حکماء نے انبیاء علیہم السلام سے ملاقات کی ہے اور چونکہ عاقل تھے اس لئے تکذیب نہیں کی بلکہ ان کی نبوت کو تسلیم کیا۔ چنانچہ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ افلاطون نے موسیٰ علیہ السلام کا زمانہ پایا ہے اور وہ آپ سے ملا بھی ہے اور کچھ سوالات بھی کئے ہیں منجملہ ان کے ایک سوال یہ مشہور ہے کہ بتلایئے کہ اگر اللہ تعالیٰ تیرانداز ہوں اور فلک کمان ہوں اور حوادث تیر ہوں تو ان سے بچ کر کہاں جائے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ تیرانداز کے پاس جا کھڑا ہو کیونکہ تیر اسی کے لگتا ہے جو تیرانداز سے دور ہو اور جو اس کے پہلو میں کھڑا ہو اس کے نہیں لگ سکتا۔ اس جواب پر افلاطون حیران ہو گیا اور کہنے لگا کہ یہ جواب نبی (علیہ السلام) کے سوا کوئی نہیں دے سکتا۔ میں تصدیق کرتا ہوں کہ آپ بیشک نبی (علیہ السلام) ہیں مگر عوام کے واسطے ہمارے واسطے نہیں کیونکہ ہم نے تو اخلاق و علوم سے اپنے کو مہذب بنالیا ہے اب ہم کو اس سے زیادہ تہذیب کی ضرورت نہیں ہاں ان لوگوں نے انبیاء کی تہذیب کو دیکھا نہیں ورنہ معلوم ہو جاتا کہ جس کو ہم تہذیب سمجھے ہوئے ہیں وہ محض تعذیب ہے اور اصل تہذیب انبیاء علیہم السلام ہی کے پاس ہے نیز انہوں نے انبیاء کے علوم کو حاصل ہی

نہیں کیا ہے ورنہ معلوم ہو جاتا کہ جن علوم پر ہم نازاں ہیں ان پر ناز کرنے کی حقیقت یہ ہے ؎

چوآں کرمیکہ در سنگے نہاں است   زمین و آسمان وے ہماں است

(مثل اس کیڑے کے جو پتھر میں پوشیدہ ہے اس کا آسمان اور زمین وہی پتھر کا سوراخ ہے)

ایسے لوگوں کے بارے میں حق تعالیٰ فرماتے ہیں فَرِحُوا بِمَا عِنْدَهُم مِّنَ الْعِلْمِ کہ جو ذرا سا علم ان کے پاس ہے اسی پر اتراتے ہیں۔ قاضی ثناء اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے تفسیر مظہری میں لکھا ہے کہ اس کے عموم میں حکماء بھی داخل ہیں بہر حال معلوم ہو گیا کہ حکماء کے دل سے بھی جب دنیا نکل گئی تھی تو آخرت ہی ان کے ذہن میں آئی تھی مگر جیسی ٹوٹی پھوٹی حقیقت ان کے پاس تھی ویسی ہی آئی اور ہم چونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے غلام ہیں تو ہمارے ذہن سے جب دنیا نکلے گی پھر آخرت کما حقہ صحیح طور پر ہمارے ذہن میں آئے گی کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت سے آخرت کی صحیح اور تمام حالت ہم کو معلوم ہو چکی ہے۔ غرض نسخے متعدد ہیں چاہے معاد ثانی کا استحضار کرو یا معاد اول کا کسی کا تو خیال کرو مگر افسوس ہم کسی نسخہ سے بھی کام نہیں لیتے۔ اور اگر کسی کو موت کا استحضار بھی اس وجہ سے دشوار معلوم ہوتا ہو کہ وہ مستقبل ہے ابھی تک اس کا وقت نہیں آیا اور معدوم کا تصور مشکل ہے تو میں آپ کو ایسے موجود کا تصور بتلاتا ہوں جس سے اس مستقبل کا تصور سہل ہو جاوے آپ اسی سے کام لیجئے وہ یہ کہ اہل تحقیق نے لکھا ہے کہ ہمارے اندر دو چیزیں ہیں ایک جسم، ایک روح ان میں سے ایک سفلی ہے ایک علوی ہے اور ہر ایک کا مبدا و معاد الگ الگ ہے جسم تو سفلی ہے اور اس کا مبدا و معاد تو زمین ہی ہے چنانچہ یہ آیت بھی جو کہ میں نے تلاوت کی ہے اس کی دلیل ہے۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں مِنْهَا خَلَقْنَاكُمْ وَفِيهَا نُعِيدُكُمْ اور روح علوی ہے اس کا مبدا و معاد آسمان ہے وہ آسمان ہی سے آئی ہے اور مرنے کے بعد آسمان ہی پر چلی جاتی ہے کیونکہ روح سے مراد روح انسانی ہے جس سے ادراک معقولات ہوتا ہے۔ روح طبی مراد نہیں جو کہ دم سے متولد ہے۔

روح انسانی کو سفلی کوئی نہیں کہتا سب نے علوی مانا ہے یہ الگ اختلاف ہے کہ وہ مجرد ہے یا مادی۔ اگر مجرد ہے جیساکہ حکماء نے بھی کہا ہے کیونکہ جس چیز کو وہ نفس ناطقہ کہتے ہیں وہی روح انسانی ہے اور نفس ناطقہ کو ان لوگوں نے بھی مادی نہیں مانا بلکہ مجرد کہا ہے اور یہی صوفیہ کی بھی تحقیق ہے کہ روح مجرد ہے تب تو علوی بایں معنی ہے کہ فوق الاجسام ہے اور یہی محمل ہوگا صوفیہ کے نزدیک روح کے فی السماء ہونے کا جیساکہ یہی محمل ہے علماء ظاہر کے نزدیک بھی احادیث کون اللہ فی السماء کا۔ اور اگر مادی ہے جیساکہ متکلمین کا قول ہے کہ انہوں نے اسے جسم مانا ہے مگر جسم علوی لطیف تب وہ علوی بایں معنی کہ اس کا جزء عالی ہے۔

پس ثابت ہوا کہ روح کے علوی ہونے پر سب کا اتفاق ہے اور ہم کو سب سے کیا لینا کوئی بھی نہ مانے تو کیا جب کہ قرآن و حدیث سے ثابت ہے کہ روح کا مبداء و معاد آسمان ہے معاد ہونا تو صراحۃً اور مبداء ہونا قیاساً چنانچہ حدیث میں روح کی حالت وارد ہے۔

"حتی تخرج ثم یعرج الی السماء فیفتح لھا الی قولہ حتی تنتھی الی السماء التی فیھا. الحدیث (مشکوٰۃ عن ابن ماجہ) یعنی جب آدمی مرتا ہے تو فرشتے اس کی روح کو آسمان پر لے جاتے ہیں اس سے یہ تو ظاہر ہے کہ روح کا معاد آسمان ہے اور مبداء ہونا اس طرح معلوم ہوا کہ موت کے بعد جسم کے لئے دفن کا حکم دیا گیا ہے جس میں حکمت یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس کو اصل کی طرف لوٹا دینا مقصود ہے۔ جب جسم کا مبداء زمین تھی اور اس کو جسم کا معاد بنایا گیا اور روح کے لئے آسمان پر لے جانا بتلایا جس سے معلوم ہوا کہ آسمان معاد روح ہے اور یہ بھی معلوم ہو چکا کہ معاد اسی کو بنایا ہے جو مبداء تھا تو معلوم ہوا کہ آسمان ہی روح کا مبداء بھی ہے پس جسم کا مبداء و معاد تو زمین ہوئی اور روح کا مبداء و معاد آسمان ہوا۔ اور موت کے بعد روح کا آسمان کی

طرف جانا جس طرح حدیث مذکور سے ثابت ہے اسی طرح قرآن سے بھی مفہوم ہوتا ہے
چنانچہ کفار کے بارہ میں حق تعالیٰ فرماتے ہیں لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ أَبْوَابُ السَّمَاءِ وَلَا يَدْخُلُونَ
الْجَنَّةَ حَتَّىٰ يَلِجَ الْجَمَلُ فِي سَمِّ الْخِيَاطِ یعنی ان کے لئے آسمان کے دروازے
نہ کھولے جائیں گے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ روحیں ان کی بھی آسمان پر جانا چاہتی ہیں
مگر ان کو دھکے دیدیئے جائیں گے پس یہ دعویٰ بھی ثابت ہو گیا کہ آسمان روح کا مبدا و معاد
ہے اور آسمان و زمین دونوں اس وقت سامنے موجود ہیں تو ان کو اس نظر سے دیکھتے رہنا
معاد مستقبل کے استحضار کو سہل کر دیتا ہے اور اب مناسبت مقام سے استطراداً ایک
تو اس پر شیخ اکبر نے یہ تفریع کی ہے کہ عالم آخرت اس وقت موجود ہے تفصیل اس کی یہ ہے
کہ عالم آخرت کے دو جزء ہیں ایک زمان آخرت جس میں جزا سزا شروع ہو جاوے اور
اعمال کا صلہ مل جاوے وہ تو بعد میں آئے گا اور ایک مکان آخرت وہ اس وقت بھی
موجود ہے یعنی آسمان اور عالم بالا چنانچہ آسمان کا موجود ہونا تو مشاہد ہے اور احادیث
سے معلوم ہوتا ہے کہ جنت ساتویں آسمان پر ہے اور یہ بھی ثابت ہے کہ جنت موجود
ہے تو معلوم ہوا کہ مکان آخرت اس وقت موجود ہے اس تحقیق سے بہت سے اشکالات
سہولت کے ساتھ حل ہو گئے مثلاً ایک اشکال یہ ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم
کو شب معراج میں رویت حق کیونکر ہوئی جبکہ دنیا میں رویت حق محال عادی ہے
اس تحقیق کے بعد جواب آسان ہو گیا کہ آپ کی رویت دنیا میں نہ تھی بلکہ عالم آخرت
میں تھی کیونکہ مکان آخرت اب بھی موجود ہے اس پر شاید یہ اشکال ہو کہ گو آپ
اس وقت مکان آخرت میں تھے مگر آپ کی حیات تو دنیوی تھی پھر حیات دنیویہ
رویت کی کیسے متحمل ہوئی اس کا جواب یہ دیا جائے گا کہ جیسے زمان آخرت میں یہ خاصیت
ہے کہ اس وقت تحمل رویت ہو جائے گا ایسے ہی مکان آخرت میں بھی یہ خاصیت ہے
کہ جو وہاں پہنچ جائے اس میں تحمل رویت پیدا ہو جاتا ہے گو وہ حیات دنیا وہی سے
متلبس ہو آخرت کے مکان و زمان دونوں کی خاصیت دنیا سے الگ ہے اور
یہاں سے زمانہ بازیوں کے بیہودہ تمسخر کا بھی جواب ہو گیا جو وہ اہل سنت کے اس عقیدہ پر

کہ عیسیٰ علیہ السلام آسمان پر زندہ موجود ہیں کیا کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اگر وہ آسمان پر زندہ ہیں تو کھاتے کہاں سے ہیں اور ہگتے موتتے کہاں ہیں اسی قسم کی بے ہودہ باتیں بکتے رہتے ہیں۔ جواب یہ ہے کہ عالم آخرت کی خاصیت سے دنیا کی خاصیت پیدا ہے، وہاں کھانا پینا ایسا ہضم ہو جاتا ہے کہ فضلہ بالکل نہیں رہتا جیسا کہ اہل جنت کے بارہ میں حدیث میں آیا ہے کہ وہ ہگنے موتنے سے پاک ہوں گے بس کھانا کھا کر ان کو مشک جیسا خوشبودار پسینہ آئے گا اور کچھ نہ ہوگا گویا فضلہ اندازکم ہوگا کہ پسینہ ہی کی راہ سے نکل جائے گا ایسے ہی عیسیٰ علیہ السلام کو صرف پسینہ آجاتا ہوگا اور کچھ ضرورت نہ ہوتی ہوگی۔ رہا یہ کہ کھاتے کہاں سے ہیں اس کا جواب ظاہر ہے کہ جنت آسمان ہی پر ہے ممکن ہے کہ وہاں سے فرشتہ کے ذریعہ سے ان کے لئے غذا پہنچتی ہو اور یہ بھی تو ممکن ہے کہ عیسیٰ ؑ کو بھوک پیاس ہی نہ لگتی ہو خدا تعالیٰ بدون غذا کے بھی تو زندہ رکھ سکتے ہیں کیونکہ جس نے غذا میں قوت ابقا رکھی ہے وہ بدون غذا کے بھی اس قوت کو پیدا کر سکتا ہے اگر قوت ابقا کے لئے غذا کا واسطہ ضروری ہے تو خود غذا میں جو قوت ابقا ہے کیا اس کے لئے بھی غذا کا واسطہ ہے تو پھر غذا کے لئے غذا لازم آئے گی پھر اس میں بھی ہم کلام کریں گے اسی طرح سلسلہ چلتا رہا کہ ہر غذا کے لئے دوسری غذا کا واسطہ بتایا گیا تو تسلسل مستحیل لازم آئے گا پس لامحالہ کسی جگہ یہ کہنا پڑے گا کہ اس غذا میں قوت ابقا بلا واسطہ پیدا ہوئی ہے معلوم ہوا کہ اس قوت کے لئے غذا کا واسطہ لازم نہیں حق تعالیٰ بلا واسطہ غذا بھی اس قوت کو پیدا کر سکتے ہیں پھر اگر عیسیٰ علیہ السلام میں اسی طرح یہ قوت پیدا کر دی گئی ہو تو کیا استحالہ ہے پھر دنیا میں ہم مشاہدہ کرتے ہیں کہ حق تعالیٰ بعض لوگوں کو بدون غذا کے ہفتوں اور مہینوں زندہ رکھتے ہیں چنانچہ مریض بعض دفعہ مہینہ بھر تک کچھ نہیں کھاتا اور زندہ رہتا ہے۔ اب یہاں تاویل کی جاتی ہے کہ اس مریض کے جسم میں رطوبات فضلیہ بہت پیدا ہو گئے ہیں معدہ ان کے تحلیل میں مشغول ہے اس لئے بھوک نہیں لگتی اور نہ حیات پر کچھ اثر پڑتا ہے۔ مگر یہ محض بات کا بنانا اور تاویل گھڑنا ہے میں کہتا ہوں کہ تندرست آدمی تو مریض سے زیادہ مرطوب

ہوتا ہے۔ غریب بیمار جس کا چہرہ بھی زرد اور ہاتھ پیر بھی لاغر ہو جاتے ہیں جو قلت دوران خون کی علامت ہے کیا ہٹے کٹے سرخ و سپید رنگ والے سے زیادہ مرطوب ہو سکتا ہے۔ ہرگز نہیں پھر ذرا کوئی تندرست تو مہینہ بھر بھوکا رہے کہ غذا کا دانہ بھی اس کے حلق میں نہ جانے پائے جس طرح بیماروں کو اس طرح کئی ہفتہ اور مہینہ بھر گذر جاتا ہے۔ تندرست تو یقیناً ہلاک ہو جائے مگر بیماروں کو حق تعالیٰ اپنی قدرت سے بدون غذا کے زندہ رکھتے ہیں تو کیا جس نے مہینہ بھر بدون غذا کے زندہ رکھا وہ اس سے زیادہ مدت تک بغیر غذا کے زندہ رکھنے پر قادر نہیں ضرور قادر ہے۔

اور اگر یہ بھی سمجھ میں نہ آئے تو یوں سمجھو کہ غذا کی دو قسمیں ہیں ایک ظاہری ایک باطنی، جس طرح غذا ظاہری سے قوت و حیات باقی رہتی ہے اسی طرح کبھی غذائے باطنی بھی اس کی قائم مقام ہو جاتی ہے۔

چنانچہ دنیا میں صوفیہ کے واقعات بکثرت اس قسم کے منقول ہیں کہ وہ مہینوں محض ذکر اللہ پر اکتفا کرتے تھے۔ اور بہت دنوں کے بعد کھانا کھاتے تھے۔

حضرت شیخ علی صابر کلیری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی حکایت متواتر اور مشہور ہے کہ زندگی بھر میں ان کے پیٹ کے اندر چند سیر سے زیادہ غذا نہیں پہنچی اور اس پر قوت کی یہ حالت کہ حضرات صوفیہ کی عمریں عام آدمیوں سے طویل ہوتی ہیں، آخر یہ کس چیز کی طاقت تھی محض ذکر الٰہی کی کہ وہ ان کے لئے غذا کا قائم مقام بن گیا تھا اس لئے ان کو غذا کی بہت کم ضرورت ہوتی تھی اور باوجود تقلیل غذا کے ان کی قوت میں کمی نہ آتی تھی تو ممکن ہے کہ حضرت عیسےٰ علیہ السلام کے لئے یہی غذائے باطنی ظاہری غذا کے قائم مقام بن گئی ہو اور چونکہ عالم آخرت کی خاصیت دنیا کی خاصیت سے الگ ہے تو ممکن ہے کہ یہاں اگر غذائے باطنی مہینہ بھر یا چالیس دن تک غذائے

ظاہری کی قائم مقام ہوتی ہے تو وہاں برسوں اور مدت دراز تک اس کے قائم مقام ہو جاتی ہے۔ آخر اس میں استحالہ کیا ہے۔

بہر حال شیخ کی اس تحقیق نفیس سے بہت سے اشکالات کا حل ہو گیا اور اس عالم آخرت کا تصور بالفعل بھی آسان ہو گیا کیونکہ عالم آخرت باعتبار مکان کے اس وقت بھی موجود ہے۔ پس یہاں دو تصور ہوئے ایک روح کے مبدأ و معاد یعنی آسمان کا کہ وہ آخرت ہے، دوسرے جسم کے مبدا و معاد کا کہ وہ زمین ہے اور یہ دونوں ہر وقت پیش نظر ہیں جس سے تصور میں کوئی تکلف ہی نہیں کرنا پڑتا بس اسی طرح تصور کیجئے کہ روح کا مبدأ و معاد سر کے اوپر ہے ایک دن روح جسم سے الگ ہو کر اوپر چلی جائے گی اور جسم کا مبدأ و معاد زمین ہے ایک دن یہ روح سے الگ ہو کر مٹی میں مل جائے گا۔ اور زمین کا جسم کے لئے مبدأ و معاد ہونا قرآن کا جس طرح مدلول ہے اسی طرح مشاہد بھی ہے۔

چنانچہ معاد ہونا تو بہت ہی ظاہر ہے، رات دن اس کا مشاہدہ ہوتا ہے کہ بہت سے بدن مرنے کے بعد پیوند زمین ہو گئے ہیں۔ باقی مبدأ ہونا اس طرح ہے کہ جسم انسان کی ترکیب عناصر اربعہ سے ہے جس میں غلبہ تراب کو ہے اور تراب کا جز و ارض ہونا ظاہر ہے۔ معلوم ہوا کہ اصل مادہ جسم انسانی کا ارض ہی ہے۔ اسی طرح سے اس کا مبدأ زمین ہے۔

دوسرے انسان کا جو مادہ ہے یعنی نطفہ وہ انہی غذاؤں سے پیدا ہوتا ہے چنانچہ باپ ماں قسم قسم کی غذائیں کھاتے ہیں جن سے ان کے بدن میں خون پیدا ہوتا ہے اور اس خون کے جوہر سے نطفہ بنتا ہے۔ پھر نطفہ سے اولاد ہوتی ہے بس یہ کہنا صحیح ہے کہ انسان کا مبدأ زمین ہے کیونکہ یہ غذائیں سب زمین میں ہی سے پیدا ہوتی ہیں۔ اور یہاں سے معلوم ہوا کہ جس طرح زمین میں نباتات کا تخم موجود ہے اسی طرح حیوانات اور انسان کا تخم بھی زمین ہی کے اندر موجود ہے۔ دیکھئے زمین کے بعض اجزاء سے درختوں کے پتے بنتے ہیں اور اسی کے بعض اجزاء سے لکڑی بنتی ہے۔

(تمام حاشیہ)

اور بعض اجزاء لطیف سے انار کا دانہ اور انگور اور سیب اور مٹھائی کھٹائی اور تمام اقسام کے مزے بھی بنتے ہیں اور ظاہر ہے کہ ان سب کی اصل زمین کے اندر ہے۔ جبھی تو ثمرات میں ان کا ظہور ہوتا ہے اسی طرح زمین کے اندر ایسا تخم بھی ہے جس سے نطفہ بنتا ہے جو انسان کی اصل ہے تو زمین کے اندر انسان کا بھی تخم موجود ہوا۔ اسی طرح زمین میں چاندی سونے کی بھی اصل موجود ہے، یاقوت اور عقیق وغیرہ کی اصل بھی موجود ہے۔ مگر چاندی پھلوں کی ایسی اصل کو نکال کر اور ان کو ترکیب دے کر پھل ظاہر کر دیتے ہیں پس وہ زمین کے اجزاء میں سے انار کی اصل کو الگ نکال لیتے ہیں وہ انار ہی میں پہنچتی ہے اور انگور وغیرہ کی اصل کو جدا نکالتے ہیں اس کا انگور بن جاتا ہے ایسے ہی وہ زمین کے اجزاء میں سے انسان کی اصل کو جدا نکال کر نطفہ بنا دیتے ہیں جس سے دوسرا انسان بن جاتا ہے۔ غرض زمین ہی کے اندر تمام اشیاء کی اصل ہے جن کو حق تعالیٰ ترکیب خاص سے الگ الگ نکالتے رہتے ہیں کہیں خوشبو کی اصل کو نکال کر چنبیلی بیلا گلاب میں ظاہر کر دیتے ہیں کبھی مٹھاس کی اصل کو الگ کر کے گنے اور انگور سیب وغیرہ میں ظاہر کر دیتے ہیں۔ یہاں سے اس حدیث کی حقیقت بھی معلوم ہو گئی ہو گی جس میں وارد ہے کہ حق تعالیٰ مسلمانوں کو جنت میں جانے کے ساتھ ہی پہلے زمین کی روٹی کھلائیں گے۔ اس پر ملاحدہ نے اعتراض کیا ہے کہ زمین کی روٹی کیسی ہو گی کیا مسلمانوں کو ڈلے پتھر کھلائے جائیں گے۔ صاحب ڈلے پتھر تو ان کو ہی ملیں گے ہم کو تو جوہر ارضی ملیگا یعنی یہ تو معلوم ہو گیا کہ تمام لذائذ اور ہر قسم کے مزے زمین ہی کے اندر موجود ہیں سو جس طرح اس وقت حق تعالیٰ ہر مزے کو الگ الگ پھلوں میں نکال کر دیتے ہیں اس وقت تمام مزے دار چیزوں کی اصل نکال کر اس کا مزہ بنایا جائے گا وہ جوہر ارض ہو گا اس میں گیہوں، چنا، انگور، بادام، انار، سیب اور ہر قسم کی لذیذ چیزوں کا مزا موجود ہو گا۔ اس کی روٹی بنا کر مسلمانوں کو کھلائی جائے گی۔ میں کہتا ہوں کہ اس وقت آپ جو گیہوں کی روٹی کھاتے ہیں یہ کس چیز کی روٹی ہے صاحب یہ بھی تو زمین ہی کی روٹی ہے۔ آٹا بھی تو زمین ہی کے اجزاء سے بنتا ہے۔

ضروری اطلاع:۔ خط و کتابت کرتے وقت یا اپنا پتہ تبدیل کراتے وقت اپنا خریداری نمبر ضرور تحریر فرمائیں

جس کو گیہوں میں الگ کرنے کھاتے ہیں، اور گیہوں یہ کہاں سے آیا تھا اسی مٹی میں سے جب آپ
ایک دانہ زمین میں ڈالتے ہو وہ زمین کی مٹی اور پانی کے بہت اجزاء کو کھینچکر پرورش پاتا ہے
اور اسی ایک دانہ کے ہزاروں دانے ہو جاتے ہیں مگر چونکہ اس وقت وہ مٹی کی شکل میں نہ رہتے
بلکہ صورت بدل گئی ہے اسی لئے یہ نہیں کہا جاتا کہ مٹی کھا رہے ہیں مگر حقیقت میں دیکھا جائے
تو آپ رات دن مٹی ہی کھاتے ہیں کیونکہ وہی رنگ بدل بدل کر ہر غلہ اور ترکاری اور پھل
پھلواری میں ظاہر ہوتی ہے پس سمجھ لو کہ حق تعالیٰ قیامت میں زمین کے انہی عمدہ اجزاء کو
جنہیں آجکل تم بہت شوق سے کھاتے ہو یکجا جمع کر کے مسلمانوں کو کھلائیں گے پھر اس کو
ڈلے پتھر اور مٹی کہنا کیونکر صحیح ہے اور حقیقت کے اعتبار سے کہو تو آجکل جتنی بھی چیزیں تم
کھاتے ہو وہ سب بھی مٹی ہی ہیں اور صورت کے اعتبار سے جیسے یہ مٹی نہیں اسی طرح وہ
بھی مٹی نہ ہوگی بلکہ صورت اور مزے میں آجکل کی غذاؤں سے وہ بہت زیادہ خوشنما اور
الذ ہوگی۔ کیونکہ اس میں تمام لذائذ کے مزے اور سب کے رنگ موجود ہونگے۔ اب یہ سوال رہا
کہ یہ تو معلوم ہو گیا کہ وہ روٹی ڈلے پتھروں اور مٹی کی نہ ہوں گی بلکہ زمین کے ماکول اجزاء کا
جوہر اور ست ہوگا لیکن مسلمانوں کو جوہر کھلایا جائے گا اس میں حکمت کیا ہے اور جنت
کے اغذیا کے ہوتے ہوئے اجزاء ارضیہ جو اس سے بدرجہا کم درجہ ہے کھلانے کی مصلحت
کیا ہے سو حکمت بھی سنئے اس میں ایک حکمت تو یہ ہے کہ مرنے کے بعد چونکہ دنیا کی
لذیذ چیزوں کے مزے کچھ تو طول مدت کی وجہ سے اور کچھ ہول محشر کی وجہ سے لوگوں کو
یاد نہ رہے ہوں گے تو اس وقت مسلمانوں کو تمام ماکول اجزاء کا جوہر کھلا کر جو کہ ہر ماکول
کے الگ الگ کھانے سے زیادہ لذیذ ہوگا یہ بتلا دیا جائیگا کہ دیکھو دنیا کی لذائذ کا تو
یہ منتہیٰ اور خلاصہ ہے جس میں سب قسم کے مزے موجود ہیں اگر بھول گئے ہو تو ان کو چکھ لو
اور دنیا کی لذتوں کو یاد کر لو۔ اس کے بعد جنتوں کی نعمتوں کے مزے چکھو کہ وہ کس درجہ
لذیذ اور لذائذ دنیا سے کتنی بڑھی ہوئی ہیں پس خلاصہ لذائذ دنیا کھا کر اور سب کے مزے یاد
کر کے جب وہ جنت کی چیزیں کھائیں گے اور ان میں اُن میں زمین آسمان کا فرق دیکھیں گے
اس وقت ان کو نعمائے جنت کی پوری قدر ہوگی تو یہ حکمت ہوگی اس جوہر کے کھلانے میں تاکہ

نعمائے جنت کی پوری قدر ہو دوسرے یہ حکمت بھی ہوگی کہ دنیا میں بعض اللہ کے بندوں نے یا تو بوجہ غربت و افلاس کے یا بوجہ ترک لذات اور مجاہدات کے سب قسم کے مزے نہیں چکھے بعضوں نے عمر بھر بھی انگور و سیب نہیں کھایا ہوگا چنانچہ میرے ایک مخدوم نے مجھ کو خربزہ کی ایک قاش دی اور خود بھی کھائی اور کہنے لگے آج سترہ برس کے بعد خربزہ کھا رہا ہوں یہ تو معمولی لذائذ کا حال ہے اور جو لذتیں بادشاہوں اور امیروں کو عجیب و غریب نصیب ہوتی ہیں وہ تو ان بیچاروں کو کہاں نصیب۔ تو حق تعالیٰ ان مقبول بندوں کو اول زمین کا جوہر کھلائیں گے تاکہ جنت میں جانے سے ہر قسم کی لذائذ کا مزہ ان کو معلوم ہو جائے۔ پھر جنت کی نعمتوں کو چکھ کر اندازہ کریں کہ یہ دنیا کی لذتیں ان کے سامنے کیا ہیں کچھ بھی نہیں اس سے یہ فائدہ ہوگا کہ جنت میں جا کر ان کو یہ وسوسہ نہ آسکے گا کہ دنیا کی لذات سے ہم محروم ہیں یا جن کے ہم تارک رہے تھے معلوم نہیں وہ کیسی ہوں گی تو پہلے سب چیزیں انہیں کھلا دی جائیں گی تاکہ یہاں کی ہر لذت کا خوب ادراک ہو جائے تو پھر ان کے متعلق نعمائے جنت کی مساوات کا وسوسہ نہ آسکے گا۔ تو اصل دعوت تو ان خاص بندوں کی ہوگی مگر کریموں کی عادت ہے کہ مہمانوں کے طفیل میں نوکر دں اور دربانوں کو بھی دعوت کے دن پلاؤ زردہ جو کچھ پکتا ہے دیدیتے ہیں اس طرح طفیل میں ہم کو بھی وہ جوہر کھلا دیا جائے گا خیر یہ تو درمیان میں ایک حدیث کے رفع اشکال کے طور پر گفتگو ہو گئی تھی۔

اصل میں یہ مضمون بیان کر رہا تھا کہ زمین جسم انسانی کا مبدا بھی ہے۔ جیسا کہ اس تقریر سے معلوم ہو گیا اور معاد تو ہے ہی اور آسمان روح انسانی کا مبدا و معاد ہے اور یہاں سے معلوم ہوا ہوگا کہ انسان بیچارہ کیسی کشاکشی میں ہے کہ اس کی ایک ٹانگ تو زمین میں ہے اور ایک آسمان پر ہے۔ روح تو اس کی سماوی ہے اور جسم ارضی ہے ایک جزو تو آسمان پر جانا چاہتا ہے اور ایک جزو زمین پر رہنا چاہتا ہے، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اس کا ایک جزو اسی وقت آسمان پر اور دوسرا زمین پر ہے کیونکہ روح حقیقی اب بھی آسمان ہی پر ہے وہ بدن میں حلول کئے ہوئے نہیں ہے بلکہ اوپر ہی سے بدن کی تدبیر کر رہی ہے اور جو روح انسان کے اندر ہے وہ روح اصلی نہیں ہے بلکہ نسمہ ہے جو بدن انسانی

میں حلول کئے ہوئے ہے صوفیہ نے اس کو نسمہ کہا ہے اور انہوں نے کشف سے معلوم کیا ہے کہ یہ روح حقیقی نہیں بلکہ ایک جسم لطیف ہے جو اس جسم کثیف میں حلول سریانی کئے ہوئے ہے جیسے جسم تعلیمی جسم طبعی میں حال ہوتا ہے گو جوہریت و عرضیت کا تفاوت ہے طلبہ اس کو سہولت سے سمجھ لیں گے اور یہ بھی کشف سے معلوم کیا ہے کہ وہ اسی جسم کی صورت پر ہے (غالباً مرنے کے بعد وہی آسمان کی طرف لیجائی جاتی ہے) اور روح حقیقی حال فی الجسم نہیں ہے بلکہ وہ جوہر مجرد عن المادہ ہے جس کو مادی سے حلول کا کچھ علاقہ نہیں صرف تدبیر و تصرف کا علاقہ ہے وہ آسمان سے بھی فوق ہے۔ اور اس کو سماوی بمعنی علوی کہا جاوے گا جیسا کہ اوپر مذکور ہوا ہے۔ اور اس فوق السماء ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ آسمان سے اوپر کسی مکان میں ہے کیونکہ مجرد کے لئے مکان نہیں ہوسکتا بلکہ صوفیہ کا اسے فوق السموات کہنا یہ اس کے لامکانی ہونے کی طرف اشارہ ہے کیونکہ فوق السموات مکان نہیں ہے تو فوق السماء ہونا لامکانی ہونا ہے اسی لئے استواء علی العرش کی ایک تفسیر یہ بھی کی ہے کہ اس میں حق تعالیٰ کے لامکانی ہونے کی طرف اشارہ ہے کیونکہ عرش منتہائے امکنہ ہے، تو حق تعالیٰ کا عرش فوق ہونا لامکانی ہونا ہے (پس اس تفسیر پر استویٰ علی العرش کے یہ معنی ہیں کہ خدا تعالےٰ مکان اور مکانیات کو پیدا کر کے ان میں مقید نہیں ہوا بلکہ لامکانی ہی رہا اور یہ مراد نہیں کہ پیدا کرنے کے وقت مکان یا مکانیات سے کچھ تلبس ہو گیا تھا پھر تنزہ عن المکان ہو گیا جیسا کہ لفظ "ثم استویٰ" میں ثم سے ظاہراً شبہ ہوتا ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ حق تعالےٰ جس طرح پہلے استوی علی العرش سے موصوف تھے اسی طرح بعد میں بھی رہے ثم کے یہ معنی ہیں یعنی پھر بھی وہ استویٰ ہی رہا۔ (واللہ اعلم، جامع) اور متکلمین نے روح حقیقی کو نہیں سمجھا وہ نسمہ ہی کو روح حقیقی کہتے ہیں اور صوفیہ نے جو روح حقیقی کو مجرد کہا ہے اس پر بعض متکلمین نے ان کی تکفیر کی ہے حالانکہ اس میں کوئی بھی تکفیر کی بات نہیں صوفیہ کو ایک چیز نسمہ کے سوا کشف سے معلوم ہوئی وہ اس کے قائل ہو گئے متکلمین کی نظر وہاں تک نہیں پہونچی وہ قائل نہ ہوئے مگر اس کے کیا معنی کہ وہ صاحب مشاہدہ کو کافر کہیں گے متکلمین کے اس حکم کی بنا یہ ہے کہ انھوں نے تجرد کو حق تعالیٰ کے لئے

کی خاص صفت مانا ہے پس مجرد سوائے حق تعالیٰ کے کوئی نہیں ہو سکتا اور صوفیہ ارواح کو بھی مجرد مانتے ہیں لہٰذا وہ شریک باری کے قائل ہوئے اور یہ کفر ہے مگر یہ دلیل نہایت مخدوش ہے اس لئے کہ اس کی کوئی دلیل نہیں کہ تجرد اخص صفات واجب ہے بلکہ میں ترقی کر کے کہتا ہوں کہ واجب کے اخص صفات کی تحقیق تو بہت دور ہے خود ممکنات کی صفات کے حقائق بھی جو کچھ کسی نے بیان کئے ہیں وہ قطعی نہیں ہیں حکماء اور منطقین خود اقرار کرتے ہیں کہ جنس کو عرض عام سے اور فصل کو خاصہ سے بہت اشتباہ ہے پس ممکن ہے کہ جس کو ہم نے فصل سمجھا ہے وہ حقیقت میں خاصہ ہو اور جس کو ہم جنس کہتے ہیں واقع میں وہ عرض عام ہو جب ہمارے علم کی ممکنات کے بارہ میں یہ حالت ہے تو صفات واجب میں اس کا نقص ظاہر ہے پس کسی کو حق نہیں کہ واجب کے لئے کسی خاص صفت کو مابہ الامتیاز قرار دیکر دوسروں کی تکفیر کرنے لگے چنانچہ صوفیہ نے متکلمین کی اس رائے کو تسلیم نہیں کیا وہ یہ کہتے ہیں کہ تجرد کا واجب کے لئے نقص صفات ہونا مسلم نہیں بلکہ اقرب یہ ہے کہ وجوب بالذات یہ اخص صفات واجب ہے پس غیر واجب کو مجرد ماننے سے شرک وکفر لازم نہیں آتا البتہ کفر اس وقت لازم آتا ہے جبکہ روح کو مجرد مان کر اس وقت کو واجب وقدیم بھی مانا جاوے اور یہاں ایسا نہیں کیونکہ ہمارے نزدیک مجرد بھی حادث ہو سکتا ہے ہمارے نزدیک ارواح مجرد بھی ہیں اور حادث بھی ہیں واجب اور قدیم نہیں ہیں۔

بہر حال صوفیہ کے قول پر تو انسان کی ایک ٹانگ آسمان پر اور ایک زمین پر ہونا ظاہر ہے کیونکہ وہ تو روح حقیقی کو حال فی الجسم نہیں مانتے بلکہ فوق السمٰوات کہتے ہیں اور متکلمین کے قول پر بھی ظاہر ہے کیونکہ گو ان کے نزدیک روح بدن میں حلول کئے ہوئے ہے مگر اس کا علوی ہونا اور طالب سموات ہونا ان کو بھی مسلم ہے کیونکہ وہ روح کو مثل ملائکہ کے جوہر کے مادی لطیف کہتے ہیں جس کا مبدأ ومعاد عالم ناسوت نہیں بلکہ عالم ملکوت ہے۔ پس انسان عجیب کشمکش میں ہے کبھی جسمیت کا غلبہ اس پر ظاہر ہوتا ہے کبھی روحانیت کا غلبہ جسمیت کے وقت اس سے اعمال سفلیہ صادر ہوتے ہیں۔ (معاصی وغیرہ) اور غلبہ روحانیت کے وقت اعمال علویہ ظاہر ہوتے ہیں (یعنی طاعات

وغیرہ) اور یہاں سے یہ بات معلوم ہوگئی کہ سالک کو کسی وقت مطمئن اور بے فکر ہو کر نہ بیٹھنا چاہئے کیونکہ جب تک جسم و روح کا تعلق باقی ہے اس وقت تک دونوں میں کشاکشی ضرور باقی ہے گو مجاہدہ کے بعد سخت کشاکشی تو نہیں رہتی مگر بالکل زوال بھی نہیں ہوتا اس لئے مجاہدہ کی ہر وقت ضرورت ہے گو مجاہدہ کاملہ کے بعد پہلی جیسی ضرورت تو نہیں رہتی مگر استغنا بھی نہیں ہوجاتا کیونکہ جب تک ضدین کا اجتماع باقی ہے اور ہر ضد دوسرے پر غالب ہونا چاہتی ہے اس وقت تک مجاہدہ کی ضرورت ناگزیر ہے۔ پس زندگی میں تو انسان کی یہ حالت ہے ؎

گہ رشک برد فرشتہ بر پاکی ما گہ خندہ زند دیو ز ناپاکی ما

(کبھی تو فرشتہ رشک کرتا ہے ہماری پاکی پر کبھی شیطان ہماری ناپاکی پر ہنستا ہے)

؎ ایماں چو سلامت بلب گور بریم احسنت بریں چستی و چالاکی ما

(جب ایمان سلامتی سے ہم قبر میں لیجائیں گے تو اپنی دینی ہمت اور چستی پر شاباشی دیں گے)

واقعی ایمان پر خاتمہ ہو گیا تو اس دن بےفکری ہوگی۔ اور اس دن مجاہدہ کی کامیابی ظاہر ہوگی ورنہ زندگی بھر تو یہی کشاکش لیل و نہار باقی ہے۔ یہ بیچ میں چند لطیفے استطراداً میں نے بیان کر دیئے ہیں اب اصل مضمون کی طرف عود کرتا ہوں میں یہ کہہ رہا تھا کہ ہمارے اندر دو چیزیں ہیں ایک جسم ایک روح اور ہر ایک کا ایک مبدا و معاد ہے جس کے استحضار سے غفلت کم ہوجاتی ہے اور غفلت ہی ہمارے امراض کی جڑ ہے تو حق تعالے نے ہم کو اس جگہ بتلایا ہے کہ تمہارے اندر جو ایک جزو جسم کا ہے اس کا مبدا و معاد زمین ہے جس کا مشاہدہ آسمان کے مشاہدہ سے اکثر و یسیر ہے تم اسی میں غور کرلو تو تمہارے دن بھلے ہوجائیں گے۔ یہ بھی کتنی شفقت ہے کہ حق تعالے نے ہم کو آسمان کا مراقبہ تعلیم نہ کیا کیونکہ وہ ہم سے دور ہے پھر ہر وقت آسمان کی طرف نظر کرنا اور غور کرنا بھی دشوار ہے اور زمین ہر وقت ہم سے قریب ہے اور اس پر ہر دم نگاہ پڑتی ہے تو بتلادیا کہ تم زمین پر چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے، سوتے لیٹتے اس کا تصور کیا کرو کہ ہم زمین ہی سے پیدا ہوئے ہیں تو ہماری اصل خاک ہے لہذا ہم کو خاک بن کر رہنا چاہیئے مٹی ہو کر تکبر کرنا نہایت ہی نازیبا ہے۔ پھر آخر میں بھی ہم مٹی ہی میں ملنے والے ہیں۔ یہ جسم سب خاک خوردہ ہوجائے گا اور ایک دن ہم زمین کے اوپر سے اس کے اندر

پہونچ جائیں گے تو اس کے لئے ہم کو ایسے اعمال کرنا چاہئیں جو اس وقت کارآمد ہوں حقیقت میں اس مراقبہ کو اصلاح حال میں بہت ہی تاثیر ہے۔ اس جگہ بجائے مراقبہ سمٰوات کے (جو کہ روح کا مبدأ و معاد ہے) مراقبہ زمین کی تعلیم فرمانے کا ایک نکتہ تو یہ تھا کہ زمین ہم سے بہ نسبت آسمان کے اقرب ہے۔ اور ایک نکتہ اس میں اور ہے وہ یہ کہ اس جگہ اوپر سے موسیٰ علیہ السلام کی گفتگو کا ذکر ہے جو فرعون کے ساتھ ہوئی تھی چنانچہ اوپر ارشاد ہے۔ "قال فمن ربکما یا موسیٰ" یعنی فرعون نے کہا کہ اے موسیٰ تم دونوں کا یعنی موسیٰ و ہارون علیہ السلام کا رب کون ہے اس کے جواب میں موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا۔ ربنا الذی اعطیٰ کل شیٔ خلقہ ثم ھدیٰ یہاں بھی ایک عجیب لطیفہ ہے وہ یہ کہ فمن ربکما کے بعد مقتضیٰ ظاہر یہ تھا کہ یا موسیٰ و ہارون کہا جاتا جب فمن ربکما الخ میں دونوں کو خطاب کیا گیا ہے تو ندا میں بھی دونوں کو خطاب ہونا چاہیئے مگر حق تعالیٰ نے صرف "یا موسیٰ" فرمایا ہے اس کی کیا وجہ ہے یہ وہ باتیں ہیں کہ ان کا کشف ہونے لگے تو آدمی قرآن کے لفظ پر ناچنے لگے لوگ ڈھولکی اور ستارہ پر کیا ناچتے ہیں واللہ قرآن کا لفظ لفظ نچا دینے والا ہے۔ اس میں نکتہ یہ ہے کہ بتلا دیا گیا کہ فرعون کا اصل روئے سخن حضرت موسیٰ علیہ السلام ہی کی طرف تھا انہی کی طرف متوجہ ہو کر بات کر رہا تھا ہارون علیہ السلام سے تبعاً خطاب تھا نہ کہ اصالتاً اور اس کی وجہ یہ تھی کہ فرعون نے موسیٰ کو تربیت کیا تھا جس کا عجیب قصہ ہے اور اس سے خدا تعالیٰ کی قدرت کا ظہور ہوتا ہے واقعہ یہ ہے کہ فرعون سے نجومیوں نے بطور پیشین گوئی کے کہدیا تھا کہ بنی اسرائیل میں ایک لڑکا پیدا ہوگا جو تیری سلطنت کے زوال کا سبب ہوگا۔ فرعون نے اس حکم کے بعد حکم کر دیا تھا کہ بنی اسرائیل میں جو لڑکا بھی پیدا ہو اس کو قتل کر دیا جائے اور لڑکیوں کو اس لئے چھوڑ دیا جائے کہ ان سے خطرہ نہ تھا دوسرے خدمتگاری کے واسطے ان کو ماما بنا کر رکھنے کی ضرورت تھی۔ بہر حال بنی اسرائیل کے بچے قتل ہونے لگے اسی زمانہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام پیدا ہوئے ان کی والدہ کو فکر ہوئی کہ اب یہ بھی قتل ہوں گے۔ حق تعالیٰ نے ان کو الہام کیا کہ ایک صندوق میں بند کر کے ان کو دریا میں

ڈال دو، ہم ان کو بچالیں گے پھر ان کو تمہارے پاس ہی پہنچا دیں گے۔ چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا اور زیادت احتیاط کے لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بہن سے فرمایا کہ تو کنارہ کنارہ صندوق کو دیکھتی ہوئی چلی جا اور معلوم کر کہ یہ کہاں پہنچتا ہے اور اسے کون اٹھاتا ہے وہ دور سے دیکھتی ہوئی چلتی رہی تھیں کہ صندوق فرعون کے محل سے نیچے کو گذرا کیونکہ وہ دریا اس کے محل سے ہو کر گذرتا تھا۔ اس وقت فرعون معہ اپنی بی بی کے محل کے نیچے کنارۂ دریا پر بیٹھا ہوا تھا کہ سامنے سے صندوق بہتا ہوا آیا تو اس نے اس کے نکالنے کا حکم دیا۔ جب صندوق اس کے سامنے لاکر رکھا گیا اور اس نے کھولا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نظر پڑی جو اپنا انگوٹھا چوس رہے تھے۔ موسیٰ علیہ السلام کو خدا تعالیٰ نے ایسا حسین بنایا تھا کہ ہر شخص کو صورت دیکھنے سے اُن پر محبت آتی تھی چنانچہ ارشاد بھی ہے "وَ اَلْقَیْتُ عَلَیْكَ مَحَبَّةً مِّنِّیْ" اور تجلی طور کے بعد تو یہ کیفیت ہوئی کہ کسی کو نگاہ بھر کر آپ کا چہرہ دیکھنے کی تاب نہ تھی اور جو دیکھ لیتا اس کی بینائی زائل ہو جاتی غرض آپ اس درجہ حسین تھے کہ بس دیکھتے ہی فرعون کو بے اختیار محبت آئی اور ان کو نکال کر گود میں لے لیا اور چومنے لگا۔ اس کے بعد پھر نجومیوں کی پیشین گوئی کا خیال آیا اور کھٹکا پیدا ہوا کہ یہ بچہ کہیں وہی نہ ہو اور قتل کا ارادہ کیا مگر اس کی بی بی حضرت آسیہ نے سفارش کی کہ اس سے کیا خطرہ اول تو یہی معلوم نہیں کہ یہ بنی اسرائیل سے ہے یا نہیں اور ہو بھی تو ہم اپنی حفاظت میں پرورش کریں گے، ہاتھ تلے رہے گا تو کیا خوف ہے۔ پھر ایسے خوبصورت بچہ کا قتل کرنا بھی دل کو گوارا نہیں فرعون کو خود بھی محبت آ ہی چکی تھی اس لئے ذرا سی سفارش پر اپنے خیال سے رک گیا اور موسیٰ علیہ السلام کو اپنا بیٹا بنا کر پالنا شروع کیا اب وہ شاہی فرزند کہلانے لگے اور دشمن کے ہاتھوں سے پلنے لگے خدا تعالیٰ نے کیسی اپنی قدرت ظاہر کی کہ لے کمبخت تو کہاں تک تدبیریں کرے گا ہم تیرے ہی ہاتھ سے دشمن کو پلوائیں گے۔

مولانا فرماتے ہیں ؎

در ببست و دشمن اندر خانہ بود　　　حیلۂ فرعون زیں افسانہ بود

(دروازہ بند کرلیا اور دشمن گھر کے اندر پرورش پا رہا ہے اس طرح سے فرعون کی تمام حیلہ سازی خاک میں ملگئی)

واقعی فرعون کی تدبیر ایسی ہی تھی کہ باہر تو ناحق بچوں کو مروا رہا تھا اور گھر کی خبر نہ تھی کہ جس کے لئے یہ سامان کر رہا ہوں وہ میرے ہی ہاتھ سے پل رہا ہے غرض جب وہ شاہی بیٹے ہو گئے تو دودھ پلانے کے لئے اناؤں کو بلایا گیا اس وقت موسیٰ علیہ السلام کی بہن بھی محل شاہی میں پہونچ گئیں حق تعالےٰ نے یہ تدبیر کی کہ جس عورت کا پستان حضرت موسیٰ علیہ السلام کے منہ میں دیا جاتا وہ اس کو منہ ہی میں نہ لیتے اور ہرگز دودھ نہ پیتے، اس پر فرعون کو بڑی پریشانی ہوئی کہ یہ کسی کا دودھ کیوں نہیں پیتا اس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بہن نے کہا "هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰۤى اَهْلِ بَیْتٍ یَّكْفُلُوْنَهٗ لَكُمْ وَ هُمْ لَهٗ نٰصِحُوْنَ کیا میں تم کو ایسی بی بی کا پتہ بتلاؤں جو تمہاری خاطر اس بچہ کو اچھی طرح پرورش کر دیں اور وہ اس کی خیر خواہ بھی ہیں۔ اہل سیر نے لکھا ہے کہ ان کے اس قول پر "وھم لہ ناصحون" فرعون کھٹک گیا اور کہا کہ یقیناً تجکو معلوم ہے کہ یہ بچہ کس کا ہے جبھی تو یہ کہتی ہے کہ وہ اس کی خیر خواہ بھی ہیں ورنہ تجکو یہ کیا معلوم ہوتا کہ اس کا خیر خواہ کون ہے کون نہیں۔ موسیٰ علیہ السلام کی بہن بڑی سمجھدار اور فہیم تھیں کیوں نہ ہو آخر کس خاندان کی تھیں فوراً جواب دیا کہ لہ کی ضمیر اس بچہ کی طرف عائد نہیں بلکہ فرعون کی طرف عائد ہے اور مطلب یہ ہے کہ وہ لوگ سرکاری خیر خواہ بھی ہیں (کانت فہیمۃ اللہ درہا ۱۲) خیر اس جواب سے اطمینان سا ہوا تو فرعون نے کہا اچھا ان بی بی کو بلا کر لاؤ چنانچہ وہ اپنی والدہ کو بلا لائیں ان کا پستان منہ میں جاتا تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اچھی طرح دودھ پینے لگے۔ فرعون نے آپ کی والدہ سے کہا کہ یہ بچہ تمہارا ہی معلوم ہوتا ہے ورنہ اس کی کیا وجہ کہ تمہارے سوا اس نے کسی کا دودھ بھی نہ پیا۔ انہوں نے فرمایا کہ حضور اتنے سے بچہ کو ماں باپ کی کیا سمجھ لایئے آپ جس عورت کا چاہیے بچہ لے آیئے وہ بھی ضرور میرا دودھ پی لے گا وجہ یہ ہے کہ بعض عورتوں کا دودھ خراب ہوتا ہے اس لئے بعضا بچہ ایسی عورتوں کا دودھ نہیں پیتا، میرا دودھ نہایت عمدہ ہے اس لئے اس نے خوشی سے لے لیا اور ہر بچہ اسی طرح پی لے گا۔ یہاں بھی وہ لاجواب ہوا اور آپ کی والدہ

کو معقول تنخواہ پر اپنے محل میں رکھا کہ تم ہی اس بچہ کو دودھ پلاؤ چنانچہ خدا تعالے نے اس طرح آپ کی ماں کو بھی ان سے ملا دیا اور پرورش ہوتی رہی حتی کہ بڑے ہوئے اور جوان ہوئے اور شاہی فرزند کہلانے کی وجہ سے سب کی نگاہوں میں معظم و محترم رہے۔ پھر ایک قبطی کا خون آپ کے ہاتھ سے ہو گیا تھا۔ اس کی وجہ سے روپوش ہو کر مدین پہونچ گئے دس سال کے بعد وہاں سے واپس ہوئے اور راستہ میں نبوت سے مشرف ہو کر فرعون کو تبلیغ کرنے کے لئے مصر میں تشریف لائے۔ اس وقت ہارون علیہ السلام آپ کے ساتھ تھے کیونکہ وہ بھی موسیٰ علیہ السلام کی درخواست پر نبی بنا دیئے گئے تھے دونوں صاحبوں نے آکر اس سے کہا اِنَّا رَسُوْلَا رَبِّكَ فَاَرْسِلْ مَعَنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ وَلَا تُعَذِّبْهُمْ قَدْ جِئْنٰكَ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ وَالسَّلٰمُ عَلٰى مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى اِنَّا قَدْ اُوْحِيَ اِلَيْنَآ اَنَّ الْعَذَابَ عَلٰى مَنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى
چونکہ فرعون موسیٰ علیہ السلام سے اچھی طرح واقف تھا اور ان پر ایک قسم کا ناز بھی تھا اس لئے اسی کی طرف روئے سخن کیا ہارون علیہ السلام کی طرف اصل خطاب نہ تھا اس واسطے فَمَنْ رَّبُّكُمَا کے بعد یا موسیٰ کہا گیا۔ یا ہارون و موسیٰ نہیں کہا گیا۔ اس سوال کے جواب میں موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ ہمارا پروردگار وہ ہے جس نے ہر شے کو وجود عطا کیا پھر اسباب بقا کی طرف ہر شے کی رہنمائی کی (چنانچہ ہر مخلوق اپنے بقا کا ذریعہ پیدا ہوتے ہی ڈھونڈھنے لگتا ہے۔ مرغی کا بچہ زمین پر چونچ مارتا ہے اور انسان کا بچہ پستان کو ڈھونڈھنے لگتا ہے وغیرہ وغیرہ) اس کے بعد فرعون نے یہ سوال کیا قال فما بال القرون الاولیٰ کہ پہلے لوگوں کا کیا حال ہے (جو مر چکے ہیں) اس سوال کی وجہ یہ تھی کہ موسیٰ علیہ السلام کے کلام میں یہ حکم تھا اَنَّ الْعَذَابَ عَلٰى مَنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى جس سے مقصود تکذیب پر وعید سنانا تھا۔ اس پر یہ سوال کیا کہ الوہیت و رسالت کے مکذبین بہت گذرے ہیں ان کی حالت عذاب میں کیا ہوئی قَالَ عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ فِيْ كِتٰبٍ لَا يَضِلُّ رَبِّيْ وَلَا يَنْسَى موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ اس کا علم خدا ہی کے پاس ہے ایک کتاب میں اسے اس نے سب محفوظ کر رکھا ہے محض علم پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ اتمام حجت کے لئے سب لکھ دیا ہے) میرے پروردگار کو غلطی اور بھول نہیں ہوتی پس

لکھنا اس غرض سے نہیں ہے کہ یاد رہے بلکہ اور حکمتوں کی بنا پر ہے پس حالت تو ان کی علم الٰہی میں منضبط ہے۔ اب صرف انتظار وقت موعود آنے کا ہے اس وقت عذاب اکبر کا ظہور ہو جاوے گا آگے حق تعالیٰ کے کمال علم و حکمت کو چند واقعات مشاہدہ سے ثابت کیا ہے تاکہ ان کا قادر ہونا بھی ثابت ہو جاوے اور ایقاع وعید کے لئے اسی علم و قدرت کی ضرورت ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے اَلَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ مَهْدًا وَّسَلَكَ لَكُمْ فِيْهَا سُبُلًا وَّ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً جس نے زمین کو تمہارے لئے بستر بنایا (جو نہ بہت سخت ہے لوہے کے مانند جس پر لیٹنے بیٹھنے سے جسم کو تکلیف ہو نہ بہت نرم ہے گارے کے مانند جس میں پاؤں دھنسنے لگے اور یہ کمال حکمت ہے) اور اس میں تمہارے لئے راستے چلائے (اگر زمین بہت سخت یا بہت نرم ہوتی تو اس پر راستوں کے نشانات یا تو قائم ہوتے یا باقی نہ رہتے تو چلنے والے کو پتہ نہ چلتا کہ اب راستہ کدھر کو ہے یہ بھی کمال حکمت ہے کہ زمین کو ایسا بنایا ہے جس پر مختلف راستے الگ الگ محفوظ رہتے ہیں) اور آسمان سے پانی اتارا (یہ بھی کمال حکمت پر مبنی ہے) اس کے بعد ارشاد ہے فَاَخْرَجْنَا بِهٖ اَزْوَاجًا مِّنْ نَّبَاتٍ شَتّٰى كُلُوْا وَارْعَوْا اَنْعَامَكُمْ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِی النُّهٰى۔ پھر ہم نے پانی کے ذریعے سے قسم قسم کی نباتات پیدا کیں ان میں سے خود بھی کھاؤ اور اپنے جانوروں کو بھی چراؤ اس میں عقل والوں کے لئے بڑی نشانیاں ہیں (کمال قدرت الٰہیہ غیر متناہیہ کی)۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اوپر تو حق تعالیٰ کا ذکر غیبت کے صیغوں سے تھا یہاں تکلم کے ساتھ ہونے لگا۔ اہل ظاہر نے تو اس کا یہ جواب دیا ہے کہ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ تک موسیٰ علیہ السلام کا کلام تھا انھوں نے تو بارش کے نازل ہونے پر گفتگو کو ختم کر دیا تھا آگے حق تعالیٰ نے پیدائش نباتات کا ذکر تتمیم کلام کے لئے بڑھا دیا اور بتلا دیا کہ پانی سے نباتات کا پیدا ہونا نہایت عجیب حکمت پر مبنی ہے اور بعض مغلوبین اہل حال نے کہا ہے کہ نہیں یہ بھی موسیٰ علیہ السلام ہی کا کلام ہے اس وقت ان پر وحدۃ الوجود کا غلبہ ہو گیا تو غائبانہ ذکر چھوڑ کر تکلم کے ساتھ فرمانے لگے کہ پھر ہم نے پانی سے نباتات کو نکالا اور اس وقت موسیٰ علیہ السلام کا "فاخرجنا" فرمانا ایسا ہی تھا جیسا کہ

شجرۂ طور نے کہا تھا اِنِّیۡ اَنَا اللّٰہُ رَبُّ الۡعٰلَمِیۡنَ " یہ اہلِ حال بڑی دور کی بات کہتے ہیں ان کو ہر شخص نہیں سمجھ سکتا طلبہ تو وہی جواب سمجھ لیں جو اہلِ ظاہر نے دیا ہے وہ اہل حال کی باتوں میں غور نہ کریں مگر ان پر انکار بھی نہ کریں (کیونکہ یہ ضرور نہیں کہ جو بات تمہارے سمجھ میں نہ آئے وہ غلط ہی ہو)

بہرحال چاہے موسیٰ علیہ السلام کا کلام ہو یا حق تعالےٰ نے ان کے کلام کو پورا کیا ہو یہ مضمون اسی گفتگو کے متعلق ہے جو فرعون سے ہو رہی تھی اس لئے یہاں حق تعالےٰ نے مراقبۂ ارض ہی کی تعلیم فرمائی کیونکہ فرعونی "مراقبۂ ارض" ہی کے قابل تھے "مراقبۂ سمار" کے قابل نہ تھے۔ یہ بھی اس مقام پر ایک نکتہ ہے جس میں ہم پر بھی یہ چھینٹا ہے کہ تم فرعون اور اس کی قوم کی طرح غبی ہو اس لئے تم کو بھی مراقبہ ارض کی تعلیم کی جاتی ہے (یہ تیسرا نکتہ ہے ۱۲) مگر حق تعالےٰ کے یہاں ایسے اغبیا کی بھی دوا موجود ہے وہ اذکیا کو مراقبۂ سماء تعلیم فرماتے ہیں (جیساکہ ایک مقام پر ارشاد ہے وَیَتَفَكَّرُوۡنَ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وقدم فیہ السموات لان المقام مقام مدح لولی الالباب ۱۲ جامع) اور اغبیا کو مراقبہ ارض بتلاتے ہیں وہ زمین ہی کا مراقبہ کرلیں تو ان کے دن بھلے ہو جائیں۔ اور اس کا سہل طریقہ یہ ہے کہ زمین پر چلتے ہوئے یہ سوچو کہ اس وقت ہم اوپر چل رہے ہیں اور عنقریب زمین کے نیچے اتریں گے۔ موت کا خیال بھی نہ ہو تو صرف اتنا ہی سوچ لینا بھی کافی ہے پھر اس سے یہ سوچ پیدا ہوگی کہ جب ہم کو زیر زمین جانا ہے تو اس وقت کے لئے کیا کرنا چاہیئے اس وقت اعمال ہی کام دیں گے اور کوئی چیز ساتھ نہ جائے گی۔ صاحبو! یہ بات تو ذرا سی ہے مگر اس پر عمل کرکے دیکھو چند دن میں حالت بدل جائے گی۔ دوا کا نفع نام بتانے سے نہیں ہوا کرتا استعمال کرنے سے ہوتا ہے آپ اس پر عمل کیجئے نفع خود معلوم ہوگا کہ کام تین قسم کے ہیں ایک وہ جو زیر زمین نافع ہیں دوسرے وہ جو مضر ہیں تیسرے وہ جو نہ نافع ہیں نہ مضر ہیں ان کو تو فوراً چھوڑ دو گے۔ رہی وہ جو نہ نافع ہیں نہ مضر ہیں وہ بھی قابلِ ترک ہیں کیونکہ آدمی جب اپنے گھر میں آتا ہے تو ترکاری، دال، گوشت، آٹا، اناج وغیرہ

لیکر داخل ہوتا ہے جو معاش کے لئے ضروری اور مفید ہیں، سانپ بچھو لیکر گھر میں کوئی نہیں گھستا جو کہ مضر ہیں۔ اور جیسے سانپ بچھو لیکر گھر میں نہیں آتے اسی طرح ڈلے پتھر لے کر بھی نہیں گھستے۔ آخر کیوں محض اس واسطے کہ فضول ہیں ان میں نفع کیا اور جو کوئی ڈلے پتھر لائے بھی تو بیوی سے بحث ہوگی وہ کہے گی کہ ان چیزوں کا گھر میں کیا کام تھا، آپ کہیں گے کہ ضرر بھی تو کچھ نہیں اس پر وہ آپ کو بیوقوف بتائے گی کہ میاں پھر ساری بستی کا کوڑا گھر ہی میں لاکر جمع کردو کیونکہ اس میں فائدہ نہیں تو ضرر بھی کچھ نہیں غرض بیوی سے خوب بحث ہوگی۔ اور ان شاء اللہ وہی جیتے گی تو جب دنیا کے گھر میں تم فضولیات جمع نہیں کرتے گو مضر بھی نہ ہو تو آخرت میں فضول اعمال کیوں لے جاتے ہو بس وہی کام کرو جو آخرت کے لئے ضروری اور مفید ہوں اور جو مضر یا فضول ہوں ان سب کو چھوڑ دو۔ صاحبو! اس مراقبہ کا نافع ہونا تجربہ میں آگیا ہے اول یہ مضمون بے ساختہ میرے قلب میں آیا تھا اس وقت کسی آیت سے استنباط کر کے میں نے اس کو نہ سوچا تھا بلکہ ویسے ہی گھر جا رہا تھا کہ دفعۃً چلتے ہوئے خیال آیا کہ اس وقت تو ہم زمین کے اوپر چل رہے ہیں اور ایک دن اس کے اندر ہوں گے اس خیال کے آتے ہی حالت بدل گئی اور قلب پر خاص اثر ہوا اور کئی دن تک اس کا غلبہ رہا پھر آیات قرآنیہ میں بھی اس کی تعلیم نظر آئی اور میری عادت ہے کہ جو مضمون مجھے نافع معلوم ہوتا ہے جی چاہا کرتا ہے کہ اپنے بھائیوں کو اس سے مطلع کردوں کیونکہ مثل مشہور ہے۔ ع

کہ حلوا بہ تنہا نہ بایست خورد

(حلوا تنہا نہ کھانا چاہیئے)

اس لئے میں نے یہ مضمون بیان کیا اور اسی لئے اس آیت کو اختیار کیا "کیفما اتفق" اختیار نہیں کیا میں نے اپنے بعض دوستوں کو بھی یہ مراقبہ تعلیم کیا ہے بہت ہی نفع ہوا غرض اس کا نافع ہونا محقق ہو چکا ہے اس لئے میں سب کو ہدایت کرتا ہوں کہ چلتے پھرتے اس کا مراقبہ رکھا کرو کہ ایک دن ہم زیر زمین ہوں گے یہ مراقبہ سہل بھی بہت ہے

اس میں کچھ دقت نہیں حق تعالےٰ نے ہم کو نزدیک کی چیزوں میں غور کرنے کی تعلیم فرمائی ہے تاکہ کچھ دشواری نہ ہو۔ چنانچہ ایک جگہ فرماتے ہیں اَفَلَا یَنْظُرُوْنَ اِلَی الْاِبِلِ کَیْفَ خُلِقَتْ ط وَاِلَی السَّمَاءِ کَیْفَ رُفِعَتْ وَاِلَی الْجِبَالِ کَیْفَ نُصِبَتْ ط وَاِلَی الْاَرْضِ کَیْفَ سُطِحَتْ ط کیا اونٹ کو نہیں دیکھتے کیونکر پیدا کیا گیا ہے اس میں سب سے پہلے اونٹ کا ذکر کیا گیا ہے کیونکہ اہلِ عرب کثرت سے اسی پر سوار ہوتے ہیں اور راکب جمل کو زیادہ تلبس اونٹ ہی سے ہوتا ہے پھر اہل عرب کو اونٹ سے محبت بھی بہت ہے۔ چنانچہ ایک شاعر اپنے محبوبہ کے خال رخسار کی تشبیہہ میں کہتا ہے کہ رخسارہ پر تل ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے بالو کے میدان میں اونٹ کی مینگنی پڑی ہو اس سے اونٹ کے ساتھ اس کا تعلق ظاہر ہے اور ایک شاعر کہتا ہے ؎

"احبہا و تحبنی و یحب ناقتہا بعیری"

(ترجمہ) میں محبوبہ سے محبت رکھتا ہوں اور وہ مجھ سے محبت کرتی ہے اور میرے اونٹ کو اس کی اونٹنی سے محبت ہے۔ اس لئے حق تعالےٰ فرماتے ہیں کہ کیا یہ لوگ ہمارے دلائل قدرت کو اونٹ میں نہیں دیکھتے کہ اس کو کیسا عجیب الخلقت بنایا ہے اور کیسا جفاکش اور صابر و بردبار کر دیا ہے پھر اونٹ پر سوار ہوتے ہی آدمی اونچا ہو جاتا ہے تو سامنے آسمان نظر آتا ہے اس لئے اس کے بعد فرماتے ہیں "وَاِلَی السَّمَاءِ کَیْفَ رُفِعَتْ" اور آسمان کو نہیں دیکھتے کیونکر بلند کیا گیا ہے پھر سفر شروع کرنے کے بعد دائیں بائیں پہاڑ نظر آتے ہیں تو آگے فرماتے ہیں والی الجبالِ کیف نصبت اور پہاڑوں کو نہیں دیکھتے کس طرح زمین میں نسب کئے گئے ہیں پھر گاہے گاہے سواری کی حالت میں زمین پر بھی نظر پڑ جاتی ہے سامنے بڑے بڑے میدان آتے ہیں جن کو سوار طے کرتا جاتا ہے تو فرماتے ہیں وَاِلَی الْاَرْضِ کَیْفَ سُطِحَتْ اور زمین کو نہیں دیکھتے کہ کس طرح بچھائی گئی جو شخص کبھی اونٹ پر سوار ہوا ہو یا اس نے راکب جمل کی حالت میں تامل کیا ہو وہ اس ترتیب کی خوبی اچھی طرح سمجھ سکتا ہے کہ پہلے اونٹ کا ذکر کیا پھر آسمان کا پھر پہاڑوں کا پھر زمین کا کیونکہ

رکوب کی حالت میں اکثر نظر اسی ترتیب سے واقع ہوتی ہے بہر حال جن چیزوں سے ہم کو زیادہ قرب۔ اور زیادہ تلبس ہوتا ہے حق تعالےٰ نے انہی میں تامل کی تعلیم فرمائی ہے اور یہاں سے ایک بات یہ بھی معلوم ہوگئی کہ حق تعالےٰ نے دلائل قدرت معلوم کرنے کے لئے اونٹ اور پہاڑ اور آسمان و زمین کا مراقبہ تو بتلایا ہے مگر امارد و نسواں کی طرف کہیں متوجہ نہیں فرمایا کیونکہ ان میں توجہ کرنے سے دلائل قدرت پر نظر نہیں رہتی بلکہ خواہش نفس پر نظر رہ جاتی ہے آگے نہیں بڑھتی معلوم ہوا کہ دلائل قدرت کا مشاہدہ انہی چیزوں میں ہوسکتا ہے جہاں خواہش نفس کا موقع نہ ہو ورنہ دلائل قدرت تو نظر قلب سے غائب ہوجائیں گے اور محض خواہش ہی خواہش رہ جائے گی۔ پس اب جو لوگ یہ دعویٰ کرتے کہ ہم امارد و نسواں کو قدرت خدا دیکھنے کے لئے گھورتے ہیں ان کا جھوٹا ہونا ظاہر ہوگیا اگر واقعی ان کو دلائل قدرت کا مطالعہ مقصود ہوتا تو وہ ان چیزوں میں نظر کرتے جن کا مراقبہ حق تعالےٰ نے تعلیم فرمایا ہے، طالب کو تو ان میں بھی وہی قدرت نظر آتی ہے جو خوبصورت لڑکوں اور عورتوں میں نظر آتی ہے بلکہ ان سے زیادہ کیونکہ ان کے مطالعہ میں محض دلائل قدرت ہی پر نظر ہوتی ہے اور کسی بات کا خیال نہیں آتا۔ شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ؎

محقق ہماں بیند اندر ابل ۔۔۔ کہ در خوبرویان چین و چگل

(محقق وہی ہوتا ہے جو اونٹ میں وہی جمال محسوس کرے جو عام لوگ حسینوں میں دیکھتے ہیں چین اور چگل ایک شہر کا نام ہے جو ترکستان میں ہے، وہاں کا حسن مشہور ہے)

صاحبو! امارد و نسواں کو وہی گھورتا ہے جس کو خدا مطلوب نہیں بلکہ مخلوق ہی مطلوب ہے۔ شیخ اس کے متعلق فرماتے ہیں ؎

ندادند صاحبدلاں دل بہ پوست ۔۔۔ وگر ابلہے داد بے مغز اوست

(اہل دل لوگ اپنے دل کو پوست اور کھال کو نہیں دیا کرتے اور اگر کوئی بیوقوف دل انکو دیتا ہے، وہ بے عقل ہے)

یعنی عقلمند کبھی پوست اور کھال کو دل نہیں دیا کرتا اور اگر کوئی دے تو وہی بیوقوف ہے اس لئے ان چیزوں سے نظر کو بچانا چاہیئے ان سے اصلاح نہ ہوگی فساد بڑھے گا۔ قدرت کے دلائل دیکھنے کے لئے زمین ہی کو دیکھ لو جو سب کی ماں ہے کہ تم کیونکر گیہوں اور میووں اور شلجم مولی میں سے نکلکر نطفہ کی شکل میں آئے پھر اس سے کس حکمت کے ساتھ اس خوبصورت جسم کی طرف منتقل کئے گئے اور کیونکر پیدا ہوئے پھر کیسے پلے بلائے جوان ہوئے، پھر یہ بھی سوچ لو کہ ایک دن زمین کے نیچے بھی جانا ہے اور زمین میں جانے سے پہلے نزع کی حالت ہوگی بیماری ہی میں مال و دولت جائداد وغیرہ سے آپ کا تعلق کم ہوجائیگا اس وقت اپنے لئے کچھ نہ کر سکوگے نہ کسی کو خیرات دے سکوگے نہ فوت شدہ نماز روزہ کی تلافی کر سکوگے پس ثلث مال میں جو چاہو کرلو اس سے زیادہ حق نہ ہوگا پھر دفن کے بعد فرشتے آدیں گے نہ معلوم سوال وجواب کیسے ہوں کیسے نہ ہوں اس کو سوچو تو پھر حالت کی اصلاح ہوگی اور فکر پیدا ہوگی۔ کہ وہ کون کون سے اعمال ہیں جن سے وہاں بیڑا پار ہو اس کے لئے آپ کو دو چیزوں کی ضرورت ہوگی ایک۔ بقدر ضرورت علم کی دوسرے عمل کی اور اگر کسی سے تحصیل علم نہ ہوسکے تو وہ اہل اللہ کی صحبت اور ان سے ملنا ملانا اختیار کرے اور ان سے پوچھ پوچھ کر عمل کرے اسکو لوگوں نے بالکل ہی ترک کر دیا حالانکہ یہ سب کی اصل ہے اور کم وبیش اس کی ضرورت سب کو ہے بخدا اصلاح حال میں اس سے بڑھ کر کوئی چیز بھی فائدہ مند نہیں۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

گر تو سنگِ خارۂ و مرمر شوی چوں بصاحب دل رسی گوہر شوی

(اگر تو پتھر کی طرح دل رکھتا ہے تو بھی مایوس مت ہو کسی اللہ والے کی صحبت میں جا اس کی برکت سے تو موتی بن جائے گا۔)

صحبت اہل اللہ کا سب کو اہتمام کرنا چاہیئے اور جن کو علم کا حاصل کرنا مطالعہ سے دشوار ہو وہ تو ضرور اس کا اہتمام کریں کہ اس کے ذریعہ سے علم وعمل دونوں سہولت سے حاصل ہوجائیں گے۔ اب میں ختم کرتا ہوں اللہ تعالیٰ سے دعا کیجئے کہ ہماری اصلاح فرمائیں۔ آمین وصلے اللہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقہٖ سیدنا ومولانا محمد وعلیٰ آلہ واصحابہ اجمعین والحمد للہ رب العٰلمین۔

تمت بالخیر

قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَلِّغُوْا عَنِّيْ وَلَوْ آيَةً
(رواہ البخاری)

التبلیغ کا وعظ

مسمیٰ بہ

الاسعاد والابعاد

حکیم الامۃ مجدد الملۃ حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی
رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

محمد عبد المنان غفرلہ

مکتبہ تھانوی ـــــ دفتر الابقاء
مسافر خانہ بندر روڈ / ایم اے جناح روڈ کراچی ۱

التبلیغ کا وعظ

مسمی بہ
الاسعاد والابعاد

أین	متی	کم	کیف	لِمَ	ماذا	من استمع	من ضبط	المستمعون	الاشتات
کہاں ہوا	کب ہوا	کتنا ہوا	کیسے ہوا	کیوں ہوا	کیا مضمون تھا	کتنے لوگ تھے	کس نے ضبط کیا	سامعین کی تعداد	متفرقات
مسجد خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون	[illegible] ۱۳۳۵ھ بروز جمعہ (بعد نماز جمعہ شروع ہوا)	تین گھنٹہ [illegible] منٹ تک ہوا	بیٹھ کر	مدرسہ امدادالعلوم تھانہ بھون میں ایک طالب علم فارغ ہو کر [illegible]	کلام پاک کی آیت [illegible]	عوام [illegible] طالب علم	احقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ	تقریباً	[illegible]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۔ الحمد للہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ ونشھد ان سیدنا ومولانا محمدًا عبدہ ورسولہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ الہ واصحابہ وبارک وسلم اما بعد فاعوذ باللہ من الشیطن الرجیم بسم اللہ الرحمٰن الرحیم وَاَنَّ ھٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْہُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِکُمْ عَنْ سَبِیْلِہٖ ذٰلِکُمْ وَصّٰکُمْ بِہٖ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ ○ (اور یہ دین میرا راستہ ہے جو مستقیم ہے سو اس راہ پر چلو اور دوسری راہ پر مت چلو کہ وہ راہیں تم کو اللہ کی راہ سے جدا کر دیں گی)۔ یہ ایک آیت ہے سورۂ انعام کی اخیر کے قریب کی اس کا مضمون ایسا عام اور کلی ہے کہ اس کی تفصیل اگر ساری عمر کی جائے اور وہ عمر بھی ایک شخص کی نہیں بلکہ ایک

جماعت، متعاقبہ کی عمر جو خود فی نفسہ متناہی ہو لیکن بمعنی (لَاتَقِفُ عِنْدَ حَدٍّ (کسی حد پر نہ ٹھیرے) غیر متناہی ہو اور اس کا ہر فرد اس کی تفصیل بیان کرنا شروع کرے پھر جہاں سے ایک نے چھوڑا ہو اس سے آگے دوسرا بیان کرے اسی طرح سب افراد بیان کرتے چلے جائیں جب بھی اس کی تفصیل ختم نہیں ہوسکتی کوئی حالت اور کوئی جزئی حادثہ اس آیت سے خارج نہیں بلکہ یہ سب کو مشتمل ہے اور حوادث کے احاطہ سے باہر ہونا ظاہر ہے۔ اس مضمون کے اختیار کرنے کی ضرورت ایک تو یہی ہے کہ مضمون علم ہے اور عام مضمون کا ضروری ہونا ظاہر ہے کیونکہ وہ سب کی ضرورت کا ہوا کرتا ہے تمام مخاطب اس میں بدرجۂ مساوی شریک ہوتے ہیں۔ مگر عام ضرورت کے علاوہ ایک خاص سبب بھی اس کے اختیار کرنے کا ہے جس کو تحدث بالنعمۃ کے طور پر عرض کرتا ہوں کیونکہ نعمت کا چھپانا ناشکری ہے اور نعمت کا ظاہر کرنا مامور بہ ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ (اور اپنے رب کے انعامات کا تذکرہ کرتے رہا کرو) دوسرے وہ نعمت سب کے نفع کی ہے تو اس کا چھپانا بے مروتی بھی ہے۔ اسی لئے مثل مشہور ہے کہ حلوا بہ تنہا بنا لیست خورد (تنہا حلوہ نہ کھانا چاہیئے) اس بنا پر جی چاہا کہ اس نعمت سے اپنے دوستوں کو بھی خبر کردی جائے تاکہ وہ بھی اس علم عظیم سے نفع حاصل کریں۔ مگر جس طرح اظہار نعمت میں یہ مصلحت ہے اسی طرح اس میں کید نفس کا مفسدہ بھی ہے کیونکہ بعض دفعہ ہم نعمت الٰہی کو تحدث بالنعمۃ سمجھ کر اس خیال سے بیان کرتے ہیں کہ اظہار نعمت کا نص میں امر ہے مگر اس میں نفس کا کید بھی مخفی ہوتا ہے کہ اس طریقہ سے وہ اپنا کمال ظاہر کرنا چاہتا ہے۔ اور نعمت سے عجب و کبر میں مبتلا ہوجاتا ہے اس طریق باطن میں اشتباہ اور تلبیس بیحد ہے۔ اخلاق حمیدہ اور اخلاق رذیلہ دونوں دوش بدوش چلتے ہیں ظاہر میں تحدث بالنعمۃ اور دعویٰ کی صورت یکساں ہوتی ہے۔ (تواضع و ناشکری میں خلط ہے تادیب و تعنیف میں اشتباہ ہے۔ سیاست اور تحکم کی صورت یکساں ہوتی ہے لطافت اس تن آرائی میں خلط ہے انتظام اور بخل کی صورت یکساں ہے غیرت غضب ایک صورت سے ظاہر ہوتے ہیں استغنا اور تکبر میں بظاہر فرق نہیں معلوم ہوتا وغیرہ وغیرہ ۱۲ جامع) اسی لئے بعض دفعہ سالک پریشان ہوکر کہتا ہے ؂

صد ہزاراں دام و دانہ است اے خدا — ما چو مرغان حریص بے نوا
دمبدم پابستہ دام نویم — گر ہمہ شہباز و سیمرغے شویم

میرہانی ہر دمے مارا و باز سوے دامے میرویم اے بے نیاز

(اے ہزاروں دام و دانہ ہیں اور ہم مثل مرغ حریص بے نوا ہیں دمبدم آپ کے دام میں پابستہ ہیں اگرچہ ہم سب شہباز اور سیمرغ ہیں ہر دم آپ ہم کو رہائی دیتے ہیں لیکن پھر بھی دام کی (پھنسا دیتے ہیں)

مگر یہ نہیں ہے کہ واقع میں بھی فرق نہیں یا ایسا دقیق فرق ہے جس کو غور سے بھی نہ سمجھ سکے بلکہ دونوں میں قوی فاصل موجود ہے مگر اس فرق کے ادراک کے لئے اہتمام و فکر کی ضرورت ہے اسی کو مولانا فرماتے ہیں

ے بحر تلخ و بحر شیریں ہمعناں درمیاں شاں برزخ لا یبغیاں

(بحر تلخ اور بحر شیریں برابر جاری ہیں مگر ان کے درمیان ایسا پردہ حائل ہے جس کی وجہ سے باہم مختلط اور مشتبہ نہیں ہونے پاتے)

بحر تلخ سے اخلاق رذیلہ مراد ہیں اور بحر شیریں سے اخلاق حمیدہ مولانا فرماتے ہیں کہ ان دونوں میں ایک فاصل قوی ایسا موجود ہے جس کی وجہ سے ایک کی مجال نہیں کہ دوسرے میں مختلط ہو سکے جیسے کلکتہ وغیرہ میں سنا ہے کہ بحر تلخ و بحر شیریں کا اجتماع ہوا ہے اور میلوں تک دونوں میں اختلاط نہیں ہوا ایک طرف شیریں پانی ہے دوسری طرف شور ایک سے کھا تا یک سکتا ہے اور دوسرے سے کسی کی دال نہیں گلتی ایسے ہی یہاں اخلاق حمیدہ و رذیلہ میں گو بظاہر اختلاط ہے مگر واقع میں ہر ایک جدا ہے۔ دونوں میں قوی فاصل موجود ہے جو حقیقی اختلاط سے مانع ہے مگر بعض اوقات صاحب معاملہ کو اس فاصل کا ادراک نہیں ہوتا اس کے لئے مبصر شیخ کی ضرورت ہے پس مولانا کا پہلا ارشاد یعنی ے صد ہزاران دام دانہ است الخ (لاکھوں جال و دانہ ہیں) صاحب واقعہ کے اعتبار سے ہے اور یہ ارشاد یعنی ے درمیان شاں برزخ لا یبغیان (درمیان میں ان کے ایسا پردہ حائل ہے کہ باہم مختلط نہیں ہونے پاتے) واقع کے اعتبار سے ہے خلاصہ یہ ہوا کہ اخلاق حمیدہ و رذیلہ میں واقع میں تو فرق ہے اور ایسا قوی فرق ہے کہ واقعیت کے لحاظ سے دونوں میں خلط کی گنجائش نہیں مگر صاحب واقعہ کو بعض دفعہ اس فاصل کا ادراک نہیں ہوتا اس لئے اس طریق میں خلط و اشتباہ بہت واقع ہو جاتا ہے۔ اور صاحب واقعہ کو بھی یہ اشتباہ قلت اہتمام کی وجہ سے ہوتا ہے۔ اور اہتمام و فکر کے بعد اس کو بھی اشتباہ نہیں ہوتا کیونکہ اہتمام پر حق تعالیٰ کا وعدہ ہے۔ رہبری کا چنانچہ ارشاد ہے وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا

لَنَهۡدِیَنَّہُمۡ سُبُلَنَا (اور جو لوگ ہماری راہ میں مشقتیں برداشت کرتے ہیں ہم ان کو اپنے راستے خود دکھلا دیں گے) مجاہدہ کی حقیقت اہتمام ہی ہے جس پر حق تعالیٰ خود رہبری کا وعدہ فرما رہے ہیں۔ تو اب ان کی دستگیری کے بعد کون چیز مانع ہو سکتی ہے۔ کوئی نہیں پس یہ مسئلہ تو مسلم ہے کہ اہتمام و مجاہدہ کے بعد غلط نہیں ہو سکتا اگر ہم میں تو اہتمام ہی کی کمی ہے۔ اسی لئے ہم کو اخلاق رذیلہ و حمیدہ میں غلط ہو جاتا ہے ہمارا التحدث بالنعمۃ ریار و عجب سے مخلوط ہمارا تواضع ناشکری سے مشتبہ ہمارا استغناء و توکل تکبر سے ملتبس ہے۔ اس لئے میں حق تعالےٰ سے مدد لیکر اس نعمت کو بیان کرتا ہوں حق تعالیٰ غلط سے محفوظ رکھے اور اگر غلط ہو جائے تو حق تعالیٰ معاف فرمائیں کیونکہ ہم بہ نسبت حفاظت کے معافی و مغفرت کے محتاج زیادہ ہیں کیونکہ حفاظت کے اہل وہ حضرات ہیں جو گناہوں سے معصوم ہیں اور ہم گناہوں سے محفوظ نہیں ہیں اس لئے مغفرت کے زیادہ محتاج ہیں دوسرے طلب مغفرت میں اپنا ایک عجز و نیاز و ضعف ظاہر ہوتا ہے۔ جو طلب حفاظت میں حاصل نہیں ہے۔ اور بندہ سے عجز و نیاز ہی مطلوب ہے۔ اس لئے ہماری خیریت اسی میں ہے کہ اپنے کو گنہگار سمجھ کر مغفرت طلب کرتے رہیں۔ اس وقت مجھے یاد آگیا قصہ حضرت ابراہیم بن ادہم کا کہ ایک مرتبہ انہوں نے دعا کی اَللّٰهُمَّ اعْصِمْنِیْ کہ اے اللہ مجھے گناہوں سے بچایئے) ارشاد ہوا کہ اگر سب یہی دعا کرنے لگیں تو رحمت و مغفرت کا ظہور کہاں ہوگا۔

اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلِیْ (اے اللہ میری مغفرت کر) کیوں نہیں کہتے وہ اس میں بتلا دیا گیا ہے کہ جس طرح حفاظت مطلوب ہے مغفرت بھی مطلوب ہے یہی مطلب ہے اس حدیث کا لَوْ لَمْ تُذْنِبُوْا لَجَاءَ اللّٰهُ بِقَوْمٍ یُذْنِبُوْنَ فَیَسْتَغْفِرُوْنَ اللّٰهَ فَیَغْفِرُ لَهُمْ۔ ترجمہ (اگر تم گناہ نہ کرو تو حق تعالیٰ ایسی جماعت کو پیدا کریں گے جو گناہ کریں پھر استغفار کریں اور ان کی مغفرت کی جائے ۱۲) اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ گناہ ہم سے مقصود ہے اور حق تعالیٰ چاہتے ہیں کہ ہم گناہ کیا کریں۔ بلکہ گناہ سے جو ضعف و عجز ظاہر ہوتا ہے وہ مقصود ہے پس اگر کہیں بدون صدور گناہ ہی کے یہ ضعف و عجز پیدا ہو جائے جیسے انبیاء علیہ السلام باوجود عصمت کے جس قدر اپنے کو گنہگار خطاوار سمجھتے ہیں ہم گنہگار ہو کر بھی اپنے کو اتنا گنہگار نہیں سمجھتے اور جس قدر وہ حق تعالیٰ سے خوف و خشیت رکھتے ہیں ہم مجرم ہو کر بھی اتنا تو کیا اس کا ہزارواں حصہ بھی خوف نہیں رکھتے۔

تو اگر ہم لوگ گناہوں میں مبتلا نہ کئے جاتے تو نہ معلوم ہماری کیا حالت ہوتی جب ہم گنہگار ہو کر بھی اپنے کو کچھ زیادہ گنہگار نہیں سمجھتے تو معصوم ہو کر نہ معلوم ہم اپنے کو کیسا کچھ مقدس سمجھتے اور ہمارے عجب کی کیا حالت ہوتی۔ اس لئے کبھی کبھی ہم کو گناہ میں مبتلا کر دیا جاتا ہے جس سے ہمارا وہ عجب توڑ دیا جاتا ہے۔ جو طاعات و اذکار سے کبھی پیدا ہونے لگتا ہے۔ اور وہ خیال تقدس پارہ پارہ ہو جاتا ہے جو کچھ دنوں تہجد اور مراقبات کی پابندی سے دل پر گذرنے لگتا ہے۔ تو جیسے ہم کو حفاظت حق کی ضرورت ہے۔ اسی طرح مغفرت کی بھی ضرورت ہے۔ اسی طرح حضرت ابراہیم بن ادہم کو تنبیہ کی گئی کہ محض عصمت کی دعا کیوں کرتے ہو۔ اس کی ساتھ دعائے مغفرت کیوں نہیں ملاتے۔ اس کے علاوہ اَللّٰھُمَّ اعْصِمْنِیْ (اے اللہ مجھے گناہوں سے بچائیے) کے ساتھ اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلِیْ (اے رب مجھے بخش دیجئے) ملانے میں ایک اور بھی حکمت ہے جس پر نظر کر کے اس کا ملانا بہت ہی ضروری ہو گیا وہ یہ کہ سب مسلمانوں کا عقیدہ ہے حق تعالیٰ مجیب الدعوات ہیں۔ چنانچہ جو لوگ دعا قبول نہ ہونے کے شاکی بھی ہوتے ہیں وہ یہ تو کہا کرتے ہیں کہ ہماری دعا قبول نہیں ہوئی مگر یہ کسی کو کہتے ہوئے نہیں سنا گیا کہ دعا قبول ہونے کا وعدہ کہاں ہے بلکہ اس کا سب کو اعتقاد ہے کہ دعا قبول کرنے کا وعدہ حق تعالیٰ نے فرمایا ہے، اور اس کا انکار کیونکر ہو سکتا ہے جبکہ قرآن میں صریح ارشاد موجود ہے اُدْعُوْنِیْ اَسْتَجِبْ لَکُمْ (تم مجھ سے دعا کرو میں تمہاری اجابت کروں گا) رہا یہ اشکال کہ جب اجابت دعا کا صریح وعدہ ہے تو پھر اس میں تخلف کیوں ہوتا ہے اس کے جواب بہت سے ہیں مگر ان کی گنجائش کہاں سہل بات وہ ہے جس کو خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ حق تعالیٰ دعا کو قبول فرماتے ہیں پھر کبھی تو جلد یا وہی مطلوب عطا فرما دیتے ہیں جو مانگا گیا ہے اور کبھی دیر سے عطا فرماتے ہیں کہ اس میں مصلحت ہوتی ہے اگر اس مطلوب کا دنیا میں دینا مصلحت نہیں ہوتا تو اس کو آخرت کے لئے ذخیرہ کے طور پر جمع

۔ قلت ویؤیدہ حدیث اخرجہ البیہقی فی الشعب وقد التزم ان لا یخرج موضوعا، من انس رفعہ لو لم تکونوا تذنبوا لخفت وفی روایۃ لخشیت علیکم ما ھو اکبر من ذلک العُجب العجب اھ لذا فی العزیزی قال المناوی وذلک ان للعجب بعلمہ مغرور راض عن نفسہ فھلک من حیث لا یشعر والعاصی معترف بالتقصیر فیرجی لہ التوبۃ والخیر ولا ینبغی الوقوع فی الذنوب اتکالا علی ذلک بل المطلوب التباعد جدا فلو فرض انہ وقع فلا یأس بل یتوب فیحصل لہ الغفران اھ مع تقدیم وتاخیر (ص ۲۰۴ ج ۳ جامع)

رکھتے ہیں، جب بندہ قیامت میں حاضر ہوگا سب دعاؤں کا ثواب اس کے سامنے کر دیا جائیگا بہرحال اجابت دعا، امر ضروری ہے، ایک مقدمہ تو یہ ہوا اس کی ساتھ ایک دوسرا مقدمہ یہ ملایا جائے کہ دعا کیوقت اس اعتقاد کا بھی حکم ہے میری یہ دعا ضرور قبول ہو گی حدیث میں ہے اُدْعُوا اللّٰہَ وَاَنْتُمْ مُوْقِنُوْنَ بِالْاِجَابَۃِ (اللہ تعالیٰ سے دعا کرو اور تم قبولیت دعا کا یقین بھی رکھو) اب بتلاؤ کہ اگر اَللّٰھُمَّ عْصِمْنِیْ کے ساتھ اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لِیْ نہ بڑھایا جائے تو یہ شخص تو اس دعا کے بعد اپنے تقدس کا معتقد ہوگا کیونکہ وہ کہے گا کہ میں نے اپنے لئے عصمت کی دعا کی اور دعا ضرور قبول ہوتی ہے اور مجھے اعتقاد اجابت کا امر بھی ہے پھر کیا وجہ ہے کہ میں اپنے کو معصوم مقدس نہ سمجھوں حق تعالیٰ نے اس الہام میں اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لِیْ بڑھا کر اس اشکال کو رفع فرما دیا اور بڑا علم عظیم عطا فرمایا کہ تم دعائے عصمت کے ساتھ دعائے مغفرت بھی کیا کرو جس کا مطلب یہ ہوگا کہ اے اللہ اول تو مجھے گناہوں سے بچایئے اور اگر ابتلا ہی مقدر ہے تو مغفرت فرمایئے اس مجموعہ کے اعتقاد میں کوئی مضائقہ نہیں کیونکہ اب خیال تقدس کسی طرح پیدا نہیں ہو سکتا سبحان اللہ ایک لفظ بڑھا کر کتنے بڑے پہاڑ کو گرا دیا یہ ہیں وہ الہامات جن کو الہام کہنا چاہئے یہ مضمون کچھ اس الہام ہی پر موقوف نہیں الہام کیسا خود نص میں بھی اس کی تعلیم موجود ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاں یہ دعا فرمائی ہے اَللّٰھُمَّ قِنِیْ شَرَّ نَفْسِیْ (اے اللہ مجھ کو میرے نفس کے شر سے بچایئے) وہیں یہ دعا بھی موجود ہے اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لِیْ ذُنُوْبِیْ (اے اللہ میرے گناہ معاف کر دیجئے) بلکہ نص میں ایک بات اور زیادہ ہے جس کا اس الہام میں پتہ نہیں وہ یہ کہ آپ نے دعائے مغفرت میں یہ قید بھی زیادہ فرمائی ہے مَا عَلِمْتُ مِنْہُ وَمَا لَمْ اَعْلَمْ۔ اے اللہ میرے سب گناہ بخشدے وہ بھی جن کو میں جانتا ہوں اور وہ بھی جن کو نہیں جانتا اس میں ان لوگوں کا دعویٰ توڑ دیا گیا جو چند موٹے موٹے گناہوں سے محفوظ ہو کر تقدس کے مدعی ہیں۔ اس جملہ نے بتلا دیا کہ عدم علم عدم علم کو مستلزم نہیں پس اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ تمہارے علم میں تمہارے سے کوئی گناہ سرزد نہیں ہوا تو یہ کیا ضرور ہے کہ واقع میں بھی سرزد نہ ہوا ہو اور اس کی ضرورت تو تنزل کے بعد ہے ورنہ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا کہ انسان کو اپنے اندر گناہ نظر نہ آئیں ادنیٰ تامل سے انسان اپنی خطاؤں کو سمجھ سکتا ہے بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰی

نَفْسِهٖ بَصِیْرَۃٌ وَّلَوْ اَلْقٰی مَعَاذِیْرَہٗ (بلکہ انسان خود اپنی حالت پر خوب مطلع ہوگا گو اپنے حیلے پیش لاوے) ہاں کوئی آنکھیں ہی بند کرلے تو اس کا علاج نہیں اس کے لئے بسبیل تنزل وہ جواب ہے جو حدیث کے اس جملہ میں دیا گیا ہے مَا عَلِمْتُ مِنْہُ وَمَا لَمْ اَعْلَمْ (وہ بھی جس کو میں جانتا ہوں اور وہ بھی جس کو میں نہیں جانتا) یعنی تمہارا عدم علم علم عدم کو تو مستلزم نہیں پس یہی سمجھ کر اپنے کو گناہ گار جانتے رہو کہ شاید تجھ سے کوئی ایسا گناہ ہوا ہو جس کی مجھے خبر نہ ہوئی ہو۔ چنانچہ حدیث میں اس کی ایک واضح نظیر بھی مذکور ہے حدیث میں آتا ہے یَتَکَلَّمُ اَحَدُکُمْ بِکَلِمَۃٍ لَا یَلْقِیْ لَھَا بَالًا یَحُطُّہُ اللّٰہُ بِھَا اِلَی النَّارِ سَبْعِیْنَ خَرِیْفًا وَیَتَکَلَّمُ اَحَدُکُمْ بِکَلِمَۃٍ لَا یَعُدُّ ھَا شَیْئًا یَرْفَعُ اللّٰہُ بِھَا لَہٗ دَرَجَاتٍ فِی الْجَنَّۃِ اَوْ کَمَا قَالَ۔ بعض تم میں سے ایک بات کہتا ہے جس کی طرف قلب کو التفات بھی نہیں ہوتا مگر حق تعالیٰ اس ایک بات کی وجہ سے اس کو جہنم میں بہت دور پھینک دیتے ہیں اور بعض آدمی ایک بات کہتا ہے جس کی کچھ وقعت اس کے نزدیک نہیں ہوتی اور حق تعالیٰ اس کی وجہ سے بہت درجے جنت میں اس کے بلند کردیتے ہیں (غور کیجئے دوسرے گناہوں کا یاد نہ رہنا تو شاید محل کلام بھی ہو مگر زبان کے گناہوں میں ایسا ہوجاتا تو کچھ بھی بعید نہیں کیونکہ یہ واقعہ ہے کہ ہم لوگ روانی کلام میں بہت سی باتیں بلا قصد وارادہ کے کہہ جاتے ہیں جن پر اصلا التفات نہیں ہوتا کہ ان کا اثر کیا ہوا ہوگا تو ذنوب لسان کا ہم کو یاد نہ رہنا کیا بعید ہے۔ کچھ بھی نہیں پس اب کسی کو بھی دعوے تقدس کا منہ نہیں رہا ۱۲ یہاں سے اہل علم کو معلوم ہوگیا ہوگا کہ احادیث دعا میں بھی بہت علوم ہیں بلکہ میں کہتا ہوں کہ علوم سلوک تو اکثر احادیث دعا ہی میں بھرے ہوئے ہیں مگر ان احادیث کو اہل علم ایسی بے توجہی سے پڑھتے اور دیکھتے ہیں جس کی کچھ حد نہیں اس لئے ہم لوگ بہت سے علوم سے محروم ہیں۔ الغرض چونکہ دعویٰ کبھی بصورت تحدث بالنعمۃ بھی ہوتا ہے اس لئے میں نے دعائے حفاظت کے ساتھ دعائے مغفرت کو بھی منضم کرلیا کہ اگر خدانخواستہ مجھ سے غلط ہوجائے تو حق تعالیٰ اس گناہ کو معاف فرمائیں اس تمہید کے بعد میں حق تعالیٰ پر توکل کرکے اور ان کی امداد طلب کرکے اس نعمت کو بیان کرتا ہوں۔ وہ نعمت یوں تو نئی نہیں ہے بلکہ پرانی ہے اور ہر مسلمان کو حاصل ہے مگر بعض دفعہ ایک وارد کسی خاص حالت سے آتا ہے تو نیا معلوم

ہوا کرتا ہے جیسے آج جمعہ کا دن ہے سب لوگ نئے نئے کپڑے پہنے ہوئے ہیں تو گو اس جدت لباس سے یہ لوگ بدل نہیں گئے بلکہ سب وہی ہیں جو ایک گھنٹہ پہلے تھے مگر پھر بھی ہر شخص میں ایک جدت ضرور معلوم ہوتی ہے۔ اور یوں خیال ہوتا ہے کہ یہ شخص ہی بدل گیا ہے۔ اور قاعدہ ہے کُلُّ جَدِیْدٍ لَذِیْذٌ (ہر نئی چیز مزیدار ہوتی ہے) اس لئے گو وہ نعمت فی نفسہ پرانی ہے مگر اس زمانہ قریب میں وہ جس شدت وجدت کے ساتھ قلب پر وارد ہوئی ہے اس طرح پہلے وارد نہ ہوئی تھی اس لئے وہ مجھے نئی نعمت معلوم ہوتی ہے۔ اور اسی لئے جو لذت وحظ اور جو اثر میرے قلب پر اس وقت ہے وہ ویسا ہی ہے جو نعمت جدیدہ سے ہوا کرتا ہے۔ جمعہ کے دن کپڑے بدلنے سے اشخاص میں جدت معلوم ہونے پر مجھے ایک حکایت یاد آئی ہماری یہاں خانقاہ میں ایک صاحب رہتے تھے جو متعلم بھی تھے ایک دن میں نے ایک مہمان کو دکھلا کر ان سے کہا کہ میں ان کا کھانا گھر سے بھیجتا ہوں تم ان کو کھلا دینا اور بتلا دیا کہ وہ مہمان یہ ہیں ان کو پہچان لو اس وقت وہ مہمان اتفاق سے ایک چادرہ اوڑھے ہوئے تھے میں مکان کو چلا آگیا کچھ دیر کے بعد ان صاحب کا کھانا آیا متعلم صاحب کھانا لیکر خانقاہ میں ان مہمان کو تلاش کرنے لگے جب وہ نہ ملے تو میرے پاس آئے کہ مہمان تو نہ معلوم کہاں چلے گئے ملتے نہیں حالانکہ اس وقت وہ مہمان میرے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے کہا بندۂ خدا یہ تو بیٹھے ہیں تو وہ کیا کہتے ہیں کہ یہ چادرہ تو اوڑھے ہوئے ہیں یہ نہیں (اس وقت مہمان نے گرمی کی وجہ سے چادرہ اتار دیا تھا) میں نے ان مہمان سے کہا کہ حضرت جب آپ کہیں جایا کریں تو اول سے آخر تک ایک ہی لباس میں رہا کریں یا کم از کم کھانے کے وقت تو وہی لباس پہن لیا کریں جس میں اول آپ وارد ہوا کریں ورنہ بھوکے مر جاؤ گے۔ کیونکہ دنیا میں ایسے بھی عقلاء ہیں جن کے نزدیک چادرہ اتار دینے سے آدمی بدل جاتا ہے تو ہمارے ان دوست نے چادرہ کے نہ ہونے سے مہمان کو نیا آدمی سمجھا اور اس کا یہ خیال گو ہمارے نزدیک حماقت ہو مگر فلاسفہ کی تحقیق پر منطبق ہے کیونکہ فلاسفہ کے نزدیک اعراض کے بدلنے سے تشخص بدل جاتا ہے اور اعراض میں ایک عرض مقولہ ملک اور ایک عرض مقولہ جدہ بھی ہے

جن کے تبدل سے تشخص معروض بدل جاتا ہے خیر تو یہ ایک لطیفہ تھا، مقصود میرا یہ ہے کہ جدت حال سے ذوالحال میں بھی گونہ جدت آجاتی ہے (گو اس درجہ کی جدت نہ ہو جیسی ہمارے ان دوست نے سمجھی تھی کہ چادرہ اتار دینے سے مہمان کے وجود ہی کی نفی کر دی ۱۲) اور قاعدہ ہے کُلُّ جَدِیْدٍ لَذِیْذٌ (ہر نئی چیز مزیدار ہوتی ہے) اس لئے مجھے اس نعمت سے وہی حظ حاصل ہو رہا ہے جو جدید نعمت سے ہوا کرتا ہے کُلُّ جَدِیْدٍ لَذِیْذٌ پر مولانا محمد قاسم صاحب قدس سرہ کا ایک لطیفہ مجھے یاد آگیا.... مولانا کی عادت تھی کہ غریبوں کو تو مہمانی میں پلاؤ قورمے کھلاتے تھے اور امیروں کو دال، ساگ۔ مولانا کا مقصود تو اس سے اور ہی کچھ تھا۔ وہ یہ کہ مولانا کی نظر میں اغنیا کی قدر نہ تھی غریبوں کی قدر تھی اس لئے غریبوں کی خاطر مدارات امیروں سے زیادہ کرتے تھے اور یہ سنت اللہ ہے۔ حدیث میں ہے کہ حق تعالیٰ فقراء مہاجرین کو اغنیاء سے پانچسو برس پہلے جنت میں داخل کریں گے تو خدا کے نزدیک غرباء کی اتنی قدر ہے مگر اب یہ رنگ ہے کہ ایک غریب مجھ سے کہتے تھے کہ آجکل تو غریبوں کی بہت ہی مٹی پلید ہے اب تو اگر کسی امیر سے ریح صادر ہو جائے تو کہتے ہیں مبارک ہو صحت ہوئی اور غریب سے صادر ہو جائے تو اس کو دھکلاتے اور مجلس سے نکال دیتے ہیں کہ کمبخت نے سڑا دیا، دماغ پاش پاش کر دیا حالانکہ غریبوں سے امیروں کی ریح زیادہ سڑی ہوئی ہوتی ہے کیونکہ وہ مرغن غذا اور مختلف قسم کے کھانے کھاتے ہیں جس سے معدہ سخت متعفن ہو جاتا ہے غریبوں کے معدے ایسے متعفن نہیں ہوتے کیونکہ اول تو وہ سادہ غذا کھاتے ہیں پھر وہ بھی معدہ میں باقی نہیں رہتی دو چار دفعہ ہل بانے سے سب ہضم ہو جاتی ہے مگر با ایں ہمہ امیروں کی ریح سے کسی کا دماغ نہیں پھٹتا اور غریبوں سے پاش پاش ہو جاتا ہے یہ زمانہ کا اثر ہے کہ آجکل غریبوں کی بیقدری بہت ہے مجھے اس مبارک اور صحت ہونے پر ایک حکایت یاد آئی ایک دفعہ میں ایک مجلس میں بیٹھا ہوا تھا۔ وہاں ایک صاحب نے زور سے ریح صادر کی لوگوں کو ناگوار ہوا تو انھوں نے یہ شعر پڑھا ؎

چو باد اندر شکم پیچد فرو هِل | که باد اندر شکم بار یست بر دل

(جب ریح پیٹ میں گھومے چھوڑ دے کہ ریح پیٹ کے اندر ایک بوجھ ہے دل پر)

کہنے لگے دیکھئے شیخ سعدی فرماتے ہیں کہ جب پیٹ میں گڑبڑ ہو تو ہوا چھوڑ دینی چاہیئے میں نے اس پر

عمل کیا ہے پھر ناگواری کی کیا وجہ. میں نے کہا کہ شیخ نے اس شعر میں یہ کہاں فرمایا ہے کہ زور سے
چھوڑا کرو کہنے لگے کہ اس شعر میں گو اظہار و اخفار کی تصریح نہیں مگر جس قصہ میں یہ شعر ہے اس میں
وقوع اعلان ہی کی ساتھ ہوا تھا جبھی تو ان کو اس معذرت کی ضرورت ہوئی آہستہ صدور ہوا ہوتا
تو اہل مجلس سے عذر خواہی کی ان کو کیا ضرورت تھی اس وقت تو مجھے ان کی بات کا کوئی جواب نہ
بن پڑا اور میں ہار گیا اور وہ دونوں راستوں سے جیت گئے او پر کے راستہ سے بھی اور نیچے کے راستہ
سے بھی (او پر کے راستہ سے حجت و دلیل کے ساتھ جیتے اور نیچے کے راستے سے تو جیتے ہوئے تھے ہی
کہ سب کو بدبو سے دبا دیا ۱۲) بعد میں ان کی دلیل کا جواب میری سمجھ میں آیا کہ وہاں تو زور سے اتفاقاً
ہوا تھا اور یہاں ان صاحب نے قصداً زور سے کیا تھا یہ فرق ہے اس قصہ میں اور ان کے فعل میں
اور واقعی قصداً زور سے ریح صادر کرنا خصوصاً مجمع میں بہت ہی نازیبا حرکت اور آدمیت کے
خلاف ہے ہمارے یہاں ایک میاں جی تھے جو لڑکوں کو پڑھایا کرتے تھے لڑکے بے تمیز تو ہوتے
ہی ہیں وہ مکتب ہی میں ریح صادر کر دیتے میاں جی نے کہا بہت نالائق حرکت ہے سارا
مکتب اس سے سڑ جاتا ہے، اب سے جس کی ریح آئے وہ باہر جا کر چھوڑا کرے۔ پھر یہ فکر ہوئی
کہ اس کے لئے کس لفظ سے اجازت لی جائے تو میاں جی نے یہ تجویز کیا کہ جب اس کام کے لئے کوئی
جایا کرے تو وہ یوں کہا کرے کہ میاں جی چڑیا چھوڑ آؤں یہ میاں جی بھی ایسی باتوں میں مجتہد ہوتے ہیں کیا
لفظ بامعنی نکالا ہے۔ بس اب کیا تھا۔ لڑکوں کے ایک کھیل ہاتھ آ گیا تھوڑی دیر میں ایک
اٹھتا دوسرا اٹھتا تیسرا آتا کہ میاں جی چڑیا چھوڑ آؤں، میاں جی چڑیا چھوڑ آؤں میاں جی چڑیا چھوڑ آؤں
آخر میاں جی تنگ آ گئے اور جھلا کر کہنے لگے کہ بس یہیں چھوڑ دیا کرو۔ یہ قصہ اس پر چلا تھا کہ آجکل
غریبوں کی بہت بے قدری ہے مگر خدا کے یہاں ان کی قدر ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں
یہ قدر تھی کہ آپ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو وصیت فرماتے ہیں یَا عَائِشَۃُ جَالِسِی الْمَسَاکِیْنَ
وَقَرِّبِیْھِمْ اے عائشہ مساکین کے پاس بیٹھا کرو اور ان کو اپنے سے قریب کرو نیز آپؐ دعا میں فرماتے تھے
اَللّٰھُمَّ اَحْیِنِیْ مِسْکِیْنًا وَّاَمِتْنِیْ مِسْکِیْنًا وَّاحْشُرْنِیْ فِیْ زُمْرَۃِ الْمَسَاکِیْنِ اے اللہ مجھے زندگی بھی مسکین رکھئے
اور موت بھی مسکینی کی حالت میں دیجئے قیامت میں بھی مساکین کی جماعت میں اٹھائیے سبحان اللہ کس قدر
آپ کو مساکین سے محبت تھی کہ اپنے لئے انہی کے ساتھ پسند فرماتے تھے۔ اس میں بعض لوگوں نے یہ نکتہ بھی

نکالا ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دعا میں مساکین کو اپنے اوپر بھی ترجیح دی۔ ہے کیونکہ یہ نہیں فرمایا کہ مساکین کا حشر میرے ساتھ کیجئے بلکہ یہ فرمایا کہ میرا حشر مساکین کے ساتھ کیجئے جس میں اپنے کو تابع اور مساکین کو متبوع قرار دیا گیا ہے مگر میرے جی کو یہ نکتہ نہیں لگا کیونکہ گو آپ نے دعا ان لفظ سے فرمائی ہے مگر حقیقت میں مساکین ہی کا حشر آپ کے ساتھ ہوگا، وہی تابع ہوں گے اور آپ متبوع ہوں گے مساکین کی تبعیت کا کسی درجہ میں بھی وہم نہیں باقی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ان الفاظ سے دعا فرمانا تواضع کی بنا پر ہے اسی سنت اللہ وسنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا اثر حضرت مولانا محمد قاسم صاحب پر تھا کہ آپ کی نظر میں غربا کی قدر زیادہ تھی اس لئے آپ ان کو پلاؤ زردہ اور قورمہ کھلاتے تھے اور امرا کی قدر نہ تھی اس لئے ان کو ساگ اور دال کھلاتے اصل وجہ تو یہ تھی مگر جب لوگوں نے آپ سے اس نرالے برتاؤ کی وجہ دریافت کی تو آپ نے اصل بات نہیں بتلائی کیونکہ اس کے اظہار میں امراء کی دل شکنی (اور غربا کے اعجاب) کا خطرہ تھا آپ نے اس کی دوسری وجہ بتلادی فرمایا کہ قاعدہ ہے کُلُّ جَدِیْدٍ لَذِیْذٌ نئی چیز لذیذ ہوا کرتی ہے اس لئے میں اپنے مہمانوں کو جدید چیز کھلاتا ہوں تاکہ ان کو لذت حاصل ہو غریبوں کیلئے تو پلاؤ زردہ قورمے جدید ہیں جو ان بیچاروں کے خواب میں بھی کبھی نہیں آتے ان کو تو یہ کھلاتا ہوں امیروں کو چٹنی ساگ، دال کھلاتا ہوں کیونکہ ان کے حق میں یہی جدید ہیں جو عمر بھر ان کے کھانے میں نہیں آتے ان کو انہیں میں لذت حاصل ہوتی ہے۔ پلاؤ زردہ تو روز کھاتے رہتے ہیں وہ ان کے لئے جدید نہیں، سبحان اللہ ایک یہ ایک علمی مضمون ہوگیا حالانکہ ظاہر میں معمولی بات تھی اہل لطائف کے یہاں معمولی سے معمولی باتیں بھی علمی مضامین بن جاتے ہیں۔ چنانچہ اس پر مولانا ہی کا ایک اور قصہ یاد آیا۔ ایک مرتبہ مولانا کی مجلس میں احباب مجتمع تھے اور سنا ہے کہ جب ان حضرات کا اجتماع ہوا کرتا تھا تو اکثر مٹھائی کی فرمائش ہوا کرتی تھی کہ بھائی مٹھائی کھلاؤ چنانچہ اس وقت بھی اس کی فرمائش ہوئی اور راز اس میں یہ ہے کہ حضرات اہل اللہ میں ذکر کے انوار سے نشاط کا غلبہ ہوتا ہے اس لئے وہ اسباب نشاط کو اہل دنیا سے زیادہ برتتے ہیں دنیاداروں کو اس قدر اسباب نشاط میسر نہیں ہوتے جو ان حضرات کو میسر ہوتے ہیں دنیاداروں کو اپنے افکار ہی سے فرصت نہیں ملتی اور اگر کبھی یہ لوگ اسباب نشاط اختیار کرتے ہیں تو بھی ایسے ہوتے ہیں جو فکر سے خالی نہیں ہوتے مثلاً گانا بجانا، شطرنج اور گنجفہ کھیلنا جو خلاف شریعت ہیں اور گناہ کو مستلزم۔ اور ظاہر ہے کہ مسلمان کو گناہ کرتے ہوئے خدا کا خوف ضرور ہوتا ہے

خواہ کسی درجہ کا خوف ہو پھر خوف کے ساتھ لذت کہاں اور حضرات اہل اللہ کے یہاں اسباب نشاط سب شریعت کے موافق ہوتے ہیں جن میں گناہ کا خطرہ نہیں ہوتا۔ اُدھر ان کا دل اوکار دنیا سے خالی ہوتا ہے اس لئے ان کو دنیا والوں سے زیادہ نشاط میسر ہوتا ہے۔ شاید کوئی یہ کہے کہ اہل اللہ کو آخرت کا تو غم ہوتا ہے پھر وہ بھی فکر سے خالی نہ ہوئے تو ان کا نشاط بھی کامل نہ ہوا اس کا جواب یہ ہے کہ فکر آخرت لذیذ فکر ہے جس سے نشاط بڑھتا ہے کم نہیں ہوتا (اس کی ایسی مثال ہے جیسے عاشق کو محبوب کی رضا کی فکر ہوا کرتی ہے رات دن وہ اسی طرح سوچ میں رہتا ہے کہ ایسا کونسا کام کروں جس سے محبوب راضی ہو مگر یہ فکر لذیذ ہوتا ہے جس کی لذت عشاق کے دل سے پوچھو۔ عاشق اس فکر سے کبھی خلاصی کا طالب نہیں ہوتا مجنوں کہتا ہے ؎

یَارَبِّ لَا تَسْلِبَنِّیْ حُبَّهَا اَبَدًا وَيَرْحَمُ اللّٰهُ عَبْدًا قَالَ آمِيْنَا

(اے اللہ لیلیٰ کی محبت ہمیشہ رہے مجھ سے سلب نہ کرنا اور اللہ تعالیٰ اس پر رحم کرے جو شخص آمین کہے)

اور کہتا ہے ؎

اِلٰهِیْ تُبْتُ مِنْ كُلِّ الْمَعَاصِیْ وَلٰكِنْ حُبَّ لَيْلٰى لَا اَتُوْبُ

(اے اللہ میں گناہوں سے توبہ کرتا ہوں لیکن لیلیٰ کی محبت سے توبہ نہیں کرتا)

حالانکہ محبت لیلیٰ نے اس کے دل کو جلا پھونک دیا تھا مگر اس پر بھی وہ اس کے زوال کا طالب نہیں بلکہ ترقی کا خواہاں ہے اور یہ مثال بہت ہی ناقص ہے کیونکہ مجنوں کا یہ عشق خطرہ آخرت سے خالی نہ تھا اس پر اس عشق کو کیونکر قیاس کیا جا سکتا ہے جس میں لذت ہی لذت ہے خطرہ کا نام نہیں مگر سمجھانے کے لئے ایک مثال ناقص بھی کافی ہے ۱۲) ہم نے ثقات سے سنا ہے کہ جب حاجی صاحب قدس اللہ سرہٗ تھانہ بھون تشریف رکھتے تھے تو صبح کو اشراق وغیرہ سے فارغ ہو کر اپنے حجرہ میں سے مٹھائی کی ہنڈیا نکالتے اور حضرت حافظ ضامن صاحب شہید قدس سرہٗ اور مولانا شیخ محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ یہ حضرات سب مل کر مٹھائی کھایا کرتے پھر اس میں باہم چھینا جھپٹی بھی ہوتی تھی کوئی ہنڈیا اٹھا کر بھاگ چلتے، دوسرے حضرات ان کے پیچھے دوڑتے حالانکہ یہ حضرات اپنے زمانہ کے مسلم الثبوت مشائخ تھے مگر ان کی معاشرت ایسی سادہ تھی جس میں تصنع و تکلف کا نام نہ تھا بھلا آج کل تو مشائخ ایسا کر کے دکھلائیں تو یہ ان کی تو شان گھٹ جائے گی متانت و وقار کے خلاف ہو جائیگا۔

چنانچہ ہمارے یہاں ایک شخص تھا وہ کہا کرتا تھا کہ علماء و مشائخ کو متانت و وقار سے رہنا چاہیئے۔ میں کہتا ہوں کہ اسکا وقار اسی کو مبارک ہو ہم تو اس کو تکبر سمجھتے ہیں ہمیں چھچھورے پن ہی میں رہنے دو اور جو کوئی ہمیں چھچورا کہے کہو ؎

گرچہ بدنامی ست نزد عاقلاں   مانمی خواہم ننگ و نام را اور

(اگرچہ عاقلوں کے نزدیک، بدنامی ہے ہم ننگ و نام کے خواہاں نہیں ہیں)

رند عالم سوز را با مصلحت بینی چہ کار   کار ملک است آنکہ تدبیر و تحمل بایدش

(رند عالم سوز یعنی عاشق کو مصلحت بینی سے کیا تعلق اس کو تو محبوب حقیقی کا کام سمجھ کر تحمل و تدبیر کرنا چاہیئے)

جس کو مریدوں اور معتقدوں کی فوج جمع کرنا ہو وہ اس متانت و وقار کو اختیار کرے اور جس کو جلانا پھونکنا اور جلنا مرنا منظور ہو اس کو ان اسباب وقار کی ضرورت نہیں بس اس کو ضرورت ہے کہ خلاف رضا محبوب کوئی کام نہ ہو جو کام ہو شریعت کی حد کے اندر ہو اس کے بعد اس کو کسی کی فکر نہیں چاہے کوئی اس کی ساتھ رہے یا نہ رہے اور میاں جس کو حق تعالیٰ عظمت دیتے ہیں اس کی عزت ان باتوں سے کم نہیں ہوا کرتی کہ ذرا ہنسی کی باتیں کرلیں دوستوں سے چھینا جھپٹی کرلی بھاگ دوڑ لئے، ہاں جس کی عزت موہوب نہ ہو مکسوب ہو وہ بیشک متانت و وقار ہی سے بنتی ہے تو لعنت ہے ایسی عزت پر جس کے لئے انسان کو کوشش و سعی کرنا پڑے۔ غرض مولانا محمد قاسم صاحب سے احباب نے فرمائش کی کہ مٹھائی کھلایئے مولانا نے ایک روپیہ کی مٹھائی منگوائی اور اپنے ایک مقرب خادم کو جن کا نام مولوی فاضل تھا تقسیم کے لئے فرمایا چنانچہ وہ تقسیم کرچکے تو مولانا محمد قاسم صاحب نے ایک لطیفہ فرمایا۔ اَلْفَاضِلُ لِلْقَاسِمِ۔ یہ جملہ ذو معانی ہے اس کے ایک معنی تو یہ ہیں کہ جو بچ جائے وہ تقسیم کرنے والے کا ہے (یعنی مولوی فاضل کا) یہی معنی مولانا کا نام قاسم تھا۔ اس صورت میں فاضل بمعنی لغوی ہے۔ اور قاسم بمعنی عرفی۔ اور تیسرے معنی یہ ہیں کہ فاضل (یعنی مسمی بہ فاضل قاسم کے ہیں یعنی تم میرے ہو اس صورت میں فاضل و قاسم دونوں بمعنی عرفی مستعمل ہوں گے۔ مولوی صاحب نے موقعہ اور اجازت دیکھ کر جواب دیا اَلْفَاضِلُ لِلْفَاضِلِ وَالْقَاسِمُ مَحْرُوْمٌ یہ جملہ بھی ذو معنیین ہیں اس میں اگر فاضل و قاسم دونوں بمعنی لغوی لئے جائیں تو معنی یہ ہیں کہ بچا ہوا اس

شخص کا ہے جو فاضل ہے (یعنی مولانا محمد قاسم صاحب کیونکہ صاحب فضیلت وہی تھے) اور تقسیم کرنے والا محروم ہے (یعنی مولوی فاضل محروم ہیں کیونکہ وہی تقسیم کر رہے تھے) اور یہ مثل بھی ہے اَلْقَاسِمُ مَحْرُوْمٌ تو جس میں قاسم بمعنی لغوی مستعمل ہے اور یہی معنی مولوی فاضل صاحب کے مراد تھے لیکن مزاح کے طور پر ایک معنی بھی اس جملہ کے ہو سکتے ہیں جبکہ فاضل و قاسم کو بمعنی عرفی لیا جائے وہ یہ کہ بچا ہوا فاضل ہے۔ (یعنی مسمی بہ فاضل کا) اور قاسم محروم ہیں (یعنی مولانا محمد قاسم صاحب) اہل اللہ کے خدام مودب ہوتے ہیں بے ادب نہیں ہوتے مگر بے ادبی اسے کہتے ہیں جس سے مخدوم کو تکلیف ہو۔ چونکہ مولوی فاضل صاحب جانتے تھے کہ اس وقت حضرت مولانا کی طبیعت مزاح کو چاہ رہی ہے اس لئے انہوں نے اجازت پاکر ذومعنیین جملہ استعمال کر دیا سو اس کا مضائقہ نہیں نہ یہ بے ادبی میں داخل ہے۔ خصوصاً جبکہ ان کی مراد ادب کے خلاف نہ تھی گو ایہام خلاف کا ہوتا ہے سو مزاح میں ایسے ایہام کی اجازت ہے جبکہ شیخ کی طبیعت مزاح پر مائل ہو یہ نہیں کہ ہر وقت موقعہ بے موقعہ ایسے جملے استعمال کیا کرو۔ سو دیکھئے اہل لطائف کے یہاں مٹھائی میں بھی علمی نکات ہوا کرتے ہیں ان کا کوئی کام اور کوئی قول بھی علمی مضامین سے خالی نہیں ہوتا یہ قصہ تو تبعاً یاد آگیا تھا اصل مقصود یہ تھا کہ مولانا نے کل جدید لذیذ کے قاعدہ سے اپنے اس فعل کی وجہ بتلائی کہ میں غریبوں کو عمدہ کھانے اور امیروں کو معمولی کھانے کیوں کھلاتا ہوں۔ اس لئے کہ ہر ایک کو جدید کھانوں سے لذت حاصل ہوا کرتی ہے۔ تو جس کے حق میں جو جدید ہوا اس کو وہی کھلانا چاہیئے۔ اسی بنا پر میرا جی چاہا کہ اس جدید نعمت سے جو فی نفسہ قدیم ہے مگر مجھ پر بہیئت مخصوصہ وارد ہونے کی وجہ سے مجھے جدید معلوم ہوئی ہے۔ اور اس سے مجھ پر ایسا خاص اثر ہوا ہے جو جدید نعمت سے ہوا کرتا ہے احباب کو بھی مطلع کروں وہ نعمت یہ ہے کہ ایک مرتبہ جا رہا تھا یا بیٹھا ہوا تھا کہ قلب پر خود بخود یہ بات آئی کہ ہم آخرت کی طرف چل رہے ہیں اور جوں جوں دن گذرتے جاتے ہیں اتنا ہی ہم آخرت کی طرف مسافت طے کر رہے ہیں یہاں تک کہ ایک دن موت آجائیگی اور یہ مسافت قطع ہو جائے گی جس کے بعد ہم آخرت تک پہونچ جائیں گے یہ مضمون ایسا ظاہر ہے کہ حدیث وغیرہ سے اس کے ثابت کرنے کی ضرورت نہیں، مگر حدیث سے بھی ثابت ہے چنانچہ ایک حدیث میں ہے اَلدُّنْيَا مُدْبِرَةٌ وَّ الْاٰخِرَةُ مُقْبِلَةٌ اَوْ كَمَا قَالَ یعنی دنیا جا رہی ہے اور آخرت آرہی ہے اس کا وہی حاصل ہے

خواہ اس کو یوں تعبیر کیا جائے کہ ہم آخرت کی طرف جارہے ہیں خواہ یوں تعبیر کیا جاوے کہ آخرت ہماری طرف آرہی ہے۔ دوسری تعبیر مجاز ہے پہلی حقیقت جیسا اس حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے آخرت کے لئے اقبال ثابت فرمایا ہے جسکی حقیقت یہ ہے کہ واقع میں زمانہ خود حرکت کر رہا ہے، اور ہماری حرکت فی الزمان مجازی ہے۔ البتہ مکان میں ہماری حرکت حقیقی ہے چنانچہ ایک مکان سے دوسرے مکان کی طرف ہم خود حرکت کرتے ہیں مکان خود ہماری طرف نہیں آتا بخلاف حرکت فی الزمان کے کہ اس کے اعتبار سے ہم متحرک مجازی ہیں کیونکہ ہم کو ایک زمانہ سے دوسرے زمانہ کی طرف خود جانا نہیں پڑتا بلکہ زمانہ خود بخود حرکت کرکے آتا ہے چنانچہ ہم سوتے رہتے ہیں اور زمانہ ہمارے اوپر گذرتا رہتا ہے کہ اس سے ظاہر ہوگیا کہ حرکت فی الزمان میں ہمارے قصد و اختیار کو اصلا دخل نہیں حقیقت میں زمانہ خود متحرک ہے اور ہم متحرک فی الزمان حقیقتہً نہیں۔ پس زمانیت کے لئے حرکت فی الزمان مجازی ہے اور بنا بر اس تحقیق کے لطیفہ تفسیر یہ بھی تنبہ کرنا چاہتا ہوں وہ یہ کہ قرآن میں یہ ہے اِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ۔ ترجمہ آیت کا یہ ہے کہ جب ان کی میعاد (معلوم یعنی موت) آجائے گی تو اس سے نہ ایک ساعت پیچھے ہٹ سکیں گے نہ آگے بڑھ سکیں گے جس کا حاصل یہ ہوا کہ موت کے وقت سے نہ کوئی آگے بڑھ سکتا ہے نہ پیچھے ہٹ سکتا ہے۔ اور مقصود یہ ہے کہ موت کے آنے کے بعد اُس سے کوئی بچ نہیں سکتا۔ اب یہاں ایک اشکال ہوتا ہے وہ یہ کہ آیت سے جو مضمون مقصود ہے یعنی موت سے محفوظ نہ ہوسکنا اس سے لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ عَنْهُ سَاعَةً کا دخل تو ظاہر ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ موت کا وقت آنے کے بعد اس سے بچ نہیں سکتے اور بچنے میں تاخر کو دخل ہوسکتا ہے مگر لَا يَسْتَقْدِمُوْنَ کو اس میں کیا دخل ہے یہ جملہ کیوں بڑھایا گیا کیونکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ موت کے وقت سے پہلے کوئی بھی نہیں مر سکتا۔ سو یہ حکم تو صحیح ہے جو مقصود ہے اس میں کیا دخل کیونکہ تقویم میں نافع ہونے کا کیا احتمال ہے وہ تو اور الٹا مضر ہوگا پھر خصوص مجیٔ اجل (مدت آنے) کے بعد تو عقلاً بھی اس کا احتمال نہیں ہاں تاخیر کا احتمال ہوسکتا تھا اس لئے اس کی نفی بے شک مفید ہے تو یہ جملہ بظاہر زائد معلوم ہوتا ہے اس کے مختلف جواب دیئے گئے ہیں مگر حضرت استاد رحمہ اللہ نے ایک عجیب جواب دیا تھا جو میں نے کہیں منقول نہیں دیکھا ممکن ہے کسی نے لکھا ہو مگر میری نظر سے نہیں گذرا اور نہ مجھ کو اس تلاش کا اہتمام ہے ہیں تو خدا تعالیٰ نے

مشائخ ہی ایسے دیئے تھے جن کی باتوں سے ایسی تسلی ہوجاتی تھی جس سے کتب بینی سے استغنا ہو گیا ہولانا نے فرمایا کہ اس اشکال کا مبنی تو یہی ہے کہ تقدیم نافع نہیں ہوسکتی لیکن غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر تقدیم ممکن ہوتی تو وہ بھی نافع ہوسکتی اس طرح موت سے بچنے کی دو صورتیں ہوسکتی تھیں ایک یہ کہ وقت موت سے مقدم وقت میں چلا جائے مثلاً جمعہ کا دن موت کے لئے مقرر ہوا وہ وقت آیا اور یہ شخص جمعرات کے دن میں داخل ہوجائے، دوسرے یہ کہ وقت موت سے موخر وقت میں چلا جاوے مثلاً جمعہ کا دن آنے کے بعد موت کے آثار دیکھ کر سنیچر کے دن میں پہونچ جائے تو دونوں صورتوں میں موت نہ آئے گی کیونکہ وقت مقررہ تو جمعہ کا تھا اور جمعہ سے دونوں صورتوں میں فرار ہو گیا تو حق تعالےٰ نے اس طرح اشارہ کردیا ہے کہ دونوں صورتیں نافع ہوسکتی تھیں مگر چونکہ حرکت من الزمان ممکن نہیں اس لئے کسی صورت کا وقوع نہیں ہوتا خیر یہ تو لطائف ہیں جو ضمناً بیان کردیئے ورنہ اصل مقصود آیت کا صرف یہ ہے کہ موت آنے کے بعد اس سے بچنا ناممکن ہے جس کو محاورہ میں اسی طرح تعبیر کیا کرتے ہیں لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ وَلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ (جیسے وَمَا يُبْدِئُ وَمَا يُعِيْدُ (وہی دوسری بار بھی پیدا کرے گا) جیسے وَمَا يُبْدِئُ وَمَا يُعِيْدُ میں ابداء و اعادہ کے معنی حقیقی مراد نہیں ہیں بلکہ اصل مقصود یہ ہے کہ باطل کار آمد نہیں ہوتا اس مقصود کو اس عبارت میں محاورہ کے موافق بیان کردیا گیا اسی طرح یہاں بھی کہہ سکتے ہیں کہ تاخر و تقدم کی حقیقۃً نفی مراد نہیں بلکہ حاصل مراد ہے اور محاورات میں کسی شے سے نہ بچ سکنے کو اسی طرح بیان کیا کرتے ہیں، اس تقدیر پر آیت کو حرکت زمانی فی الزمان کی بحث سے کوئی تعلق نہ ہوگا بلکہ یہ محض ایک لطیفہ ہوگا مگر قرآن میں ایسی جامعیت ہے کہ ؎

بہار عالم حسنش دل و جان تازہ می دارد — برنگ اصحاب صورت را بہو اصحاب معنی را

(اس کے حسن کی بہار ظاہر پرستوں کے دل و جان کو اپنے حسن صوری سے اور حقیقت پرستوں کے دل و جان کو اپنے حسن معنوی سے تر و تازہ رکھتی ہے)

قرآن میں لطائف عقلیہ کی بہت گنجائش ہے گو وہ لطائف مسوق لہا الکلام نہ ہوں اس بنا پر ایسے نکات جو قواعد شرعیہ و عربیہ کے خلاف نہ ہوں قرآن میں بیان کرنے کا مضائقہ نہیں۔ الغرض

یہ بات میرے دل پر آئی کہ ہم آخرت کی طرف چل رہے ہیں اور ہر وقت ہر ساعت برابر چل رہے ہیں یا یوں کہدیا جائے کہ آخرت برابر ہماری طرف چلی آرہی ہے، یہی مضمون قرآن میں دوسری جگہ ارشاد ہوا ہے اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ وَهُمْ فِي غَفْلَةٍ مُّعْرِضُونَ (ان لوگوں سے ان کا حساب نزدیک آپہونچا اور یہ غفلت میں ہیں) اور ایک تفسیر یہ بھی ہے حافظ رح کے اس شعر کی ؎

مرا در منزل جاناں چہ امن و عیش چوں ہر دم ۔۔۔ جرس فریاد می دارد کہ بربندید محملہا

(مجھ کو منزل محبوب میں امن و سکون کہاں ہے جبکہ ہر وقت کوچ کی گھنٹی بجتی ہے کہ سامان سفر باندھو)

اس کی ایک تفسیر یہی کی گئی ہے کہ دنیا میں امن و عیش کہاں جبکہ ہر دم دنیا کی حالت یہ پکار کر کہہ رہی ہے کہ اسباب باندھ لو اور چلنے کی تیاری کرو کیونکہ واقعی ہمارا ہر سانس جو گذر رہا ہے وہ اس کی خبر دے رہا ہے کہ تم آخرت کی طرف اتنے نزدیک ہو گئے ہو جس کی عمر بیس سال کی ہے اس نے آخرت کی طرف بیس سال کی مسافت طے کر کے قرب حاصل کر لیا جس کی زیادہ عمر ہے اس نے زیادہ قرب حاصل کر لیا ہے (سچ کہا ہے کسی نے) ؎

تَسُرُّ الْمَرْءَ مَا ذَهَبَ اللَّيَالِيْ ۔۔۔ وَكَانَ ذِهَابُهُنَّ لَهٗ ذِهَابًا

(دلی خوش ہوتا ہے کہ اتنے ایام گذر گئے حالانکہ دنوں کا گذر اس کی عمر کا گذرنا ہے)

انسان کو اس سے خوشی ہوتی ہے کہ میرے بچہ کی عمر دس سال یا بیس سال کی ہو گئی اور یہ خبر نہیں کہ وہ اسی قدر موت سے قریب ہو گیا ہے ۱۲ جامع۔ اسی مضمون کو حافظ رحمہ اللہ نے اس شعر میں بیان فرمایا ہے۔ اور جرس کا لفظ اس بنا پر اختیار فرمایا کہ اس زمانہ میں قافلہ کے ساتھ جرس رہنے کی عادت تھی جیسے آجکل اسٹیشن پر گھنٹی بجا کرتی ہے یہ بھی جرس کی یادگار ہے مگر آج کل بدؤں میں جرس کی جگہ حیّ بولنے کا دستور ہے بس ان کی حیّ کہتے ہی دوسرے میت ہو جاتے ہیں کیا مجال ہے جو اس آواز کے بعد قافلہ کے چلنے میں ذرا بھی توقف ہو سکے ریل کی سیٹی کے بعد دیر ہو سکتی ہے مگر ان کی حی کے بعد دیر نہیں ہوتی یہ تفسیر تو اس شعر کی اہل زہد نے کی ہے۔ اور عارفین کے نزدیک اس کی اور تفسیر ہے۔ کہ مجھے منزل محبوب میں امن و عیش کہاں کیونکہ یہاں تو ہر وقت جرس کی فریاد ہے کہ اس منزل پر نہ ٹھہرو اسباب باندھ کے آگے چلو

آگے چلے تو وہاں بھی قیام نہیں بلکہ اس سے آگے بڑھنے کی تاکید ہے خلاصہ یہ کہ سلوک میں ترقی کرتے رہو کسی ایک حال پر قناعت نہ کرو ایک مقام پر ٹھہرو نہیں تو جب سالک کو ہر دم ترقی کی فکر ہے تو اس کو امن وعیش کہاں اس مضمون کو دوسرے عارف نے اس طرح بیان فرمایا ہے ؎

نگردد قطع ہرگز جادۂ عشق از دویدنہا　　　　کہ می بالد بخود ایں راہ چوں تاک از بریدنہا

(عشق کا راستہ دوڑنے سے طے نہیں ہوتا جس طرح درخت انگور جتنا قطع کرو اور بڑھتا ہے)

کہ یہ راستہ دوڑنے سے قطع نہیں ہو سکتا جتنا چلتے ہیں اتنا ہی راستہ نکلتا چلا آتا ہے جیسے پہاڑوں کے بیچ میں راستہ ہوتا ہے کہ دور سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ آگے دونوں پہاڑ ملے ہوئے ہیں بس اس کے بعد راستہ ختم مگر جوں جوں قریب پہونچتے ہیں راستہ نکلتا آتا ہے، یہی حال طریق سلوک کا ہے کہ اس کا منتہیٰ کسی جگہ نہیں مگر حافظ نے اس مضمون کو مبہم فرمایا ہے جس سے صاف یہ نہیں معلوم ہوتا کہ یہ طریق سلوک کے متعلق فرما رہے ہیں اسی لئے لوگ ان کو کیا بی شرابی سمجھتے ہیں کیونکہ ان کا کلام مختلف محامل پر محمول ہو سکتا ہے۔ مولانا رومی نے اس کو صاف صاف بیان فرمایا ہے ؎

اے برادر بے نہایت درگہیست　　　　ہرچہ بروے میرسی بروے مایست

(بھائی محبوب کی درگاہ کی انتہا نہیں ہے جس مقام پر پہونچو مت ٹھہرو آگے چلو)

اور دنیا میں تو سلوک کی انتہا ہے ہی نہیں بعض عارفین کا ارشاد ہے کہ آخرت میں بھی ترقی بند نہ ہوگی بلکہ وہاں بھی ہر دم ترقی ہوتی رہے گی کیا عجب ہے کہ خلود اسی واسطے ہو کیونکہ جب راستہ بے نہایت ہے تو اس کے طے کرنے کے لئے سالک کو بھی عمر بے نہایت تک زندہ رہنا چاہیے اور جب آخرت میں بھی ترقی بند نہ ہوگی تو ممکن ہے کہ جس طرح بعض لوگ وہاں پر جنت وحور میں مشغول ہوں گے بعض ان سے بڑھ کر ہوں جو محض دیدار الٰہی میں مشغول ہوں اور ان کو تجلیات میں یوماً فیوماً ترقی ہوتی رہتی ہو۔ اسی لئے بعض کا قول ہے اِنَّ فِی الْجِنَانِ جَنَّۃً لَیْسَ فِیْھَا حُوْرٌ وَّلَا قُصُوْرٌ وَّلٰکِنْ اَرِنِیْ اَرِنِیْ (یعنی جنتوں میں ایک جنت ایسی بھی ہے کہ جہاں حور ہے نہ قصور بلکہ صرف تمنائے دیدار ہوگی اور وہاں کے رہنے والے ہر وقت یہی پکاریں گے اَرِنِیْ اَرِنِیْ (مجھکو دیدار دکھائے مجھ کو دیدار دکھائیے) مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا

کہ جو لوگ حور و قصور میں ہوں گے وعلی الاطلاق ان سے کم درجہ والے ہوں گے. مجموعہ تین قسم کے لوگ ہیں ایک وہ جن کو حور و قصور ہی کا مشاہدہ ہے اور ان کو اس میں جمال حق نظر نہیں آتا اور خاص خاص مدت میں تجلی حق سے مشرف ہوتے ہیں، دوسرے وہ جو صرف جمال حق کے مشاہدہ میں مستغرق ہیں اُن کو کسی طرف التفات نہیں، تیسرے وہ جو جمال حق کے مشاہدہ میں مستغرق رہ کر اس درجہ پر پہنچ گئے کہ ہر چیز میں ان کو جمال حق کا ہی مشاہدہ ہوتا ہے اور ظاہر میں حور و قصور سے بھی متمتع ہو رہے ہیں تو یہ اَدنیٰ والے پہلے درجہ والوں سے تو بڑھے ہوئے ہوں گے مگر تیسرے طبقہ سے افضل نہ ہوں گے بلکہ تیسرا طبقہ ان سے بھی بڑھا ہوا ہے اور اس مذاق کے لوگ دنیا میں بھی نظر سے گزرے ہیں جن کو جمال حق کے سامنے حور و قصور کی پروا نہ تھی. حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب گنج مرادآبادی فرماتے تھے کہ جب ہم جنت میں جائیں گے اور حوریں آویں گی "یہ بات اس طرح فرمائی گویا یہ طے شدہ بات ہے کہ جنت میں تو ضرور ہی جائیں گے یہ غلبۂ رجا تھا" تو ہم حوروں سے کہیں گے کہ بی قرآن پڑھو تو یہاں بیٹھو ورنہ چلتی بنو. مگر اس وقت مولانا پر غلبۂ حال تھا عشق کا حال غالب تھا کبھی عارف پر عشق کا غلبہ ہوتا ہے تو وہ ایسی باتیں کہہ جاتا ہے، اور جب معرفت کا غلبہ ہوتا ہے اس وقت اس کو کوئی چیز مشاہدۂ جمال حق سے مانع نہیں ہوتی جملہ اشیاء مرآۃ جمال محبوب بن جاتی ہیں اس وقت وہ یوں کہتا ہے ؎

ما چو چنگیم و تو زخمہ می زنی   زاری از ما نے تو زاری میکنی

(ہم مثل چنگ کے ہیں اور آپ مضراب مارتے ہیں گو یہ وزاری ہماری طرف سے ہے نہ آپ زاری کرتے ہیں)

حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ حضرات اکابر صوفیہ جیسے حضرت سیدنا عبدالقادر جیلانی قدس سرہٗ عمدہ لباس اور عمدہ غذائیں اس لئے استعمال کرتے تھے کہ ان کو ان چیزوں میں نعمائے جنت کے اظلال نظر آتے تھے تو عارف کو بعض دفعہ ہر چیز میں ظل جمال حق نظر آتا ہے اس وقت یہ حال ہوتا ہے کہ وہ حور کو بھی حاجب نہیں سمجھتا بلکہ وہ اس کے لئے ایسی بن جاتی ہے جیسے آئینہ میں صورت محبوب نظر آیا کرتی ہے اور جس وقت معرفت کا غلبہ نہ ہو بلکہ عشق کا غلبہ ہو تو وہ اس سے زیادہ کہتا ہے یعنی اپنے کو بھی حجاب سمجھتا ہے حور کو تو کیوں

نہ سمجھے گا حضرت قلندرؒ فرماتے ہیں ؎

غیرت از چشم برم روئے تو دیدن ندہم گوش را نیز حدیث تو شنیدن نہ دہم
(مجھ کو آنکھوں پر رشک آتا ہے کہ ان کو محبوب کے چہرہ انور کو نہ دیکھنے دوں اور کانوں کو بھی اسکی باتیں سننے دوں)

گر بیاید ملک الموت کہ جانم ببرد تا نہ بینم رُخ تو روح رمیدن نہ دہم
(اگر ملک الموت میری جان لینے کو آئے تو میں جب تک آپ کی تجلی نہ دیکھ لوں جان نہ دوں گا)

اور عارف اپنے کو بھی مرآۃ سمجھتا ہے اور یوں کہتا ہے ؎

ستم است اگر ہوست کشد کہ بہ سیر سرو وسمن درآ تو زغنچہ کم نہ دمیدۂ در دل کشا بچمن درآ
(تمہارے اندر خود چمن ہے اس کا پھاٹک تمہارے ہاتھ میں ہے جب جی چاہے سیر کر لو)

چنانچہ صوفیہ نے قلب میں تمام عالم ناسوت و ملکوت کو مندمج مانا ہے اس لئے وہ کہتے ہیں کہ تم کو چمن اور سرو وسمن کی سیر کی ضرورت نہیں اپنے دل کا دروازہ کھول کر اس کی سیر کرو اس میں سب کچھ موجود ہے اور دوسرے آثار کو بھی جیسا مولانا نے ایک صوفی کا قصہ لکھا ہے ؎

صوفیٔ درباغ از بہر کشاد صوفیانہ روئے بر زانو نہاد

یعنی وہ سر جھکائے باغ میں مراقب بیٹھا تھا کسی نے کہا فَانْظُرْ اِلٰی اٰثَارِ رَحْمَۃِ اللّٰہِ۔ (آثار رحمت الٰہی کی طرف دیکھ) صوفی نے جواب دیا کہ میں تو آثار رحمت ہی کا مشاہدہ کر رہا ہوں اور تم آثار الآثار کو دیکھ رہے ہو۔ اس صوفی نے تفسیر میں تغیر نہیں کیا بلکہ استدلال کیا ہے کہ جب ان آثار رحمت کے مشاہدہ کا امر ہے جو ظل آثار رحمت ہیں تو اصل آثار کے مشاہدہ کا امر کیوں نہ ہوگا جو مومن کے قلب میں ہیں تو مولانا شاہ فضل الرحمٰن صاحب کو غلبۂ عشق میں یہ یاد نہ رہا کہ وہاں حوریں بھی حجاب نہ ہوں گی یعنی مشاہدہ جمال حق سے مانع نہ ہوں گی اس لئے یہ فرمایا کہ حوریں آئیں گی تو ہم ان سے کہیں گے کہ بی قرآن سناؤ تو بیٹھو ورنہ چلی جاؤ۔ ورنہ وہاں حوروں سے باتیں کرنے میں بھی وہی قرب ہوگا جو تلاوت قرآن میں حاصل ہوتا ہے تو غالباً وہ جنت میں ارنی ارنی کی صدا ہوگی وہاں ایسے ہی عشاق کا مجمع ہوگا عارفین کاملین ان سے بھی اوپر کے درجہ میں ہوں گے جہاں حور و قصور سب کچھ ہوں گے اور کوئی چیز مانع مشاہدۂ حق سے نہ ہوگی مگر جنت میں کسی ایسی جنت کا ہونا صرف اس صوفی کے قول سے معلوم

ہورہا ہے احادیث سے اس کا کہیں ثبوت نہیں ملا پس یا تو اس کو کشف پر محمول کر کے سکوت کیا جائے یا تاویل کر کے احادیث پر منطبق کر لیا جائے تاویل یہ کہ صوفی کا مطلب یہ نہیں کہ ایسی جنت کوئی مستقل ہوگی بلکہ مطلب یہ ہے کہ ایسی حور و قصور والی جنت میں ایک حالت ایسی ہوگی جس میں غیر کی اصلاً گنجائش نہ ہوگی بلکہ اس وقت مشاہدۂ جمال حق میں بحر انی کے اور کوئی تمنا نہ ہوگی نہ کسی کی طرف التفات ہوگا چنانچہ یہ مضمون دو حدیثوں کے مجموعہ میں ہے ایک یہ کہ جب اہل جنت جنت میں پہونچ جائیں گے تو حق تعالیٰ ارشاد فرمائیں گے کہ اے جنت والو تم اور کچھ چاہتے ہو وہ کہیں گے خداوندا آپ نے ہم کو بہت کچھ عطا فرما دیا ہے ارشاد ہوگا کہ لو ہم تم کو اس سے بھی افضل نعمت عطا کرتے ہیں اور اس کے بعد حق تعالیٰ تجلی فرمائیں گے۔ حدیث میں آتا ہے کہ اس نعمت سے زیادہ لذیذ اہل جنت کے نزدیک کوئی نعمت نہ ہوگی رواہ مسلم، اور جب تک اس تجلی میں مشغول رہیں گے کسی نعمت کی طرف التفات نہ کریں گے، رواہ ابن ماجہ۔ ان حدیثوں سے اس صوفی کے قول کی مناسب تاویل ہو سکتی ہے۔ پس اس بنا پر جنت میں بھی ترقی مظنون ہوئی تو بعض نے ترقی سلوک کو اس شعر حافظ کا محمل ٹھہرایا ہے اور بعض نے دنیا سے آخرت کی طرف سفر کرنے کو محمل کہا ہے اور میں اسی کو کہہ رہا تھا کہ ہم لوگ آخرت کی طرف چل رہے ہیں ہم کو ہر وقت یہ مراقبہ پیش نظر رکھنا چاہیئے اور جس طرح سفر قطع کرنے میں ہر وقت اس پر نظر رہتی ہے کہ کون امر اس سفر میں معین ہے تو اس کی تحصیل کرتا ہے اور کون امر مانع ہے اس سے دور رہتا ہے۔ اسی طرح اس سفر الی الآخرت میں بھی ہر دم ہر کام کے وقت یہ سوچ لیا کریں کہ یہ آخرت کی منزل میں مفید ہوگا یا مضر اب بعض امور تو معین آخرت ہونگے جیسے ذکر اللہ۔ امر بالمعروف تلاوت قرآن۔ نماز۔ روزہ۔ حج۔ زکوٰۃ وغیرہا یہ تو معین ہیں مقصود میں یعنی حصول نجات میں اور یہی منزل پر پہونچنا اور بعض امور مانع عن الوصول ہیں جیسے معاصی ظاہرہ و باطنہ اور بعض امور ظاہر میں نہ معین ہیں نہ مانع جیسے امور مباحہ۔ کہ ان کے کرنے میں ثواب نہیں (الا بِنِيَّةٍ مَخْصُوْصَةٍ ۱۲) (مگر نیت مخصوصہ سے) اور ترک میں گناہ نہیں اس کو عام لوگ مستقل قسم ثالث سمجھتے ہیں مگر حقیقت میں اثر کے اعتبار سے یہ تیسری قسم نہیں بلکہ ان دونوں

قسموں میں سے کسی ایک قسم کی طرف راجع ہے کیونکہ مباح بھی اثر محمود و اثر مذموم سے خالی نہیں ہوتا فعل مباح کا اثر کچھ نہ کچھ ضرور ہوتا ہے یا محمود یا مذموم گو وہ اپنی ذات کے اعتبار سے نہ محمود ہے نہ مذموم مگر ایسا نہیں ہوتا کہ اس کا اثر بھی غیر محمود و غیر مذموم ہی ہے بلکہ اثر یا محمود ہوتا ہے یا مذموم پس اگر اس کا اثر محمود ہے تو وہ قسم اول اعمال مفید آخرت میں داخل ہے اور اگر اثر مذموم ہے تو قسم دوم مضرت آخرت میں داخل ہے اس تقریر کے بعد ایک حدیث کا اشکال رفع ہو گیا حدیث یہ ہے مِنْ حُسْنِ اِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْكُهُ مَا لَا يَعْنِيْهِ (مسلمان کے اسلام کی خوبی میں سے یہ بات ہے کہ وہ لایعنی اور فضول کاموں کو ترک کر دے ۱۲) اس پر یہ اشکال یہ ہوتا ہے کہ لایعنی سے امور محرمہ تو مراد ہو نہیں سکتے کیونکہ ان کا ترک تو واجب ولازم ہے اور سیاق حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں وجوب ترک مراد نہیں بلکہ محض ترغیب ترک دی جا رہی ہے تو یقیناً لایعنی سے مراد امور مباحہ ہیں تو اب شبہ یہ ہوتا ہے کہ جب یہ امور لایعنی مانع عن الوصول اور مضر آخرت نہیں ہیں تو اُن کے ترک کی ضرورت کیا ہے تقریر گذشتہ سے معلوم ہو گیا کہ امور مباحہ کو لایعنی کہنا یہ محض درجۂ ذات کے اعتبار سے ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اسی درجہ کے اعتبار سے ان پر لایعنی کا اطلاق فرمایا ہے ورنہ آثار کے اعتبار سے یہ امور ما یضر ہیں یعنی مضر اور اسی درجہ آثار کے اعتبار سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کے ترک کا امر فرما رہے ہیں اور اس کو کمال اسلام کی خوبی بتلا رہے ہیں پس اگر کوئی مباح مفید آخرت ہو تو اس وقت وہ لایعنی نہ ہوگا مثلاً مزاح کرنا بچوں سے یا دوستوں سے یہ فی نفسہ مباح ہے جس نہ ثواب نہ گناہ مگر اثر کے اعتبار سے یا مفید آخرت ہے یا مضر اگر مفید ہوا تو لایعنی نہ رہے گا چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی مزاح فرمایا ہے حالانکہ یقیناً آپ امور لایعنی سے بری تھے اس کا معیار یہ ہے کہ اپنی نیت کو دیکھو کہ مزاح سے مقصود کیا ہے۔ ہمارے یہاں تو کچھ بھی مقصود نہیں ہوتا ہم لوگ اکثر کام بدون کسی خاص ارادہ اور نیت کے کرتے ہیں محض عادت کی بنا پر اکثر کام ہوتے ہیں اور اگر کسی مقصود کا ارادہ بھی ہوتا ہے تو وہ نفس کی کوئی غرض ہوتی ہے بلکہ ہم کیا کہیں ہماری تو نماز بھی نفس ہی کے لئے ہے اس میں بھی کوئی نیت خالص آخرت کے لئے نہیں ہوتی اسی لئے نماز پڑھ کر ہمیں تو ڈر لگتا ہے کہ یہ

کس منہ سے کہیں کہ اے اللہ قبول فرمالے بلکہ یوں دعا کرتے ہیں کہ خدا معاف کرے تو ہمارے یہاں مزاح میں تو کیا نیت ہوتی امور واجبہ ومفروضہ میں بھی کوئی خاص نیت نہیں ہوتی بلکہ اکثر افعال عادت کی وجہ سے خود بخود صادر ہو جاتے ہیں اور اگر کوئی نیت ہوتی بھی ہے تو وہ نفس کی غرض سے خالی نہیں ہوتی خیر یہ تو ہمارا حال ہے اس کو تو رہنے دیا جائے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مزاح میں تو یقیناً کچھ مصالح ضرور ہوں گے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مزاح میں تو مصالح کیوں نہ ہوتیں عارفین نے بھی عجیب عجیب مصالح مزاح میں اختیار کی ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مزاح میں علاوہ اور مصالح کے ایک ادنیٰ مصلحت کم از کم یہ تو ضرور ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصود تبلیغ و اصلاح ہے جس میں ایک کام تو آپ کا تھا پہونچا دینا اور ایک کام قابل کا ہے کہ وہ فیض لے جس کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدا داد ہیبت کس قدر مانع ہو سکتی تھی کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حق تعالیٰ نے وہ ہیبت عطا فرمائی تھی جس کی وجہ سے بڑے بڑے سلاطین دور دراز کی مسافت پر آپ کے رعب سے کانپتے تھے اور جو آپ کے سامنے آتا تھا اس کو از خود گفتگو کی ہمت نہ ہوتی تھی اور فیض لینے کے لئے مستفید کے دل کھلنے کی ضرورت ہے جب تک اس کا دل نہ کھل جائے اس وقت تک وہ فیض نہیں لے سکتا بس یہ حال ہو جاتا ہے

سامنے سے جب وہ شوخ دلربا آجائے ہے
تھامتا ہوں دل کو پر ہاتھوں سے نکلا جائے ہے

عاشق پر جب محبوب کی ہیبت کا غلبہ ہوتا ہے تو جو کچھ وہ سوچ کر آتا ہے کہ یوں کہوں گا یہ پوچھوں گا صورت دیکھتے ہی سب ذہن سے نکل جاتا ہے اور وقت پر کچھ بھی نہیں کہا جاتا۔ ہمارے ایک عزیز ناخواندہ کہتے ہیں ؎

یوں کہتے یوں کہتے جو وہ آجاتا سب کہنے کی باتیں ہیں کچھ بھی نہ کہا جاتا

اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ سے گاہے گاہے مزاح فرمایا کرتے تھے تاکہ ان کا دل کھل جائے اور بے تکلف ہو کر استفادہ کر سکیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہیبت تو بھلا کیسی کچھ ہوگی۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے غلامان غلام کی یہ حالت تھی کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایک مرتبہ ایک جماعت کے ساتھ چلے جا رہے تھے کہ دفعتہً آپ نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو سب مارے ہیبت کے

گھٹنوں کے بل گر پڑے حالانکہ یہ وہ حضرات تھے جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مرید نہ تھے بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ پیر بھائی تھے جن میں گو نہ مساوات ہوا کرتی ہے مگر ان پر بھی آپ کا اس قدر رعب تھا مگر شاید اس میں کوئی یہ شبہ نکالے کہ وہ حضرات معتقد تو تھے تو سنئے کہ غیر معتقدین پر آپ کے رعب کی یہ شان تھی کہ ایک مرتبہ سفیر روم بڑی شان و شوکت کے ساتھ مدینہ منورہ میں آپ کی خدمت میں آیا اور شہر میں داخل ہو کر لوگوں سے دریافت کیا کہ خلیفہ کا قصر کہاں ہے ؎

گفت کو قصر خلیفہ اے حشم | تا من اسپ و رخت را آنجا کشم
قوم گفتندش کہ او را قصر نیست | مر عمر را قصر جان روشنے ست

(کہنے لگا اے لوگو! خلیفہ کا محل کہاں ہے تاکہ میں وہاں حاضر ہوں لوگوں نے کہا کہ ان کا کوئی محل ظاہری نہیں ہے ان کا محل ان کا قلب روشن ہے۔)

(اس موقعہ پر حضرت مولانا پر گریہ طاری ہو گیا مگر بہت ضبط سے کام لیا ۱۲) لوگوں نے کہا کہ عمر کے لئے نہ قصر ہے نہ ایوان ہے بس ان کا تو دل ہی قصر و ایوان ہے۔ قاصد کو بڑی حیرت ہوئی کہ وہ خلیفہ جس کے نام سے سلاطین کانپتے ہیں اس کے محل نہ قصر یہ کیا معاملہ ہے پھر اس نے پوچھا کہ آخر وہ کہاں بیٹھا کرتے ہیں لوگوں نے کہا مسجد میں اکثر بیٹھا کرتے ہیں اور کبھی بازاروں میں گلی کوچوں میں اور کبھی جنگل میدانوں میں گھومتے پھرتے ہیں تلاش کرلو کہیں مل جائیں گے۔ اب وہ آپ کی تلاش میں چلا معلوم ہوا کہ ابھی جنگل کی طرف تشریف لے گئے ہیں سفیر کو بڑی حیرت ہوئی کہ یہ عجیب بادشاہ ہے جو تنہا بازاروں جنگلوں میں پھرتا ہے، نہ ساتھ میں پہرہ دار ہیں نہ پولیس آخر وہ جنگل کی طرف چلا جس وقت اس باغ کی حد میں قدم رکھا جہاں حضرت عمر رضی اللہ عنہ پڑے سو رہے تھے قدم رکھتے ہی اس کے دل پر ہیبت و رعب نے غلبہ کیا کیونکہ جنگل میں ایک خدا کا شیر پڑا ہوا تھا اور قاعدہ ہے کہ جہاں شیر پڑا ہوتا ہے اس جنگل میں قدم رکھتے ہی بڑے بڑے بہادروں کے دل کانپ جاتے ہیں۔ اب اس سفیر کو بڑی حیرت ہوئی کہ اس شخص کے پاس نہ کوئی پہرہ چوکی ہے نہ جاہ حشم ہے نہ ساز و سامان ہے پھر یہ کیا بات ہے کہ صورت دیکھنے سے پہلے ہی میرا دل ہاتھوں سے نکلا جاتا ہے یہاں تک کہ جب قریب پہونچا تو دیکھا کہ ایک

خدا کا شیر جنگل میں تن تنہا پڑا سو رہا ہے نہ اُسے کسی دشمن کا خوف ہے نہ جاسوس کا ڈر سر کے نیچے ایک اینٹ تکیہ کے بجائے رکھی ہے نہ کوئی فرش ہے نہ بستر بس گلے میں ایک تلوار پڑی ہوئی ہے اور بے فکر سو رہے ہیں۔ اس حالت کا مقتضا یہ تھا کہ سفیر کے دل میں خلیفہ کی بے وقعتی ہوتی مگر یہاں برعکس معاملہ یہ ہوا کہ صورت دیکھتے ہی سفیر روم لرزنے لگا جونہی نظر پڑی ہے پیر اٹھانے کی ہمت نہ رہی۔ مولانا فرماتے ہیں کہ اس وقت وہ سفیر اپنے دل میں کہہ رہا تھا کہ میں نے تو بڑے بڑے سلاطین کے دربار دیکھے ہیں جن کے دربار میں رعب و داب کے ہزار سامان ہوتے تھے مگر مجھ پر کسی کا رعب طاری نہ ہوا آج کیا بات ہے کہ اس بے سروسامان شخص کے رعب سے میرا پتّہ پانی ہوا جاتا ہے آخر اس شخص کے اندر کیا چیز ہے کہ میری رگ رگ میں اس کے دیکھنے سے لرزا پیدا ہو گیا بیشک ؎

ہیبت حق است وایں از خلق نیست ہیبت آں مردِ صاحب دلق نیست

(یہ ہیبت حقیقت میں حق تعالیٰ کی ہوتی ہے اس مخلوق یا اس گدڑی والے کی نہیں ہوتی)

یہ خدائی رعب و جلال تھا جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے چہرہ سے ظاہر ہو رہا تھا بالآخر سفیر روم کی ہمّت نہ ہوئی کہ حضرت عمرؓ کو خود جگائے وہ تو اپنی جگہ دیر تک کھڑا کانپتا رہا کچھ دیر کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ خود ہی بیدار ہوئے تو دیکھا کہ ایک پردیسی اجنبی آدمی کھڑا کانپ رہا ہے۔ آپ نے اس کو پاس بلایا اور تسلی دی جس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دو سفیروں کو مرعوب دیکھ کر فرمایا تھا کہ تم مجھ سے اتنا کیوں ڈرتے ہو میں تو اس غریب عورت کا بچہ ہوں جو سوکھا گوشت کھایا کرتی تھی۔ حضرت عمرؓ کی باتیں سننے کے بعد ہیبت مبدل بہ محبت ہو گئی اور سفیر کو آگے بڑھنے اور بات چیت کرنے کی ہمت ہوئی جس کے بعد وہ سمجھ گیا کہ واقعی مذہب اسلام حق ہے پھر وہ اسلام سے مشرف ہو گیا یہ تو حضرات صحابہ کرام کی حالت تھی ہم نے اپنے بزرگوں کو دیکھا ہے کہ خدا تعالےٰ نے ان کو ایسا رعب عطا فرمایا تھا کہ بڑے بڑے لوگوں کی ان سے بات کرنے کی ہمّت نہ ہوتی تھی۔

حضرت مولانا گنگوہی قدس سرہٗ کے رعب و ہیبت کی یہ شان تھی کہ بڑے بڑے نواب مولانا سے بے تکلف باتیں نہ کر سکتے تھے، حضرت کا ان پر ایسا رعب پڑتا تھا کہ باتیں کرتے ہوئے رُکتے

ادرجھجکتے تھے اور ڈرتے تھے اور خیر بعض بزرگوں سے تولوگ اس لئے ڈرتے ہیں کہ وہ غصیانہ ہوتے ہیں بات بات میں ان کو غصّہ آجاتا ہے اس لئے ان کے پاس جاتے ہوئے لوگ کانپتے ہیں جیسے مولانا شاہ فضل الرحمٰن صاحب تھے یا آجکل بھی ایک بدنام ہے (ہائے ے ہزار نام خدا لئے تو وہ بدنامی تو۔ تجھ پر اور تیری بدنامی پر ہزار نام فدا ہیں ۱۲ جامع) مگر مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ میں تو غصّہ کا نام بھی نہ تھا، میں نے تو کبھی بھی مولانا کو غصّہ فرماتے ہوئے نہیں دیکھا مگر اس پر بھی مولانا کا اتنا رعب محض ہیبت حق کا اثر تھا اور یہ ہیبت بعض اوقات طالبین کے لئے مانع فیض ہوجاتی ہے اس لئے حضرات انبیاء علیہم السلام وا ولیاء کرام اپنے اصحاب واحباب سے گاہے مزاح کرلیتے ہیں تاکہ ان کا دل کھل جائے اور ہیبت ومحبت کے مل جانے سے اعتدال پیدا ہوجائے، اسی لئے اہل آداب نے لکھا ہے کہ مہمان کے سامنے اپنے بلا زمین پر بھی غصہ نہ ہو کیونکہ اس سے مہمان کو وحشت ہوگی اور وہ گھبرائے گا کہ نہ معلوم اس شخص کا میرے ساتھ کیسا معاملہ ہو اور شاید اس وحشت کی وجہ سے وہ کھانا بھی کم کھائے کہ نہ معلوم یہ کیسے مزاج کے ہوں گے ان کو زیادہ کھانا کہیں ناگوار نہ ہو۔ واقعی یہ ہیں آداب اور ہم نے تو اخلاق کا محض نام سن لیا ہے مگر بھائی کیا کریں کھٹے ہیں یا میٹھے سب اسی باغ کے پودے ہیں جب کوئی باغ لگاتا ہے تو سارے درخت میٹھے ہی نہیں پیدا ہوتے بلکہ کوئی میٹھا ہوتا ہے کوئی کھٹا اور اس میں بھی حکمت ہے وہ یہ کہ سب میٹھے ہی پھل ہوں تو ان کے کھانے سے تخمہ اور ہیضہ کا اندیشہ ہوتا ہے جب میٹھے پھلوں کے ساتھ کوئی کھٹا بھی مل جائے تو سب ہضم ہوتے ہیں اسی لئے اکثر لوگ دیسی آموں کو پسند کرتے ہیں کہ ان میں کھٹے میٹھے ملے ہوئے ہوتے ہیں تو یہ ساتھ کے ساتھ ہضم ہوتے رہتے ہیں اور مالدہ آم سب میٹھے ہوتے ہیں ان کو زیادہ کھالو تو ہیضہ ہوجائے۔ اسی طرح خداتعالیٰ نے باطنی باغ میں بھی کوئی درخت میٹھا رکھا ہے کوئی کھٹا باقی ہیں سب اسی باغ کے درخت اس لئے اعتراض کی کوئی وجہ نہیں۔ حضرت مولانا شاہ فضل الرحمٰن صاحب حالانکہ بہت بڑے ولی وعارف تھے مگر فطرتی طور پر تیز مزاج تھے ان کی تیزی تکبر یا بناوٹ سے نہ تھی بلکہ طبعی تھی اور مشاہدہ سے یہ بات خود معلوم ہوجاتی ہے کہ کس میں طبعی تیزی ہے اور کون تکبر کی

وجہ سے تیزی کرتا ہے چنانچہ شاہ صاحب کے یہاں ایک مرتبہ ایک شخص آیا اس نے مسجد میں آکر اپنا سامان رکھا۔ مولانا نے دیکھتے ہی فرمایا ارے نکالو وہ تھا کوئی دلیر۔ کہنے لگا دیکھوں تو وہ کون ہے جو مجھے نکالے گا۔ اب کسی خادم کی ہمت نہ ہوئی جو اُسے نکالے اور مولانا بار بار فرمارہے ہیں کہ ارے نکالو اس کو مگر کوئی نہ اٹھا آخر کو مولانا خود اٹھے اور اس کا سامان اٹھا کر مسجد سے باہر پھینکدیا اس نے اتنا ادب کیا کہ مولانا کو اسباب اٹھاتے ہوئے کچھ نہیں کہا جب وہ اسباب لیکر چلے خود بھی ساتھ ہولیا جب مولانا نے اسباب کو مسجد سے باہر رکھا اس نے اٹھا کر پھر مسجد میں اپنی جگہ لا رکھا۔ مولانا کو پھر غصہ آیا اور دوسری مرتبہ آپ نے پھر اسباب اٹھا کر مسجد سے باہر پھینکدیا مسافر نے اٹھا کر پھر اندر رکھ لیا غرض چند مرتبہ ایسا ہی ہوا، آخر کو مولانا تھک گئے تو اپنی جگہ پر آبیٹھے اور وہ مسافر اپنی جگہ جما ہوا بیٹھا رہا۔ ان حضرات کے غصہ کی ادا ہی سے معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کا منشا تکبر نہیں اگر مولانا کے غصہ کا منشا تکبر ہوتا تو خود اٹھ کر اس کا اسباب لاد کر باہر نہ نکالتے متکبرین ایسا کبھی نہیں کرسکتے وہ جو کچھ کرتے ہیں خدام کے واسطے سے کرتے ہیں تو خود ایسا کام کبھی نہیں کرتے مگر مولانا نے اس کی پروا بھی نہ کی جب کوئی خادم نہ اٹھا تو خود اسے نکالنے چلے یہ تو ہولیا اور لیجئے کھانے کا وقت آیا تو مولانا نے اس مسافر کے لئے گھر سے کھانا بھجوایا اب اس نے نخرے شروع کئے کہ جاؤ ہم نہیں کھاتا یہ روٹیوں ہی کی وجہ سے مسافروں کو دھکے دیئے جاتے ہیں کیونکہ گھر سے کھلانا پڑتا ہے تو میں ایسی روٹیوں سے باز آیا خادم نے جاکر اطلاع کی کہ حضرت مہمان نے کھانا نہیں کھایا اور یوں یوں کہتا ہے کوئی متکبر ہوتا تو یہ جواب سن کر خاموش بیٹھ جاتا مگر مولانا کی طبیعت نے مسافر کا بھوکا رہنا گوارا نہ کیا خود کھانا لے کر آئے اور اس کی خوشامد کی کہ بھائی تو میرے کہنے کا برا نہ مان، میرے یہاں اکثر لوگ دنیا کے قصے لاتے ہیں کوئی مقدمہ کی باتیں لاتا ہے کوئی اولاد کے لئے دعا کراتا ہے دین کے طالب کم آتے ہیں اس لئے مجھے غصہ آجاتا ہے غرض اس کو کھانا کھلایا مگر یاد رہے کہ یہ معاملہ لطف کا ان لوگوں کے ساتھ کیا جاتا ہے جو صرف مہمان بن کر آئیں کہ ان کو خوشامد کر کے کھانا کھلایا جاتا ہے اور جو شخص مہمان بن کر نہ آئے بلکہ اپنی اصلاح کے لئے آئے اُس کا یہ حق نہیں کہ

شیخ اس کی خوشامدیں کر کے کھانا کھلائے بلکہ اس کے ذمہ ہے کہ اپنے کھانے کا خود انتظام کرے وہ اگر نخرے کریگا تو دماغ کی اصلاح کی جائے گی اس کی ایسی مثال ہے کہ ایک شخص تو تحصیلدار کے گھر مہمان ہو کر جائے اس کو تو تحصیلدار خاطر مدارات کے ساتھ کھانا کھلائے گا اور ایک شخص تحصیلدار کے یہاں مقدمہ لیکر جائے اس کا یہ حق نہیں ہے کہ تحصیلدار اسے کھانا کھلائے بلکہ اس کے ساتھ ضابطہ کا برتاؤ ہوگا اسے اپنے کھانے کا خود انتظام کرنا پڑے گا اور اوقات مخصوصہ پر عدالت کے اندر گفتگو کا موقعہ ملے گا ہر وقت بات چیت کرنے کی بھی اسے اجازت نہ ہوگی نہ اس کی ساتھ حاکم مزاح و دل لگی کرے گا کیونکہ وہ مہمان نہیں ہے بلکہ صاحب غرض ہے آجکل یہ بھی ایک وجہ ہے بزرگوں کو بدنام کرنے کی کہ وہ مہمان اور طالب سب کے ساتھ یکساں برتاؤ چاہتے ہیں حالانکہ مہمان کا اور حق ہے طالب کا اور حق ہے۔ مہمان تو اگر فاسق بھی ہو بلکہ کافر بھی ہو تب بھی اس کی ساتھ خاطر مدارات کا معاملہ کیا جائے گا اور طالب کے ساتھ یہ معاملہ نہ ہوگا کیونکہ طالب سے مہمانوں کی طرح معاملہ کرنے سے اس کی اصلاح نہیں ہو سکتی غرض بزرگوں نے جو گاہے اپنے متعلقین سے مزاح کیا ہے اس کی حکمت یہ تھی کہ اس سے طالب کا دل کھل جاتا ہے تو وہ استفادہ بخوبی کر سکتا ہے مگر یہ حکمت ان بزرگوں کے مزاح میں ہے جن کے ذمہ تبلیغ و اصلاح کا کام ہے اور بعضے ایسے بھی ہیں جو آزاد طبع ہیں وہ تبلیغ وارشاد سے گھبراتے ہیں اُن کا مذاق یہ ہوتا ہے ؎

احمد تو عاشقی بمشیخت ترا چہ کار　　　دیوانہ باش سلسلہ شد شد نشد نشد

(احمد تو عاشق ہے مشیخت سے تجھ کو کیا کام عاشق رہے سلسلہ ہو ہو نہ ہو نہ ہو)

وہ حضرات اس قاعدہ کے پابند نہیں ان کے مزاح میں ایک دوسری حکمت ہوتی ہے اور وہ حکمت یہ ہے کہ وہ اپنی وضع کو خاک میں ملانا چاہتے ہیں اس لئے مزاح و دل لگی کرتے رہتے ہیں تاکہ چھچھوراپن ظاہر ہو ان کو اس کی پروا نہیں ہوتی کہ کوئی ہم کو چھچھورا سمجھ کر چھوڑ دے گا معتقد نہ رہے گا ان کا مذاق یہ ہوتا ہے ؎

رند عالم سوز را با مصلحت بینی چہ کار　　　کار ملک است آنکہ تدبیر و تحمل بایدش

(رند عالم سوز یعنی عاشق کو مصلحت بینی سے کیا تعلق اس کو تو محبوب حقیقی کا کام سمجھ کہ تحمل اور تدبیر کرنی چاہئے)

مگر یہ رند وضع سوز ہوتے ہیں شرع سوز نہیں ہوتے وضع و ناموس کو جلا پھونک دیتے ہیں مگر

شریعت کے پابند ہوتے ہیں اور جو وضع سوز ہونے کے ساتھ شرع سوز بھی ہو وہ یا تو فاسق ہے یا مجذوب ہے ان دونوں کے مزاح کی حکمت بیان کرنے کی ہمیں ضرورت نہیں فاسق تو ولی ہی نہیں اور مجذوب گو ولی ہوتا ہے مگر اس کے افعال میں حکمت کا قصد نہیں ہوتا گو واقع میں حکمت ہوا کرے۔ سو ان دونوں سے یہاں بحث نہیں یہاں گفتگو ان بزرگوں کے مزاح میں ہے جو اپنے افعال میں حکمت کا قصد کرتے ہیں تو ان میں جو آزاد ہوتے ہیں میں نے ان کے مزاح کی حکمت بتلا دی کہ وہ اپنی وضع کو جلانے کے لئے اور ناموس کو خاک میں ملانے کے لئے مزاح کیا کرتے ہیں وہ ان مصالح پر نظر نہیں کیا کرتے جن پر اہل سلسلہ کو نظر ہوتی ہے کار ملک است الخ میں اہل سلسلہ ہی مراد ہیں کہ وہ انتظام سلطنت کرتے ہیں ان کو مصالح کی رعایت کرنا پڑتی ہے سو وہ کریں رند کو اس کی ضرورت نہیں وہ تو ہر وقت اپنے مٹانے کی کوشش کرتا ہے اور بعض دفعہ یہ صفت اتنی بڑھ جاتی ہے کہ وہ یوں کہنے لگتا ہے ؎

افروختن و سوختن و جامہ دریدن ۔ پروانہ زمن شمع زمن گل زمن آموخت

(روشن ہونا اور جلنا اور کپڑے پھاڑتا پروانہ ہم سے شمع نے ہم سے گل نے ہم سے سیکھا ہے)

اور یوں کہتا ہے ؎

جوش عشق است کاندر مے فتاد
آتش عشق است کاندر نے فتاد

(جوش عشق ہے جو شراب میں ہے اور آتش عشق ہے جو بانسری میں ہے)

اس وقت جوش میں کوئی اس کے برابر نہیں ہوتا بلکہ وہ کہتا ہے کہ میرے ہی عشق کا اثر پروانہ اور شمع میں ہے اور میرے ہی جوش کا ظہور مے اور نے میں ہے۔ اور یہ بات محض مبالغہ کے طور پر نہیں بلکہ حقیقت کے بھی موافق ہے کیونکہ انسان عالم اکبر ہے اور عالم ناسوت عالم اصغر ہے اور عالم اصغر عالم اکبر سے مستفید ہے اس لئے جن چیزوں کا عالم ظاہر میں ظہور ہو رہا ہے سب قلب عارف کے آثار ہیں اگر اس طرح نہ سمجھو تو یوں سمجھو کہ خلق عالم سے انسان مقصود ہے تو انسان سب کی اصل ہے اور یہ عالم انسان کی فرع ہے اس لئے عارف کا یہ کہنا

درست ہے کہ میرے ہی سے تمام چیزوں نے جوش و مستی کا سبق سیکھا ہے یعنی میری ہی وجہ سے ان کا ظہور ہوا ہے جس کے بعد یہ صفات ان میں پیدا ہوئیں اگر میں نہ ہوتا تو کسی چیز کا ظہور نہ ہوتا نہ کسی میں جوش و مستی کا اثر ہوتا یہاں پر کسی کو لَخَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَكْبَرُ مِنْ خَلْقِ النَّاسِ (بالیقین آسمان اور زمین کا پیدا کرنا آدمیوں کی پیدا کرنے کی نسبت بڑا کام ہے) سے شبہ نہ پیدا ہو کہ اس آیت میں سموات و ارض کی خلقت کو انسان کی پیدائش سے بڑا بتلایا گیا ہے تو پھر انسان کو عالم اکبر اور عالم ناسوت کو عالم اصغر کہنا کیونکر صحیح ہوگا اور یہ انسان سے مستفید یا اس کی فرع کیونکر ہو سکتا ہے جواب یہ ہے کہ اس جگہ اکبریت مادہ کے اعتبار سے بتلائی گئی ہے یہاں معنی کے اعتبار سے اکبریت مقصود نہیں اور اس کی دلیل یہ ہے کہ اس آیت میں حق تعالیٰ نے معاد کو ثابت فرمایا ہے جس پر کفار کو اشکال تھا کہ انسان مرکھپ کر دوبارہ کیسے زندہ ہوگا اس کا جواب اس آیت میں دیا گیا ہے کہ جب خدا تعالیٰ نے اتنے بڑے بڑے آسمانوں کو اور زمین وغیرہ کو پیدا کر دیا تو ایک مشت خاک انسان کا دوبارہ زندہ کر دینا اس پر کیا دشوار ہے کفار کو اعادۂ جسم ہی پر اشکال تھا اس کو ایسی چیزوں کی خلقت سے دفع کیا گیا جو مادہ میں انسان سے بڑھی ہوئی ہیں سو اس درجہ میں عالم ناسوت کے لئے اکبریت مسلم ہے گفتگو معنی اور مقصودیت میں ہے اور اس میں انسان سب سے اشرف و اکمل ہے چنانچہ اس مضمون کو دوسری آیت میں اس سے زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان فرمایا گیا ہے فرماتے ہیں ءَاَنْتُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمِ السَّمَآءُ ؕ بَنٰهَا رَفَعَ سَمْكَهَا فَسَوّٰىهَا وَاَغْطَشَ لَيْلَهَا وَاَخْرَجَ ضُحٰىهَا ۝ (بھلا کیا تمہارا پیدا کرنا سخت ہے یا آسمان کا اللہ نے اس کو بنایا اس کی سقف کو بلند کیا اور اس کو درست بنایا اور اس کی رات کو تاریک بنایا اور اس کے دن کو ظاہر کیا) یہاں اشدیت محض خلقت ظاہری میں مراد ہے اور مقصودیت کے اعتبار سے دوسری جگہ ارشاد ہے۔ هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ثُمَّ اسْتَوٰۤى اِلَى السَّمَآءِ فَسَوّٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ ؕ (وہ ذات پاک ایسی ہے جس نے پیدا کیا تمہارے فائدہ کے لئے جو کچھ بھی زمین میں موجود ہے سب کا سب پھر توجہ فرمائی آسمان کی طرف تو درست کر کے بنا دیئے ان کو سات آسمان۔) جس سے معلوم ہوا کہ زمین و آسمان میں جو کچھ ہے سب

انسان ہی کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ اور ارشاد ہے وَسَخَّرَ لَكُمْ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ (اور جتنی چیزیں آسمانوں میں اور جتنی چیزیں زمین میں ہیں ان سب کو اپنی طرف سے مسخر بنایا تمہارے لئے) اور وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَائِبَيْنِ ٥ (اور تمہارے نفع کے واسطے سورج اور چاند کو مسخر بنایا جو ہمیشہ چلنے ہی میں رہتے ہیں) اور وَسَخَّرَ لَكُمُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَاٰتٰكُمْ مِنْ كُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ (اور تمہارے نفع کے واسطے رات دن کو مسخر بنایا اور جو چیزیں تم نے مانگی تم کو ہر چیز دی) اس کے علاوہ بہت سی آیات میں بتلایا گیا ہے کہ حق تعالیٰ نے تمام چیزوں کو انسان کے لئے کسی نہ کسی کام میں لگا رکھا ہے پس اس درجہ میں انسان کا عالم اکبر ہونا نصوص کے خلاف نہیں (باقی یہ شبہ نہ کیا جائے کہ انسان اگر سب کی اصل ہے تو جسامت میں چھوٹا کیوں ہے کیونکہ اصل کے لئے جسامت میں فرع کے برابر یا بڑا ہونا لازم نہیں، دیکھو درخت کی اصل ایک گٹھلی ہے جو جسامت میں درخت سے کوئی نسبت نہیں رکھتی مگر سارا درخت اسی ذرا سی گٹھلی کی فرع ہے ۱۲ جامع) پس اب کسی رند کے اس قول پر کچھ اشکال نہیں ؎

افروختن وسوختن و جامہ دریدن پروانہ زمن شمع زمن گل زمن آموخت

(روشن ہونا شمع نے اور جلنا پروانہ نے اور کپڑے پھاڑنا گل نے ہم سے سیکھا ہے)

اس پر مجھے ایک ایسے ہی رند کی حکایت یاد آئی وہ حج کو جا رہے تھے اور حالت یہ تھی کہ ایک ڈھپلی ہاتھ میں ناچتے کودتے ڈھپلی بجاتے جا رہے تھے، لوگوں نے کہا میاں تم حج کو جا رہے ہو یہ کیا حرکت ہے تو وہ یہ جواب دیتے ہیں کہ ہم جائیں اور ہمارے اللہ میاں تم کون ہو، واقعی حق تعالیٰ سے اس کے بندوں کو ایسا تعلق ہوتا ہے کہ اس جواب کے بعد کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا کہ ہم جائیں اور ہمارے اللہ میاں۔ غرض وہ اس طرح حج کو جا رہے تھے یہاں تک کہ مکہ معظمہ میں داخل ہوئے اور مطوف کے ساتھ طواف کے لئے چلے جس وقت دروازہ حرم پر پہونچے تو مطوف نے کہا دیکھو وہ بیت اللہ ہے (بیت اللہ دروازہ کے باہر ہی سے نظر آ جاتا ہے) پس بیت اللہ پر نظر کا پڑنا تھا کہ اس عاشق کو وجد طاری ہوا اور آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور زبان پر یہ شعر تھا ؎

چو رسی بکوئے دلبر بسپار جان مضطر   کہ مباد بار دیگر نہ رسی بدیں تمنا

(اب تو محبوب کے در پر پہونچ گئے ہو اب اپنی جان فدا کر دو شاید پھر اس تمنا کے حصول کا موقع نہ ملے)

بس یہ شعر پڑھتے پڑھتے دروازہ ہی پر گر پڑے اور جان دیدی ہائے وصل کی بھی تاب نہ ہوئی بس صورت دیکھتے ہی ختم ہو گیا، عاشق کی بھی عجیب حالت ہوتی ہے نہ اسے وصل میں چین ہے نہ فصل میں قرار ہے۔ بس وہ حال ہوتا ہے ؎

من شمع جاں گدازم و تو صبح دل کشائی   سوزم گرت نہ بینم میرم چو رخ نمائی

نزدیک آں چنانم دور آں چناں کہ گفتم   نے تاب وصل دارم نے طاقت جدائی

(میں شمع ہوں تو صبح ہے اگر تجھے دیکھ تو تب بھی موت ہے کہ لوگ بجھا دیں گے اگر دیکھوں تب بھی ہلاکت ہے کہ جل جاؤں گا اس محبوب کی نزدیکی ایسی ہے اور جدائی ایسی ہے جیسا کہ اوپر شعر میں ذکر کیا نہ جدائی کی طاقت نہ وصل کی تاب)

وصل کی تاب نہ تھی جب ہی تو دیکھتے ہی ختم ہو گیا اے صاحب! اگر وہ بیت کے پاس پہنچ جاتا تو کیا ہوتا وہ بیت سے پہلے رب البیت سے جا ملا۔ اس وقت لوگوں کو معلوم ہوا کہ جسکو ہم رند لاابالی سمجھ رہے تھے یہ عاشق عارف تھا پس اپنی حالت چھپانے کے لئے اس نے یہ صورت بنا رکھی تھی تمام مصالح کو خاک میں ملا دیا تھا اس کی پرواہ نہ تھی کہ کوئی کیا کہے گا مگر حالت یہ ہوتی ہے کہ اوپر کا مصالحہ تو جلانے سے خاک ہو گیا اور یہ گرم مصالحہ جو اندر اندر پھونکتا ہے باقی رہ گیا اُس نے خود اسی کو جلا پھونک دیا۔ تو ان رندوں کے مزاح و دل لگی میں یہ مصلحت ہوتی ہے کہ وہ اس کے ذریعہ سے تمام مصالح کو مسالہ کی طرح پیس دیتے ہیں اور اپنی وضع و ناموس کو مٹا کر اپنی باطنی حالت کو پردہ میں رکھتے ہیں مگر اس غرض کے لئے ناجائز امور کا ارتکاب جائز نہیں ورنہ پھر وہ وضع سوز ہی نہ رہے گا شرع سوز بھی ہو جائے گا جس کے افعال قابلِ اعتبار نہیں نہ ان میں کوئی حکمت ہے۔ تو اب ان حکمتوں پر نظر کر کے مزاح بھی لایعنی نہ رہا بلکہ مالیعنی میں داخل ہو گیا اسی طرح تمام مباحات کو دیکھو کہ وہ اپنے اثر کے اعتبار سے یا مفید ہوتے ہیں یا مضر تو اب ایسی کوئی قسم نہ رہی جو نہ مفید ہو

نہ مضر پس مباحات کو تیسری قسم نہ سمجھنا چاہیے بلکہ وہ بھی پہلی ہی دو قسموں میں داخل ہے یا محمود یا مذموم تو اب دو ہی قسم کے افعال ہوئے، ایک وہ جو معین آخرت ہیں دوسرے وہ جو مضر آخرت ہیں۔ اس کے بعد پھر ایک مراقبہ کی تعلیم کی گئی القا کے طور پر توجی چاہا کہ اپنے بھائیوں کو بھی بتلا دیا جائے اس وقت جو حالت میرے اوپر غالب تھی ویسی تو اب نہیں رہی مگر خدا تعالیٰ کی ناشکری کیوں کروں بحمد اللہ اب بھی بہت بڑا اثر قلب پر ہے، وہ مراقبہ یہ ہے کہ ہر کام کے وقت یہ سوچ لیا جائے کہ یہ کام جو ہم کر رہے ہیں (یا کرنے والے ہیں) یہ آخرت میں مضر ہے یا مفید ہے۔ اس مراقبہ کے لئے کوئی وقت معین نہیں بلکہ یہ ایسا مراقبہ ہے کہ ہر وقت اس کا وقت ہے، چلتے پھرتے بھی اس کو سوچتے رہو اور کھاتے پیتے بھی اور باتیں کرتے ہوئے بھی اور رنج وغصہ میں بھی کوئی حرکت اور کوئی سکون اس مراقبہ سے خالی نہ ہونا چاہیے۔ اس کے بعد آپ سے ان شاء اللہ تعالیٰ اول تو گناہ صادر ہی نہ ہوگا اور اگر بالفرض صادر ہوا بھی تو آپ اس وقت بیدار گنہگار ہوں گے سرکش وغافل گنہگار نہ ہوں گے اور یہ بھی ایک بڑی دولت ہے کہ انسان کو گناہ کے وقت تنبہ ہو جائے کہ میں نے یہ کام گناہ کا کیا اس سے دل پر ایک ایسا چرکہ لگتا ہے جس کے بعد معاً توبہ واستغفار کو دل چاہتا ہے۔ شاید یہاں کوئی ذہین بیٹھے ہوں اور وہ اپنے دل میں یوں کہتے ہوں کہ یہ تو اور بھی برا ہوا کہ جان کر گناہ کیا تو اس وقت یہ شخص وَيْلٌ لِلْجَاهِلِ مَرَّةً وَلِلْعَالِمِ سَبْعِيْنَ مَرَّةً (جاہل کے لئے ایک خرابی جاننے والے کے لئے ستر خرابیاں) کا مصداق ہو جائے گا تو بات یہ ہے کہ جان کر گناہ کرنا یہ کس نے کہا ہے کہ مطلقاً اشد ہے بلکہ علم کے ساتھ وہ گناہ اشد ہے جس کے ساتھ جرات بھی ہو ورنہ اگر جرات نہ ہو تو جان کر گناہ کرنا غفلت کے گناہ سے اشد نہیں اور اس مراقبہ کے ساتھ جرات تو کبھی ہو سکتی ہی نہیں تو اب یہ شخص بیدار گنہگار ہوگا کہ معصیت کو معصیت جانے گا غافل نہ ہوگا کہ یہ بھی خبر نہ ہو کہ میں نے کوئی گناہ کا بھی کام کیا ہے یا نہیں اور اس بیداری کا نتیجہ یہ ہوگا کہ معصیت کے ساتھ خشیت بھی ملی ہوئی ہوگی اور حضرت خشیت اور معصیت اگر دونوں ساتھ ساتھ ہوں تو گو وہ خشیت کامل نہ ہوگی

مگر اس کے ساتھ معصیت بھی کامل نہ رہے گی یہ خشیت ایسی چیز ہے کہ معصیت اس کی ساتھ کامل نہیں ہوسکتی اگر کامل خشیت رہے جب تو گناہ کا صدور ہی نہیں ہوتا اور اگر ناقص خشیت ہے تو اس کی وجہ سے معصیت بھی ناقص ہوجاتی ہے اس کی ایسی مثال ہے جیسے گرم پانی میں تھوڑا سا ٹھنڈا پانی ملا دو تو گو اس سے ٹھنڈا نہ ہوجائیگا مگر ویسا گرم بھی نہ رہے گا تو خشیت کے ساتھ معصیت کی یہ کیفیت ہوگی کہ اس وقت آپ اگر غیبت بھی کریں گے تو دل کو حظ حاصل نہ ہوگا زبان سے غیبت کریں گے اور دل میں جوتے پڑتے ہوں گے کہ ہائے یہ میں نے کیا کیا تو یہ تھوڑا نفع ہے اس مراقبہ کا اس لئے میں یہ نہیں کہتا کہ اس مراقبہ کے بعد آپ سے گناہ کا صدور ہی نہ ہوگا بلکہ اس کے ساتھ یہ بھی کہتا ہوں کہ اگر صدور ہوگا تو خشیت کے ساتھ ہوگا اور اس مضمون کے اظہار میں یہ بھی فائدہ ہے کہ اگر کسی کو تجربہ ہوا ہو کہ خشیت کے ساتھ بھی گناہ ہوجاتا ہے اور وہ اس وقت مولویوں کو جھوٹا کہتا ہو کہ یہ مولوی بھی بے پر کی باتیں اڑایا کرتے ہیں کہ خشیت و خوف دل میں پیدا ہوجانے سے گناہ نہیں ہوتے حالانکہ ہم نے تو آیات وعید و احادیث عقاب کا بہت مطالعہ کیا اور ان سے خوف بھی پیدا ہوا مگر پھر بھی گناہ موقوف نہیں ہوتے تو وہ اس مضمون کو سن کر مولویوں کو جھوٹا نہ کہیں گے کیونکہ جیسا ان کو خشیت کے ساتھ گناہ صادر ہونے کا تجربہ ہوا ہوگا اس کے ساتھ یہ بھی تجربہ ہوا ہوگا کہ گناہ کے وقت دل میں ایک خلش بھی ساتھ ساتھ موجود تھی جس نے معصیت کو بھی ضعیف بنا کر گناہ بے لذت میں داخل کردیا تھا تو صاحب جیسی خشیت آپ کو حاصل ہوئی تھی ویسا ہی اس نے اثر بھی کیا وہ بیکار تو نہ ہوئی پھر اب مولویوں کو جھوٹا کیوں کہتے ہیں بات یہ ہے کہ خشیت کے تین درجے ہیں۔ ایک خشیت اعتقادی یہ تو ہر مسلمان کو حاصل ہے کیونکہ ایمان نام ہی ہے خوف ورجا کا پس اس درجہ سے تو کوئی مسلمان خالی نہیں مگر اعتقادی خشیت گناہوں سے روکنے میں کافی نہیں بلکہ اس کے ساتھ استحضار خشیت کی بھی ضرورت ہے یہ دوسری قسم ہے پھر استحضار کے دو درجے ہیں ایک استحضار کامل دوسرے استحضار ناقص استحضار کامل کے ساتھ معصیت ہرگز نہیں ہوسکتی مگر ہم لوگوں کو استحضار کامل حاصل نہیں اور اسی کی ضرورت ہے لیکن استحضار کامل ایک دو دن میں حاصل نہیں ہوا کرتا اس کے لئے مشق کی ضرورت ہے پہلے آپ استحضار ناقص ہی کیجئے اس سے گو معصیت کا انعدام نہ ہوگا مگر تقلیل ضرور ہوجائے گی اور وہی کیفیت

ہوگی جو یں۔ نے ابھی بیان کی ہے کہ خشیت ناقصہ کے ساتھ معصیت بھی ناقص ہی ہوگی اور معاً توبہ داستغفار کی توفیق ہوگی وہ حالت نہ رہے گی جو پہلے تھی کہ گناہ کرکے دل پر جوں بھی نہ رینگتی تھی پھر اسی حالت پر اکتفا نہ کیجئے بلکہ استحضار ناقص سے استحضار کامل کی طرف ترقی کیجئے ان شاء اللہ تعالیٰ شدہ شدہ آپ ایک دن کامیاب ہو جائیں گے یہ میں نے اس لئے کہا کہ شاید کوئی شخص اس مراقبہ پر عمل کرے اور ترک معاصی میں پوری کامیابی نہ ہو تو مایوس ہو جائے۔ تو مایوسی کی کوئی وجہ نہیں ان حضرات کو سمجھ لینا چاہیئے کہ دو چار روز کی مشق سے استاد مشاق نہیں بنا کرتے بلکہ استاد بننے کے لئے عرصہ تک مشق کی ضرورت ہوا کرتی ہے جیسے خوشنویسی حاصل ہو جاتی ہے چند روز کی کوشش سے مگر استاد بننے کے لئے عرصہ دراز کی ضرورت ہے اسی طرح قرآن حفظ کر لینا تو چند روز کا کام ہے مگر اس کا قابو میں آجانا ایک مدت چاہتا ہے پھر ان کاموں میں کمال حاصل کرنے کا طریقہ کیا ہے سب کو معلوم ہے کہ کام میں لگا رہنا اور مشق کا جاری رکھنا ہی اس کا طریقہ ہے پس یہی طریق عمل اس مراقبہ میں بھی جاری رکھئے چند روز میں کامیابی نہ ہو تو گھبراؤ نہیں ناامید نہ ہو ؎ ناامیدی را خدا گردن زدہ است (ناامیدی کی خدا نے گردن مار دی ہے) مولانا فرماتے ہیں۔ ؎

کوئے نومیدی مرو کامیدہاست ۔ سوئے تاریکی مرو خورشیدہاست

(ناامیدی کی راہ نہ جاؤ بہت سی امیدیں ہیں تاریکی کی طرف نہ چلو بہت سے آفتاب ہیں
یعنی اللہ تعالیٰ سے ناامید نہ ہو بلکہ امیدیں رکھو)

اور ایک جگہ فرماتے ہیں ؎

اندریں رہ میتراش و می خراش ۔ تادم آخر دم فارغ مباش

(اس طریق وصول الی اللہ میں ہمیشہ ادھیڑ بن میں لگے رہو اور آخری وقت ایک لحظہ بھی فارغ مت رہو)
یعنی یہ ایک دن کا کام نہیں ساری عمر کا کام ہے لگے رہو کوشش کرتے رہو ان شاء اللہ ایک دن کامیاب ہو گے اور یہ حال ہوگا ؎

تا دمے آخر دمے آخر بود ۔ کہ عنایت با تو صاحب سر بود

(آخر وقت تو کوئی گھڑی آخر ایسی ضرور ہوگی جس میں عنایت ربانی تمہاری
ہمراز و رفیق بن جائے گی۔)

اور یہ حال ہوگا ؎

یوسف گم گشتہ باز آید بکنعاں غم مخور کلبۂ احزاں شود روزے گلستاں غم مخور

(یوسف گم شدہ کنعان میں واپس آجائے غم مت کھا غموں کا تنگ وتاریک گھر کسی دن گل ستاں ہوجائے گا غم مت کر)

ان شاء اللہ ایک دن یہ غم ختم ہوجاوئے گا اور کامیابی سے دل مسرور ہوگا (رَزَقَنَا اللّٰہُ تَعَالٰی وَاِیَّاکُمُ الْوُصُوْلَ اِلَیْہِ اٰمِین ۱۲ جامع) (اللہ تعالیٰ ہم اور تم کو وصول الی اللہ نصیب فرمائیں) میں دعوے سے نہیں کہتا خدا کے بھروسہ پر کہتا ہوں کہ اس مراقبہ کو جاری رکھو ان شاء اللہ تعالیٰ ایک دن ضرور کامیاب ہوگے (وَالَّذِیْنَ جَاھَدُوْا فِیْنَا لَنَھْدِیَنَّھُمْ سُبُلَنَا جو لوگ ہماری راہ میں ہمیشہ مشقتیں برداشت کرتے ہیں ان کو اپنے راستے ضرور دکھادیں گے وعدہ الٰہی ہے ۱۲ جامع) پس ہر کام پر اس حیثیت سے نظر کرو کہ یہ معین فی المقصود ہے یا مضر پھر جو معین ہو اس کو اختیار کرو اور جو مضر ہو اس کو ترک کردو۔ میں کوشش کرتا ہوں کہ جو بات میرے دل میں ہے وہ سامعین کے دل میں ڈال دوں، مگر کیونکر ڈالدوں یہ میرے اختیار سے باہر ہے اور الفاظ اس کے لئے کافی نہیں اور یہ ان لوگوں کے اعتبار سے کہتا ہوں جن کے دل میں یہ وارد پہلے سے نہ ہو اور جو پہلے سے اس کا ذوق رکھتے ہیں وہ تو اشارہ ہی سے سمجھ گئے ہوں گے مگر جو بات دل میں نہ پہونچائی جاسکے کم از کم اس کو کانوں میں تو ڈال دیا جاوے شاید کسی وقت ذوق حاصل ہو تو یہ کان میں پڑی ہوئی بات کام آئے گی اور چونکہ طویل مضمون یاد نہیں رہا کرتا اس لئے میں خلاصہ بیان کرتا ہوں کہ بس ہر کام سے پہلے اتنا سوچ لیا کرو کہ یہ نجاتِ آخرت میں معین ہے یا نجات سے مانع ہے اور اس کا استحضار ہر کام میں رکھو خواہ مباح ہو یا فرض ہو یا واجب یا اور کچھ۔ اور اسی غرض کے لئے میں نے اس وعظ کا نام (الاسعاد والابعاد تجویز کیا ہے اسعاد کے معنی ہیں اعانت اور ابعاد کے معنی ہیں تنحیہ یعنی دور کرنا کذا فی القاموس) تو یہ نام آپ کو اس مراقبہ کی یاد دہانی کرے گا کیونکہ وہ مراقبہ بھی اسی بات کا ہے کہ کونسا کام مقصود آخرت میں معین ہے اور کونسا مقصود سے دور کرنے والا ہے تو اب آپ کو لمبا مضمون

یاد کرنا نہ پڑے گا بلکہ محض اس وعظ کا نام تصور معانی کے ساتھ اس مراقبہ کی یاددہانی میں کافی ہو جائے گا اور یہ محض دولفظ ہیں جن کا یاد کرنا دشوار نہیں یہ تجربہ ہے کہ الفاظ مختصرہ سے بڑے بڑے مضامین مستحضر ہو جاتے ہیں، میں نے تو مختصر الفاظ سے طالب علمی کے وقت میں بہت علوم حاصل کئے ہیں مجھے ابتدا سے اختصار محبوب ہے۔ کچھ طبیعت ہی اختصار پسند واقع ہوئی ہے جس کا سبب میری کاہلی بھی ہو سکتی ہے کیونکہ مجھے طول طویل کاموں کی ہمت نہیں خیر کچھ ہی سبب ہو باقی یہ تجربہ بالکل صحیح ہے کہ بعض دفعہ مختصر الفاظ سے بڑے بڑے کام نکل جاتے ہیں اور میں نے تو اس سے بہت ہی کام لیا ہے۔ چنانچہ جس زمانہ میں میں جلالین پڑھتا تھا تو اس وقت میں نے یہ چاہا کہ جلالین کے جو دو حصے دو مصنفوں کے ہیں اس کو یاد رکھوں کہ پہلا کس کا ہے اور دوسرا کس کا۔ کیونکہ جلالین ایک شخص کی تصنیف نہیں ہے بلکہ سورۂ کہف سے اخیر تک جلال الدین محلی رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیف ہے اور انہوں نے اول حصہ کی بھی تفسیر شروع کی تھی، چنانچہ سورۂ فاتحہ کی تفسیر لکھ بھی چکے تھے کہ عمر نے وفا نہ کی اور انتقال ہو گیا تو سورۂ بقرہ سے سورۂ اسراء تک، علامہ جلال الدین سیوطی نے تکمیل کی۔ چونکہ دونوں کا نام جلال الدین ہے اس لئے یہ یاد نہ رہتا تھا کہ پہلا حصہ کس کا ہے اور دوسرا کس کا تو میں نے دونوں کے لقب سے اول حرف لے لیا چنانچہ سیوطی کے اول میں سین ہے اور محلی کے شروع میں میم ہے اور سین حروف ہجا میں میم سے مقدم ہے تو میں نے یہ جملہ یاد کر لیا اَلْاَوَّلُ لِلْاَوَّلِ وَالْاٰخِرُ لِلْاٰخِرِ یعنی پہلا حصہ اس کا ہے جس کے لقب کا پہلا حرف ترتیب ہجا میں مقدم ہے اور دوسرا اس کا ہے جس کے لقب کا پہلا حرف ترتیب میں موخر ہے۔ اس طرح سے یہ مضمون ہمیشہ یاد رہا۔ اسی طرح حدیث معراج میں یہ آتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر آسمان میں خاص خاص انبیاء سے ملاقات کی ہے اور اس کی ترتیب بھی احادیث میں مذکور ہے کہ پہلے آسمان میں آپ نے آدم علیہ السلام سے ملاقات کی اور دوسرے میں حضرت عیسیٰ و یحییٰ علیہما السلام سے ملاقات کی اور تیسرے میں یوسف علیہ السلام سے اور چوتھے میں ادریس علیہ السلام سے اور پانچویں میں ہارون علیہ السلام سے اور چھٹے میں موسیٰ علیہ السلام سے اور ساتویں میں حضرت ابراہیم علیہ

السلام سے۔ مگر یہ ترتیب یاد نہ رہتی تھی تو میں نے اس کے یاد کرنے کے لئے ایک مختصر لفظ بنالیا یعنے اعیا ھو جس میں ہمزہ آدم علیہ السلام کے لئے اور عین عیسٰی علیہ السلام کے لئے ہے اسی طرح ہر نبی کے نام میں جو حرف اول تھا وہ اس جملہ میں لے لیا گیا ہے اور ہر ایک سے ملاقات کی ترتیب وہی ہے جو ترتیب حروف کی اس جملہ میں ہے مگر اس میں دو باتیں قابل تنبیہ ہیں ایک یہ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے نام کا کوئی حرف اس میں نہ آسکا اس جملہ میں صرف چھ حرف ہیں جس سے چھٹے آسمان تک کی ترتیب معلوم ہوسکتی ہے ساتواں حرف ایک اور ہوتا تو ابراہیم علیہ السلام کی ترتیب پر بھی دلالت ہو جاتی اور اس کے لئے صرف یہ ممکن تھا کہ آخر میں الف بڑھا کر أَعْيَا هُمَا کردیا جاتا مگر اس کے معنے کچھ موزوں نہ ہوئے کیونکہ أَعْيَاهُمْ کے معنی تو یہ ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سب انبیا کو سبقت سے عاجز کردیا اور یہ ایک عمدہ معنی ہیں اور اعیاھما میں ضمیر تثنیہ لانے سے یہ معنے ہوتے ہیں کہ آپ نے دو کو عاجز کردیا سو یہ معنے کچھ موزوں نہ معلوم ہوئے کیونکہ اس میں دو کی تخصیص بلا وجہ کرنی پڑتی ہے۔ سو اتنی بات خود یاد رکھ لی جائے کہ اس میں ساتویں نبی کا نام مذکور نہیں جن سے ساتویں آسمان پر ملاقات ہوئی تھی اور یہ بھی یاد رکھ لیا جائے کہ انکا نام ابراہیم علیہ السلام ہے۔ دوسری بات یہ بھی یاد رکھ لی جائے کہ عیسٰی علیہ السلام کے ساتھ یحیٰی علیہ السلام بھی ہیں کہ وہ بھی دوسرے ہی آسمان پر ہیں ان کے لئے کوئی لفظ مستقل نہ آسکا اور اس جملہ میں جو تیسرا حرف یا رہے وہ حضرت یوسف علیہ السلام کے نام کی علامت ہے جو ترتیب میں تیسرا حرف ہے وہ تیسرے ہی آسمان پر ہیں سو حرف عین سے ایک نبی کی طرف اشارہ ہوگیا اور دوسرے کو زبانی یاد رکھا اور یہاں سے معلوم ہوگیا کہ یہ جو مشہور ہے کہ عیسٰی علیہ السلام فلک چہارم پر ہیں یہ غلط ہے نہ معلوم یہ کس طرح بے اصل مشہور ہوگیا۔ زیادہ تر یہ بات شعراء کے کلام میں پائی جاتی ہے جن میں بعض وہ شعراء بھی ہیں جو محقق ہیں مگر انہوں نے اس غلطی میں عوام کا اتباع کرلیا ہے اس لئے ہمیں ان کے کلام میں تاویل کی ضرورت نہیں بلکہ صاف بات یہ ہے کہ بعض دفعہ شاعری میں محقق بھی مذاق عوام کی رعایت کرکے غیر محقق بات استعمال کرلیتا ہے مگر بحر العلوم نے ان کی رعایت کرکے یہ تاویل کی ہے کہ فلک

چہارم سے مراد آسمان چہارم مراد نہیں بلکہ کرۂ چہارم مراد ہے اور آسمان دوم عدد کرات علویہ میں چوتھے نمبر پر ہے کیونکہ اُس سے نیچے آسمان اول ہے اور اس کے نیچے کرۃ النار ہے اور اس کے نیچے کرۃ الہوار ہے اس طرح آسمان دوم چوتھا کرہ ہوا اس پر یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ ہوار کے نیچے کرۃ الماء اور اس کے نیچے کرۃ الارض بھی ہے تو اس کا یہ جواب دیا جائے گا کہ یہ کرات سفلیہ ہیں اور گفتگو کرات علویہ میں ہے اس لئے ان دونوں سے نقض وارد نہیں ہوتا۔ دوسرے متکلم خود دو کرہ کے اوپر ہے اور اس کے اوپر صرف عناصر کے دوہی کرے ہیں ہوا ونار۔ خیر کسی کو یہ تاویل پسند ہو تو وہ یہ تاویل کر کے مولانا رومی وغیرہ کے کلام کو درست کرے جنھوں نے عیسیٰ علیہ السلام کو آسمان چہارم پر مانا ہے۔ بعض شعرار تو ایسا غضب کرتے ہیں کہ ایک شاعر نے عیسیٰ علیہ السلام کو فلک چہارم پر مان کر انہیں بیمار بھی مانا ہے کہتا ہے ؎

برآسمانِ چہارم مسیح بیمار است — تبسّم تو برائے علاج درکار است

(چوتھے آسمان پر نعوذ باللہ عیسیٰ علیہ السلام بیمار ہیں تیرا تبسم ان کے علاج کیلئے درکار ہے)

یعنی وہ اپنے معشوق چرمی سے کہتا ہے کہ آسمان چہارم پر مسیح بیمار ہیں۔ بھلا مسیح اور بیمار۔ وہ تو مردوں کو زندہ کرتے اور اندھوں اور کوڑھیوں کو اچھا کرتے تھے وہ بیمار ہوں گے۔ اور خیر زمین پر رہتے ہوئے تو بیمار ہونا کچھ تعجب خیز نہ تھا یہ تو اُن کو آسمان پر بیمار مانتا ہے بھلا وہاں بیماری کا کیا گذر۔ جب وہاں عیسیٰ علیہ السلام نہ زمین کی غذائیں کھاتے ہیں نہ وہاں ان کو بول و براز کی حاجت ہوتی ہے۔ نہ وہاں کسی قسم کا تعفن ہے تو وہاں بیمار ہونا کیسا۔ پھر بیماری کا علاج بھی ان کے معشوق چرمی کا تبسم ہی میسر ہوا۔ کتنی بڑی گستاخی ہے کہ ایک نبی (علیہ السلام) کا علاج اپنے محبوب کے تبسم کو بتلاتا ہے مگر شعرار کو اس کی کچھ پروا نہیں بس انہیں تو یہ چاہیئے کہ شعر بن جائے چاہے عقل و شعور پر اس سے پردہ ہی پڑ جائے اور غضب یہ کہ اس مرض میں بعض عارفین بھی مبتلا ہیں وہ کسی معشوق چرمی کے مقابلہ میں تو انبیار کی توہین نہیں کرتے مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح میں بعض دفعہ ایسی باتیں کہہ جاتے ہیں جن سے دوسرے انبیار کی توہین ہو جاتی ہے۔

چنانچہ جامی فرماتے ہیں ؎

"غلامے بود یوسف زر خریدہ" (یوسف زر خریدہ ایک غلام ہے)

خدا معاف کرے ان حضرات کو میرا تو رونگٹا کھڑا ہوتا ہے اس معنی کے تصور سے بھی بھلا یوسف علیہ السلام کو غلام کہنا اور زر خرید کہنا کیا یہ تھوڑی بات ہے۔ بہت سخت بات ہے مگر شعرا اس کی پروا نہیں کرتے۔ میں ایک معیار بتلاتا ہوں جس سے ہر شخص آسانی کے ساتھ سمجھ سکتا ہے کہ انبیاء کی شان میں کونسی بات کہنے کی ہے اور کونسی بات کہنے کی نہیں، وہ یہ کہ یہ تصور کر لیا جائے کہ اگر کسی مجمع میں وہ نبی موجود ہوں جن کی شان میں ہم نے یہ بات کہی ہے تو کیا اس مجمع میں ان کے سامنے ہم یہ بات کہہ سکتے ہیں۔ یا کم از کم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے آپ کے بھائیوں کے متعلق ہم یہ مضمون پڑھ سکتے ہیں۔ بس جو بات ایسی ہو جس کے متعلق دل گواہی دے کہ اس کو ہم ان پیغمبر کے سامنے کہہ سکتے ہیں وہ تو کہو اور جس میں کھٹکا پیدا ہو کہ سامنے یہ بات نہیں کہہ سکتے اس کو اپنے کلام میں سے نکال دینا چاہیئے۔ یہ بہت بڑا معیار میں نے آپ کے ہاتھ میں دیدیا ہے اس کو مستحضر رکھ کر شعراء اپنے کلام میں اصلاح کر سکتے ہیں۔ الغرض میں نے لفظ اعیا ہم سے اس ترتیب کو یاد کیا تھا جس ترتیب سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے معراج میں حضرات انبیاء سے آسمانوں پر ملاقات فرمائی ہے تو میں نے مختصر الفاظ سے بہت کام لیا ہے۔ اسی بنا پر میں نے اس وعظ کا نام ایسا تجویز کیا جو اختصار کے ساتھ آپ کو اس مراقبہ کی یاد دہانی کرے گا میں نے بہت دیر میں اس بات کو کہا جو مجھے اس وقت کہنی تھی اور بات بھی مختصر ہی تھی جس کے لئے اتنی دیر کی ضرورت نہ تھی نہ اتنی دیر کی نیت تھی مگر خود بخود دیر ہو گئی لیکن حرج ہی کیا ہے یہ وہ باتیں نہیں ہیں جن کے زیادہ ہونے سے ہیضہ ہو جب ماکولات میں بھی بعض ایسی چیزیں ہیں جن کے زیادہ کھانے سے ہیضہ نہیں ہوتا جیسے خربوزہ کو لوگ بتلاتے ہیں تو کیا معقولات میں ایسا ہونا کچھ دشوار ہے۔

اب میں اس مضمون کا انطباق آیت متلوہ پر ظاہر کرنا چاہتا ہوں حق تعالےٰ

فرماتے ہیں وَ اَنَّ ھٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْہُ (یہ دین میرا راستہ ہے جو مستقیم ہے سو اس راہ پر چلو) یہ معنی معطوف ہے تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّکُمْ عَلَیْکُمْ (آؤ میں تم کو وہ چیزیں پڑھ کر سناؤں جن کو تمہارے رب نے تم پر حرام فرمایا ہے) پر جو قُلْ کے تحت میں ہے تقدیر یہ ہوئی قل تعالوا الخ وَ قُلْ اَنَّ ھٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا الخ (آپ کہہ دیجئے یہ دین میرا راستہ ہے جو مستقیم ہے) اور اس کا مقتضا یہ تھا کہ اس جگہ ان مکسورہ ہوتا کیونکہ قول کے تحت میں ان مکسورہ ہی آیا کرتا ہے اور ایک قرارت میں مکسورہ ہے بھی مگر ہماری قرارت میں اَنَّ مفتوحہ ہے جس کی وجہ صحت یہ ہے کہ اس قرارت میں یہاں اَخْبِرْ (خبر دیجئے) مقدر ہے جس کے ملانے کے بعد لفظاً یہ قُلْ کے اوپر معطوف ہے اس لئے منصوب ہوگیا گو معنًا تَعَالَوْا پر عطف ہے۔ ترجمہ آیت کا یہ ہے کہ (لوگوں کو) بتلا دیجئے کہ یہ میرا راستہ ہے سیدھا اس کا اتباع کرو۔ ہذا سے مذکور سابق کی طرف اشارہ ہے اور پر تقریبًا دس احکام اوامر و نواہی کا مجموعہ مذکور ہے چنانچہ ارشاد ہے۔ قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّکُمْ عَلَیْکُمْ اَلَّا تُشْرِکُوْا بِہٖ شَیْئًا وَّبِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا ج وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَکُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ نَحْنُ نَرْزُقُکُمْ وَاِیَّاھُمْ ج وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَھَرَ مِنْھَا وَمَا بَطَنَ ج وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِیْ حَرَّمَ اللّٰہُ اِلَّا بِالْحَقِّ ط ذٰلِکُمْ وَصّٰکُمْ بِہٖ لَعَلَّکُمْ تَعْقِلُوْنَ ○ وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْیَتِیْمِ اِلَّا بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ حَتّٰی یَبْلُغَ اَشُدَّہٗ ج وَاَوْفُوا الْکَیْلَ وَالْمِیْزَانَ بِالْقِسْطِ ج لَا نُکَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا ج وَاِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَلَوْ کَانَ ذَا قُرْبٰی ج وَبِعَھْدِ اللّٰہِ اَوْفُوْا ط ذٰلِکُمْ وَصّٰکُمْ بِہٖ لَعَلَّکُمْ تَذَکَّرُوْنَ ○ وَ اَنَّ ھٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا الی آخرہ۔ ترجمہ یہ ہے۔ کہ آپ (ان سے) کہیے کہ آؤ میں تم کو وہ چیزیں پڑھ کر سناؤں جن کو تمہارے رب نے تم پر حرام فرمایا ہے وہ (چیزیں یہ ہیں ایک) یہ کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی چیز کو شریک مت ٹھہراؤ (پس شریک ٹھہرانا حرام ہوا) اور (دوسرے یہ کہ) ماں باپ کے ساتھ احسان کیا کرو (پس ان سے بری طرح رہنا حرام ہوا) اور (تیسرے یہ کہ) اپنی اولاد کو افلاس کے سبب قتل مت کیا کرو (زمانۂ جاہلیت میں اس کی عادت تھی کہ اولاد کو زندہ درگور کر دیتے تھے) (کیونکہ) ہم تم کو اور ان کو (دونوں کو) رزق (مقدم

دیں گے (وہ تمہارے رزق مقدر میں شریک نہیں ہیں پھر کیوں قتل کرتے ہو پس
قتل کرنا حرام ہوا) اور (چوتھے یہ کہ) بے حیائی (یعنی بدکاری) کے جتنے طریقے ہیں اُن کے
پاس بھی مت جاؤ (پس زنا کرنا حرام ہوا) خواہ وہ علانیہ ہو یا پوشیدہ اور (پانچویں یہ کہ)
جس کا خون کرنا اللہ تعالیٰ نے حرام کر دیا ہے اس کو قتل مت کرو ہاں مگر حق (شرعی) پر
قتل جائز ہے مثلاً قصاص یا رجم میں پس قتل ناحق حرام ہوا) اس (سب) کا تم کو اللہ
تعالیٰ نے حکم دیا ہے تاکہ تم (ان کو) سمجھو (اور سمجھ کر عمل کرو) اور (چھٹے یہ کہ) یتیم کے مال
کے پاس نہ جاؤ (یعنی اس میں تصرف نہ کرو) مگر ایسے طریقے سے (تصرف کی اجازت ہے)
جو شرعاً مستحسن ہے (مثلاً اس کے کام میں لگانا اُس کی حفاظت کرنا اور بعض اولیاو
اوصیا کو اس میں یتیم کے لئے تجارت کرنے کی بھی اجازت ہے جس کا حکم فقہ میں مذکور ہے)
یہاں تک کہ وہ اپنے سن بلوغ کو پہونچ جاوے (اس کے بعد اس کا مال اس کو دیدیا
جائے گا بشرطیکہ سفیہ یعنی بے وقوف نہ ہو پس تصرف غیر مشروع مال یتیم میں حرام ہوا)
اور (ساتویں یہ کہ) ناپ اور تول پوری پوری کیا کرو انصاف کے ساتھ (کہ کسی کا حق
اپنے پاس نہ رہے اور نہ آوے پس آپس میں دغا کرنا حرام ہوا۔ اور آگے بتلاتے ہیں کہ یہ
احکام کچھ دشوار نہیں جن پر عمل دشوار ہو کیونکہ) ہم (تو) کسی شخص کو اس کے امکان سے
زیادہ (احکام کی) تکلیف نہیں دیتے (پھر ان احکام میں کوتاہی کی کیا وجہ) اور آٹھویں
یہ کہ) جب تم (فیصلہ یا شہادت وغیرہ کے متعلق) کوئی بات کیا کرو تو (اس میں) انصاف
(کا خیال) رکھا کرو گو وہ شخص (جس کے مقابلہ میں وہ بات کہہ رہے ہو) قرابت دار ہی ہو
(پس خلاف عدل حرام ہوا) اور (نویں یہ کہ) اللہ تعالیٰ سے جو عہد کیا کرو (جیسے قسم یا
نذر) اس کو پورا کیا کرو (بشرطیکہ وہ نذر و قسم خلاف شرع نہ ہو پس اس کا عدم ایفاء
حرام ہوا) اس کے بعد فرماتے ہیں کہ یہ ہے میرا سیدھا راستہ اس کا اتباع کرو پس
گو ھٰذا کا مرجع یہ امور مذکورہ ہیں لیکن یہ اشارہ علی سبیل التخصیص نہیں بلکہ علی سبیل التعمیم
ہے یعنی وہ دین جس کے یہ احکام بطور نمونہ کے ہیں سب کا سب واجب الاتباع ہے اور
اشارہ میں تعمیم کی وجہ ظاہر ہے کہ وجوب اتباع کچھ انہی احکام میں منحصر نہیں اور نہ حضور

صلی اللہ علیہ وسلم کا راستہ انہی کے ساتھ مخصوص پس ھٰذَا کے بعد صِرَاطِیْ فرمانا خود تعمیم پر دلالت کرتا ہے کیونکہ اس صراط کا دیگر احکام پر مشتمل ہوتا سب کو معلوم ہے خود قرآن میں ان کے علاوہ اور بہت سے احکام مذکور ہیں اور احادیث میں بہت سے احکام موجود ہیں پس مطلب یہ ہوا کہ لوگوں۔سے یہ بھی کہہ دیجئے کہ کچھ انہی احکام کی تخصیص نہیں بلکہ دین اسلام اور اس کے سب احکام جن میں سے بعض اوپر مذکور ہوئے ہیں میرا سیدھا راستہ ہے اس کا اتباع کرو پس ہذا سے حقیقت میں دین اسلام کی طرف اشارہ ہے جو احکام مذکورہ کے ضمن اجمالاً مفہوم ہو چکا ہے اور ان احکام تسعہ مذکورہ کے ذکر کے بعد ھذا سے مجموعہ دین کی طرف اشارہ کی وجہ صحت یہ بھی ہے کہ یہ احکام مذکورہ گو ظاہر میں چند احکام ہیں مگر حقیقت میں یہ سارے اسلام کا خلاصہ ہے کیونکہ ان میں عقائد و معاملات و معاشرات وعبادات کے مہتم بالشان امور سب مذکور ہیں اور اہتمام کی وجہ یہ ہے کہ یہ احکام سب محکوم ہیں جو کسی شریعت میں کبھی منسوخ نہیں ہوئے اس طرح یہ گویا تمام شریعت کا خلاصہ ہے پھر اَنَّ ھٰذَا صِرَاطِیْ (یہ دین میرا راستہ ہے) میں صراحۃً تعیم کر دی گئی جس سے بقیہ احکام غیر محکمہ بھی اجمالاً سب مذکور ہو گئے اور صراطی میں ضمیر متکلم کا مرجع حق تعالیٰ نہیں ہیں بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہیں کیونکہ یہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہو رہا ہے کہ لوگوں سے کہہ دیجئے کہ یہ میرا راستہ ہے جیسا کہ اوپر مذکور ہوا کہ یہ آیت معنیً تعالوا پر معطوف ہے جو قُلْ کے تحت میں ہے اور لفظاً یہاں اَخْبِرْ محذوف ہے پس خطاب قُلْ وَاَخْبِرْ (آپ کہہ دیں اور خبر دیدیں) کے بعد ضمیر متکلم کا مرجع قائل ہی ہو سکتا ہے اور قائل حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہیں تو اس ضمیر کا مرجع بھی آپ ہی ہیں چنانچہ اس کی نظیر دوسری جگہ بھی مذکور ہے کہ وہاں بھی دین اسلام کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا راستہ کہا گیا ہے۔ قُلْ ھٰذِہٖ سَبِیْلِیْٓ اَدْعُوْٓا اِلَی اللّٰہِ عَلٰی بَصِیْرَۃٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِیْ (آپ فرما دیجئے یہ میرا طریق ہے میں خدا کی طرف اس طور پر بلاتا ہوں کہ میں دلیل پر قائم ہوں میں بھی اور میرے ساتھ والے بھی) اور اسلام کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا راستہ کہنا بطور دعوت کے ہے کہ آپ اس طریق کے داعی ہیں ورنہ حقیقت میں یہ صراط اللہ ہے چنانچہ بعض جگہ حقیقت کے موافق ارشاد ہے اِنَّکَ لَتَھْدِیْٓ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ صِرَاطِ اللّٰہِ الَّذِیْ لَہٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ (اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ آپ ایک سیدھے راستہ کی

ہدایت کر رہے ہیں یعنی اس خدا کے راستہ کی کہ اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے)
اس پر یہ سوال وارد ہوگا کہ جب حقیقت میں یہ صراط اللہ ہے تو پھر ہر جگہ حقیقت کے موافق کلام کیوں نہ فرمایا بعض جگہ مجازاً اس کو صراط رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) اور بعض جگہ حقیقت کے موافق صراط اللہ کیوں فرمایا تو جواب اس کا یہ ہے کہ بعض جگہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اس صراط کو اس لئے مضاف کر دیا گیا تاکہ سامعین کو اس پر عمل کرنے کی ہمت ہوا اور وہ سمجھ لیں کہ ہم اس راستہ کو طے کر سکتے ہیں اگر پہلے ہی یہ فرمادیا جاتا کہ یہ خدا کا راستہ ہے اس پر چلو تو لوگ یہ سن کر گھبرا جاتے کیونکہ خداتعالیٰ کی ذات تک ذہن کی رسائی اولاً دشوار ہے تو ان کی تو یہ شان ہے ؎

اے برتر از خیال و قیاس و گمان و وہم ۔۔۔ وز ہر چہ گفتہ اند و شنیدیم و خواندہ ایم
دفتر تمام گشت و بپایاں رسید عمر ۔۔۔ ما ہمچناں در اول وصف تو ماندہ ایم

(اے اللہ آپ وہم و گمان خیال و قیاس سے بالاتر ہیں جو کچھ بزرگوں نے کہا تھا اور ہم نے سنا اور پڑھا اس سے بھی بالاتر ہیں۔ دفتر تمام ہوگیا اور عمر اختتام کو پہنچی ایک وصف بھی آپ کا بیان نہ کر سکے)
خداتعالیٰ کی ذات تک وہم بھی نہیں پہونچ سکتا جو کچھ اس کے متعلق ہمارے ذہن میں آتا ہے خداتعالیٰ اس سے بھی وراء الوراء ثم وراء الوراء ہیں اسی کو مولانا فرماتے ہیں ؎

در تصور ذات او را گنج کو ۔۔۔ تا در آید در تصور مثل او

(اس کی ذات کے تصور میں کہاں گنجائش ہے تاکہ اس کا مثل تصور میں آجائے)
یہ لفظ سارے نسخوں میں گنج ہے۔ مثنوی کو جس کنج (اور جس گوشہ) سے نکالو گے سب میں یہی نکلے گا کسی کے پاس اس کی کنجی نہ تھی صرف حضرت حاجی صاحب ہی کے پاس اس کی کنجی تھی حضرت ہی نے اس کا قفل کھولا۔ حضرت نے مکہ مکرمہ میں ایک دفعہ ایک شیخ کو گنج پڑھاتے ہوئے دیکھا تھا اور اس کے معنے بنانے وہ بہت تاویلیں کر رہے تھے مگر کوئی بات نہ بنتی تھی حضرت نے اصلاح دی کہ یہ لفظ گنج ہے بمعنی گنجائش کے بس اس کو سنکر وہ شیخ پھڑک ہی تو گئے۔ اب شعر کے معنے بے تکلف ظاہر ہوگئے مطلب یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی ذات کی کسی کے تصور میں گنجائش نہیں یعنی تصور بالکنہ کی گنجائش نہیں حق تعالیٰ کا بالکنہ ذہن میں آنا محال ہے جس کی تفصیل کتب معقول میں مذکور ہے جب حق تعالیٰ کی ذات تک کسی کی رسائی نہیں تو اگر ابتداءً ہی اسلام کو صراط اللہ کہدیا جاتا یعنی حق تعالیٰ کی

طرف اس کی نسبت کی جاتی تو لوگ گھبرا جاتے اور اس سوچ میں پڑ جاتے کہ حق تعالیٰ تو ذہن سے بہت دور ہیں پس اسی طرح ان کا رستہ بھی نہ معلوم کتنا دور دراز ہوگا اس لئے پہلے اس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف مضاف کیا گیا کہ لوگوں سے کہہ دیجئے کہ یہ تو میرا راستہ ہے اس پر چلو۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک سب کی رسائی ممکن ہے آپ عیاناً سب کے سامنے ہیں پھر بشریت میں سب کے شریک ہیں اس لئے یہ سن کر ہمت بندھی کہ یہ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا راستہ ہے اور آپ ذہن سے بہت دور نہیں ہیں تو آپ کا راستہ بھی دور نہ ہوگا بلکہ نزدیک ہوگا یہ فائدہ ہوا آپ کی طرف نسبت کرنے سے کہ راستہ کا نزدیک وسہل ہونا معلوم ہوگیا پھر جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک رسائی ہوگئی اور اس راستہ پر چلنا شروع ہوا اب حقیقت منکشف ہوئی کہ یہ تو حقیقت میں خدا کا راستہ ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم صرف داعی ہیں آپ خود بھی اسی راستہ پر چل رہے ہیں یہ دیکھ کر ڈھارس بندھ گئی کہ حق تعالیٰ اس کے طے کرنے میں بندوں کی امداد فرماتے ہیں چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس راستہ کو طے کرلیا ہے معلوم ہوا کہ اس کا طے کرنا انسان کی قدرت سے خارج نہیں تو ہم بھی اس کو طے کرسکتے ہیں خصوصاً جبکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم (جو واقف طریق ہیں) ہمارے معین ورفیق ہیں۔ واقعی اگر حق تعالیٰ کی امداد نہ ہو تو پھر اس راہ کا طے کرنا بہت دشوار ہے کیونکہ خدائی راستہ ہے جس کو وہی طے کرسکتا ہے جس کو حق تعالیٰ طے کرانا چاہیں اسی لئے سالک کو جب اس پر نظر ہوتی ہے کہ یہ راستہ خداتعالیٰ کا راستہ ہے اس وقت وہ بڑا پریشان ہوتا ہے اور اس کے طول ولاتناہی کے خیال سے گھبراتا ہے اور یوں کہتا ہے ؎

بحریست بحر عشق کہ ہیچش کنارہ نیست آنجا جز اینکہ جاں بسپارند چارہ نیست

(دریائے عشق ایسا دریا ہے کہ اس کا کوئی کنارہ نہیں ہے اس جگہ جان سونپنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے)

اور جب اس پر نظر کرتا ہے کہ یہ راستہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا راستہ ہے جس پر آپ جس لے رہے ہیں تو اس کی ہمت بندھتی ہے اور یوں کہتا ہے۔

تو دستگیر شو اے خضر پے خجستہ کہ من پیادہ می روم وہمرہاں سوار انند

(اے خضر راہ تو ہی میرا ہاتھ پکڑ کہ میں پیدل ہوں میرے ہمراہی سوار ہیں۔)

اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اعانت ورفاقت سے اس راستہ میں چلنے کا ارادہ کرلیتا ہے

یہ تو ان لوگوں کے لئے ہے جن کی رسائی حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک ہو چکی ہے اور جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک بھی وصول نہ رکھتے ہوں ان کو اس کی ضرورت ہے کہ ان مشائخ کا دامن پکڑیں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک رسائی حاصل کر چکے ہیں (جیسے بادشاہ تک پہونچنے کیلئے وزیر کا واسطہ ضروری ہے مگر جو وزیر تک بھی نہ پہونچا ہو اس کو چاہیئے کہ ان لوگوں کی خوشامد کرے جو وزیر تک رسائی رکھتے ہیں ۱۲ جامع)

شیخ فرید فرماتے ہیں ؎

بے رفیقے ہر کہ شد در راہِ عشق عمر بگذشت و نشد آگاہ عشق

(بے پیر اور رہبر کامل کے جو شخص اس عشق کے راستہ میں چلا عمر گذر گئی مگر عشق سے باخبر نہ ہوا)

گر ہوائے ایں سفر داری دلا دامن رہبر بگیر و پس برآ

(اے دل اگر اس سفر محبت کے طے کرنے کی خواہش رکھتا ہے تو رہبر کامل کا دامن پکڑ اور پیچھے آ)

اور مولانا فرماتے ہیں ؎

بالہ باید راہ را تنہا مرو بے قلاؤز اندریں صحرا مرو

قلاؤز سے مراد قل اعوذ یا مولوی نہیں بلکہ قلاؤز کہتے ہیں رہنما کو یہ ترکی لغت ہے گو وہ قلاؤز ہو گا قل اعوذ یا ہی۔ مطلب یہ ہے کہ اس راستہ کو رہنما کے بغیر طے نہ کرو ورنہ بہت پریشان ہو گے اور راستہ طے نہ ہو سکے گا۔ آگے فرماتے ہیں ؎

ہر کہ تنہا نادر ایں رہ را برید ہم بعون ہمت مرداں رسید

(اگر کسی نے شاذ و نادر اس راہ سلوک کو تنہا بے صحبت پیر قطع کر بھی لیا ہے تو وہ بھی غائبانہ پیروں کی توجہ سے پہونچا ہے)

اس میں جواب ہے اس سوال کا کہ ہم تو بعض اولیاء کو دیکھتے ہیں کہ وہ بدون رہنما کے واصل ہو گئے ظاہر میں ان کا کوئی شیخ نہ تھا۔ مولانا فرماتے ہیں کہ اول تو یہ نادر ہے وَالنَّادِرُ کَالْمَعْدُوْمِ (نادر مثل معدوم کے ہوتا ہے) اس لئے تو نادر سے نقض وارد نہیں ہو سکتا۔ دوسرے

یہ کہ جس کو تم ظاہر میں بدون کسی رہنما کے واصل دیکھتے ہو وہ حقیقت میں ایسا نہیں واقع میں وہ بھی کسی رہنما کے واسطہ سے واصل ہوا ہے گو ظاہر میں اس کا کوئی شیخ نہیں مگر وصول اس کو بھی عون ہمت مردان طریق سے ہوا ہے یعنی اہل اللہ میں سے کسی نے اس پر نظر کی ہے جس کی برکت سے وہ واصل ہوگیا ہے گو اس شخص کو اس کی خبر بھی نہ ہو کہ مجھ پر کس نے نظر کی ہے۔ حضرات اہل اللہ کے احسان کی یہ شان ہوتی ہے کہ بہت لوگوں کو ان کے احسان کی خبر بھی نہیں ہوتی اور وہ اُن کے لئے دعائیں کرتے کرتے تھک گئے ہیں۔

حضرت مجدد صاحب قدس اللہ سرہٗ کا واقعہ ہے کہ آپ کے زمانہ میں ایک بزرگ صاحب سلسلہ تھے جن سے بہت فیض جاری تھا مگر حضرت مجدد صاحب کو ان کی بابت مکشوف ہوا کہ اس کا خاتمہ شقاوت پر ہوگا۔ پس حضرت مجدد صاحب یہ دیکھ کر تڑپ ہی تو گئے آپ کے دل نے گوارا نہ کیا کہ میرے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کا ایک شخص شقی ہو کر مرے اور وہ شخص بھی کیسا جس سے ہزاروں کو دین کا فیض ہو رہا ہے۔ آپ نے اس کے لئے دعا کرنی چاہی مگر ڈرے کہ اس میں حضرت حق کی مزاحمت نہ ہو کہ تقدیر مکشوف ہونے کے بعد اس کے خلاف کی دعا کرتا ہے۔ مگر پھر حضرت سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانی قدس اللہ سرہٗ کا مقولہ یاد آیا کہ میں وہ شخص ہوں کہ حق تعالیٰ سے کہہ کر میں شقی کو سعید کرا سکتا ہوں۔ اس پر مجدد صاحب کی بھی ہمت ہوئی۔ معلوم ہو گیا کہ ایسی دعا کرنا خلاف ادب نہیں چنانچہ پھر تو آپ نے اس کے لئے بہت دعائیں کیں اور پوری کوشش کی کہ کسی طرح اس شخص کی شقاوت کو مبدل بہ سعادت کر دیا جائے حتیٰ کہ آپ کو مکشوف ہو گیا کہ حق تعالیٰ نے اس کو سعید کر دیا تب آپ کو چین آیا تو دیکھئے مجدد صاحب نے اس شخص کے حق میں در پردہ کتنا بڑا احسان فرمایا مگر اس شخص کو خبر بھی نہ تھی اُسے کچھ بھی معلوم نہ تھا کہ میرے واسطے کسی شخص کے دل پر کیا گذر رہی ہے راتوں کی نیند اس کی اڑ گئی ہے۔ خیر یہ واقعہ تو ہو گیا مگر اس پر یہ شبہ ہوتا ہے کہ تقدیر کس طرح بدل گئی جس کے متعلق ارشاد ہے مَا يُبَدَّلُ الْقَوْلُ لَدَيَّ (میرے نزدیک قول نہیں بدلتا)

(ان شاء اللہ بقیہ آئندہ)

(ریختہ گل کراچی)

حضرت مجدد صاحب نے اس شبہ کا جواب بھی خود ہی دیا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ بعض امور کے متعلق لوح محفوظ میں اطلاق ہوتا ہے اور واقع میں وہ کسی قید کے ساتھ مقید ہوتے ہیں مگر وہ قید لوح محفوظ میں مذکور نہیں ہوتی بلکہ وہ علم الٰہی میں ہوتی ہے تو اس شخص کے متعلق لوح محفوظ میں تو صرف اتنا ہی تھا کہ اس کا خاتمہ شقاوت پر ہوگا مگر علم الٰہی میں اس کے ساتھ ایک قید تھی یعنی بشرطیکہ کوئی مقبول بندہ اس کے لئے دعا نہ کرے سو یہ واقعہ تقدیر کے خلاف نہیں ہوا کیونکہ تقدیر اصل میں علم الٰہی کا نام ہے۔ اسی لئے یہ حضرات ام الکتاب کی تفسیر علم الٰہی سے کرتے ہیں کیونکہ اس میں تغیر و تبدل کبھی نہیں ہوسکتا۔ پس در اصل ام الکتاب وہی ہے گو لوح محفوظ بھی کتاب المحو والاثبات کے اعتبار سے ام الکتاب ہے کیونکہ لوح محفوظ میں اتنا تغیر و تبدل نہیں ہوتا جتنا کتاب المحو والاثبات میں ہوتا رہتا ہے مگر فی الجملہ تغیر اس میں ہوسکتا ہے اور ہو جاتا ہے۔ اور جو تقدیر علم الٰہی کے درجہ میں ہے اُس میں اس کا اصلا احتمال نہیں۔ پس حقیقت کے اعتبار سے ام الکتاب وہی ہے۔ اور اس تفسیر کے اعتبار سے کلام نفسی کے درجہ میں قرآن کے قدیم ہونے کی دلیل نص سے نکل سکتی ہے کیونکہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں وَاِنَّهٗ فِیْٓ اُمِّ الْكِتٰبِ لَدَیْنَا لَعَلِیٌّ حَكِیْمٌ یعنی قرآن ہم سے غایت قرب کے درجہ میں علی حکیم ہے یہ غایت قرب لدیّ کا مدلول ہے اور غایت قرب ذات حق سے مرتبہ صفات کو ہے تو حاصل یہ ہوا کہ قرآن مجید درجہ صفت میں علی ہے حکیم ہے اور قرآن جو درجہ صفت ہے وہی کلام نفسی ہے اور اسی لئے اس کو علی حکیم کہا گیا اور علی حکیم کا اطلاق قرآن مجید میں کسی حادث پر نہیں آیا تو لدینا اور علی حکیم دونوں کی دلالت اس کے صفت ہونے اور قدیم ہونے پر ہوئی اور اس کے قبل جو ارشاد ہوا ہے اِنَّا جَعَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِیًّا (ہم نے اس کو قرآن عربی کر دیا) اس کا جعل کا مفعول ہونا اور عربیۃ کے ساتھ موصوف ہونا قرینہ ہے کہ اسی سے کلام لفظی کا درجہ مراد ہے تو دونوں آیتوں میں دونوں درجوں کا بیان نہایت وضاحت سے ہوگیا خیر یہ توضیح میں ایک علمی لطیفہ تھا مقصود میرا یہ تھا کہ اہل اللہ بعض دفعہ اس طریقہ سے بعض لوگوں پر احسان فرماتے ہیں کہ ان کو خبر نہیں ہوتی بھلا اگر مجدد صاحب بیان نہ فرماتے تو ان بزرگ کو اس احسان کی اطلاع کیسے ہوتی اور معلوم ہوتا ہے کہ وہ بزرگ حضرت مجدد صاحب کے

ضروری اطلاع: خط و کتابت کرتے وقت یا اپنا پتہ تبدیل کراتے وقت اپنا خریداری نمبر ضرور تحریر فرمائیں۔

معتقد ہوں گے اگر معتقد نہ ہوتے تو اس احسان کو تسلیم کرنے کے بجائے مجدد صاحب پر نہ معلوم کیا کیا اعتراض کرتے یہ ہے ہم بعونِ ہمت مردان رسید (مردان خدا کی توجہ سے پہونچے) اور یہ بھی ان بزرگ کی سعادت کی علامت تھی کہ انھوں نے مجدد صاحب پر اعتراض نہیں کیا بلکہ تسلیم سے کام لیا ان حضرات پر انکار نہ کرنا بھی بڑی دولت ہے اہل اللہ کے ساتھ انکار سے پیش آنا بڑا وبال ہے بلکہ کام کی بات تو یہ ہے کہ اپنے چھوٹوں پر بھی حقیر سمجھ کر انکار نہ کرو کیونکہ کیا خبر ہے کہ خدا کے یہاں کون عزیز ہے اور کون حقیر بعض دفعہ جن کو ہم اپنے سے چھوٹا سمجھتے ہیں خدا کے نزدیک بڑے ہوتے ہیں مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان کی تربیت و تعلیم بھی نہ کرو کیونکہ تعلیم میں تحقیر و بے ادبی نہیں بلکہ تعلیم تو ادب ہی ہے کیونکہ ہر چیز کا ادب اس کے مناسب ہوتا ہے چھوٹوں کا ادب یہی ہے کہ ان کی تربیت و تعلیم کی جائے۔ یہاں تک تو لفظ صِرَاطٌ کے متعلق بیان تھا آگے فرماتے ہیں مُّسْتَقِيمًا یعنی یہ راستہ مستقیم ہے۔ لفظ مستقیم کے معنی ایک تو لغوی ہیں یعنی اَقْصَرُ الْخُطُوطِ الْوَاصِلَةِ بَيْنَ النُّقْطَتَيْنِ (دو نقطوں کے درمیان میں جو خطوط واصل ہو سکیں ان میں جو سب سے چھوٹا ہو وہ مستقیم لغوی ہے) اور ایک معنی عرفی ہیں یعنی بے خوف و خطر راستہ۔ عرف میں رہ راست کو کہتے ہیں جس میں کوئی خطرہ نہ ہو چنانچہ کہا کرتے ہیں کہ فلاں گاؤں کا سیدھا راستہ یہ ہے اس کو چلے جاؤ حالانکہ اس میں موڑ بھی آتے ہیں مگر مطلب یہ ہوتا ہے کہ یہ راستہ بے خطر ہے اس میں تم کو غلطی پیش نہ آئے گی صاف سڑک پڑی ہوئی ہے اور یہی عرفی معنی اس شعر میں مراد ہیں۔ ؎ "راہ راست برو اگرچہ دور است" (بے خطر راستہ پر چلو اگرچہ دور ہو) اگر راہ راست کے معنی عرفی نہ لئے جائیں تو لغوی معنی کے اعتبار سے اگرچہ دور است (اگرچہ دور ہو) نہیں بن سکتا کیونکہ جو راستہ لغۃً مستقیم ہوگا وہ اوروں سے دور کبھی نہیں ہو سکتا بلکہ اس کے لئے اقصر الطرق ہونا لازم ہے جن لوگوں کو مستقیم کے لغوی اور عرفی معنی میں فرق معلوم نہیں وہ اس شعر کو حل نہیں کر سکتے مگر اس تحقیق کے بعد مطلب صاف ہے کہ بے خطر راستہ کو اختیار کرو اگرچہ وہ دور ہی کیوں نہ ہو یہ تو لفظ کی تحقیق تھی اب میں کہتا ہوں کہ صراطِ حق یعنی اسلام کے متعلق یہ دونوں معنی مراد ہو سکتے ہیں کیونکہ صراطِ حق بے خطر بھی ہے اور وصول الی اللہ میں وہ تمام طرق سے اقرب و اقصر بھی ہے تو آپ کو اختیار ہے کہ چاہے مستقیم کو لغوی معنی پر محمول کیجئے یا عرفی پر (یا دونوں پر) یہاں سب کی گنجائش

اس کے بعد ارشاد ہے وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيلِهِ یعنی اس راستہ (اسلام) کا اتباع کرو اور دوسرے مختلف راستوں کا اتباع نہ کرو ورنہ وہ تم کو خدا کے راستہ سے جدا اور دور کردیں گے اور دور ہونا اس طرح کا نہیں ہے کیونکہ وہ موصل تو ہوتے ہیں نقطۂ مقصود سے دور تو نہیں کرتے بلکہ اس طرح کی دوری ہے جیسے مثلث کی ایک ساق کو چھوڑ کر اگر دوسری ساق پر چلنے لگے تو ساق اول سے وقتاً فوقتاً بعد ہی بڑھتا جاتا ہے جیسے اقصر الخطوط کے سوا تمام خطوط واصلہ دور دراز ہوا کرتے ہیں اور جدا ہونا زیادہ ظاہر ہے کیونکہ بے خطر راستہ کو چھوڑ کر خطرناک راستہ اختیار کرنے کا نتیجہ یہی ہوتا ہے کہ مقصود تک وصول میسر نہیں ہوتا بیچ ہی میں ہلاک ہوجاتا ہے اور ایک بات یہاں اور قابل توجہ ہے وہ یہ کہ پہلے تو صِرَاطِی میں ضمیر متکلم کا مرجع حضور صلی اللہ علیہ وسلم تھے جس میں اس راستہ کی طرف اضافت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف تھی اور یہاں عن سبیلہ بضمیر غائب فرمایا گیا ہے اس کا مرجع حق تعالیٰ ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نہیں ہیں ورنہ سبیلی بیاء متکلم فرماتے سو اس کی توجیہ کی اس لئے کوئی ضرورت نہیں کہ یہ اضافت تو حقیقت کے موافق ہے۔ توجیہ کی ضرورت تو صراطی میں تھی جس کا نکتہ میں بیان کرچکا ہوں اس کے بعد ارشاد ہے ذٰلِكُمْ وَصّٰكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ اس کی خدا تعالیٰ نے تم کو وصیت فرمائی ہے تاکہ تم تقویٰ حاصل کرسکو۔ وصیت کرنے سے مراد تاکیدی حکم دینا ہے کیونکہ وصیت اصل میں اس بات کو کہتے ہیں جو انسان اپنے مرنے کے وقت عزیزوں اور وارثوں سے کہا کرتا ہے چونکہ وہ انسان کا آخری وقت ہوتا ہے اس لئے اس وقت جو بات کہتا ہے وہ خاص ضرورت کی باتیں ہوتی ہیں جن کی تعمیل کو وہ بہت مؤکد و لازم کیا کرتا ہے چونکہ حق تعالیٰ عدم و فنا سے پاک ہیں اس لئے یہاں پر وصیت کے معنی متعارف تو ہو نہیں سکتے بلکہ اس کا لازم مراد ہے یعنی حکم تاکیدی لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ یہ نتیجہ ہے اتباع صراط مذکور کا مطلب یہ ہے کہ تم اس راستہ پر چلو تو امید ہے کہ تم کو وصال مقصود حاصل ہوجائے گا اس طرح سے تم نجات آخرت سے کامیاب ہوجاؤ گے کیونکہ تقوی کے معنے لغت میں بچنے کے ہیں تو حاصل یہ ہوا کہ تم عذاب سے بچے رہو گے اور یہی خلاصہ ہے نجات کا اور شریعت کی اصطلاح میں تقویٰ کمال دین کو کہتے ہیں چنانچہ موارد نصوص میں غور کرنے سے یہ بات واضح ہوجائے گی

اس تفسیر پر مطلب یہ ہوا کہ اس راستہ پر چلنے سے تم کو کمال دین حاصل ہوجائے گا اور یہی حاصل ہے مقصود پر پہونچنے اور منزل پر وصول ہوجانے کا اس کے بعد میں اس آیت کو مضمون پر منطبق کرنا چاہتا ہوں گو اس تفصیل کے بعد تقریر انطباق کی ضرورت نہیں رہی مگر میں تبرعاً اس کو بھی بیان کئے دیتا ہوں تاکہ پوری تسلی ہوجائے کہ آیت مضمون مقصود پر بسہولت منطبق ہے۔ سو اوپر معلوم ہوچکا ہے کہ هٰذَا صِرَاطِیْ سے دین اسلام کی طرف اشارہ ہے اور اسلام گو نام لغۃً ہے مجموعہ اعمال کا اور عقاید اس میں مجازاً داخل ہیں اور حقیقۃً عقائد ایمان کا مدلول ہیں اسی لئے کہا جاتا ہے کہ ایمان فعل قلب ہے اور اسلام فعل جوارح اور یہ اطلاق لغوی ہے کیونکہ ایمان کے معنے تصدیق کے ہیں جو اولاً بالذات قلب سے صادر ہوتی ہے اور اسلام کے معنے گردن نہادن بطاعت ہیں جس کا محل جوارح ہیں اور بعض نصوص میں بھی اسلام و ایمان کا اطلاق اس حقیقت کے موافق وارد ہے قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰکِنْ قُوْلُوْا اَسْلَمْنَا (اعراب نے کہا کہ ہم ایمان لائے آپ کہدیجئے تم ایمان نہیں لائے لیکن یہ کہو کہ ہم اسلام لائے) لیکن یہ حقیقت لغویہ ہے اصطلاح شرعی میں اسلام نام ہے مجموعہ عقائد و اعمال کا اور ایمان نام ہے مجموعہ عقائد کا تو شرعاً اسلام عام ہے اور ایمان خاص اور یہاں پر هٰذَا صِرَاطِیْ سے جو اسلام کی طرف اشارہ ہے اس سے یہی اسلام شرعی مراد ہے جو عقائد و اعمال سب کو شامل ہے جس کا قرینہ یہ ہے کہ اوپر قُلْ تَعَالَوْا (آپ کہئے کہ آؤ) میں عقائد و اعمال دونوں کا ذکر ہے اُس کے بعد وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا (یہ دین میرا راستہ ہے جو مستقیم ہے) فرمایا گیا ہے تو اس میں مجموعہ عقائد و اعمال کی طرف اشارہ ہونا مناسب ہے اور ان اعمال و عقائد کو جو صراط فرمایا گیا تو تخصیص ان ہی اعمال و عقائد کی مقصود نہیں یہ تو بطور تمثیل کے فرمایا ہے مقصود اتباع صراط اسلام کا ہے جو تمام اصول و فروع کو شامل ہے البتہ ایک تحقیق سمجھنے کی یہاں ضرورت ہوگی وہ یہ کہ اوپر بعض نواہی کا ذکر ہے جیسے لَا تُشْرِکُوْا وَلَا تَقْتُلُوْا وَلَا تَقْرَبُوْا (مت شریک کرو اور مت قتل کرو اور نہ قریب جاؤ اور جب کوئی بات کہو تو انصاف کرو) اور بعض مامورات کا ذکر ہے جیسے بِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا وَاَوْفُوا الْکَیْلَ وَاِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا (والدین کے

ساتھ احسان کردناپ۔ تول پوری کرو۔ اور ان سب کو صراطی فرمایا۔ اس کے اتباع کا امر فرمایا تو صراط کہیں فعل ہوگا کہیں ترک اور اتباع فعل سے ہوگا کہیں ترک سے غرض هٰذَا صِرَاطِيْ سے مراد تمام وہ اعمال ومامورات ہیں جو معین آخرت و مفید مقصود ہیں جن کا مفید ہونا مستقیماً میں مدلول ہے کہ استقامت کے لئے موصل الی المقصود ہونا لازم ہے اور وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ (دوسری راہ پر مت چلو کہ وہ راہیں تم کو اللہ کی راہ سے جدا کردیں گی) میں تمام وہ اعمال آگئے جو مانع عن الآخرت و مضر للمقصود ہیں اور مضر ہونا فتفرق سے ظاہر ہے۔ پس ان مقدمات سے حاصل یہ ہوا کہ ہم کو ہر کام میں یہ دیکھنا چاہیئے کہ یہ فعل معین آخرت ہے یا مضر آخرت ہے اب اس میں تمام شریعت آگئی کوئی مضمون شریعت کا اس سے خارج نہیں رہا۔ اس لئے اس آیت کے تحت میں تمام شریعت کا ذکر ہوسکتا ہے۔ اسی واسطے میں نے ابتداء میں کہا تھا کہ اس آیت کی تفصیل عمر بھر میں بھی بیان نہیں ہوسکتی اور وہ ایک شخص کی عمر نہیں بلکہ ایک جماعت کی عمر جو فی نفسہ گو متناہی ہو مگر بمعنی لَا تَقِفُ عِنْدَ حَدٍّ غَيْرُ مُتَنَاهِيْ (غیر متناہی کہ کس حد پر نہ ٹھیرے) ہو پس اس میں وہ احکام بھی داخل ہیں جو اس ماہ رواں یعنی شعبان کے متعلق یا ماہ آیندہ رمضان کے متعلق شریعت میں وارد ہیں لہذا میں احکام شعبان کو بھی اس کے تحت میں بیان کرنا چاہتا ہوں اور رمضان کے متعلق اگر موقعہ ملا تو پھر کبھی بیان ہوجائے گا۔ شعبان کی بابت حدیث میں یہ خاص فضیلت مذکور ہے اِذَا كَانَتْ لَيْلَةُ النِّصْفِ مِنْ شَعْبَانَ فَقُوْمُوْا لَيْلَهَا وَصُوْمُوْا نَهَارَهَا فَاِنَّ اللّٰهَ تَبَارَكَ وَتَعَالٰى يَنْزِلُ فِيْهَا لِغُرُوْبِ الشَّمْسِ اِلَى السَّمَاءِ الدُّنْيَا فَيَقُوْلُ اَلَا مِنْ مُسْتَغْفِرٍ فَاَغْفِرَ لَهٗ اَلَا مِنْ مُسْتَرْزِقٍ فَاَرْزُقَهٗ اَلَا مِنْ مُبْتَلًى فَاُعَافِيَهٗ اَلَا كَذَا اَلَا كَذَا حَتّٰى يَطْلُعَ الْفَجْرُ رَوَاهُ ابْنُ مَاجَه وَسَنَدُهٗ ضَعِيْفٌ كَمَا يَدُلُّ عَلَيْهِ تَصْدِيْرُ الْمُنْذِرِيْ اِيَّاهُ بِلَفْظِ رُوِيَ وَهُوَ عَلَامَةُ الضُّعْفِ كَمَا صَرَّحَ بِهٖ فِيْ خُطْبَةِ كِتَابِهٖ اه تَرْغِيْبُ ص۱۷۹ ج ۱ لٰكِنَّهٗ يُحْتَمَلُ فِيْ فَضَائِلِ الْاَعْمَالِ۔ جامع) یعنی حق تعالےٰ اس مہینہ کی پندرھویں رات میں غروب ہی کے وقت سے آسمان اول کی طرف نزول فرماتے ہیں۔

جیسا نزول ان کی شایانِ شان ہے اس میں ہم کو کاوش کی ضرورت نہیں بلکہ اس کی ممانعت بھی ہے کیونکہ یہ متشابہات میں سے ہے پھر فرماتے ہیں کہ کوئی مغفرت کا طالب ہے؟ کہ میں اس کی مغفرت کر دوں کوئی روزی کا طالب ہے کہ میں اس کو روزی دوں کوئی بیمار (طالب شفا) ہے کہ میں اس کو عافیت دوں اسی طرح بہت سے امور کے متعلق فرماتے رہتے ہیں کہ کوئی ایسا ہے کوئی ایسا ہے یہاں تک کہ طلوع فجر تک یہی معاملہ رہتا ہے سبحان اللہ یہ اس رات کی کتنی بڑی فضیلت ہے گویا یوں کہنا چاہیئے کہ اس رات حق تعالیٰ ہمارے گھر پر تشریف لاتے ہیں کیونکہ آسمان اول ہمارے گھر کی چھت ہے اور محبوب کا چھت پر آجانا گھر ہی میں آجانا ہے تو بس ہمارا حال اس شعر کے مصداق ہوتا ہے ؎

امروز شاہ شاہاں مہماں شد است مارا　　جبریل با ملائک دربان شد است مارا

(آج بادشاہوں کا بادشاہ ہمارا مہمان ہے جبرائیل وملائک ہمارے دربان ہیں۔)

اب اس کو خود سوچ لو کہ جب محبوب گھر میں مہمان ہو تو عاشق کا کیا حال ہوتا ہے۔ جناب خوشی کے مارے رات بھر نیند نہیں آتی یہی جی چاہا کرتا ہے کہ ساری رات محبوب سے باتیں کرتا رہوں خصوصاً جس کا محبوب ایسا ہو جو اپنے عشاق کی باتیں سننے سے گھبراتا بھی نہ ہو نہ اس کو نیند آتی ہو نہ غنودگی ستاتی ہو ایسے محبوب کا عاشق تو ہرگز اس رات میں سو دیگا جس میں محبوب اس کے گھر پر آیا ہو بس اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں اس رات میں قیام کا امر بھی نہ فرماتے جب بھی صرف اس خبر کا کہ حق تعالیٰ اس رات آسمان دنیا پر نزول فرماتے ہیں مقتضا یہی تھا کہ ہم اس رات کو عبادت و ذکر میں گذاریں اور رات بھر بیدار رہیں چہ جائیکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی ارشاد ہے قُوْمُوْا لَیْلَھَا وَصُوْمُوْا نَھَارَھَا (اس کی رات میں شب بیداری کرو اور دن میں روزہ رکھو) مگر وہ شاہ شاہاں ایسا مہربان ہے کہ مہمان ہو کر بھی تمہیں سونے سے نہیں روکتا تم کو سونے کی اجازت مگر باوجود اس طرف سے اجازت ہونے کے پھر بھی یہ اچھا نہیں معلوم ہوتا کہ جیسے روز ویسے ہی اس روز کچھ تو کرنا چاہیئے۔ رات بھر جاگنے کی ضرورت نہیں بلکہ اچھا بھی نہیں کیونکہ حدیث میں ہے اَحَبُّ الْاَعْمَالِ اِلَی اللّٰہِ اَدْوَمُھَا بہتر عمل خدا تعالیٰ کے نزدیک وہ ہے جس کو دوام کیا جائے سو شعبان کی اس شب میں اتنا جاگنا چاہیئے جس پر نباہ ہو سکے یہ نہیں کہ ایک مرتبہ تو ساری رات جاگ لئے اور دوسری مرتبہ کچھ بھی نہیں شاید کوئی صاحب اس حدیث کو سنکر یہ کہیں کہ یہ دوام تو بڑا سر لگا سال میں ایک رات تو کچھ دیر جاگنا آسان تھا سال بھر کون جاگے ارے صاحب! آپ گھبرائیں نہیں

یں سال بھر کی راتوں میں آپ کو نہیں جگاتا بلکہ آپ سال میں ایک ہی رات جاگ لیا کیجئے رہا یہ شبہ کہ اس صورت میں دوام کہاں ہوا تو میں کہتا ہوں یہ بھی ایک صورت دوام کی ہے کہ سال میں ایک رات ہمیشہ جاگ لیا کرے جیسے روٹی پر آپ کو دوام ہے مگر اس کا یہ تو مطلب نہیں کہ ہر وقت کھایا کرے یا کپڑے بدلنے پر دوام ہے کہ ہفتہ میں ایک بار یا دو بار بدلا کرتے ہیں اس دوام کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ ہر وقت کپڑے بدلے جائیں پس اسی طرح سال بھر میں ایک رات جاگنے کا التزام کر لینا یہ بھی دوام ہے بشرطیکہ یہ ایک رات ناغہ نہ ہو تو اس رات میں اتنی مقدار بیداری کے لئے معین کرنی چاہیئے کہ جس پر ہمیشہ کم از کم اس رات میں تو دوام ہو جایا کرے چاہے ایک ہی گھنٹہ ہو بلکہ میں اس سے ترقی کر کے کہتا ہوں کہ چاہے دو ہی رکعت ہوں کچھ تو ہوں پس قلیل عمل بھی دوام کے ساتھ عمل کثیر بغیر دوام سے بہتر ہے اگر دو رکعت بھی کسی سے نہ ہو سکیں تو کم از کم ایک مرتبہ استغفار ہی اس رات میں کر لیا کیجئے التزام کے ساتھ یہ بھی ان شاء اللہ تعالیٰ کافی ہے۔ ہمارے حضرت حاجی صاحب کا شعر ہے ؎

گرچہ کرتے ہیں بہت سے نالہ و فریاد ہم ... بس ہے اپنا ایک بھی نالہ اگر پہونچے وہاں

سبحان اللہ یہ علوم ہیں حاجی صاحب کے حق تعالیٰ نے حاجی صاحب کو کتنا سہل راستہ الہام فرمایا تھا پس وہی انبیاء کا راستہ ہے جس کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم لائے تھے جس کی شان یہ ہے سَهْلَةٌ بَيْضَاءُ نقية ليلها ونهارها سواء حضرت حاجی صاحب کی یہی تعلیم تھی کہ کچھ کرنا چاہیئے چاہے قلیل ہی ہو پس تم ہر شعبان میں اس رات کے لئے کچھ کام مقرر کر لو یہ بھی دوام ہے اگر تمام رات بیدار نہ رہ سکو تو جتنا ہو سکے پانچ منٹ ہی سہی۔ اور حدیث میں آتا ہے اس رات سب کی مغفرت ہو جاتی ہے (جو بھی مغفرت طلب کرے ۱۲) سوائے مشرک اور مشاحن کے یعنی جن دو شخصوں میں دنیوی عداوت و کینہ ہو ان کی بھی مغفرت نہیں ہوتی بلکہ کہدیا جاتا ہے ان کو ابھی رہنے دو جب تک یہ صلح کر لیں (قلت رواہ البیہقی من طریق العلاء بن الحارث عن عائشۃ وقال ھذا مرسل جید یعنی ان العلاء لم یسمع من عائشۃ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم کذا فی الترغیب ص۴۸۷ ج۱) اللہ اللہ کینہ بھی کتنا گناہ ہے کہ اس کو شرک کے ساتھ جمع کیا گیا ہے کہ جس طرح مشرک کی مغفرت اس رات میں نہیں ہوتی اسی طرح کینہ ور کی بھی مغفرت نہیں ہوتی اب تو مسلمانوں میں کینہ بہت ہی بڑھ گیا ہے حالانکہ اس میں ہر مسلمان کا وہ مشرب ہونا چاہیئے تھا جو صوفیہ کا ہے وہ یوں کہتے ہیں ؎

آئین ماست سینہ چوں آئینہ داشتن ... کفر ست در طریقت ما کینہ داشتن

ترجمہ (ہمارے طریق میں کینہ رکھنا کفر ہے ہمارا آئین ہے سینہ کو مثل آئینہ صاف رکھنا) (کینہ کو کفر کہنا کا مطلب یہ ہے کہ وہ قریب بکفر ہے اور اس کی دلیل حدیث مذکور میں موجود ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم مشاحین کو مشرک کے ساتھ جمع فرمایا ۱۲) مگر اب تو صوفیوں میں بھی یہ بات نہیں رہی ان میں کینہ و بغض کی کثرت ہونے لگی حالانکہ مسلمانوں کو تو یہ دعا تعلیم کی گئی ہے وَلَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا (اے اللہ ہمارے دلوں میں مسلمانوں کی طرف سے کینہ پیدا نہ کیجیے ۱۲) تو اس مرض سے بچنا چاہیے مگر آجکل مسلمان اپنے بھائیوں ہی سے کینہ بہت رکھتے ہیں غیروں سے تو اتحاد کی کوشش کی جاتی ہے ان کو غیر قوموں سے اتنا کینہ نہیں ہوتا جتنا اپنے بھائیوں سے ہوتا ہے افسوس! بس اس رات سے پہلے ہر شخص کو اپنے دل میں سے مسلمانوں کی طرف سے کینہ نکال دینا چاہیے ورنہ اس کی مغفرت نہ ہوگی اس دن کے ختم ہونے کے بعد (اس دن چودھویں تاریخ تھی) جو رات اب آرہی ہے وہی لیلۃ النصف من شعبان ہے جس کا نام شب برات ہے مگر حلوے مانڈے والوں کو یہاں آج ہی شب برات ہے واقعی ان بدعات کے ساتھ عقل بھی خبط ہو جاتی ہے یہ کتنی بڑی غلطی ہے کہ دن کو شب کہتے ہیں شاید چودھویں تاریخ کو اہتمام کرنے سے پندرھویں رات ہی مقصود ہوتی ہوگی اسی اہتمام کے سبب چودھویں تاریخ ہی کو شب برات کہنے لگے۔

دوسری غلطی یہ کہ بقرعید کی طرح شب برات کا بھی عرفہ کیا جاتا ہے یہاں کے لوگ تو عرفہ کو نہ جانتے ہوں گے مگر لکھنؤ وغیرہ میں آج سے ایک دن پہلے آفت شروع ہوگئی ہوگی پھر وہ عرفہ ہی نہیں ہوتا بلکہ اس میں صرفہ بھی کیا جاتا ہے۔ یہ سب قصہ پیر جیون کا نکالا ہوا ہے انھوں نے اپنے کھانے کے واسطے ایک تو چودھویں ہی تاریخ سے شب برات شروع کر دی پھر اس کا عرفہ نکالا تاکہ بار بار مٹھائی حلوا ملے۔

واللہ اگر ان کو مٹھائی وغیرہ نہ دو تو یہ خود بدعات سے توبہ کرلیں۔ ان کا آسان امتحان یہ ہے کہ ان سے فاتحہ خوب دلواؤ، مولود خوب پڑھواؤ اور کچھ دو دلاؤ نہیں، پھر دیکھو جب ان پر مفت کی مشقت پڑے گی وہ خود ان کو بدعات کہنے لگیں گے۔

کانپور میں ایک مولوی صاحب کسی رئیس کے یہاں مولود پڑھنے گئے۔ درمیان میں آپ نے ایک شعر پڑھا اور وجد ظاہر کرکے اپنا کرتہ جھر سے پھاڑ ڈالا۔ یہ معاملہ دیکھ کر گھر والے لئے اسی وقت بزاز کے یہاں سے اس بدذات کے واسطے

کپڑا منگایا دکیونکہ اس میں ان کی سبکی تھی کہ مولوی صاحب ان کے گھر آئے تھے سُر تنگے اورجائیں گے ننگے ۱۲) تو یہ لوگ دنیا وصول کرنے کے لئے ایسی ایسی ترکیبیں کرتے ہیں اگران کو کچھ نہ دیا جاوے اس وقت سب بدعات کی حقیقت خود ہی کھل جائے گی۔ لوگ خواہ مخواہ دلائل سے ان کو طے کرنا چاہتے ہیں حالانکہ حق و ناحق کا امتحان اس ترکیب سے بآسانی ہوسکتا ہے۔

مولوی عبدالحق صاحب خیرآبادی گو معقولی تھے مگر خوش عقیدہ تھے ان سے کسی نے پوچھا کہ حضرت مولود پڑھنا کیسا ہے، فرمایا بڑی برکت کی چیز ہے اس کی ادنیٰ برکت تو یہ ہے کہ مولود خواں کو کم از کم دو حصّے تو ضرور ہی ملتے ہیں۔

اسی طرح ایک مرتبہ ایک خانصاحب مولانا کے پاس آئے تھے وہ اس زمانہ میں مستاجری کرتے تھے جس کا بھوپال وغیرہ میں بہت رواج تھا تو مولانا نے خانصاحب سے پوچھا کہ آجکل تو وصول یابی کے دن ہیں آپ یہاں کیسے آگئے۔ خانصاحب بولے کہ میں تو گاؤں کو بڑے پیر صاحب کے سپرد کرآیا ہوں۔ مولانا نے فرمایا اچھا ہم تو اب تک یہ سمجھتے تھے کہ بڑے پیر صاحب ولی ہیں مگر آپ کے قول سے معلوم ہوا کہ پدھان بھی ہیں جو زمین و جائیداد کا بھی انتظام کرلیتے ہیں۔ غرض ان بدعات کا کچھ خاصہ ہے کہ ان سے عقل بھی خبط ہو جاتی ہے اور منشا سب کا وہی پیٹ کا دھندا ہے۔ یہ پیٹ انسان سے سب کچھ کراتا ہے۔ چنانچہ بدعات شعبان میں بھی انہی حضرت کی برکت کا ظہور ہوتا ہے مسلمان کے لئے اتنی بات کافی ہے کہ جو کام کرے یہ دیکھ لے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس کو کیا ہے یا نہیں یا اشارۃً دلالۃً اس کی ترغیب دی ہے یا نہیں چنانچہ شعبان کی اس رات میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کھانا حلوا وغیرہ کچھ نہیں پکوایا جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کام نہیں کیا تو تم کیوں کرتے ہو۔ شیخ سعدی نے خوب فرمایا ہے ؎

بزہد و ورع کوش و صدق و صفا　　ولیکن میفزائے بر مصطفےٰ

(یعنی زہد و ورع و صدق و صفا میں کوشش کرو لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھنے کی کوشش نہ کرو کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی بڑھ نہیں سکتا بلکہ جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھنا چاہتا ہے وہ اور نیچے کو گر جاتا ہے ۱۲ جامع) بھلا ان بدعات میں تو بعض منکرات ایسے

مختلط ہیں جن کی وجہ سے ان کو مباح بھی نہیں کہا جا سکتا لیکن اگر کوئی کام منکرات سے خالی بھی ہوا اور فی نفسہ مباح ہو لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو اختیار نہ کیا ہو تو عارفین اس کو بھی پسند نہیں کرتے بلکہ ان ہی کاموں کو پسند کرتے ہیں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عملاً ثابت ہیں چنانچہ مولانا گنگوہی (قدس سرہٗ) فرماتے تھے کہ حضرت حافظ محمد ضامن صاحب شہید رحمۃ اللہ علیہ نے ایک بار فرمایا کہ بھائی بزرگوں نے تو ہر لقمہ اور ہر گھونٹ پر الحمد للہ کہنے کی ترغیب دی ہے اور یہی ان کا معمول بھی ہے مگر ہم کو تو حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے فعل سے محبت ہے کہ بس ایک بار شروع کھانے میں بسم اللہ کہہ لے اور ایک بار فراغت کے بعد اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ اَطْعَمَنَا وَسَقَانَا وَجَعَلَنَا مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ (۱) سب تعریف ہے اللہ ہی کے لئے جس نے ہم کو کھلایا اور پلایا اور مسلمانوں میں سے کیا) کہہ لیا مولانا گنگوہی نے فرمایا کہ حافظ صاحب نے یہ کیا اچھی بات فرمائی اھ اتباع سنّت اس کا نام ہے مگر ہم لوگوں نے تو محض نام ہی یاد کر لیا ہے پس اتباع سنت اسی میں ہے کہ اس زمانہ کے متعلق جو کچھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے وہی کیا جائے اور اپنی طرف سے کچھ زیادتی نہ ایجاد کی جائے۔ شعبان کے مہینہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک تو یہ ثابت ہے کہ پندرھویں رات کو کچھ اور راتوں سے زیادہ بیدار رہا جائے۔ دوسرے یہ ثابت ہے کہ پندرھویں تاریخ کو روزہ رکھا جائے، اس روزہ کا بہت ثواب ہے اور حکمت اس دن کے روزہ کی اور اس کی رات کے قیام کی یہ سمجھ میں آتی ہے کہ نصف شعبان کا وقت مقدار و کیفیت وغیرہ میں رمضان کے وقت کے مماثل ہوتا ہے چنانچہ اس کے بعد رمضان تک دن کی زیادتی کمی میں نمایاں فرق نہیں ہوتا چند منٹوں ہی کا تفاوت ہوتا ہے نیز موسم میں بھی کچھ زیادہ تغیر نہیں ہو سکتا پندرہ دن میں کوئی معتد بہ تفاوت نہیں ہوا کرتا جیسی گرمی ۱۵ شعبان کو ہوگی بس قریب قریب اسی کے یکم رمضان کو ہوگی تو اس دن کے روزہ کی اور اس کی رات کے قیام کی ترغیب میں یہ حکمت معلوم ہوتی ہے کہ اس دن کا روزہ رکھکر اور اس کی رات کو جاگ کر امتحان کر لو کہ بس رمضان کا روزہ بھی ایسا ہی ہوگا اور تراویح کی نماز بھی ایسی ہی ہوگی جیسے اس رات کا جاگنا پھر گھبراتے کیوں ہو میں اس حکمت کا دعوٰی تو نہیں کرتا مگر

مجھے یہ حکمت معلوم ہوتی ہے اور گو یہ حکمت مقصود نہ ہو مگر اس دن کے صیام اور رات کے قیام پر یہ فائدہ مرتب تو ضرور ہوتا ہے کہ اس سے رمضان کے صیام و قیام کا نمونہ معلوم ہو کر اس کی ہمت بندھ جاتی ہے۔ اور مجھے یہی حکمت معلوم ہوتی ہے۔ حدیث اِذَا انْتَصَفَ شَعْبَانُ فَلَا صَوْمَ اِلَّا عَنْ رَمَضَانَ (جب نصف شعبان گذر جائے تو سوائے رمضان روزہ نہ رکھا جائے) کی (جب شعبان نصف گذر جائے" اور گذر جانیکے ترجمہ سے خود پندرہویں تاریخ کا اس سے خارج ہونا مفہوم ہو گیا کیونکہ نصف متیقن پندرھویں کے بعد ہی گذرتا ہے نہ اُس سے پہلے" تو رمضان کے سوا اور روزہ نہیں) کہ اس سے بھی رمضان کے لئے ہمت کا تازہ رکھنا مقصود ہے اگر نصف شعبان کے بعد روزے رکھے گئے تو ان سے لحوق ضعف کا اندیشہ ہے جس سے شاید رمضان کے روزوں کی ہمت پست ہو جائے اور اگر نصف شعبان کے بعد کھانے پینے میں مشغول رہے گی تو وہ ہمت جو ایک روزہ کے امتحان سے پیدا ہو چکی تھی کمزور نہ ہو گی باقی احکام شرعیہ کی مصالح کا احاطہ کون کر سکتا ہے یہ بھی حق تعالےٰ کا انعام ہے کچھ تھوڑی بہت حکمتیں ہم جیسوں کو بھی بتلا دی جاتی ہیں جن سے ضعیف الایمان لوگوں کو تسلی ہو جاتی ہے ورنہ مسلمان کا اصل مذاق تو یہ ہونا چاہیے

زباں تازہ کردن باقرار تو نینگیختن علت از کار تو

(آپ کی ربوبیت کا اقرار کرنا آپ کے کاموں میں علتیں نکالنے کو مانع ہے)

اب میں ایک مضمون اور بیان کرنا چاہتا ہوں اور اسی پر بیان کو ختم کر دوں گا کیونکہ وقت بہت گذر گیا عصر کی نماز بھی قریب ہے یہ مضمون پہلے ایک علمی رسم سے ظاہر ہو چکا ہے اور اس کی اجمالی کیفیت ایک مختصر تقریر سے معلوم ہو چکی ہے میں مضمون کو بھی اسی آیت میں داخل کرتا ہوں۔ یہ مضمون دستاربندی علماء ہے گو اس میں ہم لوگوں کی اغراض مختلف ہو گئی ہیں جن میں بعض اغراض خراب بھی ہیں کہیں اس سے اپنی کارگذاری کا اظہار مقصود ہوتا ہے کہیں چندہ کی کوشش کیلئے اس قسم کے جلسوں کو ذریعہ بنایا جاتا ہے اور چندوں میں حدود شرعیہ کا لحاظ نہیں کیا جاتا کہیں اس کی حقیقت اور اس فعل کے درجہ کو واضح نہیں کیا جاتا جس سے عوام کو غلطی اور خود فارغ شدہ جماعت کو بھی دھوکہ ہوتا ہے لوگ ان لوگوں کو ابھی سے مقتدا اور معتمد سمجھنے لگتے ہیں اور خود فارغ شدہ جماعت بھی اپنے متعلق یہ اعتقاد کر لیتی ہے کہ بس ہم آج سے مقتدا ہو گئے باقی اصل مقصود اس تقریب سے تعلیم کا اہتمام

اور غیر فارغ شدہ جماعت کو تکمیل کی رغبت دلاتا ہے اور حقیقت اس کی وہ ہے جس کو میں عنقریب بیان کروں گا۔ رہا یہ کہ ہماری غرض اس وقت اس تقریب سے کیا تھی سو یہ بات گو مجھے اپنے آپ نہ بیان کرنی چاہیے تھی مگر خدا تعالیٰ کی نعمت سمجھ کر بیان کرتا ہوں کہ بحمد اللہ یہاں اس تقریب سے نہ مدرسہ کی شہرت مقصود ہے اور اس مختصر جلسہ سے جس کے لئے کوئی تداعی و اہتمام مطلق نہیں کیا گیا اس کا وہم ہی کیا ہو سکتا ہے نہ مدرسہ کی کارگذاری کا اظہار مقصود ہے اور یہ کارگذاری ہی کیا ہو سکتی ہے کہ ساری عمر میں مدرسہ سے ایک طالبعلم کی تکمیل ہوئی نہ اس سے کچھ چندہ کی کوشش مقصود ہے کیونکہ یہ دفتر ہی یہاں بند ہے نہ یہاں اس کی سعی ہے نہ مدرسہ سے چندہ کی فہرست اور حساب کی روداد شائع ہوتی ہے محض توکل پر کام چل رہا ہے نہ اس تقریب سے عوام پر یہ ظاہر کرنا ہے کہ وہ ان فارغ شدہ طالبعلم کو آج ہی سے مقتدا اور عالم فاضل سمجھنے لگیں بلکہ محض یہ بتلانا ہے کہ ان صاحب نے ہمارے مدرسہ میں درسیات کی تکمیل کر لی ہے اور ہمارے نزدیک ان میں استعداد اور مناسبت علوم سے پیدا ہو گئی ہے جس کی شہادت مدرسین مدرسہ نے سند دیکر ظاہر کی ہے باقی محض استعداد و مناسبت سے مقتدائیت اور فضل و کمال پیدا نہیں ہو جاتا بلکہ اس کے لئے شغل درس تدریس اور کتب دینیہ کا مطالعہ کرتے رہنا ضروری ہے (اور یہی مطلب ہے مدرسین کا سند دینے سے کہ ہمارے نزدیک ان میں استعداد مقتدائیت موجود ہے اگر یہ اس استعداد سے کام لیتے رہیں گے تو ان شاء اللہ ایک دن مقتدا اور معتمد عالم ہو جائیں گے ۱۲) اور دوسری غرض اس تقریب سے وہ ہے جو آیت متلوہ پر اس مضمون کے انطباق سے ظاہر ہو گی اس آیت کے اخیر میں حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔ ذَالِكُمْ وَصّٰكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ (اللہ تعالیٰ نے تمکو ان کا حکم دیا ہے تاکہ تم متقی ہو جاؤ) میں اس مضمون کو ذٰلِكُمْ وَصّٰكُمْ بِهٖ میں داخل کرنا چاہتا ہوں کیونکہ جس طرح اس جملہ میں حق تعالیٰ نے صراط مستقیم کے اتباع کی وصیت فرمائی ہے اسی طرح دستار بندی اور اعطار سند بھی وصیت عملی ہے جس سے مقصود فارغ شدہ طالب علم کو اتباع صراط مستقیم کی وصیت مقصود ہے اور ان کو بتلانا ہے کہ تم ہمارے نزدیک عامل شریعت ہوا ور مقتدا بننے کی تم میں استعداد پیدا ہو گئی ہے اب ہم تمہاری اس قابلیت کو عملاً ظاہر کرتے ہیں کیونکہ عادۃً حیادار طبائع کو اس عملی صورت کی لاج بہت ہوا کرتی ہے،

جس سے وہ اپنے اوپر ایک بار گراں محسوس کرتے ہیں نیز عوام کو بھی اس صورت سے یہ وصیت مقصود ہے کہ یہ فارغ شدہ طالبعلم اب عالم ہوگئے ہیں اب ان کا ادب کرنا چاہیئے اور ان سے مستفیض ہونا چاہیئے (بشرطیکہ یہ اسی شغل میں لگے رہیں) پس جس طرح کہ آیت میں اصل مقصود تاکیدی حکم ہے اتباع صراط مستقیم کا جس کو مجازاً وصیت سے تعبیر کیا گیا اسی طرح یہاں اس عملی صورت (دستار بندی وغیرہ) سے اصل مقصود تاکیدی حکم ہے ان صاحب کو جن کی دستار بندی کی گئی ہے جس کو مجازاً میں وصیت سے تعبیر کرتا ہوں۔ اب اس مضمون کا تعلق آیت کے اس جزو سے واضح ہوگیا ہوگا۔

نیز انطباق کی ایک تقریر یہ ہو سکتی ہے کہ جن اعمال کی یہاں وصیت ہے ان پر عمل کرنا موقوف ہے علم پر تو عمل کی تاکید مستلزم ہے تحصیل علم کی تاکید کو تو تحصیل علم کو موجب اسعاد سمجھ کر اختیار کرے اور جہل کو موجب ابعاد سمجھ کر اختیار کرے اور جہل کو موجب ابعاد سمجھ کر ترک کرے۔ اور تیسرے مضمون کے اعتبار سے میں اس بیان کے نام میں ایک اضافہ کر کے الاسعاد والابعاد مع مجلس قباد رکھتا ہوں گو نام لمبا ہوگیا مگر مولوی قباد کے دوست اتنی مشقت برداشت کرلیا کریں گے۔ لمبے نام پر ایک حکایت یاد آئی کہ ایک شخص کی کنیت ابو عبداللہ تھی کسی نے اس سے پوچھا کہ تیری کنیت کیا ہے تو صرف ابو عبداللہ کہتے ہوئے اسے شرم آئی کہ یہ تو ذرا سا نام ہے تو وہ جواب میں کہتا ہے اَبُوْ عَبْدِ اللّٰہِ السَّمِیْعِ الْعَلِیْمِ الَّذِیْ یُمْسِكُ السَّمَاءَ اَنْ تَقَعَ عَلَی الْاَرْضِ اِلَّا بِاِذْنِہٖ اس پر ظریف نے کہا مَرْحَبًا بِكَ یَا اَبَا نِصْفِ الْقُرْاٰن واقعی خوب ہی ظرافت کا جواب دیا۔ تو ایسے ہی اس وعظ کا نام بھی لمبا ہوگیا اتنا فرق ہے کہ وہاں طول بے ضرورت تھا اور یہاں بضرورت ہے۔ اب یہاں آیت کے متعلق ایک نکتہ ہے اس کو بیان کر کے میں ختم کئے دیتا ہوں نکتہ یہ ہے کہ اس جگہ قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَیْكُمْ (آپ کہدیجئے آؤ میں تم کو وہ چیزیں پڑھ کر سناؤں جن کو تمہارے رب نے تم پر حرام کیا ہے) سے وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا (یہ دین میرا راستہ ہے جو مستقیم ہے) تک تین آیتیں ہیں اور ہر آیت کے ختم پر حق تعالیٰ نے ذٰلِكُمْ

وَصّٰکُمْ بِہٖ (اللہ نے تمکوان چیزوں کا حکم دیاہے تاکہ تم سمجھو) فرمایا ہے لیکن پہلی آیت کے اخیر میں تو ذٰلِکُمْ وَصّٰکُمْ بِہٖ لَعَلَّکُمْ تَعْقِلُوْنَ (اللہ نے تم کو ان چیزوں کا حکم دیا ہے تاکہ تم سمجھو) فرمایا اور دوسری آیت کے ختم پر ذٰلِکُمْ وَصّٰکُمْ بِہٖ لَعَلَّکُمْ تَذَکَّرُوْنَ (اللہ نے تم کو ان چیزوں کا حکم دیا ہے تاکہ تم نصیحت پکڑو) فرمایا اور اس تیسری آیت کے اخیر میں ذٰلِکُمْ وَصّٰکُمْ بِہٖ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ فرمایا ہے اب سوال یہ ہوتا ہے کہ جب وصیت سب کی مقصود ہے تو اس تفرق عنوان کی کیا ضرورت ہے، گو اس کا جواب یہ ہو سکتا ہے کہ مقصود تفنن کلام ہے جو ایک شعبہ ہے بلاغت کا اور کسی نکتہ کے بیان کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی مگر بعض لوگ چُلبلے ہوتے ہیں وہ اتنی بات پر کفایت نہیں کرتے بلکہ ان کا ذہن اس سے آگے چلتا ہے تو انھوں نے اس تفرق عنوان میں یہ نکتہ بتلایا ہے کہ پہلی آیت میں جن پانچ امور کا ذکر ہے ان میں بجز اسارۃ بالوالدین کے اہل عرب اعتقادی غلطی کرتے تھے کہ امور قبیحہ کو مستحسن سمجھتے تھے صرف اسارۃ بالوالدین (یعنی ماں باپ کے ساتھ بُرا سلوک کرتے) کو اعتقاداً اچھا نہ سمجھتے تھے اس کے سوا سب میں ان کی اعتقادی غلطی تھی اس لئے باعتبار اکثر کے وہاں تعقلون فرمایا کیونکہ اعتقادیات کا تعلق زیادہ تر عقل سے ہے اور دوسری آیت میں مخاطبین کی کوئی اعتقادی غلطی نہ تھی بلکہ وہ احکام عمل کے متعلق ہیں جن میں وہ تغافل وسہو کرتے تھے اس لئے وہاں تذکرون مناسب ہوا۔ اور تیسری آیت میں کسی خاص حکم کا بیان نہیں بلکہ عام حکم ہے اتباع صراط مستقیم کا تو وہاں تتقون مناسب ہوا کیونکہ تقویٰ بھی شرعاً عام ہے جس کا تعلق عقائد واعمال وغیرہ سب سے یکساں ہے تو بعض عقلاء نے یہ نکتہ بیان کیا ہے اگر کسی کو پسند ہو تو اس کو اختیار کرے ورنہ اس کی کوئی ضرورت بھی نہیں اور بظاہر یہ نکتہ بعید بھی نہیں معلوم ہوتا۔ یہ تو لطائف تھے مگر اصل مقصود میرا وہی مراقبہ ہے کہ ہر کام اور ہر حرکت و سکون میں یہ سوچا جائے کہ یہ فعل آخرت کے لئے معین ہے یا مضر اگر معین ہو تو اس کو کیا جائے اگر مضر ہو نہ کیا جائے اس طرح ان شاء اللہ بہت جلد معاصی سے اجتناب کی ہمت پیدا ہو جائیگی اور جو اس سہل ترکیب سے بھی کام نہ لے تو وہ اپنے ہاتھوں محروم ہونا چاہتا ہے اس کا کسی کے پاس کوئی علاج نہیں اب دعا کیجئے کہ حق تعالیٰ ہم کو فہم سلیم عطا فرمادیں اور عمل کی توفیق دیں اور ان فارغ شدہ طالب علم کے لئے بھی دعا کریں کہ حق تعالیٰ ان کو صراط مستقیم پر چلائے اور ان کے علم و عمل میں برکت عطا فرمائیں۔ آمین۔

وصلی اللہ علی سیدنا ومولانا محمد وعلی آلہ واصحابہ اجمعین ٥ تمت

قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ تعالیٰ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ اٰیَۃً
(رواہ البخاری)

التبلیغ کا وعظ

مسمّٰی بہ

درجات الاسلام

حکیم الامّۃ مجدّد الملّۃ حضرت مولانا محمّد اشرف علی صاحب تھانوی
رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

محمّد عبد المنّان غفرلہٗ

مکتبۂ تھانوی ــــــ دفتر الابقاء
مسافر خانہ بندر روڈ / ایم۔ اے۔ جناح روڈ کراچی ۱

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الوعظ مسمّٰی بہ

درجات الاسلام

این	کہاں ہوا	جامع مسجد۔ صدر بازار۔ میرٹھ
متی	کب ہوا	۱۵ ربیع الاول ۱۳۴۲ھ یوم الاحد شروع وقت صبح ۸ بجے
کم	کتنی دیر ہوا	۲½ گھنٹہ (ختم ساڑھے دس بجے ہوا)
کیف	کیونکر ہوا	کھڑے ہو کر
لِمَ	کیوں ہوا	جناب شیخ رشید احمد صاحب سوداگر صدر میرٹھ کی درخواست پر تشریف لے گئے اور ان کی طلب پر بیان ہوا۔
ماذا	کیا مضمون تھا	اس پر شکایت تھی کہ ہمارا اسلام نام کا اسلام ہے نیز اسلام کے تین درجے بیان فرمائے۔
من الذی انتفع	کس طبقہ کو زیادہ مفید تھا۔	عموماً سب مسلمانوں کو اور خصوصاً ان لوگوں کو جو تقریر و تحریر میں اسلام کا نوحہ کیا کرتے ہیں۔
من ضبط	کس نے ضبط کیا	احقر ظفر احمد تھانوی عفا اللہ عنہ و غفر لوالدیہ و اخوانہ و مشائخہ و احبابہ و اقربائہ اجمعین۔
المستمعون	سامعین کی تعداد	تقریباً ۳۵۰
الاشتات	متفرقات	چونکہ حضرت مولانا پر دھوپ آگئی تھی جس سے طبیعت پریشان ہو گئی اس لئے بیان جلد ختم فرما دیا ورنہ مضمون بہت کچھ باقی تھا۔
کیفیت	کیفیت	ختم وعظ پر ایک انگریزی اسکول کے مسلمان طلبہ سو سے زیادہ حاضر ہوئے اور درخواست کی کہ بیان کو وسعت دی جائے ہم ابھی حاضر ہوئے ہیں مولانا نے فرمایا کہ اب تو میں ختم کر چکا اگر کسی قدر پہلے کہا جاتا تو اس درخواست کی تعمیل کر دیتا لیکن اب طبیعت پر گرانی ہو گی۔ اسکول کے طلبہ اپنے ماسٹر کو کوستے ہوئے چلے گئے کہ اس نے ہم کو بہت دیر میں چھٹی دی حالانکہ ہم دیر سے اجازت مانگ رہے تھے ۱۲ جامع

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ ونشھد ان سیدنا ومولانا محمداً عبدہ ورسولہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلی آلہ واصحابہ وبارک وسلم اما بعد فَقَدْ قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یُوْشِکُ اَنْ یَّاْتِیَ عَلَی النَّاسِ زَمَانٌ لَا یَبْقٰی مِنَ الْاِسْلَامِ اِلَّا اِسْمُہٗ وَلَا یَبْقٰی مِنَ الْقُرْاٰنِ اِلَّا رَسْمُہٗ مَسَاجِدُھُمْ عَامِرَۃٌ وَّھِیَ خَرَابٌ عُلَمَاءُ ھُمْ شَرٌّ مَّنْ تَحْتَ اَدِیْمِ السَّمَآءِ تَبْدَاُ مِنْھُمُ الْفِتْنَۃُ وَفِیْھِمْ تَعُوْدُ۔ (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قریب ہے کہ لوگوں پر ایک زمانہ ایسا آوے گا کہ لوگوں

میں اسلام کا نام ہی رہ جائے گا اور قرآن سے کچھ نہ رہے گا مگر رسم یعنی نقش ان کی مسجدیں بظاہر آباد ہوں گی لیکن حقیقت میں خراب ہوں گی ان کے علماء آسمان سے نیچے کی مخلوق میں سب سے بدتر ہوں گے ان ہی سے دین میں فتنہ برپا ہوگا اور ان ہی میں لوٹ آئے گا۔)

الحدیث میں جس عبارت کی میں نے اس وقت تلاوت کی ہے یہ ایک حدیث ہے یعنی ارشاد جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا (فَدَاہُ اٰبَاؤُنَا وَ اُمَّھَاتُنَا) آپ پر ہمارے باپ مائیں قربان ہوں) اس میں حضرت سیدنا محمد مصطفےٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم (نَفْسِیْ وَرُوْحِیْ فِدَاہُ (میری جان اور روح آپ پر فدا ہو) نے اسلام کے درجات کے تفاوت کی طرف اشارہ فرمایا ہے بلکہ اشارہ کیا ہے قریب صراحت کے ہے چنانچہ عنقریب واضح ہوجائے گا۔ اسی سے سامعین کو اس مضمون کی ضرورت معلوم ہوگئی ہوگی کیونکہ اسلام سے بڑھ کر مسلمانوں کا کوئی مقصود نہیں ہمارا مقصود صرف اسلام ہے اور ہمارے تمام مقاصد باوجود متفرق و منتشر ہونے کے سب اسی ایک لفظ میں مدمج ہیں یعنی لفظ اسلام میں۔ ہمارا کوئی مقصود بھی اس سے خارج نہیں اس میں ہمارے افعال بھی آگئے اور اقوال بھی اور احوال بھی تمام شعبے اسی امر واحد کی طرف راجع ہیں مسلمانوں کی کوئی حالت کوئی قول و فعل اس سے خارج نہیں مقاصد حقیقیہ باسرہا (تمام کی تمام) اسی ایک چیز میں منحصر ہیں یعنی اسلام ۔مقاصد میں حقیقیہ کی قید میں نے اس لئے لگائی کہ مقاصد کی دو قسمیں ہیں بعض مقاصد حقیقیہ ہیں اور بعض غیر حقیقیہ تمام مقاصد کا ایک درجہ نہیں ہوتا بلکہ بعض دفعہ ایک مقصود دوسرے مقصود سے راجح اور مقدم ہوتا ہے پس دنیوی امور جو مسلمانوں کے مقاصد میں داخل ہیں وہ مقاصد غیر حقیقیہ ہیں اگر دنیوی امور کا اسلام کی طرف راجع ہونا کسی کے نزدیک مخفی ہو تو ممکن ہے لیکن اس میں تو کچھ شک نہیں کہ مقاصد حقیقیہ سب اسی کی طرف راجع ہیں اور دنیوی امور مقاصد غیر حقیقیہ ہیں اگر وہ راجح نہ ہوں نہ سہی اس لئے میں نے حقیقیہ کی قید لگا دی۔ لیکن غور کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے دنیوی مقاصد بھی اسلام ہی کی طرف راجع ہیں وہ بھی اس سے جدا نہیں ہوسکتے مثلاً ایک شخص نماز پڑھ رہا ہے اور اس وقت ایک اندھا آدمی کنوئیں پر آرہا ہے کہ اگر اس کو بچایا نہ جائے تو کنوئیں میں گر جانے کا اندیشہ ہے اس وقت واجب بلکہ فرض ہے کہ نماز کو توڑ دے گو وہ نماز فرض ہی ہو اور اس اندھے کو بچائے یہاں ظاہر میں کو شبہ ہوسکتا ہے کہ اس میں دنیا کو دین پر مقدم کرنا لازم آتا ہے کیونکہ نماز دین کا کام ہے اور جان کا بچانا دنیوی کام ہے۔ مگر واقع میں یہاں دنیا کی تقدیم دین پر نہیں ہے گو ظاہر میں

شبہ ہوتا ہے بلکہ ایک امر دین کی تقدیم ہے دوسرے امر دین پر کیونکہ حفاظت جان مسلم یہ بھی دین ہے گو ظاہر میں اس کے لئے تو دنیا ہے مگر ہمارے لئے تو یہ دین ہی کا کام ہے اگر حفاظت جان مسلم ہمارے لئے دنیا کا کام ہوتا تو یہ حفاظت اسی جگہ واجب ہوتی جہاں ہماری دنیا کا نفع ہو حالانکہ ایسا نہیں ہے کیونکہ اس حکم میں نہ قرابت کی قید ہے نہ دوستی کی۔ بلکہ ہر مسلمان کی جان بچانا فرض ہے خواہ وہ عزیز نہ ہو یا اجنبی دوست ہو یا نہ ہو حتیٰ کہ دشمن کی جان کا بچانا واجب ہے اور ظاہر ہے کہ دشمن کی حفاظت تو دنیا ہو ہی نہیں سکتی بلکہ یہ تو دنیا کے لئے مضر ہے کیونکہ اگر دشمن ہلاکت سے بچ گیا تو ساری عمر کے لئے ایک مشغلہ رہے گا مگر شریعت کا حکم ہے کہ اگر تمہارا کوئی دشمن بھی کنویں میں گرتا ہو یا کوئی شخص اس کو ناحق قتل کرتا ہو تو اس کا بچانا حسب وسعت واجب ہے اس جگہ اس کی جان کی حفاظت مسلم ہونے کے لحاظ سے واجب ہے اور یہ دین ہے اور تعمق کے بعد یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہر شخص کے لئے اپنی جان کی حفاظت دین میں داخل ہے گو ظاہر میں یہ دنیا کا کام معلوم ہوتا ہے کیونکہ جان ہماری نہیں ہے یہ خدا کی امانت ہے اس کو حکم الٰہی کے موافق خرچ کرنا چاہیئے اگر کسی جگہ اپنی جان کو خطرہ میں ڈالنا شرعاً جائز نہ ہو تو وہاں جان کی حفاظت شرعاً واجب ہے اور یہ دین کا کام ہے مگر چونکہ ان امور کا دین ہونا اکثر لوگوں پر مخفی ہے اس لئے میں نے تقریب الی الفہم (سمجھ کے قریب کرنے) کی غرض سے مقاصد میں حقیقیہ کی قید لگادی تھی ورنہ در حقیقت ہمارے سب مقاصد خواہ حقیقی ہوں یا غیر حقیقی سب کے سب اسلام کی طرف راجع ہیں سب کام کا مرجع اسلام ہی ہے۔ پس ہمارا سب کا ایک ہی مقصود ہے یعنی اسلام اور وہ مشتمل ہے تمام مقاصد حقیقیہ وغیر حقیقیہ کو اس میں نماز روزہ حج زکوٰۃ بھی آگئے اور کھانے پینے کے احکام متعلق آمدنی بھی آگئے اسی طرح تمام معاملات و معاشرات و سیاسیات بھی اس میں داخل ہیں گو لوگوں نے ان کو اسلام سے خارج سمجھ رکھا ہے۔ آج کل صرف چند عبادات کو اسلام میں داخل سمجھا جاتا ہے نماز روزہ ہی میں لوگوں نے دین کو منحصر کر لیا ہے بس اگر نماز پڑھ لیں تو دیندار ہیں اور اگر تہجد بھی پڑھنے لگیں تو جنید ہیں اور اگر زکوٰۃ بھی دینے لگیں پھر تو ان کی دینداری میں کچھ کسر ہی نہیں اور اگر حج بھی کر لیا تو گویا رجسٹری ہو گئی۔ گو معاملات کیسے ہی خراب اور گندے ہوں اگر معاملات و معاشرات کو بھی دین میں داخل سمجھا جاتا تو فقط نماز روزہ کر لینے سے ہم اپنے کو دیندار نہ سمجھتے کیونکہ ابھی بعض اجزاء دین کے ہم سے فوت ہو رہے ہیں مگر ہماری حالت یہ ہے کہ تہجد پڑھ لینے کے بعد اپنے کو دیندار سمجھنے لگتے ہیں۔ نیز کسی قدر وضع کی درستی کو بھی دین میں داخل سمجھتے ہیں کہ

ثقہ وضع ہو جبّہ اور پائجامہ ٹخنوں سے نیچے نہ ہو لباس ریشمی نہ ہو ڈاڑھی منڈی ہوئی یا کتری ہوئی نہ ہو تشبیہ بالکفار نہ ہو اگر ایسی وضع ہو گئی تو بس ان کی دینداری میں کچھ کسر نہیں رہی بڑے پکّے دیندار ہو گئے پھر دوسروں کو اگر ہماری وضع دیکھ کر دینداری کا گمان ہو تو کچھ تعجب نہیں مگر غضب تو یہ ہے کہ ہم خود بھی اپنے کو ایسا ہی سمجھنے لگتے ہیں حالانکہ ہم کو معلوم ہے کہ معاملات وغیرہ میں ہماری کیا حالت ہے بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰی نَفْسِهٖ بَصِیْرَةٌ وَّلَوْ اَلْقٰی مَعَاذِیْرَهٗ (بلکہ انسان خود اپنی حالت پر مطلع ہے گو اپنے حیلے پیش لائے) انسان اپنی اصلی حالت کو خوب جانتا ہے گو وہ کیسے ہی بہانے بنائے وہ بہانے کیا ہیں، وہ بہانے یہ ہیں کہ بعض دفعہ انسان کو اپنی حقیقت معلوم ہوتی ہے۔ خوب جانتا ہے کہ میں بہت سے کام شریعت کے خلاف کرتا ہوں مگر اس کی وضع اور نماز روزہ کی وجہ سے لوگ اس کے معتقد ہیں تو اس سے وہ خود بھی دھوکہ میں آجاتا اور اپنے نفس کا معتقد ہو جاتا ہے کیونکہ وہ دیکھتا ہے کہ اتنے آدمی مجھے دیندار سمجھتے ہیں گویا میری دینداری پر اجماع ہو چکا ہے اور اتنے آدمیوں کا اجماع غلط نہیں ہو سکتا۔ مگر میں کہتا ہوں کہ اجماع کہاں ہوا ہے ابھی ایک مسلمان کا اختلاف باقی ہے اور وہ اختلاف ایسے شخص کا ہے جس کا اختلاف اس اجماع میں قادح ہے وہ مسلمان کون ہے وہ خود تم ہو۔ کیونکہ تمہارا دل تو جانتا ہے کہ تم دیندار نہیں ہو پھر یہ اجماع کیونکر حجت ہو سکتا ہے تم جانتے ہو کہ میں نے بلوغ کے بعد بہت سی نمازیں قضا کی ہیں جن کو ابھی تک ادا نہیں کیا نہ ادا کی فکر ہے۔ دوسروں کو اس حالت کا علم نہیں اس لئے وہ تم کو دیندار خیال کرتے ہیں مگر تم کو تو اپنی حالت معلوم ہے کہ میں ایک گناہ میں مبتلا ہوں نیز تم حج میں بلا وجہ تاخیر کر رہے ہو تمہارے ذمہ کسی کا قرض آتا ہے جس کو ٹال رہے ہو پھر تم اپنے کو دیندار کیونکر سمجھتے ہو۔ یہ ہے وہ بہانہ جو منجملہ دوسرے بہانوں کے اکثر لوگوں کو گمراہ کئے ہوئے ہے کہ وہ محض دوسروں کے اعتقاد کی بنا پر اپنے معتقد ہو رہے ہیں حالانکہ ہر ایک کو اپنی حقیقت معلوم ہے اور وہ جانتا ہے کہ مجھ میں بہت سی باتیں دینداری کے خلاف موجود ہیں۔ تو یہ دینداری کیا ہوئی نوتہ ہوا کہ تم اس کو دیندار سمجھتے ہو وہ تم کو دیندار سمجھتا ہے تم اس کو نوتہ دے رہے ہو وہ تم کو نوتہ دے رہا ہے یہ تو وہی حکایت ہوئی کہ گھر سے آیا ہے معتبر نائی ایک شخص کی حکایت ہے کہ وہ پردیس میں تھا اور بال بچے گھر پر تھے ایک دن اس کی بیوی نے غسل کیا تھا اس لئے نتھ اتار کر رکھ دی تھی اس حالت میں گھر کی

نائن آئی اس نے جو دیکھا کہ بیوی جی کے ناک میں نتھ نہیں تو وہ یہ سمجھی کہ شاید یہ رانڈ ہوگئی ہے اس لئے نتھ اتار دی ہے وہ اُلٹے پاؤں اپنے گھر گئی اور نائی سے جاکر کہا کہ تو بے فکر کیا بیٹھا ہے جلدی سے جاکر اپنے ججمان کو اطلاع کر دے کہ آپ کی بیوی رانڈ ہوگئی کیونکہ آج میں نے اس کو نتھ اتارے ہوئے بیٹھا دیکھا ہے اور اس حالت میں بیوہ ہی رہا کرتی ہے۔ وہ نائی بھی بیوی کی طرح بیوقوف تھا دوڑا اپنے آقا کے پاس پہونچا بہت دور جگہ تھی کئی دن میں راستہ طے ہوا۔ میاں نے پوچھا کہاں سے آرہا ہے، نائی نے کہا حضور کے گھر سے آرہا ہوں پوچھا ہمارے گھر خیریت تھی کہا حضور اور تو سب خیریت ہے مگر آپ کی بیوی بیوہ ہوگئی آقا صاحب دونوں سے بڑھ کر احمق تھے یہ سن کر لگے رونے اور اسی وقت غمی کا سامان ہونے لگا۔ دوست احباب کو جو اطلاع ہوئی تو یہ سمجھے کہ شاید گھر سے کوئی خبر ایسی ویسی آئی ہوگی تعزیت کے لئے مجتمع ہوگئے جب مجمع اکٹھا ہوگیا تو کسی نے دریافت کیا کہ گھر سے کوئی اطلاع آئی ہے۔ کہنے لگے کہ ہائے میری بیوی رانڈ ہوگئی، اب تو لوگ بڑے حیران ہوئے کہ یہ خبر کیسی جب بیوی کا شوہر یہ صحیح سلامت ہے تو پھر وہ بیوہ کیونکر ہوئی دوستوں نے کہا میاں تم بڑے بے وقوف ہو جب تم صحیح سلامت بیٹھے ہو تو تمہاری بیوی رانڈ کہاں ہوئی، آپ فرماتے ہیں کہ یہ تو میں بھی جانتا ہوں لیکن گھر سے جو نائی خبر لایا ہے نہایت معتبر ہے اس لئے یہ خبر غلط نہیں ہوسکتی گو میں جانتا ہوں کہ میرے ہوتے ہوئے وہ بیوہ نہیں ہوسکتی اس حکایت پر تو سب ہنستے ہیں مگر صاحبو! اس حماقت میں ہم سب مبتلا ہیں کہ باوجودیکہ اپنی دینداری کی حالت ہم کو معلوم ہے لیکن محض دوسروں کے اعتقاد کی وجہ سے ہم اپنے معتقد ہورہے ہیں۔ اس شخص نے جو باوجود اپنے زندہ ہونے کے اپنی بیوی کو بیوہ مان لیا اس میں کیا تاویل ہوسکتی ہے سوا اس کے کہ بیوہ کے معنے بدل دیئے جائیں کہ ایک قسم بیوہ کی وہ ہے جس کا شوہر مرجائے اور ایک قسم وہ ہے جو نتھ یا بالی اتار دے مگر یہ خاص نوایجاد اصطلاح ہوگی، وَلَامُشَاحَةَ فِي الْاِصْطِلَاحِ (اصطلاح مقرر کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں) سو ہم آپ کی اصطلاح میں مزاحمت نہیں کرتے ممکن ہے کہ آپ کے نزدیک دینداری کی بھی دو قسمیں ہوں ایک حقیقی دیندار دوسرے وہ جس کو لوگ دیندار سمجھیں اس نئی اصطلاح کے موافق آپ

دیندار کیا شیخ بھی بن سکتے ہیں مگر اس حالت میں آپ ویسے ہی شیخ ہوں گے جیسے سب کا گروشیخ نجدی ہے یعنی شیطان۔ غرض ہماری حالت یہ ہے کہ ہم دین کی حقیقت کو نہیں سمجھتے اس لئے محض نماز روزہ کرکے اپنے کو دیندار سمجھنے لگتے ہیں حالانکہ معاملات و معاشرات وغیرہ بھی سب دین ہیں حتیٰ کہ پیشاب و پاخانہ کرنا اور ان سے فراغت کرنا بھی دین ہے گو ظاہر میں راحتِ نفس ہے مگر اُن کاموں میں اگر نیت درست رکھی جائے تو سب دین کے کام ہیں مثلاً پیشاب و پاخانہ اس نیت سے کرو کہ اس سے فارغ ہو کر طبیعت ہلکی ہو گی اور تندرستی قائم رہے گی تو نماز وغیرہ میں دل لگے گا اس نیت سے یہ کام بھی باعث ثواب ہوں گے حدیث میں ہے لَا یُصَلِّیْ اَحَدُکُمْ وَھُوَ یُدَافِعُہُ الْاَخْبَثَانِ۔ یعنی ایسی حالت میں نماز نہ پڑھو کہ تم کو بول و براز کا تقاضا ہو۔ اب دیکھئے اس وقت نماز پڑھنا حرام اور پیشاب و پاخانہ سے فراغت کرنا واجب ہے اور یہ شخص دنیا کے کام میں نہیں بلکہ دین کے کام میں ہے کیونکہ اس حالت میں یہ حکم شرعی کا امتثال کر رہا ہے۔ پس دین کی حقیقت امتثال امر ہے جس وقت جس کام کا شریعت امر کرے اس وقت وہی دین ہے فقط نماز روزہ ہی دین نہیں بلکہ نماز وغیرہ بھی اسی وقت تک دین کے کام ہیں جبکہ امر کے موافق ہوں اگر امتثال امر نہ ہو تو یہ بھی دین میں داخل نہیں۔ مثلاً نماز خلاف امر ہو جیسے طلوع یا غروب کے وقت پڑھی جائے تو بجائے ثواب کے گناہ ہوگا۔ روزہ کیسی اچھی عبادت ہے مگر خلاف امر ہو تو وہ بھی دین کا کام نہیں۔ مثلاً کوئی شخص عید کے دن روزہ رکھے اور تمام دن غیبت بھی نہ کرے ذکر شغل ہی میں مشغول رہے اور تمام آداب صیام کی رعایت کرے مگر شام کو یہ شخص مردود ہے کیونکہ اس دن روزہ رکھنا خلاف امر ہے۔ ایسے ہی کوئی شخص حج کرے مگر ذی الحجہ کی نویں تاریخ کے بجائے دسویں کو وقوف عرفہ کرے تو اس کا حج مردود ہے کیونکہ اس نے خلاف امر کیا۔ پس معلوم ہوا کہ دین کی حقیقت امتثال امر ہے۔ چنانچہ حضرت حاجی صاحب نے آیت وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنَ میں یہی نکتہ بیان فرمایا تھا۔ کیونکہ ظاہر میں اس آیت پر ایک اشکال وارد ہوتا ہے وہ یہ کہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں نے جن و انس کو عبادت ہی کے لئے پیدا کیا ہے حالانکہ دوسری آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں کے علاوہ

بھی تمام مخلوق عبادت میں مشغول ہے چنانچہ ارشاد ہے۔ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَسْجُدُ لَهٗ مَنْ فِى السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِى الْاَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُوْمُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَابُّ وَكَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ (کیا تم کو یہ بات معلوم نہیں کہ اللہ کے سامنے سب عاجزی کرتے ہیں جو کہ آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں اور سورج اور چاند اور ستارے اور پہاڑ اور درخت اور چوپائے اور بہت سے آدمی بھی) اس سے معلوم ہوا کہ پہاڑ اور درخت اور تمام جانور عبادت کرتے ہیں اور ان میں کوئی قید بھی نہیں لگائی اور انسان کے لئے كَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ (بہت سے آدمی) کی قید بھی ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ انسان تو سب کے سب عبادت نہیں کرتے اور درخت جانور وغیرہ کو بلا قید بیان فرمایا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ وہ سب کے سب عبادت میں مشغول ہیں تو وصف عبادت میں بظاہر دوسری مخلوق انسان وجن سے بڑھی ہوئی ہیں پھر بھی پہلی آیت میں عبادت کو انسان وجن کے لئے تخصیص کے ساتھ بیان فرمایا ہے کہ ان کو محض عبادت ہی کے لئے پیدا کیا گیا ہے اس اشکال کا جواب حضرت حاجی صاحب کی ایک تحقیق سے معلوم ہوا۔ حاجی صاحب نے بطور نکتہ کے فرمایا تھا کہ عبادت کا مادہ عبد ہے جس کے معنی ہیں غلام اور اس لفظ میں غایت ذلت کا اظہار ہے چنانچہ لغۃً عبادت کے یہی معنی ہیں اسی لئے عبادت کا درجہ حق تعالیٰ کے لئے خاص ہے غیر اللہ کی عبادت جائز نہیں حق تعالیٰ کو عبادت بہت پسند ہے حتیٰ کہ تسمیہ میں بھی اس کی رعایت کو حدیث میں مستحب کیا گیا ہے حدیث میں ہے اَحَبُّ الْاَسْمَآءِ اِلَى اللّٰهِ عَبْدُ اللّٰهِ وَعَبْدُ الرَّحْمٰنِ. حق تعالیٰ کو سب ناموں سے زیادہ محبوب عبداللہ وعبدالرحمٰن ہے جن کے لفظوں ہی سے بندگی اور غلامی کا اظہار ہے۔ عورتوں کو اگر شبہ ہو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کے وہ نام نہ بتلائے جو حق تعالیٰ کو پسند ہوں تاکہ ہم بھی وہی نام رکھا کریں تو یاد رکھو کہ اس حدیث میں عورتوں کے لئے بھی نام موجود ہیں۔ عبد کا مؤنث امۃ ہے تو عورتوں کو امۃ اللہ وامۃ الرحمٰن نام رکھنا چاہیئے۔ اس کے معنی ہیں خدا کی بندی جیسے عبداللہ کے معنے ہیں خدا کا بندہ۔ اور ہر چند کہ حق تعالیٰ کے نام بہت ہیں مگر حدیث میں عبد کی اضافت اللہ اور رحمٰن کی طرف خصوصیت سے اس لئے کی گئی ہے کہ ان دو ناموں میں ایک خاص ترجیح ہے وہ یہ کہ اللہ اسم علم ہے باقی تمام نام اسمار

صفات میں سے رحمٰن کو یہ ترجیح ہے کہ اس میں مبالغہ زیادہ ہے اس لئے لغۃً رحمٰن کا اطلاق غیر خدا پر
نہیں کیا جاتا تو گو حقیقت میں یہ بھی اسم صفت ہے مگر غلبۂ استعمال کی وجہ سے اسم علم کے مشابہ
ہے باقی مسیلمہ کذاب کا اپنے کو رحمٰن سے موسوم کرنا یہ محض اس کی شرارت تھی ورنہ لغۃً اس
لفظ کا خدا تعالیٰ کے ساتھ مختص ہونا اسے بھی معلوم تھا مگر جس طرح فرعون اپنے کو الٰہ کہتا تھا
بہرحال ان دو ناموں کے اندر دوسرے ناموں سے ایک خاص وجہ ترجیح ہے لیکن اگر حق تعالیٰ
کے دوسرے ناموں کی طرف عبد یا امۃ کو مضاف کر کے نام رکھا جائے تو وہ بھی نفس فضیلت
میں انہی دونوں کے مثل ہوں گے (گو کسی قدر تفاوت سہی ۱۲) پس اگر نام رکھنے میں اس کی
رعایت کی جایا کرے تو اچھا ہے کہ خدا تعالیٰ کے ناموں کی طرف عبد یا امۃ کو مضاف کر کے نام
رکھا جائے۔ مگر آجکل لوگ ان ناموں کو بہت کم اختیار کرتے ہیں دوسرے امور کی رعایت
کو مقدم سمجھتے ہیں مثلاً قافیہ وغیرہ کی ایک صاحب کی عادت تھی کہ وہ اپنی اولاد کے نام اس
وزن پر رکھتے تھے۔ بِسْمِ اللّٰہِ۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ۔ قُلْ ھُوَ اللّٰہُ وغیرہ ایک ظریف نے
کہا کہ اب کے بچہ پیدا ہو تو اس کا نام ناقۃ اللہ بیت اللہ رکھ دینا وہ بڑے بگڑے کہ یہ
بھی کوئی نام ہے کہنے لگے صاحب قرآن میں موجود ہیں اس سے بڑھ کر اور کیا دلیل ہوگی
اور عورتوں کی تو عجیب عادت ہے ان کے یہاں قافیہ وغیرہ کے علاوہ ناموں میں ایک
اور بات بھی دیکھی جاتی ہے کہ نام زبان پر چلنے والا ہو رواں ہو۔ وہ ایک نام کو مکرر سکرر چند مرتبہ
کہکر دیکھتی ہیں کہ یہ نام رواں بھی ہے یا نہیں اگر ان کی زبان پر بے تکلف رواں ہوگیا تو اچھا
ہے ورنہ بُرا۔ ہمارے وطن میں ایک بی بی ہیں ان کی لڑکیوں کے نام امۃ المُنّا کے قافیہ پر ہیں
جب اس قافیہ کے بہت سے نام ہو گئے اور پھر ایک لڑکی پیدا ہوئی تو مجھ سے کہا گیا کہ اس کا نام
رکھو میں نے کہا کہ اس قافیہ پر صرف دو نام رہ گئے ہیں اور وہ دونوں عورتوں ہی کی صفت
میں کہے گئے ہیں ایک وصف حضرت علیؓ نے بیان فرمایا ہے اور ایک حضرت فاطمہؓ نے۔ حضرت
علیؓ نے عورتوں کو شیطان کہا ہے۔ حضرت فاطمہؓ نے ریحان فرمایا ہے تو اب اس بچی کا نام ریحان
رکھ دو یا شیطان رکھ دو۔ شیطان تو بھلا کون رکھتا اس کا نام ریحان ہی رکھا گیا اور واقعی لفظی
ومعنوی دونوں حیثیتوں سے یہ نام بہت ہی موزوں ہے۔ مگر باوجود ان تمام خوبیوں کے ایک

ایک بڑی بی اس نام کو چند مرتبہ مکرر کہہ کر کیا فرماتی ہیں کہ یہ کیا نام رکھا ریراں ریراں میں نے کہا سبحان اللہ تم نے اس نام کی اچھی گت بنائی۔ اور یہ جو میں نے کہا تھا کہ یہ نام حضرت فاطمہ کے کلام میں ہے اس کا واقعہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ حضرت علیؓ نے ہنسی کے طور پر عورتوں کی مذمت میں ایک شعر حضرت فاطمہ کے سامنے پڑھا ؎

اِنَّ النِّسَاءَ شَیَاطِیْنُ خُلِقْنَ لَنَا   نَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شَرِّ الشَّیَاطِیْنُ

(عورتیں شیاطین ہیں جو ہمارے لئے پیدا کی گئی ہیں ہم شیاطین کے شر سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں)

تو حضرت فاطمہؓ نے اس کے جواب میں فرمایا ؎

اِنَّ النِّسَاءَ رِیَاحِیْنٌ خُلِقْنَ لَکُمْ   وَکُلُّکُمْ یَشْتَھِیْ شَمَّ الرِّیَاحِیْنُ

(عورتیں پھول ہیں جو تمہارے لئے پیدا کی گئی ہیں۔ ہر ایک تم سے پھول سونگھنے کی خواہش رکھتا ہے)

عورتوں میں ناموں کے متعلق ایک اور بات دیکھی جاتی ہے کہ یہ نام کچا ہے یا پکا۔ جیسے ترکاریاں بعضی کچی بعضی پکی ہوتی ہیں ایسے ہی عورتوں کے یہاں ناموں کی بھی دو قسمیں ہیں۔ نہ معلوم ناموں کا کچا پکا ہونا انہیں کیسے معلوم ہوتا ہے یہ عورتوں کے خاص علوم ہیں جو مردوں کو بھی معلوم نہیں چنانچہ عبد اللہ اور عبد الرحمن کی نسبت کہا کرتی ہیں کہ یہ پکا پکا نام ہے جیسے بڈھوں کا نام ہوتا ہے تو پکا نام ان کے نزدیک وہ ہے جو بوڑھاپے کے مناسب ہو۔ اور کچا نام وہ ہے جو بچپن کے مناسب ہو باقی اس کی پہچان کہ کونسا نام بچپن میں پھبتا ہے اور کونسا بڑھاپے میں یہ عورتوں ہی کو حاصل ہے صاحب مردوں کی فہم اس سے قاصر ہے۔ مگر میں کہتا ہوں کہ اچھا ہم نے مانا کہ عبد اللہ نام پکا ہے تو عورتوں کو پھر بھی یہ نام اپنی اولاد کا ضرور رکھنا چاہیئے کیونکہ اس میں فال نیک ہے کہ بچہ بڑھا ہوگا۔ پس یہ تو اور وجہ اولویت ہوگئی نہ کہ وجہ انکار۔ کیونکہ عورتیں تو ایسے فال شگون کی بہت معتقد ہوتی ہیں تو وہ اس نام کو فال نیک ہی سمجھ کر اختیار کر لیا کریں۔ خیر یہ گفتگو تو بیچ میں ناموں کے متعلق بطور جملہ معترضہ کے آگئی تھی میں یہ کہہ رہا تھا کہ عبادت کا مادہ عبد ہے جس سے معلوم ہوا کہ انسان عبدیت کے لئے پیدا ہوا ہے اور عبدیت خدا کو پسند ہے جس کی دلیل میں نے ابھی بیان کی ہے۔ ایک مقدمہ تو یہ ہوا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ دوسری مخلوقات کی اطاعت کس قسم کی ہے سو انسان کی اطاعت اور دوسری مخلوقات کی اطاعت میں بڑا فرق ہے

اس کو پہلے اپنے خادموں کے اندر دیکھ لو، ہمارے یہاں دو قسم کے خادم ہوتے ہیں ایک تو نوکر ہوتا ہے اور ایک غلام۔ نوکر کی خدمات اکثر متعین ہوا کرتی ہیں گو اس سے مختلف قسم کے کام لئے جائیں مگر پھر بھی باوجود عموم کے اس میں کچھ مستثنیات بھی ہوتے ہیں مثلاً جو نوکر آپ کی ڈیوڑھی کا ملازم ہے آپ اس سے گھر کے کام جتنے چاہیں لیلیں مگر اس سے پاخانہ نہیں اٹھوا سکتے وہ اس کام سے انکار کر دیتا ہے کیونکہ اس کی خدمتیں متعین ہیں جن میں یہ خدمت داخل نہیں اس کو اس سے انکار کا حق ہے اور غلام کی خدمتیں معین نہیں ہوتیں اس سے ہر قسم کا ذلیل و خسیس اور نفیس و شریف (جائز) کام لیا جاسکتا ہے اس کو کسی خدمت سے انکار کا حق نہیں اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ آقا کو کسی مجلس یا محفل میں جانا ہے مگر خود کسی وجہ سے نہیں جاسکتا تو سلاطین و امراء کے قصص سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے ایسے مواقع میں اپنے غلام کو اپنا لباس پہنا کر بھیجدیا۔ اس وقت وہ غلام شاہی منصب کے

ﻋـﮧ یہاں سے ان لوگوں کو سبق لینا چاہیئے جو اسلام کے مسئلہ غلامی پر اعتراض کرتے ہیں بھلا جس غلامی کے یہ آثار ہوں کہ آقا اور غلام میں کامل اتحاد پیدا ہو جاوے اس کو خلاف عدل کون کہہ سکتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ جب دشمن کی فوج کے ہزاروں لاکھوں آدمی معرکہ قتال میں اسیر و قید ہو کر آئیں تو ان کے متعلق بہتر سلوک کی صورت کیا ہے۔ اگر ان کو فوراً رہا کر دیا جائے تو یہ صورت جس قدر ضرر رساں ہے ظاہر ہے کہ جس دشمن کی کثیر تعداد کو مصیبت کے ساتھ گرفتار کیا تھا اس کو پھر اپنے مقابلہ کے لئے رہا کر دیا اور اگر ان کو قید کیا جاوے تو اس میں جو قباحت ہے ظاہر ہے۔ قیدی کو قید رکھ کر خواہ کتنی ہی راحت دی جائے اس کے دل سے عداوت نہیں نکل سکتی۔ دوسرے قیدیوں پر جتنا روپیہ صرف ہوتا ہے اس کا اندازہ ہر سلطنت کر سکتی ہے تو دشمنوں کے اوپر اتنی کثیر رقم صرف کرنا جس سے نتیجہ کچھ بھی حاصل نہیں کیونکہ وہ دشمن کے دشمن ہی رہتے ہیں محض حماقت ہے پھر قید کے اندر اسیروں کو ہر قسم کی علمی اور تمدنی ترقی سے روکنا ظاہر ہے کہ قید میں رہ کر کوئی شخص علمی ترقی نہیں کر سکتا اس کی تمام قوائے فکریہ معطل پڑی رہتی ہیں اس لئے اسیروں کو قید رکھنا بھی کچھ مفید ثابت نہیں ہو سکتا۔ اگر ضرر سے بچنے کے لئے سب کو تہ تیغ کیا جاوے تو اس کا قبیح ہونا ہر شخص کو معلوم ہے ان سب باتوں پر نظر کر کے بتلایا جاوے کہ قیدیوں کے ساتھ بہتر سلوک کی صورت کیا ہے ہم دعوے کے ساتھ کہتے ہیں کہ اس کے متعلق جو طریقہ اسلام نے بتلایا ہے اس سے بہتر کوئی مذہب نہیں بتلا سکتا اسلام کا حکم ہے کہ جتنے قیدی معرکہ جنگ میں گرفتار ہوں اول تو ان سے اپنے قیدیوں کا

(بقیہ بر صفحہ آئندہ)

فرائض انجام دیتا تھا کیونکہ اس وقت وہ بادشاہ کا نائب بنا ہوا ہے اور کبھی آقا بیمار ہے غلام اس کی تیمارداری کرتا اور بعض دفعہ اس کا پاخانہ تک اٹھاتا ہے غرض غلام کے لئے کوئی

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) مبادلہ کیا جاوے جو فریق مخالف کے ہاتھوں میں گرفتار ہو چکے ہیں۔ اس کے بعد جو بچیں ان کو غنائم میں تقسیم کر دیا جائے کہ وہ ان کو اپنا غلام بنا کر اپنے گھر میں رکھیں جو خود کھاویں وہی انکو کھلادیں جو خود پہنیں وہی ان کو پہناویں طاقت سے زیادہ ان سے کوئی کام نہ لیں اور ان کے دین و دنیا کے درست کرنے کا خیال رکھیں جب آقا غلام کو اپنے گھر میں اولاد کی طرح رکھے گا تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ پہلی عداوت اس کے دل سے نکل جائے گی اور وہ آقا کے گھر کو اپنا گھر سمجھے گا اس کی اولاد کو اپنے بھائی خیال کرے گا اس طریقہ پر خزانۂ سلطنت اسیروں کے بیشمار مصارف سے محفوظ رہتا ہے اور ایک ایک آدمی پر ایک ایک غلام تقسیم ہو جانے سے اس پر بھی کوئی بار نہیں پڑتا بلکہ وہ غلام کے کھانے کپڑے کو اس کی خدمت کے معاوضہ میں خوشی سے قبول کر لیتا ہے مسلمان غلاموں کو علم و حرفت سے بھی محروم نہیں رکھ سکتے کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ جاہل غلام سے مہذب اور شائستہ غلام کی قیمت زیادہ ہوتی ہے اس وجہ سے مسلمانوں نے عموماً غلاموں کی تعلیم کا بہت زیادہ انتظام کیا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آج علماء کی فہرست میں صدہا اور ہزارہا آزاد شدہ غلاموں کا نام نہایت عزت و احترام سے لکھا ہوا نظر آرہا ہے۔ پھر چونکہ آقا کو غلام کے ساتھ ایک تعلق مالکانہ ایسا دیا گیا ہے جو انسان کو اپنی اولاد کے ساتھ بھی حاصل نہیں اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ غلاموں کے ساتھ آقاؤں کو اولاد سے زیادہ تعلق ہو گیا کہ جس طرح کسی شخص کے بیٹے کو گالی دینا اور مارنا باپ کی اہانت شمار ہوتا ہے اسی طرح کسی کے غلام کو ذلیل و حقیر کرنا آقا کو ذلیل کرنا سمجھا جانے لگا۔ جو مسلمان احکام اسلام کے پابند تھے ان کے واقعات تاریخ میں موجود ہیں کہ وہ غلاموں کو کس محبت اور شفقت کے ساتھ پالتے تھے اور ان کی تعلیم و تہذیب کا کس درجہ خیال کرتے تھے تو کیا اس غلامی کو خلاف عدل و انصاف کہنا انصاف کا خون کرنا نہیں ہے۔ رہا یہ کہ بعض لوگوں نے غلاموں کے ساتھ بُرے برتاؤ بھی کئے ہیں سو اس کا جواب یہ ہے کہ ان لوگوں کا یہ برتاؤ ایسا ہی تھا جیسا کہ بعض مسلمان نماز نہیں پڑھتے اور شراب پیتے ہیں اس کے ذمہ دار یہ لوگ خود ہیں قانون اسلام اس کا کسی طرح ذمہ دار نہیں اسلام نے غلاموں کے متعلق جس قدر رعایتی احکام صادر کئے ہیں کوئی قوم اس کی نظیر نہیں دکھا سکتی کہ دشمن کی فوج کے قیدیوں کے ساتھ اُس نے اتنے حقوق کی رعایت کی ہو۔ واللہ اعلم ۱۲ جامع

خاص خدمت متعین نہیں یہی حالت انسان و دیگر انواع خلق کی ہے کہ تمام مخلوق کے متعلق خاص خاص عبادات ہیں مگر انسان کے لئے کوئی عبادت خاص نہیں (انسان سے مراد مجموعۂ انس و جن ہے یعنی مکلفین ۱۲ منہ) مثلاً ملائکہ میں بعض کے لئے عبادت رکوع معین ہے وہ رکوع ہی میں رہتے ہیں، بعض کے لئے عبادت سجود متعین ہے وہ ہر وقت سجدہ ہی میں رہتے ہیں اور وہ ایک حال پر رہنے سے تھکتے نہیں کیونکہ وہ نور سے بنے ہیں اور نور میں یہ خاصیت ہے کہ اس میں تعب و نصب نہیں ہوتا حق تعالیٰ فرماتے ہیں یُسَبِّحُوْنَ اللَّیْلَ وَالنَّھَارَ لَا یَفْتُرُوْنَ (رات دن پاکی بیان کرتے ہیں اس سے تھکتے نہیں) اسی طرح آسمان زمین وغیرہ کے لئے ایک ایک عبادت متعین ہے۔ چنانچہ ان کی ایک عبادت تو محسوس ہے وہ یہ کہ جس کام کے لئے جو چیز بنائی گئی ہے اس کام میں آتی رہے جیسے پہاڑ جس کام کے لئے بنائے گئے ہیں اس کام میں لگے ہوئے ہیں زمین اپنے کام میں لگی ہوئی ہے آسمان چاند سورج سب ایک ایک کام میں لگے ہوئے ہیں یہ ان کی عبادت ہے چنانچہ آیت فَقَالَ لَھَا وَلِلْاَرْضِ ائْتِیَا طَوْعًا اَوْ کَرْھًا قَالَتَا اَتَیْنَا طَائِعِیْنَ ہ کی تفسیر میں یہی کہا گیا ہے کہ حق تعالیٰ نے آسمان و زمین سے فرمایا کہ تم (جس کام کے لئے بنائے گئے ہو اس کے انجام دینے کے لئے) آؤ خواہ خوشی سے یا ناخوشی سے انھوں نے جواب دیا کہ ہم خوشی سے حاضر ہیں۔ غرض ان مخلوقات کا ان کاموں میں مستعمل ہوتے رہنا جن کے لئے یہ بنائے گئے ہیں ایک عبادت ہے یہ عبادت تو محسوس ہے اور ایک عبادت غیر محسوس ہے جیسے حق تعالیٰ نے ہر مخلوق کو ایک تسبیح جداگانہ تعلیم کر دی ہے۔ وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِہٖ وَلٰکِنْ لَّا تَفْقَھُوْنَ تَسْبِیْحَھُمْ (کوئی چیز ایسی نہیں جو اللہ تعالیٰ کی حمد کے ساتھ پاکی نہ بیان کرتی ہو لیکن اس کی تسبیح تم نہیں سمجھتے) گو اس میں مفسرین کا اختلاف ہے بعض نے تسبیح حالی مراد لی ہے کہ ہر چیز اپنی حالت سے حق تعالیٰ کی قدرت و نزاہت کو ظاہر کرتی ہے اور بعض نے تسبیح حقیقی مراد لی ہے کہ اہل کشف کا یہی قول ہے وہ جمادات کی تسبیح کو سنتے ہیں اس لئے وہ اس کو حقیقت پر محمول کرتے ہیں۔ میں نے کسی کتاب میں دیکھا ہے کہ حق تعالیٰ نے بعض ملائکہ کو یہ تسبیح تعلیم کی ہے سُبْحَانَ الَّذِیْ جَمَعَ بَیْنَ الثَّلْجِ وَالنَّارِ (پاک ہے اللہ جس نے برف و آگ کو جمع کر دیا ہے) ان فرشتوں کا آدھا جسم برف کا ہے اور آدھا جسم آگ کا ہے نہ برف آگ کی گرمی کو کم کرتا ہے نہ آگ برف کو پگھلاتی ہے اس لئے اُن کو یہ تسبیح تعلیم کی گئی ہے کہ پاک ہے وہ ذات جس نے برف اور آگ کو

جمع کر دیا۔ ملائکہ کی ایک جماعت کو تسبیح تعلیم کی گئی ہے سُبْحَانَ الَّذِیْ زَیَّنَ الرِّجَالَ بِاللُّحٰی وَالنِّسَاءَ بِالذَّوَائِبِ پاک ہے وہ ذات جس نے مردوں کو ڈاڑھی سے زینت دی اور عورتوں کو زلفوں سے۔ اس پر شائد بعض لوگ خفا ہوں گے کہ یہ فرشتے تو روزہ ہماری برائی کرتے ہیں ہم کو مردوں میں بھی شمار نہیں کرتے ہیں۔ بھائی جب تم خود ہی اپنی مردانگی کی علامت کا صفایا کردو تو کوئی کیا کرے غرض اسی طرح تمام مخلوق کا ذکر متعین ہے ان کے سپرد ایک خاص عبادت ہے اور انسان کی عبادت و خدمت متعین نہیں ایک وقت میں نماز کا حکم ہے ایک وقت میں نماز سے ممانعت ہے اور پاخانہ جانے کا حکم ہے جس وقت کسی کو پاخانہ پیشاب کا تقاضا ہو اس وقت اگر کو نماز پڑھنا مکروہ ہے، پاخانہ جانا ضروری ہے اس وقت اس کا پاخانہ جانا بھی عبادت میں داخل ہے اس کو اس کام پر بھی نماز ہی کا ثواب ملے گا اور اگر اس وقت وہ نماز میں مشغول ہوا تو گناہ ہوگا غرض کبھی اس کی نماز قضاء حاجت کے حکم میں ہے اور کبھی قضاء حاجت نماز کے حکم میں ہے اسی طرح کبھی اس کو سونے کا حکم ہے کبھی جاگنے کا حکم ہے۔ حدیث میں ہے کہ تمام رات مت جاگو اِنَّ لِنَفْسِكَ عَلَيْكَ حَقًّا وَاِنَّ لِعَيْنِكَ عَلَيْكَ حَقًّا وَاِنَّ لِزَوْجِكَ عَلَيْكَ حَقًّا فَاَدُّوْا اِلٰى كُلِّ ذِىْ حَقٍّ حَقَّهٗ (تیرے نفس کا تجھ پر حق اور تیری آنکھوں کا بھی تجھ پر حق ہے اور تیری بیوی کا بھی تجھ پر حق ہے پس ہر صاحب حق کے حق کو ادا کرو) تو دیکھئے ایک مخصوص حصۂ شب میں سونا مامور بہ ہوا اور وہ مخصوص حصہ ہر شخص کے مزاج کے مناسب ہوگا جتنی دیر میں دماغ و جسم کا تعب زائل ہو جایا کرے۔ نیز اگر کسی شخص کو ذکر کرتے کرتے یا تہجد کی نماز پڑھتے ہوئے نیند کا غلبہ ہونے لگا تو اس کے لئے حدیث میں وارد ہے لِيَرْقُدْ یعنے سو رہے۔ لَعَلَّهٗ يَسْتَغْفِرُ فَيَسُبُّ نَفْسَهٗ مبادا کہیں استغفار کرتے ہوئے اپنے آپ کو برا بھلا ہی کہنے لگے مثلاً اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلِیْ (اے اللہ مجھ کو بخش دے) کی جگہ اَللّٰهُمَّ اعْفِرْلِیْ عین سے کہنے لگے تو اس کے معنی برے ہیں جس میں اپنے اوپر بد دعا ہے کہ مجھے مٹی میں ملادے اور یہاں تک بھی غنیمت ہے بعض دفعہ نیند میں حق تعالیٰ کا نام غلط سلط نکلنے لگتا ہے اس لئے میں مشورہ دیتا ہوں کہ ذکر میں جب نیند آنے لگے تو زبان سے ذکر فوراً بند کردو اس وقت قلب سے توجہ اور خیال رکھو اور کوئی شخص ذکر قلبی کو بے اصل سمجھ کر اس سے متوحش نہ ہو

یہ بھی احادیث سے ثابت ہے صحیحین کی متفق علیہ روایت ہے حضرت عائشہ فرماتی ہیں کَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَذْکُرُ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ اِحْیَانِہٖ (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ہر وقت میں ذکر اللہ کرتے رہتے تھے) اب بتائیے کہ ذکر ہر وقت میں زبان سے کیونکر ہوسکتا ہے بعض مواقع میں ذکر لسانی نہیں ہوسکتا اب یا تو علی کل احیانہ میں مجاز کے قائل ہوجیے کہ اس کے معنے فی اکثر احیانہ ہیں یا صوفیہ کے مذہب پر ذکر قلبی کے قائل ہوکر اس کو اپنے عموم پر رکھیے اور یہی ظاہر ہے بلکہ صوفیہ کے نزدیک تو اصل ذکر قلبی ہی ہے یعنی اگر ذکر لسانی ذکر قلبی سے خالی ہو تو وہ اس کو معتبر نہیں سمجھتے (مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ ذکر لسانی میں اگر حضور قلب نہ ہو تو ذکر نہ کرے چھوڑ بیٹھے بلکہ مطلب یہ ہے کہ محض لسانی کو کافی سمجھ کر اس پر قناعت نہ کرے بلکہ ذکر قلبی کے لئے کوشش کرتا رہے اور وہ کوشش یہی ہے کہ لسانی پر دوام کرے اور اس کی ساتھ دل کو متوجہ کرنے کی بھی عادت ڈالے اسی طرح ذکر قلبی حاصل ہوجائے گا۔ مولانا فرماتے ہیں

از صفت وز نام چہ زاید خیال   واں خیالش ہست دلال وصال

(صفت اور اسم سے تصور اور خیال پیدا ہوتا ہے اور پھر وہ تصور رہبر وصال بن جاتا ہے)
ایک جگہ فرماتے ہیں ؎

مست ولایعقل نہ از جام ہو   اے زہو قانع شدہ برنام ہو

(تم جام محبت سے مست ولایعقل نہیں ہو تم صرف نام حق پر بجائے محبت کے قناعت کئے ہوئے ہو) اس میں نام پر قناعت کرلے سے منع فرماتے ہیں ذکر اسمی سے مطلقاً منع نہیں فرماتے کیونکہ یہی تو زینہ ہے ذکر قلبی کا اور وصول الی الذّات (ذات تک پہونچانے) کا ۱۲ جامع) اور اس حدیث سے زیادہ صریح دوسری حدیث ہے مَنْ ذَکَرَنِیْ فِیْ نَفْسِہٖ ذَکَرْتُہٗ فِیْ نَفْسِیْ وَمَنْ ذَکَرَنِیْ فِیْ مَلَاءٍ ذَکَرْتُہٗ فِیْ مَلَاءٍ خَیْرٍ مِّنْہُ اَلْحَدِیْث۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جو کوئی مجکو اپنے دل میں یاد کرے میں بھی اس کو اپنی ذات سے یاد کرتا ہوں اور جو کوئی مجکو جماعت میں یاد کرے میں اس کو اس کی جماعت سے بہتر جماعت میں یاد کرتا ہوں اس میں تو ذکر نفسی کو ذکر جماعت کے مقابلہ میں بیان فرمایا ہے جس میں ذکر قلبی کے سوا بظاہر اور کچھ مراد نہیں گو یہ احتمال ہے کہ مقابلہ جماعت میں ذکر ہونے سے ذکر خلوت مراد ہو باللسان مگر ایک

اور حدیث حاشیہ حصن حصین میں نقل کی ہے یَفْضُلُ الذِّکْرُ الْخَفِیُّ الَّذِیْ لَا یَسْمَعُہُ الْحَفَظَۃُ سَبْعُوْنَ ضِعْفًا۔ اھ (ص ۲۷) (ذکر خفی جس کو نگہبان فرشتے بھی نہ سنتے ہوں ذکر جلی سے ستر گنا فضیلت رکھتا ہے) اس سے ذکر خفی کا ذکر جلی سے افضل ہونا ثابت ہوتا ہے قُلْتُ وَلٰکِنِّیْ لَمْ اَعْرِفْ سَنَدَہٗ نَعَمْ لَہٗ شَاھِدٌ قَوِیٌّ مِنْ حَدِیْثِ سَعْدِ بْنِ اَبِیْ وَقَّاصٍ عَنْہُ مَرْفُوْعًا قَالَ خَیْرُ الذِّکْرِ الْخَفِیُّ وَخَیْرُ الرِّزْقِ اَوِ الْعَیْشِ مَا یَکْفِیْ رَوَاہُ اَبُوْ عَوَانَۃَ وَابْنُ حَبَّانٍ فِیْ صَحِیْحِہِمَا کَذَا فِی التَّرْغِیْبِ ص ۵۰۰ حاشیۃ المشکوٰۃ) میں کہتا ہوں اس کی سند مجھے معلوم نہیں ہاں اس کے لئے شاہد قوی ہے حدیث سعد ابن وقاص سے جو مرفوعاً ان سے مروی ہے انھوں نے بیان کیا ذکر خفی بہتر ہے رزق یا عیش سے اس قدر بہتر ہے جو کافی ہو اس کو ابوعوانہ وابن حبان نے اپنی صحیحین میں روایت کیا ہے)

بہرحال یہ تو محض ان لوگوں کی تسلی کے لئے کہا گیا جو بدون حدیث کے کسی بات کا ثبوت نہیں مانتے ورنہ اصل حکم تو یہ تھا کہ جب نیند آوے سو رہو اور اس وقت ذکر کو بند کردو لیکن میں نے ان لوگوں کے لئے جو ذکر کا بند کرنا ایسے حال میں گوارا نہیں کرتے یہ بتلا دیا کہ وہ ذکر قلبی کیا کریں۔

حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ سے ایک شخص نے عرض کیا کہ حضرت ذکر میں نیند بہت آتی ہے اس کا کیا علاج آپ نے فرمایا اس کا علاج یہی ہے کہ بس تکیہ سر کے نیچے رکھ کر سو رہو۔ واقعی مشائخ محققین کی عجیب شان ہوتی ہے مگر محققین سے میری مراد وہ علماء نہیں ہیں جن کے صرف عقائد صحیح ہوں ان کو تو اہل حق اور محقق کہنا چاہیئے۔ تو جب مشائخ اہل حق بولا جاتا ہے اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ دکاندار نہیں بدعتی نہیں ہیں پیری مریدی کو پیشہ نہیں بناتے پس اہل حق اور محقق تو دکانداروں اور بدعتیوں کے مقابلہ میں ہوتے ہیں مگر حق ہونے کے لئے صرف محق ہونا کافی نہیں اور یہ ضرور نہیں کہ ہر محق محقق ہو اس کی تفصیل یوں سمجھئے کہ محق ہونا تو ایسا ہے جیسے تندرست ہونا اور محقق ہونا ایسا ہے جیسے طبیب ہونا تو ظاہر ہے کہ ہر تندرست طبیب نہیں ہوتا اور نہ طبیب بننے کے لئے صرف تندرست ہونا کافی ہے پس مشائخ محققین وہ ہیں جو عقائد صحیحہ کے ساتھ امراض نفس و معالجات نفس سے بھی ماہر ہوں چنانچہ حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ

محقق ہونے کے ساتھ محقق بھی تھے تو انھوں نے ذکر میں نیند آنے کا اچھا علاج بتلایا کہ تکیہ سر کے نیچے رکھ کر سو رہو پھر جب کچھ نیند سے بوجھ ہلکا ہو جاوے پھر کام شروع کر دو واقعی اس کا بس یہی علاج ہے اگر کوئی غیر محقق ہوتا تو نہ معلوم کیا کیا بتلاتا چنانچہ بعض لوگ بتلایا کرتے ہیں کہ جب نیند کا غلبہ ہو سیاہ مرچیں چبایا کرو میں کہتا ہوں آخر کہاں تک۔ اگر پھر نیند آئی تو پھر مرچیں چبائے تو بھلا کتنے سیر مرچیں چبائے علاوہ اس میں اس نقصان کے کہ منہ سے بہت زیادہ پانی کا بہنا دماغ کے ضعف کا سبب ہوگا۔ نیز زیادہ مرچیں چبانے حرارت قلب کا اندیشہ ہے۔ ایک بڑا نقصان یہ ہے کہ جس کام کے لئے یہ شخص جاگنے کی تدبیریں کر رہا ہے اس مرچ کے مشغلہ میں وہ کام بھی نہ ہوگا کیونکہ تجربہ کر کے دیکھ لیا جاوے کہ غلبۂ نیند میں اگر مرچ چباتے رہو اس وقت تو نیند کم ہو جاتی ہے مگر جہاں تھوڑی دیر اس کو موقوف کیا پھر نیند آنا شروع ہوئی تو یہ اچھا جان کو پاپ لگا۔ اور اگر کہیں سیاہ مرچوں سے حرارت بڑھ گئی دماغ خشک ہو گیا تو وہی بات ہو جائے گی جیسا انبہٹہ کے ایک بھولے مولوی صاحب ہر وعظ میں مسلمانوں کی عملی کوتاہیاں بیان فرما کر کہا کرتے تھے کہ یہ سب فساد مرچوں کا ہے ان کے نزدیک دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے زنا، چوری، جھوٹ، فریب، ترک صوم و صلوٰۃ یہ سب مرچوں کا فساد ہے خیر ان امور میں تو مرچوں کے فساد کو دخل ہو یا نہ ہو لیکن اگر کسی ذاکر کا دماغ سیاہ مرچیں چبانے سے خراب ہو گیا تو وہاں ضرور یہی کہا جائے گا کہ یہ سب مرچوں کا فساد ہے۔ بعض لوگ نیند دور کرنے کے لئے لونگیں چبانا بتلاتے ہیں یہ تو سخت آگ ہے اس کی تو تھوڑی مقدار بھی جگر و قلب کو پھونک دے گی پھر بہت جلد اختلاج وغیرہ کا اندیشہ ہے جس کے بعد پھر ساری عمر وظیفہ کو تو خیر باد کہو ہی گے نماز روزہ بھی چھوٹ جائے گا۔ تو یہ اچھی حفاظت ہے وظیفہ کی کہ نماز روزہ کو بھی برباد کیا یہ سب طریقے واہیات ہیں، بس اس کا آسان علاج وہی ہے جو مولانا گنگوہی نے فرمایا کہ تکیہ سر کے نیچے رکھ کر سو رہو شیخ کو معرفت کے ساتھ کسی قدر طبیب بھی ہونا چاہیئے تاکہ ہر شخص کی قوت و ضعف کے لحاظ سے عمل تعلیم کرے۔ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ضیاء القلوب میں لکھا ہے کہ ذاکر کو دودھ گھی کی تکثیر چاہیئے تاکہ ذکر جہر سے دماغ خشک نہ ہو جائے یہ کام تو ساری عمر کا ہے ایک دو روز کا کام تھوڑا ہی ہے کہ آج کیا اور کل چھوڑ دیا اس لئے دماغ کی

حفاظت بہت ضروری ہے۔ بعض لوگ ذکر کے ساتھ تقلیل غذا کو ضروری سمجھتے ہیں یاد رکھو یہ قاعدہ کلیہ نہیں ہے ہر شخص کا مزاج اس میں مختلف ہے تقلیل غذا سے کسی کو نفع ہوتا ہے اور کسی کو ضرر ہوتا ہے اور آجکل بوجہ ضعف قوی کے ضرر ہی زیادہ ہوتا ہے بس اس زمانہ میں تقلیل غذا کا مفید درجہ یہ ہے کہ قدرے بھوک رکھ کر کھانا کھایا جاوے یعنی دسترخوان سے ایسے وقت میں اٹھو کہ دو چار لقمہ کی بھوک باقی ہو۔ زیادہ تقلیل سے قوے دماغیہ وغیرہ پر بُرا اثر ہوتا ہے تو بھائی تم کو ذکر کرنا ہے یا نفس کو ہلاک کرنا۔ بزرگوں نے جو نفس کشی بتلائی ہے اس کا یہ مطلب تھوڑا ہی ہے کہ اس کو بھوکا مارو ان کا مطلب یہ ہے کہ اس کو تواضع کی ضرب سے ہلاک کرو اس میں ذلت پیدا کرو۔ تکبر کو توڑ دو اور یہ بات پیدا ہوتی ہے کسی کی جوتیاں سیدھی کرنے سے۔ تقلیل غذا سے یہ بات حاصل نہیں ہوتی بلکہ اس سے تو اور تکبر بڑھتا ہے کیونکہ یہ شخص اپنے کو صاحب مجاہدہ سمجھنے لگتا ہے اور جو لوگ پیٹ بھر کے کھانا کھاتے ہیں ان کو حقیر اور اپنے سے کم سمجھتا ہے وہی حال ہو جاتا ہے ؎

چوں گرسنہ میشوی سگ سے شوی (جب فاقہ سے ہوتا ہے تو کتے کی طرح ہوتا ہے)

بہر حال میں یہ کہہ رہا تھا کہ انسان کی کوئی خدمت متعین نہیں بلکہ ہر وقت میں اس کے لئے جدا خدمت ہے، جیسے غلام ہوتے ہیں ایک وقت اس کو سونیکا حکم ہے اس وقت سونا اس کی عبادت ہے ایک وقت جاگنے کا حکم ہے اس وقت جاگنا اس کی عبادت ہے، ایک وقت پیشاب پاخانہ کا حکم ہے اس وقت یہی اس کی عبادت ہے پس اس کی عبادت کی حقیقت کیا ہے "محض امتثال امر" کہ جس وقت جو حکم ہو اس کو بجالائے اور اس سے ہم کو سمجھنا چاہیئے کہ حق تعالیٰ کی ہمارے حال پر کس قدر شفقت و عنایت ہے کہ اول تو ہم سے غلاموں کا سا برتاؤ فرمایا نوکروں جیسا برتاؤ نہیں کیا۔ اور یہ کتنا بڑا فخر ہے کہ حق تعالیٰ ہم کو اپنا غلام بنالیں ؎ منت منہ کہ خدمت سلطاں ہمی کنی ؛ منت شناس ازو کہ بخدمت بداشتت ؛

(احسان مت جتاؤ کہ میں بادشاہ کی خدمت کرتا ہوں بلکہ اس کا احسان سمجھو کہ تم جیسے کو اپنی خدمت میں رکھ چھوڑا ہے)۔ پھر اس برتاؤ میں ہمارا نفع کس قدر ہے کہ ہم کو سونے اور جاگنے اور قضائے حاجت کرنے اور بیوی کے پاس جانے میں بھی ثواب ملتا ہے، قدم قدم پر ثواب ہی ثواب ہے کیونکہ معاشرت کو بھی دین ہی میں داخل فرمایا ہے گو بعض لوگ اسکو دین سے خارج سمجھتے ہیں۔

(بقیہ نکتہ اگلی قسط میں)

مگر بالکل غلط ہے حق تعالیٰ نے قرآن میں آداب مجلس اور احکام استیذان کو امر و نہی کے ساتھ بیان فرمایا ہے اور کسی شے کا مامور بہ و منہی عنہ ہونا یہی دین ہونے کی علامت ہے حق تعالیٰ فرماتے ہیں یَا أَیُّهَا الَّذِینَ آمَنُوا إِذَا قِیلَ لَکُمْ تَفَسَّحُوا فِی الْمَجَالِسِ فَافْسَحُوا یَفْسَحِ اللّٰهُ لَکُمْ وَإِذَا قِیلَ انْشُزُوا فَانْشُزُوا۔ اے مسلمانو! جب تم سے یہ کہا جاوے کہ کھل کر بیٹھ جاؤ تو کھل جایا کرو حق تعالیٰ بھی تمہارے لئے (جنت وغیرہ میں) وسعت کردیں گے اور جب یہ کہا جاوے کہ کھڑے ہوجاؤ تو کھڑے ہوجایا کرو۔ تو دیکھئے اس آیت میں آداب مجلس کی تعلیم دی گئی ہے اور ہر چند کہ جو تعلیم اس میں دی گئی ہے وہ امر فطری ہے کہ ضرورت کے وقت کھل کر یا کھڑے ہو کر پھر سمٹ کر بیٹھنا طبیعت انسانی کا خود تقاضا ہے مگر حق تعالیٰ نے اس کا امر اس لئے فرمایا کہ بعض لوگ ایسے متکبر اینٹھ مروڑ والے ہوتے ہیں کہ اُن سے کسی کے واسطے ہیئت بدلنا دشوار ہوتا ہے۔ میرا خود واقعہ ہے کہ میں نے ایک صاحب سے صف بندی کے وقت کہا کہ بھائی داہنی طرف آجاؤ وہ نہ آئے میں نے دوسرے شخص سے کہا بھائی ان کی تو شان گھٹتی ہے تم ہی آجاؤ تو ان کو اس قدر ناگوار ہوا کہ صف سے نکل مسجد سے بھی بھاگ گئے۔ واقعی ایسے بد دماغوں میں غرور و تکبر کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے چنانچہ اسی واسطے یہ لوگ جماعت میں بھی کم شریک ہوتے ہیں اور کہتے ہیں کہ مسجد میں جلاہے دھنیے ہر قسم کے آدمی ہوتے ہیں اور وہ ہمارے دوش بدوش کھڑے ہوتے ہیں تو ہم کیسے آویں ارے ظالمو! خدا کے دربار میں بھی اگر تمہارا تکبر ڈھیلا نہیں ہوتا تم وہاں بھی اپنی شان کو محفوظ رکھنا چاہتے ہو اچھا پھر یہی ہے تو پھر تم جُلاہوں دھنوں کی جنت میں بھی نہ جانا کیونکہ جنت میں یہ لوگ بھی ہوں گے بلکہ تم سے زیادہ ہوں گے کیونکہ جنت کے اعمال و خصال غرباء میں زیادہ ہوتے ہیں اور غالباً درجات میں بھی تم سے عالی ہوں تو وہاں تم کو یہ کیسے گوارا ہوگا کہ جنت میں جلاہوں کے ساتھ رہو اور ساتھ رہنا بھی اُن سے کم درجہ ہو کر چاہیئے تو یہ کہ جب تم کو فرشتے جنت میں لیجانے لگیں تو صاف کہدینا کہ ہم جلاہوں کے ساتھ نہیں رہتے ہم تو فرعون و شدّاد و نمرود کے ساتھ رہیں گے جیسے سودا کا اور اس کی بیوی کا قصہ ہے۔

سوداتو ایک رند مشرب شاعر تھا مگر اس کی بیوی نیک نماز روزہ کی پابند تھی ایک دن سودا کو مسخرہ پن سوجھا تو آپ بیوی سے کہنے لگے تو جو نماز پڑھتی ہے اس سے کیا نفع آخر اتنے دن تجھے نماز پڑھتے ہوئے ہو گئے تجھے کیا ملا اس نے کہا ہمیں آخرت میں جنت ملے گی ہم نماز کی بدولت جنت میں جائیں گے۔ تو سودا کیا کہتا ہے جا باولی! تو وہاں بھی ان جلاہوں اور ملانوں اور کنجڑوں ہی کے ساتھ رہے گی (کیونکہ جنت میں غربا ہی زیادہ ہوں گے) اور دیکھو ہم قیامت کے دن جہنم میں جائیں گے جہاں بڑے بڑے بادشاہ ہوں گے فرعون، نمرود، شداد، قارون ہامان وغیرہ۔ بڑا ہی مسخرہ تھا اُس کو یہاں بھی تمسخر سوجھا۔ مگر جہاں بعض امرار ایسے اینٹھ مڑور کے ہوتے ہیں وہاں بعض بیچارے متواضع اور مسکین طبع بھی ہوتے ہیں۔ ایک دیندار نواب صاحب ذالی ملک کی حکایت ہے کہ ایک غریب آدمی نماز میں اُن کے دوش بدوش کھڑا ہو گیا تھا وہ غریب اُن سے بالکل مل کر نہیں کھڑا ہوا جیسا کہ نماز میں حکم ہے صرف اسی خوف سے کبھی یہ بُرا مانیں وہ بچ بچ کر کھڑا ہوتا تھا اور سلام کی ساتھ ہی فوراً بھاگا۔ نواب صاحب نے اس کو طلب کیا وہ بہت ڈرا کہ کہیں کپڑا وغیرہ لگ گیا ہے اس کی بازپرس ہو گی مگر لوگوں نے سمجھا دیا کہ تو ڈرنا مت اور دین کے خلاف بات مت کہنا۔ جب حاضر ہوا تو نواب صاحب نے پوچھا تم ہم سے بچ بچ کر کھڑے ہوتے تھے کیا ہم سے ڈرتے تھے اس نے کہا تم سے کیا ڈرتا خدا کے دربار میں سب برابر ہیں۔ میں اس لئے بچتا تھا کہ کہیں مجھ میں دنیا کا اثر نہ ہو جاوے بڑے خوش ہوئے اور درباریوں سے کہا دیکھو اللہ کے بندے کیسے کیسے ہیں اور اس کی کچھ ماہواری تنخواہ مقرر کر دی اور بہت معتقد ہوئے۔ سو ایسے امرا بھی ہیں (اس موقع پر پہنچکر سامعین وعظ سے جناب شیخ رشید احمد صاحب نے فرمایا کہ مسجد کے پچھلے حصہ میں دھوپ آگئی ہے وہاں جو لوگ بیٹھے ہیں ان کو تکلیف ہے ذرا اگلے حصہ والے کچھ اور آگے بڑھ کر بیٹھ جاویں چنانچہ سبنے اس پر عمل کیا۔ حضرت مولانا نے فرمایا کہ) دیکھئے اسی وقت ضرورت ہو گئی تَفَسَّحُوا فِي الْمَجٰلِسِ مجلس میں کھل کر بیٹھنے کی) اور بحمداللہ سب نے تعمیل کی جو کہ علامت ہے تواضع واخلاص کی اگر اینٹھ و مروڑ والے ہوتے تو اتنی جلدی تعمیل نہ ہوتی۔ غرض میں یہ کہہ رہا تھا کہ معاشرت کے آداب بھی داخل دین ہیں چنانچہ قرآن میں تَفَسَّحُوا فِي الْمَجٰلِسِ مجلس میں

کھل کر بیٹھنے) کا امر ہے۔ ایک حدیث میں تفریق بین الاثنین (دو کے درمیان تفریق) کی ممانعت ہے یہ بھی آداب مجلس میں سے ہے کیونکہ بعض لوگ باہم دوست ہوتے ہیں وہ مل کر بیٹھنا چاہتے ہیں ان کو درمیان میں اجنبی کے آنے سے سخت ایذا ہوتی ہے اسی طرح اس کی بھی ممانعت ہے کہ کسی کو اس کی جگہ سے اٹھا کر خود وہاں بیٹھا جاوے کہ یہ سخت تکبر اور ظلم ہے کسی کو اس کی جگہ سے اٹھانے کا کسی کو کچھ حق نہیں (بشرطیکہ وہ مجلس عام ہو جیسے مسجد یا مجلس وعظ وغیرہ خاص مجلس نہ ہو۔ ۱۲جامع) اور کہاں تک گناؤں شریعت نے آداب معاشرت بہت بتلائے ہیں ان کا مختصر پتہ بتلانے کے لئے میں ایک بات کہتا ہوں وہ یہ کہ آج کل بعض قرآنوں کے ساتھ فہرست مضامین قرآنیہ بھی طبع ہوئی ہے پہلے فہرست قرآن نہیں بنائی گئی تھی مگر آجکل جہاں اور نئے نئے کام ہو رہے ہیں وہاں یہ بھی ایک نیا کام ہوا ہے تو آپ قرآن کی فہرست لیکر دیکھئے اس میں آپ کو آداب اللباس' آداب الکلام، آداب السلام' آداب المجلس وغیرہ ملیں گے اس سے پتہ چلے گا کہ حق تعالیٰ نے معاشرت کے باب میں بھی ضروری چیز سے تعرض کیا ہے اس کے بعد حدیث کی کوئی کتاب مثلاً مشکوٰۃ لے لیجئے اور اس کی فہرست دیکھئے اس میں بھی آپکو آداب اللباس' آداب الطعام' آداب السلام، آداب المجلس' ذم الکبر' ذم التھاجر، ذم التحاسد والتباغض باب ماعلی الحکام من التیسیر، باب اطاعۃ الامراء والحکام وغیرہ وغیرہ ہر قسم کے احکام متعلق معاشرت وسیاست وسلطنت کے ملیں گے اور وہ سب کے سب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال افعال سے ماخوذ ہیں اور عبادت نام ہے امتثال احکام کا اور احکام ہر قسم کے ہیں تو انسان کی کوئی حالت عبادت سے خالی نہیں ہو سکتی کیونکہ ہر حال کے متعلق شریعت کا ایک حکم ہے اور اس کا بجالانا عبادت ہے اور یہیں سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ اسلام میں ہمارے تمام مقاصد داخل ہیں ہمارا کوئی مقصود اسلام سے باہر نہیں کیونکہ اسلام کے معنی اطاعت ہی کے ہیں جو احکام کے متعلق ہوتی ہے اور احکام سے ہماری کوئی حالت باہر نہیں تو اسلام سے ہمارا کوئی مقصود خارج نہیں ہو سکتا اس سے آپ کو اسلام کی عظمت معلوم ہو گئی ہو گی۔ اب سمجھئے کہ اس حدیث میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کے متعلق ایک ضروری بات بیان فرمائی ہے ضروری ہونا تو اسی سے معلوم ہو گیا ہو گا کہ اس

بات کا تعلق تو قف اسلام سے ہے کیونکہ اسلام کی ضرورت معلوم ہے اور ضروری کے ایسے متعلقات بھی ضروری ہوا کرتے ہیں کیونکہ وہ تعلق ایک خاص حیثیت کا ہے جو ترجمہ سے معلوم ہو جائے گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ قریب ہے لوگوں پر ایک زمانہ ایسا آوے گا کہ لوگوں میں اسلام کا نام ہی رہ جائے گا اور قرآن سے کچھ نہ رہے گا مگر رسم یعنی نقش حدیث طویل ہے مگر آگے اجزاء کا بیان اس وقت مقصود نہیں گو ممکن ہے کہ ضمناً وہ بھی بیان میں آجاویں مگر مقصود اس وقت یہی جملے ہیں اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اسلام کے چند درجے ہیں لَا یَبْقٰی مِنَ الْاِسْلَامِ اِلَّا اِسْمُہٗ (نہیں باقی رہے گا اسلام بجز اس کے نام کے) میں لفظ مِنَ الْاِسْلَامِ (اسلام سے) بتلا رہا ہے کہ یہ بھی اسلام کی ایک فرد ہے گو فرد ادنیٰ ہی سہی تو ایک درجہ تو یہ ہوا جس کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے درجۂ اسم فرمایا ہے یعنی نام کا اسلام پھر اس جملہ میں نفی و استثناء ہے جو حصر کو مفید ہے اور حصر میں ماعدا کی نفی ہوا کرتی ہے معلوم ہوا کہ اسلام میں ہیں اور بھی چیزیں جن کی یہاں نفی کر کے صرف درجۂ اسم کو باقی رکھا گیا ہے اور ویسے بھی محاورہ میں نام کا درجہ حقیقت کے مقابلہ میں بولا جایا کرتا ہے تو ایک درجہ اور نکلا جس کو کام کا اسلام یا حقیقی اسلام کہنا چاہئے اب آپ کو معلوم ہوا ہوگا کہ اس حدیث کے مضمون کو اسلام سے کس قسم کا تعلق ہے اس میں اسلام کے درجے بتلائے گئے ہیں جن میں بعض ناقص ہیں بعض کامل جب اس حیثیت کا تعلق ہے تو اس کی ضرورت میں کیا کلام رہا۔ پھر جب اسلام مطلوب ہے جیسا کہ بیان بھی ہو چکا اور مسلمان کے لئے اسلام کا مطلوب ہونا بدیہی بات ہے اور قاعدہ ہے کہ جو چیز مطلوب ہوا کرتی ہے اس کا درجہ کمال ہی مطلوب ہوا کرتا ہے درجۂ نقصان کسی کو مطلوب نہیں ہوتا نہ اس پر کوئی راضی ہوتا ہے مثلاً تعلیم اولاد کا درجہ ایک کامل ہوتا ہے ایک ناقص مثلاً انٹرنس کا درجہ کامل ہے تو اس سے کم کے اوپر کوئی راضی نہیں ہوتا اور اگر کوئی زیادہ مالدار ہے اس کی نظر میں درجہ کمال بی۔ اے یا ایف۔ اے وہ اس سے کم کے اوپر راضی نہیں ہوتا پھر خود بی۔ اے اور ایف اے میں بھی دو درجے ہیں ایک ناقص ایک کامل۔ ناقص یہ کہ پڑھنے لکھنے کے بعد استعداد درست نہ ہو کسی فن سے مناسبت نہ ہو تو اس حالت میں کہا جاتا ہے کہ

صاحب تعلیم برائے نام ہوئی روپیہ ہی برباد گیا ایسی تعلیم باوجود یکہ عدم تعلیم کے مقابلہ میں کچھ درجہ ضرور رکھتی ہے مگر عموماً اس کو ناکائی اور برائے نام سمجھا جاتا ہے اور کوئی شخص اپنی اولاد کے لئے ایسی ناقص تعلیم کو پسند نہیں کرتا اسی طرح ہر چیز کو دیکھ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ مطلوب میں ہمیشہ درجۂ کمال مقصود ہوتا ہے درجۂ نقصان کوئی گوارا نہیں کرتا جب یہ بات سمجھ میں آگئی تو اب سمجھو کہ اسلام کے بھی مختلف درجات ہیں جن میں بعض کامل اور بعض ناقص ہیں اور اسلام مطلوب ہے تو اسلام میں بھی درجہ کمال ہی مطلوب ہونا چاہیئے مگر افسوس کہ اسلام میں ہم لوگ ناقص حالت پر قناعت کئے ہوئے ہیں اس کے کمال کی فکر نہیں کرتے۔ سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسی کی شکایت فرماتے ہیں یہ حدیث گو بظاہر بصورت خبر ہے مگر درحقیقت اس سے مقصود شکایت ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم در اصل ہماری شکایت فرما رہے ہیں کہ تمہاری دین سے لاپروائی رفتہ رفتہ اس درجہ بڑھ جائے گی کہ ایک وقت میں تمہارا اسلام نام کا رہ جائے گا۔ ایک بار میرے ذہن میں ایک بات آئی تھی پھر بعد تامل وہ بہت مفید اور صحیح معلوم ہوئی وہ یہ کہ جملہ خبریہ خود مقصود نہیں ہوتا بلکہ ہمیشہ انشاء ہوتا ہے اگر جملہ خبریہ بولا جاوے تو اس میں ساتھ ہی ایک جملہ انشائیہ مقصود ہوتا ہے مثلاً کوئی شخص یہ کہے کہ جس کا آپ کو انتظار تھا وہ آگیا تو یہ خبر خود مقصود نہیں ہو سکتی بلکہ مقصود یہ ہے کہ تم مطلع ہو جاؤ تاکہ انتظار کی کلفت رفع ہو) یا یہ کہ اس کی مہمانی کرو خاطر و مدارات کا سامان کرو۔ یا کسی نے خبر دی کہ آج کل حاکم وقت بدل گیا ہے۔ یہ جملہ بھی خود مقصود نہیں ہو سکتا بلکہ مقصود یہ ہوگا کہ اب اس کے مذاق کی رعایت کرنا ضروری ہے پہلے حاکم مذاق معلوم کر لینا اب کافی نہ ہوگا۔ غرض اسی طرح غور کر کے دیکھ لیا جائے کہ تمام جمل خبریہ میں کوئی نہ کوئی جملہ انشائیہ ضرور لگا ہوا ہوتا ہے جو کہ فی نفسہ مقصود ہوتا ہے مگر یہ ان لوگوں کے کلام میں ہوگا جو فضول کلام کے عادی نہ ہوں ہمیشہ سوچ کر بات کرتے ہوں یعنی عقلاء کے کلام میں تو یہی قاعدہ ہے کہ جملہ خبریہ خود مقصود نہیں ہوتا ہے مگر آج کل مقصود بدل گیا ہے اس زمانہ میں خود اخبار ہی کو لوگوں نے مقصود بنا لیا ہے جیسے کسی اخبار میں ایک خبر دیکھ کر بیان کر دی کہ مرزاپور میں طاعون پھیل رہا ہے۔ اب ان حضرات سے اگر کوئی سوال کرے کہ اس خبر سے آپ کا

مقصود کیا ہے تو وہ خاموش ہیں ان کی خاموشی سے اس کلام کا فضول اور لغو ہونا ثابت ہو جائے گا اگر یہ کلام مفید ہوتا اور متکلم نے سوچ کر اسے زبان سے نکالا ہوتا تو وہ ضرور کسی مقصود کا نام لیتا جو صورت انشاء میں ہوتا مثلاً یہی کہتا کہ وہاں مسلمان آباد ہیں دعا کرو یا اپنی حفظ صحت کا انتظام کرو۔ یا وہاں جانے کا قصد نہ کرو وغیرہ وغیرہ اگر وہ ان جمل انشائیہ میں سے ایک بھی بیان کر دے تو اس کا جملہ خبریہ لغو نہ رہے گا مفید ہو جائے گا۔

اس سے آپ کو اندازہ ہوا ہوگا کہ آج کل اکثر لوگ فضول وعبث ولغو ولایعنی امور میں مشغول ہیں بعض لوگ کارڈ لکھتے ہیں تو ان سے یہ نہیں ہوسکتا کہ مقصود کی ایک دو بات لکھ کر کارڈ کو ختم کردیں انہیں اس کو مکھیاں سی مار کر بھرنا فرض ولازم سمجھتے ہیں اب وہ پر کیونکر ہوگا۔ انہی فضول خبروں قصوں سے پہلے کارڈ ایک پیسہ کا تھا تو یہ لوگ چار پیسے وصول کرتے تھے اور اب تو آٹھ پیسے وصول کرتے ہیں واقعی بالکل مکھیاں سی مارتے ہیں جس کا پڑھنا بھی مشکل ہوتا ہے۔ ہمارے وطن میں ایک صاحب ہیں وہ اپنے عزیز کو بڑے لمبے لمبے خطوط لکھتے تھے جس میں فضول سوالات ہوا کرتے تھے مثلاً یہ کہ آجکل غلّہ کا بھاؤ کیا ہے آپ کے پڑوس میں کون کون لوگ رہتے ہیں ان کے یہاں خیریت ہے یا نہیں اور اسی قسم کی بہت سی باتیں ہوتی تھیں مکتوب الیہ سب باتوں کا جواب کہاں تک دے آخر اُس نے ان فضولیات کا جواب دینا چھوڑ دیا تو وہاں سے تقاضا ہوتا کہ تم میری سب باتوں کا جواب نہیں دیتے۔ اُس نے جواب دیا کہ تمہارے خطوط میں فضول ولایعنی سوالات ہوتے ہیں میں سب کا جواب کہاں تک دوں مگر کاتب کو اپنی غلطی کا احساس نہ ہوا تو مکتوب الیہ نے بھی یہی عمل شروع کیا کہ اب اُن سے اسی قسم کے فضول سوالات کرنا شروع کئے۔ حتیٰ کہ ایک خط میں سَو سے زیادہ سوالات تھے تو وہ حضرت بڑے جھلائے اور لکھا کہ تم بہت فضول باتیں لکھتے ہو اس سے بڑی کلفت ہوتی ہے۔ انہوں نے جواب دیا کہ حضرت مجھے بھی آپ کے بیہودہ سوالات سے ایسی ہی کلفت ہوتی تھی اب آپ کو اندازہ ہوا۔ غرض اس ترکیب سے پیچھا چھوٹا۔ میرے پاس جب ایسے خطوط آتے ہیں جن میں فضول خبریں یا فضول سوالات ہوں تو میں یہ شعر لکھ دیتا ہوں ؎

ما قصۂ سکندر و دارا نخواندہ ایم　　از ما بجز حکایت مہر و وفا مپرس

ترجمہ (ہمنے دارا وسکندر کے قصے نہیں پڑھے ہیں ہم سے مہر و وفا سے علاوہ اور قصے مت پوچھو) ہم سے اگر دین کی بات پوچھو تو ہم ضرور بتلادیں گے۔ محنت سے ہم نہیں گھبراتے بشرطیکہ وہ بات اس قابل ہو کہ اس میں محنت کرنے سے خدا کی رضا حاصل ہوتی ہو ہم سے دین کا مسئلہ پوچھو اگر ہم کو جواب یاد ہوگا تو فوراً جواب دیں گے اگر یاد نہ ہوگا کتاب دیکھ کر جواب معلوم کرنے کی کوشش کریں گے چاہے اس میں ہم کو ہفتہ دو ہفتہ تک کتابوں کی ورق گردانی کرنی پڑے اگر پھر بھی ہم کو شرح صدر نہ ہوگا تو اپنے سے زیادہ جاننے والے کا پتہ بتلا دیں گے۔ ابھی آج کل کا قصہ ہے کہ ایک شخص میرے پاس سلسلہ میں داخل ہونے کے لئے آیا چونکہ اس کی برادری میں عورتوں کو میراث نہ دینے کا رواج تھا اس لئے پہلے حقوق العباد سے سبکدوش ہونے کی اسے تعلیم کی گئی کہ پہلے اس گناہ سے نجات حاصل کرو پھر سلسلہ میں داخل ہونے کا قصد کرنا وہ بیچارہ طالب تھا اس لئے خوشی سے اس پر تیار ہوگیا اور اُس نے سب کے حقوق ادا کرنے کا تہیہ کرلیا چونکہ کئی پشتوں سے عورتوں کو میراث نہیں دی گئی تھی اس لئے جہاں تک پتہ چل سکا وہاں تک ورثہ کے نام لکھے گئے معلوم ہوا کہ پر دادا کے بھی اوپر سے عورتیں محروم ہیں تو کئی بطن کا لمبا مناسخہ ہوا ورثہ کی تحقیق اور فرائض نکالنے میں دو ہفتے لگ گئے مگر ہم اس سے نہیں گھبرائے دو تین آدمیوں کو اپنے ساتھ لیکر میں نے مناسخہ نکالا اور سب کے سہام الگ الگ بتلائے اُس اللہ کے بندے نے سب ورثۂ محرومین کو ان کا حق ادا کیا ان لوگوں نے لینے سے انکار بھی کیا کیونکہ بعض کے بہت ہی معمولی حصے تھے کسی کے دو روپیہ کسی کے چار روپیہ مگر اس نے معافی کو منظور نہیں کیا بلکہ سب کا پیسہ پیسہ ادا کردیا۔ غرض ضروری باتوں میں محنت سے ہم نہیں گھبراتے ہاں فضول امر میں ہم سے ایک سطر بھی نہیں لکھی جاتی۔ اس کا احساس وہ شخص کرتا ہے جس کو وقت کی قدر ہو مگر آجکل لوگ وقت کی قدر ہی نہیں جانتے حالانکہ زندگی کی ہر ہر گھڑی ہر سکنڈ اور منٹ اتنا قیمتی ہے کہ ساری دنیا بھی اس کی قیمت نہیں ہوسکتی مرتے وقت اس کی قدر معلوم ہوگی کہ ہائے ہم سے کتنا بڑا خزانہ فضول برباد ہوگیا اس وقت آپ تمنا کریں گے کہ کاش مجکو ایک دو منٹ کی اور مہلت مل جائے تو میں توبہ و استغفار کرکے گناہوں سے پاک ہوجاؤں حقوق العباد کے متعلق ورثہ کو وصیت کردوں مگر اس وقت مہلت کہاں اِذَا جَاءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً

وَلَا یَسْتَقْدِمُوْنَ ط وقت آنے کے بعد نہ ایک منٹ اِدھر ہو سکے گا نہ ادھر۔ اور ارشاد ہوگا اَوَلَمْ نُعَمِّرْكُمْ مَا يَتَذَكَّرُ فِيْهِ مَنْ تَذَكَّرَ وَجَآءَكُمُ النَّذِيْرُ کیا ہم نے تم کو اتنی عمر دراز اور طویل مہلت نہ دی تھی جس میں اگر تم چاہتے تو نصیحت حاصل کر سکتے تھے خصوصاً جبکہ تمہارے پاس ڈرانے والے بھی آچکے تھے (بعض نے نذیر کی تفسیر شیب (بڑھاپے) سے کی ہے ۱۲) غرض وقت بہت قابل قدر چیز ہے لیکن لوگ اس کی قدر نہیں کرتے فضول باتوں میں ضائع کرتے ہیں۔ بعض طالبین کی عادت ہے کہ وہ محض حالات سے خط کو بھر دیتے ہیں اس سے کچھ نہیں معلوم ہوتا کہ مقصود کیا ہے اگر یہ مقصود ہے کہ ہمارے اوپر ایسے ایسے حالات وارد ہوتے ہیں تو اس اطلاع سے کیا مقصود ہے اگر یہ مقصود ہے کہ یہ حالات قابل التفات ہیں یا نہیں اور محمود ہیں یا مذموم تو اس کی تصریح ہونی چاہیئے ورنہ محض اطلاع ایک فضول امر ہے اس تفصیل سے معلوم ہوا ہوگا کہ آجکل اکثر لوگ اخبار فضول میں مشغول ہیں اور حدیث میں ہے حُسْنِ اِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْكُهٗ مَا لَا يَعْنِيْهِ یعنی اسلام کی خوبی یہ ہے کہ مسلمان لایعنی امور کو ترک کر دے تو یہ سب امور قابل ترک ہیں (یہ مضمون غایت تفصیل کے ساتھ وعظ ترک مالایعنی میں بیان ہو چکا ہے۔ قابل مطالعہ ہے) بعض لوگ خطوط میں خواب بہت لکھتے ہیں مجھے اس سے بھی اُلجھن ہوتی ہے کوئی بہت ہی عجیب و غریب خواب ہو تو اس کی اطلاع کا مضائقہ نہیں مگر یہ تو نہ ہونا چاہیئے کہ ہر خط میں خواب ہی لکھے ہوئے آیا کریں۔ اگر دس خطوط میں امراض نفس کا معالجہ دریافت کیا جائے اپنے عیوب کی اصلاح کا طریق دریافت کیا جائے تو اس کے بعد ایک خط میں خواب لکھ دینے کا بھی مضائقہ نہیں مگر اب تو حالت یہ ہے کہ دس خطوں میں تو خواب کی کیفیات ہوتی ہیں اور ایک خط میں بیداری کی۔ یہ تو یقیناً لایعنی میں داخل ہے پھر طرہ یہ کہ خواب لکھ کر اس کی تعبیر دریافت کرنا چاہتے ہیں اور مجھے اول تو تعبیر سے بہت کم مناسبت ہے دوسرے اُس کو طریق سے کچھ تعلق نہیں نہ شان اصلاح کے لئے معبّر ہونا ضروری۔ بلکہ تعبیر کے فن کو تو اسلام کی بھی ضرورت نہیں زمانہ جاہلیت میں بعض کفار ایسے معبّر ہوئے ہیں کہ علماء اسلام میں بھی ایسے معبّر نہ ہوئے ہوں گے تو جو فن مسلم و کافر دونوں میں مشترک ہو اس کو طریق یا بزرگی سے کیا تعلق

اس لئے میں کہا کرتا ہوں کہ جس خط میں خواب لکھا جائے اس کے ساتھ یہ بھی لکھ دیا جائے کہ اگر تعبیر ضروری ہو تو لکھی جائے ورنہ کچھ ضرورت نہیں اس سے مکتوب الیہ پر بار نہیں ہوتا اسی لئے میں خوابوں کا جواب کم دیتا ہوں اکثر تو یہ شعر لکھ دیتا ہوں ؎

نہ شبم نہ شب پرستم کہ حدیث خواب گویم　　چو غلام آفتابم ہمہ ز آفتاب گویم

(نہ میں شب ہوں نہ شب پرست جو خواب کی تعبیر بیان کروں محبوب حقیقی کا بندہ ہوں ان ہی کی باتیں بیان کرتا ہوں)

خواب کا درجہ شریعت میں صرف اتنا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اچھے خواب کو مبشرات میں سے فرمایا ہے کہ یہ دل خوش کن چیز ہے اور برے خواب کو تحزین من الشیطان (شیطان کی طرف سے حزن و ملال میں ڈالنا) کہا گیا ہے یعنی شیطان برے خواب دکھلا کر مسلمان کو پریشان کرنا چاہتا ہے تو اس سے پریشان و مغلوب نہ ہونا چاہیئے ورنہ شیطان اور تنگ کرے گا خواب سے نہ کوئی جنت میں جائے گا نہ دوزخ میں کیونکہ اس کا مدار اعمال اختیاریہ پر ہے اور خواب اختیاری نہیں اگر کوئی آدمی ساری عمر برے خواب دیکھتا رہے تو اس کا کیا قصور ہے اور جو ساری عمر اچھے خواب دیکھے اس کا کیا کمال ہے خلاصہ یہ کہ خواب علت نہیں محض علامت ہے وہ بھی جبکہ خواب خواب ہو تبخیر دماغ نہ ہو اور آجکل اکثر خواب تو ایسے ہی ہوتے ہیں کہ تبخیر دماغ سے پریشان خیالات نظر آنے لگتے ہیں۔ مگر لوگوں نے اس کو مقاصد میں داخل کر لیا ہے اور خواب کے اوپر اعتماد کر کے فیصلے کر لیتے ہیں بعض لوگ چاہتے ہیں کہ مردہ کو خواب میں دیکھ لیا جائے اور جب تک وہ نظر نہیں آتا اس وقت تک متفکر رہتے ہیں۔ حالانکہ اس میں ایک ضرر ہے وہ یہ کہ مردہ اگر اچھی حالت میں نظر آیا تو اس کے بعد ایصال ثواب سے غفلت ہو جاتی ہے گویا ان کے نزدیک ثواب پہونچانے کے لئے معذب ہونا بھی ضروری ہے۔ اور اگر اسے معذب دیکھا تو مسلمان سے خوامخواہ بدگمانی ہو گی حالانکہ محض خواب کی بنا پر کسی سے بدگمان ہونا جائز نہیں یہ ساری گفتگو اس پر شروع ہوئی تھی کہ جملہ خبریہ سے بھی انشا ہی مقصود ہوتی ہے اور جس جملہ سے انشا مقصود نہ ہو وہ مہمل ہے یہ مرض آجکل ہی ہوا ہے کہ اخبار کو بھی مقصود سمجھتے ہیں۔ پس ہر چند کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام میں اس جگہ جملہ خبریہ وارد ہے مگر جب خبر خود مقصود نہیں ہو سکتی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم جو سید الحکما و الفصحا ہیں آپ کے

کلام میں خبر سے مقصود انشا کیوں نہ ہوگا۔ اگر اس پر کوئی اشکال کرے کہ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ (فرما دیجئے اللہ ایک ہے) میں خبر سے کیا مقصود ہے میں کہوں گا کہ مقصود یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ واحد ہے تم اس کو واحد ہی سمجھو۔ غرض حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام میں بھی اس جگہ خبر مقصود نہیں بلکہ انشا مقصود ہے اور مطلب یہ ہے کہ اے لوگو! تم اپنے اسلام کی تکمیل میں کوشش کرو اور درجۂ کمال حاصل کرنے کی فکر کرو۔ ایسا نہ ہو کہ وہ نام کا اسلام رہ جائے یا محض صورت ہی صورت رہ جائے اور یہ درجہ نہ کافی ہے نہ مطلوب کیونکہ مقاصد میں ہمیشہ درجہ کمال مطلوب ہوا کرتا ہے اور اس حدیث میں ضمناً ان لوگوں کی شکایت بھی ہوگئی جو محض درجۂ صورت یا درجۂ اسم پر اکتفا کرلیں گے اسی کو آپ بطور شکایت کے بیان فرماتے ہیں کہ عنقریب ایک زمانہ ایسا آوے گا کہ اسلام کا نام ہی نام رہ جاوے گا اور قرآن کے صرف نقوش رہ جاویں گے۔ اس کلام نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بات تو صراحۃً معلوم ہوگئی کہ آپ اسلام کے مراتب و درجات بیان فرما رہے ہیں البتہ ان درجات کی تعیین یہ بعض کی اشارۃً ہے اور بعض کی صراحۃً۔ غور کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کے تین درجے بیان فرمائے ہیں لہذا پہلے میں ان درجات کی تعیین کرنا چاہتا ہوں پھر تکمیل کا طریقہ بیان کروں گا۔ ایک درجہ تو اس جگہ صراحۃً مذکور ہے جس کو نام کا اسلام فرمایا ہے اور دو درجے صراحۃً مذکور نہیں مگر تامل سے سمجھ میں آسکتے ہیں چنانچہ وَلَا يَبْقٰى مِنَ الْقُرْاٰنِ اِلَّا رَسْمُهٗ (قرآن سے صرف نقش ہی باقی رہ جائیں گے) سے دوسرا درجہ مفہوم ہوتا ہے یعنی رسم اسلام کیونکہ جیسے قرآن میں ایک درجہ رسم قرآن ہے اسی طرح اسلام میں ایک درجہ رسم اسلام ہے جس کو صورت اسلام کہنا چاہیے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ لفظ اسم اور لفظ رسم کے معنی میں غور کرنے سے لغۃً فرق معلوم ہوتا ہے، اسم کہتے ہیں نام کو اور رسم کہتے ہیں نقش کو پس درجۂ اسم میں تو شئی کا تحقق نہ صورۃً ہوتا ہے نہ معنیً محض نام ہی نام ہوتا ہے اور درجۂ رسم میں نام کے ساتھ صورت کا بھی تحقق ہوتا ہے پس یہ درجہ نام کے درجہ سے بڑھا ہوا ہے۔ یہ دو درجے ہوئے اب ایک تیسرا درجہ اور ہونا چاہیے جس کے اعتبار و تقابل سے ایک درجہ کو نام کا اسلام اور ایک درجہ کو صورت کا اسلام کہا گیا ہے وہ درجہ حقیقت کا ہے ظاہر ہے کہ بدون تصور حقیقت کے نہ نام کا درجہ ہوسکتا ہے نہ صورت کا

اس لئے اس کا ماننا تو ضروری ہے۔ اب ترتیب وار سُن لیجیے کہ اسلام کے تین درجے ہوئے ایک تو
تو درجۂ حقیقت ہے جس کو کام کا اسلام کہنا چاہیئے، دوسری صورت کا درجہ ہے تیسرے نام کا اسلام ہے
جس میں نہ حقیقت ہے نہ صورت ہے مگر برائے نام اس پر حقیقت کا اطلاق کر دیا جاتا ہے۔ اس کو
ایک مثال میں سمجھئے کہ مثلاً دوستی ایک شے ہے اس کے بھی ہمارے عُرف میں تین درجے ہیں ایک تو
دوستی کی حقیقت ہے کہ دل سے خیر خواہی اور ہمدردی ہو دوسرے دوستی کی صورت ہے کہ ظاہر میں
برتاؤ ایسا ہے جیسا دوستوں کے ساتھ کیا جاتا ہے مگر دل میں محبت زیادہ نہیں لیکن اس کے ساتھ اتنی
بات بھی ہے کہ دشمنی کا برتاؤ بھی نہیں نہ پیچھے غیبت شکایت ہے نہ دشمنوں کے ساتھ سازش ہے یہ بھی
ایک درجہ میں دوستی ہے یعنی دوستی کی صورت ہے جس کی حقیقت یہ ہے کہ دشمنی نہ کرنے کو بھی دوستی کہدیا
جاتا ہے اور ایک قسم کی دوستی یہ ہے کہ منہ پر تو دوستی کا برتاؤ کیا جاتا ہے جھک کر سلام کرتے ہیں
سامنے خوشامد کی باتیں بناتے ہیں اور پیچھے ایذا و اضرار کے درپے ہوتے ہیں تو پہلا درجہ تو کمال
دوستی کا ہے اور دوسرا درجہ صورت دوستی کا ہے اور تیسرا درجہ صرف نام کی دوستی ہے جیسے منافقین
کو برائے نام مسلمان کہدیا جاتا ہے مگر ظاہر ہے کہ جس طرح ہماری نگاہ میں نام کی دوستی کی ذرا بھی قدر
نہیں ہوتی اسی طرح خدا تعالیٰ کے یہاں منافقوں کے اسلام کی کچھ بھی قدر نہیں مومن کہلانے سے
اور مسلمان نام ہو جانیسے کیا ہوتا ہے مولانا فرماتے ہیں ؎

میم و واؤ میم و نون تشریف نیست لفظِ مؤمن جز پئے تعریف نیست

یعنی مومن کا لفظ (بدون وجود حقیقت کے) کچھ شرافت نہیں بلکہ محض پتہ کے لئے ہے جس سے فی الجملہ
امتیاز ہو جاتا ہے اس حالت میں لفظ مؤمن کی ایسی مثال ہوگی جیسے کسی جاہل لٹھ کا نام فاضل
رکھدیا جاوے تو اس نام سے اس کو ایک امتیاز تو حاصل ہو جائیگا کہ فاضل کہنے سے وہی سمجھا جاویگا
مگر نام فاضل ہونے سے وہ سچ مچ تو فاضل نہیں ہو جاتا وہ تو جاہل کا جاہل ہی رہتا ہے اسی طرح منافق
کو مؤمن کے لقب سے کچھ حاصل نہ ہوگا کہیں الفاظ سے بھی کام چلا کرتا ہے۔ اگر کوئی یہ اشکال کرے
کہ لَا یَبْقٰی مِنَ الْقُرْاٰنِ اِلَّا رَسْمُہٗ (قرآن سے صرف نقش ہی باقی رہ جائیں گے) سے جو تم نے
دوسرا درجہ مراد لیا ہے کہ لفظ رسم سے درجۂ صورت مراد ہے اُس کی کیا دلیل ہے ممکن ہے کہ
اس سے بھی وہی مراد ہو جو الا اسمہٗ سے مراد ہے (مگر اس کا نام ہی نام) پس ایک جملہ میں جس درجۂ

پس ایک جملہ میں ہے دوسرے جملہ میں اسی درجہ قرآن کا بیان ہے اس کے چند جواب ہیں اول یہ کہ بلاغت کا مسئلہ ہے کہ تاکید سے تاسیس اولی ہے لہذا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام میں جو کہ سید البلغاء ہیں تاسیس ہی مراد ہونی چاہیئے۔ دوسرے یہ کہ قرآن کے متعلق درجۂ اسم مراد لینا صحیح بھی نہیں کیونکہ احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ علم دین جس میں قرآن بھی داخل ہے قرب قیامت میں خود مرتفع نہ ہوگا بلکہ علماء وقراء مر جاویں گے اس کے بعد مسلمان بھی دنیا سے اٹھ جائیں گے سو قرآن مجید کا علم وعمل گو باقی نہ رہے مگر خود قرآن مجید رہے گا یہ نہیں کہ قرآن کا صرف نام ہی نام رہ جائے اور اس کی صورت بھی باقی نہ رہے بلکہ قرآن کی صورت اخیر زمانہ تک ضرور باقی رہے گی لہذا اِلَّا رَسْمُهٗ (مگر اس کے نقش) سے درجۂ اسم مراد لینا صحیح نہیں ہو سکتا اس سے درجۂ صورت ہی مراد ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ایک زمانہ میں مسلمانوں کے اندر صرف قرآن شریف کے نقوش رہ جائیں گے اس کے سمجھنے والے اور اس پر عمل کرنے والے بہت کم رہ جائیں گے اور صرف درجۂ رسم کا باقی رہنا بھی باعتبار اکثر کے ہے کل کے اعتبار سے نہیں کیونکہ قیامت تک ایک جماعت قرآن کی سمجھنے والی اور اس پر عمل کرنے والی ضرور رہے گی خواہ وہ معدودے چند ہی ہوں کیونکہ ایک صحیح حدیث میں یہ بھی آچکا ہے لَا یَزَالُ طَائِفَةٌ مِّنْ اُمَّتِیْ یُقَاتِلُوْنَ عَلَی الْحَقِّ ظَاهِرِیْنَ اِلٰی یَوْمِ الْقِیَامَةِ (قُلْتُ رَوَاهُ الشَّیْخَانِ وَاللَّفْظُ لِمُسْلِمٍ ۱۲ جامع) (میری امت سے ایک گروہ قیامت تک حق پر مقاتلہ کرکے غالب رہے گا میں کہتا ہوں کہ اس کو بخاری ومسلم نے روایت کیا ہے اور لفظ مسلم کے ہیں) یعنی قیامت تک ایک جماعت حق پر ضرور رہے گی اور ظاہر ہے کہ حق پر ہونا بدون عمل بالقرآن کے ممکن نہیں کہ ایک جماعت قرآن پر عمل کرنے والی قیامت تک (مراد قرب قیامت ہے) ضرور رہے گی۔ لہذا لَا یَبْقٰی مِنَ الْقُرْاٰنِ اِلَّا رَسْمُهٗ (قرآن سے اس کے نقش ہی باقی رہ جائیں گے) سے درجۂ اسم مراد نہیں ہو سکتا اور اس تقریر سے معلوم ہوا کہ لَا یَبْقٰی مِنَ الْاِسْلَامِ اِلَّا اسْمُهٗ (اسلام سے صرف اس کا نام ہی نام باقی رہیگا) بھی اکثر کے اعتبار سے ہے سب کے اعتبار سے نہیں کیونکہ ہر زمانہ میں ایک جماعت کامل الاسلام بھی ضرور رہے گی۔ اب اس کو سمجھئے کہ اسلام میں درجۂ حقیقت کونسا ہے اور نام کا اسلام کونسا ہے اور صورت اسلام کیا ہے اس کے سمجھنے

کے لئے پہلے آپ کو اسلام کی حقیقت سمجھنی چاہیئے حقیقت کے معلوم ہونے کے بعد باقی دو درجے خود ہی معلوم ہو جائیں گے۔ آج کل اسلام کا نوحہ کرنے والے تو بہت ہیں مگر افسوس حقیقت جاننے والے بہت کم ہیں۔ آجکل لکچروں اور وعظوں میں اسلام کا رانڈ رونا رویا جا رہا ہے کہ اسلام پستی میں آگیا، اسلام کمزور ہو گیا کوئی کہتا ہے کہ اسلام کو اتحاد و اتفاق کی ضرورت ہے کوئی کہتا ہے کہ اسلام مسلمانوں سے یہ درخواست کرتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ کوئی ان سے پوچھے کہ تم یہ نوحہ کس کا کر رہے ہو۔ کیا اسلام کوئی پتلا ہے جس کے اوپر یہ آفتیں آرہی ہیں، کیا اسلام کوئی تم سے الگ چیز ہے جو کبھی بڑھا ہوتا ہے کبھی بیمار ہوتا ہے کبھی اس پر حملے کئے جاتے ہیں۔ اے صاحبو! اسلام تو حقیقت میں آپ کی ایک صفت ہے۔ تم اپنے آپکو مسلم یا مسلمان کہتے ہو تم موصوف ہوا اور اسلام تمہاری ایک صفت ہے جیسے کوئی شخص حسین ہو تو حُسن اس کی ایک صفت ہے اور وہ موصوف بالحسن ہے اور یہ قاعدہ ہے کہ صفت کا تحقق موصوف ہی کے ساتھ ہوا کرتا ہے جُدا نہیں ہوا کرتا چنانچہ حسن کا تحقق ہمیشہ حسین آدمی کے ساتھ ہوا کرتا ہے حسن کے لئے کوئی جُدا تحقق نہیں۔ جب یہ بات ہے تو اب بتلاؤ کہ تم جو اسلام کا نوحہ کرتے ہو اس کا مطلب کیا ہے کیا اس کی بعینہٖ یہی مثال نہیں کہ کوئی شخص حسن کا نوحہ کرتا پھرے اور اپنی خبر نہ لے۔ صاحبو! آپ کا نوحہ اسلام کرنا حقیقت میں آپنا نوحہ ہے، تمہارا تنزل یہ اسلام کا تنزل ہے، تمہاری ضرورت اسلام کی ضرورت ہے ورنہ کوئی بتلائے کہ تم سے علیحدہ اسلام کا وجود کونسا ہے مگر اب حالت یہ ہے کہ اسلام کا تو رانڈ رونا روتے ہیں مگر اپنی خبر نہیں لیتے اپنی اصلاح کا کسی کو اہتمام نہیں بس وہ حالت ہے جو مولانا فرماتے ہیں ؎

کردهٔ تاویل لفظ بکر را — خویش را تاویل کن نے ذکر را
بر ہوا تاویل قرآں می کنی — پست و کژ شد از تو معنے سنی

(تو نے لفظ بکر تاویل کی اپنی تاویل کر لیعنی اپنی اصلاح کر) نہ ذکر کی تاویل کر نفسانی اغراض سے قرآن پاک کی تاویل کرتا ہے تجھ قرآن پاک کے معنی کو کج اور بگاڑتا ہے)

جو لوگ اسلام کی خدمت کرنا چاہتے ہیں ان کو چاہیئے کہ اپنی خدمت کریں جب وہ خود درست ہو جائیں گے تو اسلام بھی درست ہو جائے گا۔ اسلام کی اصل خدمت یہی ہے کہ تم اپنی اصلاح کرو اور اپنے اعمال و اقوال و احوال کو اسلام کے مطابق بناؤ جب تمہاری کامل اصلاح ہو جائے گی تو اسلام کو ترقی ہو جائے گی۔ مگر اب تو یہ حالت ہے کہ اسلام کی خدمت اور حفاظت کا دعویٰ کرتے ہیں اور ساتھ ہی یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ وقت نماز روزہ کی تعلیم اور مسئلہ مسائل بتلانے کا نہیں ہے اب تو خدمتِ اسلام کی ضرورت ہے اے اللہ نہ معلوم وہ اسلام کی خدمت و حفاظت کیا چیز ہے جس کے لئے نماز روزہ کی اور حلال و حرام کے جاننے کی بھی ضرورت نہیں۔ حتیٰ کہ ایک دفعہ کسی اخبار میں کسی ریفارمر کا یہ مضمون شائع ہوا تھا کہ اسلام میں ایک ایسی چیز ہے جو ترقی سے بہت ہی سدِّ راہ ہے وہ یہ کہ مسلمان ہوکر پانچ وقت کی نماز پڑھنا پڑتی ہے۔ بہت سے غیر مسلم مسلمان ہونا چاہتے ہیں اور وہ اسلام کو حق سمجھتے ہیں مگر پانچ وقت کی نماز کو فرض سن کر وہ اسلام سے رُک جاتے ہیں لہٰذا ہمارے علماء کو چاہیئے کہ اسلام میں سے نماز کو نکال دیں اگر یہ نکال دی گئی تو اسلام کو بہت ترقی ہوگی اور بڑا مانع مرتفع ہو جائے گا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ (ہم اللہ ہی کے ہیں اور اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں) میں کہتا ہوں کہ اگر اسلام میں سے نماز کو نکال دیا گیا اور نکالنے کے معنی یقیناً یہی ہیں کہ نماز کو ضروری نہ کہا جاوے پھر وہ اسلام ہی کہاں رہے گا وہ بھی ساتھ ساتھ رخصت ہو جائے گا پھر اگر لوگ اسلام بھی قبول کریں تو وہ محض نام کا اسلام ہوگا حقیقت اسلام اس میں نام کو بھی نہ ہوگی تو اب جتنی بھی ترقی ہو وہ اسلام کی ترقی تھوڑا ہی ہوگی کفر کی ترقی ہوگی کیونکہ فرضیت صلوٰۃ سے انکار کرنا کفر ہے یہ تو اسلام کی خدمت ایسی ہوگی جیسے ایک بڑھیا کے گھر میں شاہی باز آ گرا تھا اس نے باز کبھی دیکھا نہ تھا اس لئے اُس کی بڑی چونچ دیکھ کر وہ بھی ٹیڑھی کہنے لگی کہ ہائے تو دانہ کیونکر کھاتا ہوگا تیری چونچ تو بڑی ٹیڑھی ہے اس کے بعد قینچی سے اُس کی چونچ کاٹ ڈالی۔ پھر ٹیڑھے ناخن دیکھ کر اُسے اور بھی ترس آیا کہ ہائے کسی نے تیرے ناخن بھی نہیں بنائے تو چلتا کیسے ہوگا اس نے ناخن بھی کاٹ دیئے۔ پھر لمبے لمبے بازو

دیکھ کر کہنے لگی کہ اتنا لوجھ لیکر تجھ سے اڑا کیونکر جاتا ہوگا پھر قینچی سے پر بھی کاٹ دیئے اس نے تو اپنے زعم میں اس کے ساتھ بڑی ہمدردی کی تھی مگر حقیقت میں اس نے اُس کو تباہ کر دیا جب بادشاہ کو تلاش کے بعد پتہ لگا کہ شاہی باز ایک بڑھیا کے گھر میں ہے تو اس نے منگوایا تو وہاں وہ لنڈورا بنا ہوا پہونچا بادشاہ نے حکم دیا کہ اس کو لے کر بازار میں اور شہر کی گلی کوچوں میں منادی کرو کہ جو شخص اپنے قدر دان مربی سے جدا ہو کر ناقدروں کے ہاتھ میں جا پھنسے اس کی یہ گد بنا کرتی ہے تو صاحبو! ہم بھی آجکل اسلام کی ایسی ہی خدمت وحفاظت کر رہے ہیں جیسے اس بڑھیا نے شاہی باز کی خدمت کی تھی کہ اسلام کی ناک کان کاٹ کر آپ اسکو رونق وترقی دینا چاہتے ہیں کہ نہ نماز کی ضرورت ہے نہ روزہ کی نہ قربانی کی نہ حج کی نہ کفریات ومعاصی سے بچنے کی اور پھر بھی وہ اسلام کی حفاظت ہی چلی جارہی ہے ان لوگوں کو یہ بھی خبر نہیں ہے کہ ہم جس کی خدمت وحفاظت کا دعوے کر رہے ہیں ہمارے اقوال وافعال سے اس کی بیخکنی ہورہی ہے۔ شیخ شیرازی فرماتے ہیں ؎

یکے بر سر شاخ وبُن می برید　　　خداوند بستاں نگہ کرد و دید

(ایک شخص ٹہنی پر بیٹھا ہوا جڑ کاٹ رہا تھا باغ کے مالک نے نگہ کی اور دیکھا)

ایک صاحب نے مجھ سے ابھی ایک مسئلہ پوچھا تھا میں نے اس کا شرعی جواب دیدیا تو وہ کیا کہنے لگا کہ یہ تو سود کی صورت ہے میں نے کہا بہتر ہے اگر آپ کے نزدیک یہ سود کی صورت ہے تو اس پر عمل نہ کریں مگر اسلام کا حکم یہی ہے ہم اس کو بدل نہیں سکتے" افسوس! لوگوں کا مذاق آجکل یہ ہو رہا ہے کہ شریعت میں وہی مسائل رکھے جائیں جو ہماری عقل کے مطابق ہوں اور جو بات اُن کی سمجھ میں نہ آوے اس کو شریعت میں نہ رہنا چاہیے میں کہتا ہوں کہ اگر ایسا کر دیا جائے تو پھر وہ مذہب اسلام کہاں رہے گا بلکہ خود ساختہ مذہب ہو جائیگا تو جس مذہب میں بندوں کی رائے اور تصنیف کو دخل ہو سکے وہ تو ایسا کر سکتا ہے مگر اسلام میں ایسا نہیں ہو سکتا یہ تو خدا کا بھیجا ہوا مذہب ہے جس کی حفاظت کا حق تعالیٰ نے خود وعدہ کیا ہے اس میں کسی کی ذاتی رائے اور تصنیف چل نہیں سکتی بہت لوگ احکام میں تحریف کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر ذاتی تجربہ شاہد ہے کہ سب تحریفات خود ہی مٹ جاتی ہیں اور احکام شرعیہ اپنی اسی اصلی حالت پر قائم رہتے ہیں۔

الغرض میں یہ کہہ رہا تھا کہ اسلام تم سے جدا کوئی چیز نہیں مسلمانوں ہی سے اسلام کا ظہور ہوتا ہے اس لئے اسلام کی ترقی تمہاری ترقی ہے اور تمہارا تنزل اسلام کا تنزل ہے جیسے کسی عورت سے دوسری عورت نے پوچھا کہ بی فوج کسے کہتے ہیں اس نے کہا کہ تیرا میاں میرا میاں یہ سب مل ملاکر فوج ہوجاتی ہے واقعی فوج کی حقیقت اس نے خوب بتلائی کوئی فوج کا الگ پتلا تھوڑا ہی ہوتا ہے یہی حالت اسلام کی ہے کہ ہمارے اور تمہارے درست ہونے سے اسلام کی ترقی ہوتی ہے کوئی ہم سے الگ چیز تھوڑا ہی ہے تو اب اگر اسلام کی ترقی چاہتے ہو تو اپنی حالت کی اصلاح کرو جب تم سب درست ہو جاؤ گے بس اسلام کو ترقی ہوگئی مگر یہ یاد رکھو کہ اپنی درستی یا اسلام کی ترقی کے یہ معنی نہیں کہ تم مال و دولت زیادہ جمع کرنے کی تدبیریں کرو یہ تو خوش حالی اور تمول کی ترقی ہے۔ اسلام کی ترقی یہ ہے کہ تم اپنی ایسی حالت بناؤ کہ تم کو دیکھ کر دنیا یوں کہنے لگے کہ ہاں بھائی یہ لوگ مسلمان ہیں یعنی تمہاری حرکات و سکنات کو دوسروں کی حرکات و سکنات سے امتیاز ہو تمہاری وضع و ہیئت ممتاز ہو تمہارے احوال و افعال و اقوال تعلیم اسلام کے تابع ہوں اُس وقت یہ بات حاصل ہوگی کہ جہاں ایک مسلمان اور ایک کافر کو جمع کیا جائیگا فوراً لوگوں کو معلوم ہوجائے گا کہ یہ مسلمان ہے یہ کافر ہے دونوں کے برتاؤ کو دیکھ کر لوگ پہچانیں گے کہ اس کا برتاؤ مسلمانوں جیسا ہے اس کا نہیں اب تو ہماری یہ حالت ہے کہ ہماری تقریر و تحریر معاملات و معاشرت اسلام سے بہت دور جا پڑی ہے حتیٰ کہ صورت میں بھی بہت کم امتیاز باقی ہے اس حالت میں اسلام کو ترقی کیونکر ہو اور اگر اسی حالت میں رہ کر تم نے ترقی بھی کی تو یاد رکھو وہ اسلام کی ترقی نہ ہوگی بلکہ محض مال و دولت کی ترقی ہوگی۔ مگر اس طرف لوگوں کو بہت ہی کم توجہ ہے اپنی اصلاح کی فکر ہی نہیں صرف اسلام کے تنزل کا نوحہ کرتے رہنا ان کا کام رہ گیا ہے حالانکہ خود اسلام میں کوئی نقص یا ضعف کچھ نہیں ہوا ایک دفعہ میں ایک مدرسہ کے جلسہ میں شریک ہوا وہاں ایک واعظ صاحب نے اپنے وعظ میں کہا کہ آج کل اسلام کی حالت بیوہ عورت جیسی ہے جس طرح وہ اپنے سرپرست کے مرجانے سے تیری میری دست نگر ہوجاتی ہے اسی طرح اسلام تمہارا منہ تک رہا ہے اس لئے اعانت اسلام کی سخت ضرورت ہے پھر اخیر میں اعانت کا طریقہ یہ بتلایا کہ مدرسہ میں چندہ دو۔ مجھے یہ مضمون بہت ناگوار ہوا۔

جب میری باری آئی تو میں نے کہا کہ اسلام کی حالت بیوہ جیسی عورت کیسوں ہونے لگی ہاں تم خود رونڈوے ہو گئے ہو گے اپنے ضعف کو اسلام کی طرف کیوں منسوب کرتے ہو اسلام ہرگز ضعیف نہیں ہوا بلکہ حقیقت میں تم ہی ضعیف ہو رہے ہو اور اسلام کی طرف تمہارا اس ضعف کو منسوب کرنا ایسا ہے جیسے ہمارے یہاں ایک عورت نے عید کا چاند دیکھا تھا اس وقت وہ بچے کو پاخانہ کرا رہی تھی جلدی میں اُسے کپڑے سے پونچھ کر ناک پر انگلی رکھ کر چاند دیکھنے لگی عورتوں کی عادت ہوتی ہے کہ اکثر ناک پر انگلی رکھ کر بات چیت کیا کرتی ہیں انگلی میں کہیں پاخانہ لگا رہ گیا تھا تو وہ کیا کہتی ہے۔ اوئی اب کے چاند سڑا ہوا کیوں نکلا۔ اس بھلی مانس نے اپنی انگلی کی تو خبر نہ لی چاند کو سڑا ہوا بتلا دیا یہی ہماری حالت ہے کہ اپنے ضعف کی تو خبر نہیں لیتے اسلام کو ضعیف بتلاتے ہیں حالانکہ اسلام کی اب بھی وہی حالت ہے جو پہلے تھی ؎

ہنوز آں ابرِ رحمت دُرفشان ست خم و خمخانہ با مہر و نشان ست

(اب بھی وہ ابر رحمت درفشاں ہے خم اور خمخانہ مہر و نشان کے ساتھ موجود ہے)

سڑے ہوئے تم خود ہو رہا ہے تاب اسلام کو سڑا ہوا کیوں بتلاتے ہو باقی یہ جو میں نے ابھی کہا تھا کہ اسلام مسلمانوں کے ساتھ لگا ہوا ہے ان سے جدا اور الگ نہیں ہے اس لئے مسلمانوں کا تنزل اسلام کا تنزل ہے اور ان کی ترقی اسلام کی ترقی ہے یہ مضمون اس سے متعارض نہیں کیونکہ اس سے میری مراد ظہور اسلام ہے نہ کہ حقیقت اسلام یعنی اسلام کا ظہور مسلمانوں کے تابع ہے اور مسلمانوں کو دیکھ کر ہی دوسری قوموں کو اسلام کا ظہور معلوم ہوتا ہے ورنہ حقیقتِ اسلام ایک مستقل شئے ہے وہ کسی کے تابع نہیں کیونکہ وہ نام ہے قرآن و حدیث کی تعلیم کا اور یہ اسلام کسی وقت کمزور نہیں ہو سکتا یہ تو ابتداء سے جیسا ہے اسی حال پر موجود ہے اس کا توصرف تو کسی وقت بھی نہیں ہو سکتا اور نہ ان شاء اللہ کبھی ہوگا البتہ جس اسلام کا لوگ توصرف کر رہے ہیں وہ مسلمانوں ہی کے تابع ہے اور اس کی ترقی و تنزل کو میں نے مسلمانوں کی ترقی و تنزل کے تابع کہا تھا۔

خلاصہ یہ کہ اسلام کے دو وجود ہیں ایک اصلی ایک عارضی وجود اصلی اس کا مستقل ہے

اور اس میں کبھی ضعف نہیں آسکتا اور وجوہ عارضی اہل اسلام کے ساتھ لگا ہوا ہے اس کی قوت و ضعف مسلمانوں کی حالت کے تابع ہے اور اسی کا آج کل نوحہ ہورہا ہے جو کہ درحقیقت اپنا ہی نوحہ ہے! صاحبو اسلام کی حالت جب خراب ہوتی جب یہودیت و نصرانیت کی طرح اسلامی احکام میں بھی خلط ہو جاتا مگر خدا کے فضل سے احکام اسلامی اب تک اسی آب و تاب کے ساتھ اپنی اصلی حالت پر رہیں گو اہل باطل نے تحریف کی بہت کوشش کی ہے مگر لفظی تحریف تو کبھی ہو ہی نہ سکی چنانچہ قرآن کو خدا تعالیٰ نے حفظ کے ذریعہ سے ایسا محفوظ کیا ہے کہ اس میں ایک حرف کی بھی کمی بیشی نہیں ہوسکتی احادیث میں وضاعین نے اپنی طرف سے کچھ باتیں ٹھونسنا چاہی تھیں تو حق تعالیٰ نے محدثین کی جماعت کو پیدا کر دیا جنہوں نے رجال و سند سے بحث کر کے وضاعین کی وضع کو نکال باہر کیا حدیث کی اس طرح حفاظت کی گئی البتہ تحریف معنوی اہل اہوا، ہر زمانہ میں کرتے رہتے ہیں مگر وہ بھی چند روز کے بعد مٹ جاتی اور محرفین ہی کے ساتھ انکی تحریف بھی چل دیتی ہے اور اسلام کی ہر وقت وہی حالت رہتی ہے ؎

ہنوز آں ابر رحمت دُرفشاں ست خم و خمخانہ با مہر و نشان ست

(اب بھی وہ ابر رحمت درفشاں ہے خم و خمخانہ مہر و نشاں کے ساتھ موجود ہے)

اور تماشا یہ ہے کہ تحریف معنوی بھی اس وقت تک نہیں چلتی جب تک اس کی تائید میں کوئی شرعی دلیل نہ پیش کی جائے اگر کوئی شخص اپنی طرف سے ایک بات نکال کر یوں چاہے کہ مسلمان اس کو میرا قول سمجھ کر اسلام میں داخل کرلیں تو ایسا کبھی نہیں ہوسکتا کیونکہ مسلمانوں کے عقیدہ میں یہ بات بیٹھی ہوئی ہے کہ اسلام میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی اپنی طرف سے کسی بات کا اضافہ بدون حکم الٰہی کے نہیں کرسکتے تھے تو دوسروں کا تو شمار ہی کیا ہے۔ بس تحریف بھی کسی شرعی حکم کے تابع ہو کر ہی کچھ روز تک چلتی ہے اور واقعی یہ غایت حفاظت ہے چنانچہ ایک دنیا پرست عالم نے کسی شخص کے لئے اس کی ساس کو حلال کرنا چاہا تھا کیونکہ اس ترکیب سے ان کو ایک ہزار کی رقم ملتی تھی تو اب دیکھئے یہ تحریف کیونکر چلی محض اتنی بات کہنے پر وہ شخص قانع نہیں ہوا کہ بس میں جائز کرتا ہوں تو بلا تکلف جائز سمجھ بلکہ ان مولوی

صاحب کو اس کے لئے باقاعدہ فتویٰ مرتب کرنا پڑا جس میں ظالم نے دلائل شرعیہ میں تحریف کی اور اسی ترکیب کا معاوضہ اس نے ایک ہزار روپیہ لیا تھا چنانچہ اس نے لکھا کہ ساس کہتے ہیں منکوحہ کی ماں کو اور ابھی تک اس کا منکوحہ ہونا ہی متحقق نہیں کیونکہ ہندوستان کی عورتیں جاہل ہیں اکثر ان کی زبان سے کلمات کفر نکل جاتے ہیں اور نکاح کے وقت لڑکی سے تجدید ایمان نہیں کرائی گئی لہذا غالب یہ ہے کہ وہ مرتدہ تھی جب کا نکاح درست نہیں ہوا تو وہ منکوحہ نہیں ہوئی تو اس کی ماں منکوحہ کی ماں نہیں ہوئی لہذا اس سے نکاح درست ہے رہا یہ کہ حرمت مصاہرت کا ثبوت تو زنا سے بھی ہو جاتا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ حرمت مصاہرت کا مسئلہ مختلف شافیہ ہے امام شافعی اس کے قائل نہیں لہذا حرمت مصاہرت کے بارہ میں ہم نے بضرورت امام شافعی کے مذہب کو اختیار کر لیا ہے تو دیکھئے اس عالم کی تحریف بھی اس ترکیب سے چلی کہ اس کو کھینچ تان کر ایک صورت فقہیہ کے تحت میں داخل کرنا پڑا گو وہ داخل ہو نہیں سکی کیونکہ اس شخص نے محض احتمال کی بنا پر اس عورت کو مرتدہ بتایا ہے اور یہ کسی طرح جائز نہیں واقعی جب عالم بگڑتا ہے وہ ستم ہی ڈھاتا ہے جاہل تو گناہ کر کے شرماتا بھی ہے کیونکہ وہ گناہ کو گناہ سمجھتا ہے مگر عالم اگر گناہ بھی کرتا ہے تو اس کو دین کے اندر ٹھونستا ہے نعوذ باللہ منہ اسی طرح ایک جگہ کسی آدمی نے اپنی علاتی بہن سے نکاح کیا تھا نہ معلوم وہ کمبخت بہن کیونکر راضی ہوگئی اس کی ماں نے کہا کہ کمبخت یہ تو نکاح نہیں ہوا حرام ہوا کہنے لگی واہ ہم تو اپنے بھائی ہی کے پاس رہیں گے تم کو کیا۔ واقعی بھائی سے زیادہ بہن کا حقدار کون ہے تو یہ شخص قابل وقت ہوگیا جس طرح اس نے اپنی بہن سے نکاح کرنا چاہا تھا اور یہی دلیل بیان کی تھی کہ اپنی بہن کا میں زیادہ مستحق ہوں اسی طرح اس شخص نے کیا پھر جب اس سے لوگوں نے سوال کیا کہ ظالم تونے بہن سے نکاح کس قاعدہ سے کیا یہ تو نص قطعی سے حرام ہے یعنی وَ اَخَوَاتُکُمْ (تمہاری بہن بھی حرام ہیں) کہنے لگا کہ اَخَوَاتُکُمْ سے اخوات کاملہ مراد ہیں یعنی حقیقی بہنیں لِاَنَّ الْمُطْلَقَ اِذَا اُطْلِقَ یُرَادُ بِہِ الْفَرْدُ الْکَامِلُ (مطلق کا جب اطلاق کیا جائے تو اس سے فرد کامل مراد ہوتا ہے)

تو اس ظالم نے بھی تحریف کر کے ایک شرعی قاعدہ کے تحت میں اس کو داخل کیا۔ اسی طرح ایک صاحب نے فتوے دیا کہ مَنْكُوْحَةُ الْجُدِّ (دادا کی منکوحہ) سے نکاح جائز ہے اور دلیل یہ بیان کی کہ مَا نَكَحَ اٰبَآؤُكُمْ (ان عورتوں سے بھی نکاح حرام ہے جن سے تمہارے باپوں نے نکاح کیا ہے) سے صرف منکوحۃ الاب مراد ہے باپ کی منکوحہ حالانکہ اجماعاً منکوحۃ الجد بھی اس میں داخل ہے پھر سُنا کہ بعد میں ان صاحب نے اس غلطی سے رجوع کیا غنیمت ہے تو گو لوگ دین میں ایسی معنوی تحریفیں کرتے رہتے ہیں مگر یہ بھی چلتی نہیں چند روز میں سب مٹ مٹا جاتی ہیں کیونکہ قرآن مجید میں جابجا خدا تعالیٰ کے وعدے ہیں کہ ہم اس دین کی حفاظت کریں گے اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (ہم نے ہی قرآن کو اتارا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں) (اور) هُوَ الَّذِىْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ (وہ وہ ذات ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا تاکہ اُس کو تمام دینوں پر غالب کر دیں اگرچہ مشرکین ناپسند کریں) اور حدیث میں ہے لَا يَزَالُ طَائِفَةٌ مِّنْ اُمَّتِىْ ظَاهِرِيْنَ عَلَى الْحَقِّ لَا يَضُرُّهُمْ مَنْ خَذَلَهُمْ حَتّٰى يَأْتِىَ اَمْرُ اللّٰهِ۔ کہ قرب قیامت تک ایک جماعت میری امت میں سے حق پر ہمیشہ قائم رہے گی اور اُن کو اس سے کچھ ضرر نہ ہوگا کہ لوگ ان کا ساتھ چھوڑ دیں۔ یہ جماعت اسلام کی خدمت اور احکام کی حفاظت کرتی رہے گی اور محرفین کی لفظی و معنوی تحریفات کو دین میں سے نکالتی رہے گی وہ کسی کی مخالفت کی پروا نہ کریں گے دوسری حدیث میں ان لوگوں کو بشارت دی گئی ہے۔ حضور صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں اِنَّ هٰذَا الدِّيْنَ بَدَاَ غَرِيْبًا وَسَيَعُوْدُ غَرِيْبًا فَطُوْبٰى لِلْغُرَبَاءِ۔ غریب کے معنی مفلس و نادار نہیں ہیں بلکہ عربی میں غریب کہتے ہیں پردیسی، اجنبی، بے یار و بے مددگار کو مطلب یہ ہوا کہ اسلام کی ابتدا بھی ایسی حالت میں ہوئی ہے کہ اس کے یار و مددگار کم تھے اور اخیر میں بھی اس کی یہی حالت ہو جائیگی

کہ اس کے مددگار کم ہوں گے اور جو لوگ مددگار ہونگے بھی ان کا ساتھ کوئی نہ دے گا تو اسلام کے معاونین بھی اس وقت بے یار و بے مددگار ہوں گے آگے ان کو بشارت ہے فَطُوْبٰی لِلْغُرَبَاءِ کہ ان بے یار و مددگار لوگوں کے لئے مبارکبا ہے اس سے معلوم ہوا کہ ایک زمانہ میں دین کے ناصر بہت کم ہو جائیں گے کیونکہ طائفہ کا اطلاق جماعت قلیل ہی پر ہوتا ہے خصوصاً جب لفظ امت کے مقابل لایا گیا ہے تو اس سے قلیل ہی مراد ہیں اور یہ بھی معلوم ہوا کہ ان ناصروں کے ساتھی بھی کم ہوں گے اور اس وقت یہی تھوڑی سی جماعت حق پر ہوگی یہی دین کو اصلی صورت میں ظاہر کریں گے۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ کسی جانب جماعت کثیرہ کا ہونا حقانیت کی دلیل نہیں۔

الغرض اسلام یہودیت و نصرانیت کی طرح ضعیف و کمزور نہیں ہو سکتا اس میں خلط ملت اور تحریف نہیں ہو سکتی اس لئے اسلام کا نوحہ کرنا کسی وقت بھی درست نہیں البتہ دین کو ہم لوگوں نے خود بگاڑ رکھا ہے یعنی لوگوں کی نظروں میں اپنی حرکتوں سے اس کو بدنام کر دیا ہے۔ کفار ہمارے اعمال و افعال کو دیکھ کر یہ سمجھتے ہیں کہ اسلام کی یہی تعلیم ہوگی اس لئے وہ اسلام پر اعتراض کرنے کی جرأت کرتے ہیں یا اسلام کو وحشی اور غیر متمدن مذہب بتلاتے ہیں اگر آج ہم اپنی اصلاح کر لیں تو کفار کی آنکھیں کھل جائیں کہ اسلام سے زیادہ تہذیب و تمدن کسی مذہب میں بھی نہیں بس اے صاحبو! تم اپنے ضعف کو اسلام کی طرف کیوں منسوب کرتے ہو اسلام ضعیف نہیں اس کی قوت ذاتی ہے عارضی نہیں اس کی اصلی قوت کبھی زائل نہ ہوگی ہاں وہ قوت جو ہر مذہب کو اپنے متبعین کے اعتبار سے حاصل ہوتی ہے اس میں کبھی ضعف تمہاری عارضی حالت کی وجہ سے ہو سکتا ہے اور ظاہر ہے کہ اس ضعف کا منشا ہم خود ہیں ہماری وجہ سے یہ ضعف پیدا ہوتا ہے تو اس کا علاج یہ ہے کہ تم اپنے ضعف کا علاج کرو اپنی اصلاح کر کے قوت پیدا کرو۔ ورنہ بدون اپنی اصلاح کے اسلام کا نوحہ کرنا ویسا ہی ہوگا جیسا کہ اس عورت نے چاند کو سڑا ہوا بتلایا تھا نیز جس طرح ایک حبشی جا رہا تھا

راستہ میں اسے ایک آئینہ پڑا ہوملا اٹھا کر دیکھا تو اس میں آپ کو اپنی دلفریب صورت نظر آئی جھلا کر پھینکدیا اور کہا کہ ایسا بدصورت تھا جب ہی تو کوئی تجھے یہاں پھینک گیا ہے تو جس طرح اس حبشی نے آئینہ میں اپنی صورت دیکھ کر یہ سمجھ لیا کہ آئینہ ہی کی یہ صورت ہے اسی طرح اسلام کے آئینہ میں آپ کو اپنا ضعف نظر آرہا ہے جس کو آپ اسلام کا ضعف سمجھتے ہیں۔ جیسے ایک بوڑھے میاں کی حکایت ہے کہ ان کا بچہ روٹی کھارہا تھا پاس لوٹا رکھا تھا اس نے جو لوٹے پر ہاتھ رکھا تو روٹی کا ٹکڑا اس کے ہاتھ سے لوٹے میں گر گیا۔ لڑکے نے جو اس میں سے نکالنا چاہا تو اس کو پانی میں اپنی صورت نظر آئی وہ سمجھا کہ لوٹے میں کوئی دوسرا لڑکا بیٹھا ہوا ہے وہ کہنے لگا کہ ابا اس نے میرا ٹکڑا چھین لیا ہے پوچھا کس نے کہا یہ جو لوٹے میں بیٹھا ہوا ہے۔ ابا جان نے جو جھک کر دیکھا تو ان کو اپنی صورت نظر آئی۔ آپ فرماتے ہیں کہ تف ہے تیری اوقات پر اتنی بڑی داڑھی لگا کر بچے کے ہاتھ سے ٹکڑا چھینتے شرم نہ آئی مجھ کو اس جگہ ایک نکتہ بھی بتلانا ہے کہ اسلام وایمان ایک ہیں یا دو۔ نصوص سے یہ فرق معلوم ہوتا ہے کہ اسلام اعمالِ ظاہرہ پر اطلاق کیا جاتا ہے اور ایمان عقائد کا نام ہے گو اطلاق میں دونوں متحد ہیں کیونکہ آجکل جو شخص صورت اسلام اختیار کئے ہوئے ہو ہم اس کو مومن ہی کہیں گے کیونکہ نفاق کا علم ہم کو نہیں ہوسکتا وحی بند ہوچکی ہے مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اسلام وایمان میں اطلاقاً بھی فرق تھا پس آجکل دونوں کا اتحاد ایک عارض کی وجہ سے ہے کہ ہم کو نفاق کا علم نہیں ہوسکتا ورنہ اصل میں فرق ضرور ہے پس یہ بھی خوشی کی بات ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے اسلام ہی کی شکایت فرمارہے ہیں ایمان کی شکایت نہیں فرماتے اس سے معلوم ہوا کہ جس خاص زمانہ میں مسلمانوں کے اعمال میں ایسا تغیر آجائے کہ ان کا اسلام برائے نام رہ جائے یہ ضرور نہیں کہ ایمان بھی برائے نام رہ جائے ممکن ہے کہ عقائد ضروریہ توحید ورسالت وقرآن وآخرت میں تغیر نہ آئے عقائد درست رہیں چنانچہ بحمد اللہ اس وقت تک تو اکثر مسلمانوں کے عقائد درست ہیں گو بعض فروعی اختلاف بدعت وسنت وتقلید وعدم تقلید پیدا ہوگئے ہیں مگر یہ نزاع ضروریات میں نہیں

اب جبکہ رسم اور اسم کے معنی اور اسلام کے درجات معلوم ہو گئے تو اس سے اس کی وجہ بھی معلوم ہو گئی ہوگی کہ اسلام کی بابت تو یہ شکایت فرمائی گئی کہ لَا یَبْقٰی مِنَ الْاِسْلَامِ اِلَّا اِسْمُهٗ (اسلام سے صرف اس کا نام ہی نام باقی رہ جائے گا۔) اور قرآن کے متعلق فرمایا کہ لَا یَبْقٰی مِنَ الْقُرْاٰنِ اِلَّا رَسْمُهٗ یعنی قرآن کے نقوش ہی رہ جائیں گے حاصل اس وجہ کا یہ ہے کہ قرآن میں ایسا تغیر نہیں ہوا کہ غیر قرآن قرآن مشہور ہو گیا چنانچہ قرآن آپ کے سامنے موجود ہے قدیم سے قدیم نسخوں کا مقابلہ کر کے دیکھ لو ایک حرف کا فرق نظر نہ آئے گا بشرطیکہ اہل مطابع نے تصحیح کا پورا اہتمام کیا ہو۔ اور اگر ان لوگوں سے کچھ کوتاہی ہوئی ہے وہ بھی سب کو بلا اختلاف معلوم ہے لہٰذا یہ نہیں کہا جا سکتا کہ قرآن کا کسی وقت نام ہی نام رہ جائے گا صورت بھی نہ رہے گی۔ بلکہ صورت قرآن ہمیشہ رہے گی۔ البتہ اسلام کی اُس خاص وقت میں صورت بھی نہ رہے گی بلکہ صرف نام ہی رہ جاوے گا اس سے خود یہ بات ظاہر ہے کہ رسم کا درجہ اسم سے بڑھا ہوا ہے اس پر اگر کسی کو یہ سوال ہو کہ کیا ہمارا اسلام صورتِ اسلام بھی نہیں حالانکہ ہم نماز روزہ وغیرہ بہت کچھ کرتے ہیں تو سمجھو کہ محاورات میں اعمال و اقوال کے متعلق اکثر کا اعتبار ہوتا ہے مثلاً ایک بستی میں آپ کے دشمن زیادہ ہوں اور دوست ایک دو ہوں تو آپ کہا کرتے ہیں کہ فلاں بستی ساری میری دشمن ہے اسی طرح ایک شخص آپ کے ساتھ دشمنی کے برتاؤ زیادہ کرتا ہے اور دوستی کے کم تو اس کو دشمن ہی کہا جاتا ہے دوست برائے نام بھی نہیں کہا جاتا۔ اس قاعدہ پر نظر کر کے دیکھا جائے کہ اس وقت مسلمانوں میں نماز روزہ ادا کرنے والے کتنے ہیں معلوم ہو جائیگا کہ بہت کم ہیں زیادہ وہی لوگ ہیں جن کی صورت و وضع اعمال و اقوال ہی شریعت سے بہت دور ہیں تو مجموعہ پر نظر کر کے یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ مسلمانوں میں اسلام کا نام ہی رہ گیا صورت بھی نہیں رہی کیونکہ اسلام کا مصداق تو یہی اعمال ظاہرہ تھے۔ پھر جو لوگ نماز وغیرہ کرتے بھی ہیں اُن میں بھی یہ دیکھا جائے کہ

ایسے کتنے آدمی ہیں جن کی نماز صورت میں درست ہے قاعدہ کے موافق ہے سارے مجموعہ پر نظر کر کے اوسط یہی نکلے گا کہ اکثر کی نماز خراب ہے غرض ہماری حالت یہ ٹھہری کہ اکثر اعمال میں حقیقت تو کیا ہوتی صورت بھی کامل نہیں کیونکہ عبادت کی حقیقت تو یہ ہے جس کو ایک حدیث میں اس طرح بتلایا گیا ہے

اَنْ تَعْبُدَ اللّٰہَ کَاَنَّکَ تَرَاہُ فَاِنْ لَمْ تَکُنْ تَرَاہُ فَاِنَّہٗ یَرَاکَ۔

حق تعالٰے کی عبادت اس طرح کرو جیسے گویا تم اس کو دیکھ رہے ہو کیونکہ تم اگر نہیں دیکھتے تو وہ تو تم کو دیکھ رہے ہیں اور اس کا مقتضا بھی عبادت کا اسی طرح کرنا ہے جیسا اگر تم دیکھتے ہوتے اگر اس مراقبہ کے ساتھ نماز ادا کی جائے تو اس وقت نماز کی حقیقت موجود ہو گی مگر ایسی نماز تو بھلا کون پڑھتا ہے اس لئے حقیقت کا تو پتہ ہی نہیں لیکن حقیقت کامل نہ ہو تو کم از کم صورت تو کامل ہوتی افسوس یہ ہے کہ ہمارے اعمال کی صورت بھی خراب ہے مثلاً نماز ہی میں قیام کا ادب یہ ہے کہ نظر سجدہ گاہ پر رہے ہماری حالت یہ ہے کہ نظر سجدہ کی جگہ سے بہت آگے رہتی ہے چنانچہ نماز میں سر اٹھا کر کھڑے ہوتے ہیں بعضے دیواروں پر چھت پر نظر دوڑاتے ہیں۔ قرأت کا ادب یہ ہے کہ ہر لفظ تدبر و فکر کے ساتھ زبان سے نکالیں، یہاں یہ حالت ہے کہ آموختہ سا یاد کر لیا ہے کھڑے ہوئے اور حافظوں کی طرح آموختہ سنا دیا۔ نیز قرات کا یہ بھی ادب ہے کہ ہمیشہ کے لئے چھوٹی ہی سورت متعین نہ کی جائے ہماری حالت یہ ہے کہ ہم نے چھانٹ کر چھوٹی چھوٹی سورتیں مقرر کر لی ہیں اِنَّا اعطینا، قُل ھُوَ اللّٰہ، لاِیلٰف قریش، وَالعصر بس ساری نمازیں انہی سے ادا ہوتی ہیں پھر غضب یہ ہے کہ ان چند سورتوں کی بھی تصحیح کا خیال نہیں کرتے الحمد کو الہمد پڑھتے ہیں اِنّا اعطینا کو اِنّا آیتنا پڑھتے ہیں جس کو عربی زبان کوئی نہیں کہہ سکتا کیونکہ الہمد یہ عربی لغت نہیں ہے وعلیٰ ہذا القیاس رکوع کا قاعدہ یہ ہے کہ سر اور کمر اور سرین سب برابر بہ سطح مستوی کی طرح

رہیں یہاں یہ حالت ہے کہ کمر اونچی رہتی ہے سر کبھی بہت جھکا ہوا ہے کبھی اونچا اٹھا ہوا رکوع میں نظر پیروں پر رہنی چاہیئے ہماری نگاہ بہت دور پہونچتی ہے پھر رکوع سے سر اٹھا کر سیدھا کھڑا ہونا واجب ہے مگر بہت لوگ سیدھی طرح کھڑے نہیں ہوتے بس یوں ہی سر کا ذرا سا اشارہ کر کے دہم سے سجدہ میں گر پڑتے ہیں بعض لوگ جلدی میں تین بار بھی تسبیح پوری نہیں کرتے پھر سجدہ کی ہیئت بھی خلاف قاعدہ بنا رکھی ہے کہنیاں زمین پر رکھی ہوتی ہیں بازو اچھی طرح نہیں کھلتے کمر جھکی ہوئی رہتی ہے حالانکہ سجدہ میں کمر اونچی رہنی چاہیئے۔ پھر سجدہ سے سر اٹھا کر سیدھا بیٹھ کر دوسرا سجدہ کرنا چاہیے بہت آدمی سجدہ کر کے سیدھی طرح نہیں بیٹھتے بس ذرا سا سر کا اشارہ کر کے دوسرا سجدہ شروع کر دیتے ہیں تو بھلا اس حالت میں صورت بھی درست کہاں رہی صورت تو اس کو کہتے ہیں کہ عالمگیر جب تخت نشین ہوئے تو مبارک باد کے لئے جہاں سب لوگ آئے وہاں ایک بہروپیہ بھی آیا تھا بادشاہ متبع شریعت تھے بہروپیہ کو انعام کس مد سے دیں اور تقویٰ بھگاریں تو عرفاً شان شاہی کے خلاف اس لئے آپ نے ایک لطیف حیلہ سے ٹالنا چاہا فرمایا کہ انعام دیا جاتا ہے کمال پر تم ہم کو اپنا کمال دکھلاؤ تب انعام دیں گے اور تمہارے کمال کا معیار یہ ہے کہ ایسا بہروپ اختیار کرو جس میں ہم تم کو پہچان نہ سکیں۔ عالمگیر کو اپنی فراست پر ناز تھا وہ سمجھتے تھے کہ یہ جس بہروپ میں بھی آئے گا میں ضرور پہچان لوں گا اور واقعی اُس نے مختلف قسم کی صورتیں بنائیں مگر عالمگیر نے ہر دفعہ پہچان لیا آخر جب عالمگیر نے دکن کا سفر کیا تو جتنے شہر اور قصبے راستہ میں آتے تھے سب کے حکام کو اطلاع دی گئی کہ جس شہر میں جو بزرگ ہوں ان کے نام اور احوال سے اطلاع دی جائے یہ بہروپیہ بھی راستہ میں ایک شہر کے قریب کسی پہاڑی پر جا بیٹھا اور اپنا چیلا شہر میں چھوڑ دیا اس نے مشہور کرنا شروع کیا کہ فلاں پہاڑ پر ایک بڑے پہونچے ہوئے بزرگ رہتے ہیں یہاں تک کہ اسکی طرف رجوعات شروع ہوئیں اور بڑی شہرت ہوگئی۔ چنانچہ بزرگوں کی فہرست میں حاکم شہر نے اس کا نام بھی لکھ بھیجا عالمگیر قطع منازل کرتے ہوئے اور ہر شہر کے بزرگوں سے ملتے ملاتے دعائیں لیتے ہوئے یہاں بھی پہونچے تو ان حضرت سے

ملنے کا ارادہ ہوا لیکن پہلے وزیر کو احتیاطاً بھیجا کہ جاکر دیکھو یہ شخص واقعی بزرگ ہے یا نہیں وزیر نے جو آکر ملاقات کی تو بہروپیہ نے سلوک و تصوف کے بہت سے مضامین اور علوم و معارف بیان کئے جو وزیر کے خواب میں بھی نہ آئے تھے پہلے زمانہ میں یہ لوگ علوم حاصل کرتے تھے محض پیشہ ہی نہ تھا بلکہ ایک فن ہوگیا تھا۔ وزیر نے واپس آکر بہت تعریف کی کہ میں نے تو ایسا بزرگ ایک بھی نہیں دیکھا اگر آپ اُن سے ملاقات نہ کریں گے تو میں یہ سمجھوں گا کہ آپ نے بزرگوں کو دیکھا ہی نہیں عالمگیر کو یہ سنکر اشتیاق زیادہ ہوا زیارت کو چلے جاکر بیٹھے تو ان حضرت نے عالمگیر کے سامنے بھی استغناء و توکل خوب ظاہر کیا بزرگوں کے ملفوظات و حکایات و علوم خوب بیان کئے جن سے عالمگیر کو بڑی خوشی ہوئی اس کے بعد بادشاہ نے بیس ہزار اشرفیوں کے توڑے نذر کئے بہروپیہ نے واپس کردیئے اور کہا کہ اپنی طرح مجھ کو بھی دنیا پرست بنانا چاہتے ہو جاؤ لیجاؤ۔ عالمگیر نے خجلت کے ساتھ نذر اٹھا لی اور اجازت لے کر واپس ہوئے۔ راستہ میں بادشاہ و وزیر دونوں تعریف کرتے جارہے تھے کہ حقیقت میں ایسا بزرگ نظر سے نہیں گذرا اس وقت بہروپیہ صاحب بھی پیچھے پیچھے جارہے تھے بادشاہ کی جو نظر پڑی تو اس نے جھک کر سلام کیا اور وہی دعائیہ کلمات جو بہروپیوں کی اصطلاح ہے عرض کئے۔ عالمگیر نے کہا آہا یہ بزرگ آپ تھے واقعی یہ نقل تم نے خوب کی ہم بالکل نہیں پہچان سکے۔ پھر خیمہ میں پہونچکر پانچسو روپیہ انعام دیئے جس کو بہروپیہ نے بڑی خوشی سے قبول کیا اس کے بعد عالمگیر نے اس سے سوال کیا کہ ایک بات تو بتلاؤ تم نے بیس ہزار اشرفیاں تو ناک پر مار کر واپس کردیں اور پانچسو روپیہ اس خوشی سے لے لئے اس کی کیا وجہ تھی، اگر تم اس وقت ساری اشرفیاں لے لیتے تو حقیقت معلوم ہوجانے کے بعد بھی ہم اس کو تم سے واپس تھوڑا ہی لیتے۔ اس کا جو جواب بہروپیہ نے دیا وہ سننے کے قابل ہے۔

کہا حضور یہ میں خوب جانتا تھا لیکن اس وقت میں نے صوفیہ کا بہروپ بنا رکھا تھا اس وقت اگر میں نذر قبول کرلیتا تو نقل غلط ہوتی جو میرے کمال کے لئے دھبہ تھا

جب نقل کامل ہو چکی تواب جو کچھ حضور نے عطا فرمایا ہے یہ میرے کمال کا صلہ ہے اس کو میں نے خوشی سے قبول کیا کیونکہ میرا گذارا اسی پر ہے۔ صاحبو! نقل کے یہ معنی ہیں جو اس بہروپیہ نے سمجھے۔ افسوس یہ ہے کہ ہم لوگ نماز روزہ کی نقل بھی تو پوری نہیں کرتے۔ ہمیں صورت صلوٰۃ کی اتنی رعایت تو کرنی چاہئے جیسے اس بہروپیہ نے صورت بزرگی کی رعایت کی۔ پھر صورت ظاہراً کامل ہونے کے بعد بھی وہ نقل ہی ہو گی حقیقت جب بھی نہ ہو گی حقیقت تو اس وقت ہو گی جبکہ قلب حاضر ہو اور حضور قلب کے معنی فنا کے نہیں ہیں کہ ایسی یکسوئی ہو کہ کسی چیز کی بھی خبر نہ ہو یہ تو اکابر کی باتیں ہیں میں تو ایک معمولی بات بتاتا ہوں جس پر ہر ایک کو عمل سہل ہو مگر افسوس تو یہ ہے کہ ہم واجد علی شاہ کے احدی بنے ہوئے ہیں کہ آسان سے آسان کام بھی ہم سے نہیں ہوتا واجد علی شاہ کے زمانہ میں کاہلوں کی ایک جماعت تھی جو احدی کے لقب سے مشہور تھے وہ کاہلی میں حد سے بڑھے ہوئے تھے جن کا ایک قصہ یہ ہے کہ دو احدی ایک جگہ جمع تھے ایک لیٹا ہوا ایک بیٹھا ہوا سامنے سے ایک سوار گذرا تو لیٹے ہوئے احدی نے اسے پکارا کہ اے میاں سوار اے میاں سوار ذرا خدا کے واسطے یہاں آنا، وہ سمجھا کہ کوئی کام ہو گا۔ آیا پوچھا بتلا کیا کہتا ہے کہنے لگا کہ یہ بیر جو میرے سینہ پر رکھا ہوا ہے ذرا میرے منہ میں ڈال دے اس نے کہا کم بخت اتنا کام تجھ سے نہیں ہو سکتا تھا جو میرا راستہ کھوٹا کیا پھر اس کے ساتھی سے کہا کہ ابے اتنا کام تو نے بھی نہ کر دیا تو وہ کہنے لگا کہ بس میاں ایسی بات مجھ سے نہ کہنا میں دوں گا اس کے منہ میں بیر اس سے اتنا تو ہو ہی نہ سکا کہ کل میں لیٹا تھا اور میرا منہ کھلا تھا ایک کتا آ کر منہ میں پیشاب کرنے لگا اس کو ہٹا ہی دیتا سوار نے دونوں پر لاحول پڑھی کہ کمبخت دونوں منحوس ہیں۔ واقعی دین کے بارہ میں ہماری حالت بالکل ان احدیوں کے مشابہ ہے کہ ہم سے دین کا آسان سے آسان کام بھی نہیں ہو سکتا سو حضور قلب کی حقیقت نہایت سہل ہے مگر ہوتی ہے کرنے سے وہ ایک حدیث سے معلوم ہوتی ہے حضور صلی اللہ علیہ

وسلم فرماتے ہیں مَنْ صَلّیٰ رَکْعَتَیْنِ مُقْبِلاً عَلَیْهِمَا بِقَلْبِهٖ لَمْ یُحَدِّثْ فِیْهِمَا نَفْسَهٗ دَخَلَ الْجَنَّةَ جو شخص دو رکعتیں اس طرح پڑھ لے کہ دل سے ان پر متوجہ ہو اور اپنے جی سے باتیں نہ کرے وہ جنت میں داخل ہوگا۔ اس سے حضورِ قلب کی یہ حقیقت معلوم ہوئی کہ نماز پر دل سے متوجہ ہو یعنی ہر رکن کے ادا کرنے میں یہ بات پیشِ نظر رہے کہ میں نماز پڑھ رہا ہوں پھر ہر رکن کو نماز کے قاعدہ پر ادا کرے بتلائیے تو یہ کیا مشکل کام ہے۔ اگر کسی کو خطرات و وساوس آتے رہیں تو یہ حضورِ قلب کے منافی نہیں پس اتنا ضروری ہے کہ خود وساوس نہ لاوے اور جو آتے ہوں ان کی طرف التفات نہ کرے دیکھئے کس قدر تو آسان مگر ہم سے یہ بھی نہیں ہوسکتا وجہ ساری یہ ہے کہ دین کا اہتمام ہی قلب میں نہیں رہا اب بتلائیے جب ہمارے اعمال کی صورت بھی شریعت کے موافق نہیں تو یہ کیونکر کہا جائے کہ ہمارے اسلام میں صورت اسلام ہے بس یہی کہا جائیگا کہ اسلام نام کا رہ گیا ہے پھر زیادہ افسوس یہ ہے کہ اگر مسلمانوں میں کسی کو دین کا تھوڑا بہت خیال بھی ہوتا ہے تو وہ دین و اسلام کی ساری اصلاح کا طریقہ صرف بیعت ہونے کو سمجھتا ہے کہ بس کسی سے مرید ہو جاؤ پھر خود بخود اصلاح ہو جائے گی بلکہ بعض تو یہ سمجھتے ہیں کہ پیر ہم سب کی طرف سے کافی ہو جائے گا ہمیں کچھ کرنے کی ضرورت ہی نہیں پس یہ لوگ اعمال کا مطلق اہتمام نہیں کرتے صرف پیروں کے نذرانہ کا خیال رکھتے ہیں کہ ان کی سالانہ نذر قضا نہ ہوجائے سال بھر کی نماز روزہ قضا ہوجائے اور یہ مذاق بگاڑا ہے ان دوکاندار پیرزادوں نے کہ انہوں نے عوام کو یہی سمجھا رکھا ہے کہ بس سلسلہ میں داخل ہو جانا نجات کے لئے کافی ہے تمہیں اور کچھ کرنے کی ضرورت نہیں اس لئے عوام انہیں کے بھروسہ پر رہتے ہیں۔ ایک ایسے ہی پیر اپنے مریدوں کے گاؤں میں گئے تھے ایک گوجر کے مہمان ہوئے اُس نے کہا پیر توں تو (یعنی تو تو) بڑا دُبلا ہو رہا ہے۔ پیر صاحب بولے کہ دُبلا کیونکر نہ ہوں تم لوگ نماز نہیں پڑھتے مجھے سب کی طرف سے نماز پڑھنی پڑتی ہے روزہ نہیں رکھتے مجھے سب کی طرف سے روزے رکھنے پڑتے ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ مجھے سب کی طرف سے پل صراط پر چلنا پڑتا ہے جو بال سے باریک اور تلوار سے تیز ہے اس مصیبت سے دُبلا ہو گیا۔ گوجر بولا وَہ وَیہ (یعنی تعجب) توں تو بڑا کام کرے ہے جا میں نے فلانا موجی کا

کھیت تجھ کو دیا۔ پیر صاحب بڑے خوش ہوئے مگر ساتھ ہی یہ بھی فکر ہوئی کہ ان گنواروں کا کیا اعتبار ایسا نہ ہو کہ پھر زبان سے پھر جائے اس لئے کہا کہ چودھری جی پھر کھیت پر قبضہ کرادو۔ اس نے کہا ہاں ہاں چل ابھی قبضہ کرلے اس نے پیر کو تو آگے کیا اور خود پیچھے رہا اور ایسے راستہ سے لے چلا جہاں ایک گول چل رہی تھی اور بعض جگہ ڈول تازی بنی ہوئی تھی وہاں پھسلن بہت ہوتی ہے۔ پیر صاحب ایک جگہ پھسل کر گرے تو پیچھے سے چودھری نے ایک لات دی کہ ابے توں تو یوں کہے تھا کہ میں پل صراط پر چلا کروں ہوں جو بال سے بھی زیادہ باریک ہے تو ایک بالشت کی ڈول پر تو چل ہی نہیں سکتا پلصراط پر کیا چلتا ہوگا تو جھوٹا ہے جا میں کھیت نہیں دیتا واقعی وہ پیر تو اسی قابل تھا۔ اور خیر بعض لوگ اتنے نادان تو نہیں ہیں اس لئے وہ خود بھی عمل کرتے ہیں مگر امراض قلب کے علاج میں وہ بھی کوشش نہیں کرتے بس اُن کی زیادہ دوڑ یہ ہوتی ہے کہ جب گناہوں کا خیال آیا تو پیر کے پاس آئے کہ حضور ایسی توجہ کر دیجئے کہ گناہوں سے نفرت ہوجائے چاہے پیر صاحب کو خود بھی نفرت نہ ہو بلکہ معاصی کی طرف میلان ہوتا ہو کیونکہ میلان تو نقص نہیں ہاں اس پر عزم یا عمل کرنا یہ نقص ہے پس زوال میلان کی طلب کرنا گویا فرشتہ ہوجانے کی درخواست کرنا ہے انسان تو میلان سے خالی نہیں ہوسکتا اس کا تو کمال ہی یہ ہے کہ باوجود میلان کے پھر معاصی سے بچتا رہے بدون میلان کے معاصی سے بچنے میں کیا کمال ہوگا تو یہ بھی ان کی غلطی ہے کہ توجہ ہی پر بھروسہ کئے بیٹھے ہیں۔

صاحبو! جو کام تمہارے کرنے کا ہے وہ دوسروں کے کئے نہ ہوگا اگر دوسروں کے کئے کچھ ہوسکتا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم ابو طالب کا کام کرنے کے لئے کیوں نہ کافی ہوجاتے۔ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے بہت ہی کوشش کی کہ ابو طالب ایمان لے آئیں مگر وہ ایمان نہ لائے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی کچھ نہ کرسکے اس پر یہ آیت نازل ہوئی اِنَّكَ لَا تَهْدِىْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِىْ مَنْ يَّشَآءُ (بے شک جس کو تم محبوب رکھتے اس کو ہدایت نہیں کرسکتے لیکن اللہ تعالیٰ جس کو چاہیں ہدایت دیں)

دیکھئے بچہ اگر بیمار ہو تو شفا اس کے ہی پینے پینے سے ہوگی باپ کا کام یہ ہے کہ نسخہ لکھوائے دوا لا دے اس کو تیار کر دے مگر یہ تو اس کا کام نہیں کہ خود پی بھی لے اور اس کے پینے سے لڑکا اچھا ہو جائے اگر لڑکا دوا نہ پئے تو ماں باپ کیا کر سکتے ہیں شفا تو اسی کے پینے سے ہوگی یہی حال اصلاح نفس کا ہے، چنانچہ نص میں اس کی تصریح ہے وَاَنْ لَّیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی (انسان کے لئے وہی ہے جس کی کوشش کرے) معتزلہ نے اس آیت سے ایصال ثواب کی نفی پر استدلال کیا ہے یہ غلطی ہے کیونکہ اس جگہ حصر حقیقی نہیں بلکہ اضافی ہے اور مطلب یہ ہے کہ جو بات عمل پر موقوف ہے وہ بدون عمل کے حاصل نہ ہوگی بلکہ اپنے ہی عمل سے حاصل ہوگی اور ثواب ہر جگہ عمل پر موقوف نہیں ہے چنانچہ دیگر نصوص ایصال ثواب یا تسبب ثواب کے اس پر شاہد ہیں یہ بات کام کی اس آیت کے متعلق ابھی ذہن میں آئی ہے جو بہت بے تکلف ہے۔

غرض میں یہ کہہ رہا تھا کہ حضور قلب کی حقیقت حدیث کے اس لفظ سے معلوم ہو رہی ہے مُقْبِلًا عَلَیْهِمَا بِقَلْبِهٖ (ان پر دل سے متوجہ ہو) تو یہ کیا مشکل کام ہے کہ اپنی توجہ کو ادھر ادھر نہ لے جاؤ بتلایئے اس میں کیا دشواری ہے مگر ہماری حالت یہ ہے کہ اس کا بھی ذرا اہتمام نہیں نمازیں ہی تمام وساوس ہم کو سوجھتے ہیں غرض حقیقت صلوٰۃ تو حضور قلب سے حاصل ہوتی ہے اور صورت صلوٰۃ اس طرح حاصل ہوگی کہ کوئی کتاب مسائل کی جس میں نماز کے فرائض و واجبات و سنن و مستحبات بیان ہوئے کر پڑھو اور آجکل اردو میں ایسے رسائل بکثرت شائع ہو گئے ہیں اگر حضور قلب ابھی حاصل نہ ہو سکے تو کم از کم صورت صلوٰۃ تو کامل کر لو۔ اور حضور کے لئے کوشش کرتے رہو اس وقت یہ کہا جائے گا کہ آپ کی نمازیں صورت صلوٰۃ موجود ہے۔ یہ تو صرف نماز کا بیان تھا اس کے بعد اپنی ساری باتوں کو دیکھو، لین دین کو اور معاملات و معاشرات کو تو ہر شعبہ میں آپ کو معلوم ہوگا کہ ہماری کوئی حالت ظاہر میں بھی شریعت کے مطابق نہیں لہذا اکثر کے اعتبار سے یہ ارشاد بالکل صحیح ہے کہ

لَا یَبْقٰی مِنَ الْاِسْلَامِ اِلَّا اِسْمُہٗ (اسلام سے اس کا نام ہی باقی رہ جائیگا) جب ہمارا اسلام برائے نام ہے اور ضرورت ہے ترقی کی چنانچہ ترقی کی ضرورت پر سب کا اتفاق ہے اور ترقی ہوتی ہے تدریجاً تو ہم کو چاہئے کہ پہلے درجۂ اسم سے درجۂ رسم تک ترقی کریں پھر ان شاء اللہ تعالیٰ درجۂ رسم سے حقیقت تک بھی وصول ہو جائیگا اس سے معلوم ہوا کہ حالت موجودہ بھی بیکار و فضول نہیں یہ بھی غنیمت ہے۔ ع۔ بلا بودے اگر ایں ہم نبودے (مصیبت ہوتی اگر یہ بھی نہ ہوتی) مگر اس کو کافی نہ سمجھو بلکہ تکمیل کی فکر کرو۔ مجکو سب سے زیادہ مقصود اس حدیث کا جزء اول تھا دوسرا جزء و تبعاً مذکور ہو گیا اور بحمد اللہ مقصود کے متعلق کافی بیان ہو چکا ہے۔ اب میں ختم کرنا چاہتا ہوں اور اخیر میں ترقی دنیا کے متعلق اتنا اور کہتا ہوں کہ وہ اگر مقصود بھی ہے تو مقصود بالذات نہیں دین کے تابع ہے جب ہم خدا کو راضی کرلیں گے تو اس کے ہاتھ میں سب خزائن رحمت ہیں وہ ہماری مدد کریں گے پس سب سے مقدم اپنے دین کی درستی ہے جب اس تدبیر پر ہر شخص عمل کریگا تو ہر ایک کی حالت درست ہو جائیگی جس سے مجموعہ خود بخود درست ہو جائیگا پھر اسلام کی حالت جسکو تم رو رہے ہو درست ہو جائیگی کیونکہ تمہاری ہی کمزوری سے اسلام میں ضعف آیا تھا جب تم قوی تندرست ہو جاؤ گے اسلام بھی قوی ہو جائیگا اور تمہاری قوت کا طریقہ بجز اس کے کچھ نہیں کہ تم اپنی حالت کی اصلاح کا اہتمام کرو اور خدا تعالےٰ کو راضی کرو۔ جس کے لئے اس کی بھی ضرورت ہے کہ جو لوگ اصلاح کے طریقے جانتے ہیں اُن سے رجوع کرو۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

ایں ہمہ گفتیم والیک اندر بسیچ　　بے عنایاتِ خدا ہیچیم ہیچ
بے عنایات حق و خاصان حق　　گر ملک باشد سیہ ہستش ورق

(یعنی ہم نے اد پر بہت سے وعظ و نصیحت کی ہے لیکن جس کام کے پختہ ارادہ کرنے میں جب تک حق تعالیٰ کی عنایت نہ ہو ہم محض ہیچ ہیں اور بدون خدا تعالےٰ اور خاصان خدا کی عنایت کے تو اگر فرضاً فرشتہ بھی ہو تو تیرا ورق سیاہ یعنی اعمال محض سیاہ ہوں گے ۱۲)

اور خاصان حق کی عنایت حاصل کرنے کا بھی طریقہ یہی ہے کہ تم اپنی تکمیل کی

کوشش کرو اُن کے عنایت و کرم کے لئے روپیہ پیسہ نہیں چاہئے بلکہ وہ تو اُسی سے خوش ہوتے ہیں جس کو کام میں لگا ہوا دیکھتے ہیں گو خدمت کچھ بھی نہ کرتا ہو۔ بچہ جتنا شوقین ہوتا ہے استاد کی عنایت اتنی ہی بڑھتی ہے، یہی قاعدہ یہاں بھی ہے۔ اب دعا کیجئے کہ حق تعالیٰ توفیق زیادہ دے۔

وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ سیدنا ومولانا محمد وعلی اٰلہ و اصحابہ اجمعین والحمد للہ رب العٰلمین۔

(اس کے بعد حضرت حکیم الامت دام مجدہم نے حسب معمول ہاتھ اٹھا کر دعا فرمائی اور دعا پر بیان ختم ہوا ۱۲ (جامع)

تمت

ضروری معروضہ

الحمد للہ تعالیٰ۔ ثم الحمد للہ تعالیٰ۔ اس دسمبر ۱۹۸۳ء کے رسالہ الابقاء پر آپ کا زرِ سالانہ ختم ہو گیا۔

۱۔ ڈاک خانہ نے وی پی رجسٹری وغیرہ کا خرچہ دگنا کر دیا ہے۔ الابقاء بذریعہ وی پی منگانے سے آپ کے چار روپے کا نقصان ہے۔ لہذا زرِ سالانہ منی آرڈر سے ارسال فرما کر اپنے چار روپے بچالیں اور اپنے چار روپیے کا نقصان نہ کریں۔

۲۔ جدید سال ۱۹۸۴ء کے لئے بیس روپیہ براہِ کرم آج ہی ارسال فرما دیں۔ جزاکم اللہ تعالیٰ۔

۳۔ اپنے منی آرڈر کے ساتھ ساتھ ہی کم از کم ایک ایک یا دو دو خریدار کا بھی زرِ سالانہ ارسال فرما دیں تو اس خالص دینی، تبلیغی، اصلاحی رسالہ کی ترقی اشاعت کا ثواب آپ کو مل جاوے گا۔ امید ہے کہ ان شاء اللہ تعالیٰ ثم ان شاء اللہ تعالیٰ میری یہ تینوں عرضیں قبول فرما دیں گے۔ جزاکم اللہ تعالیٰ والسلام۔

طالبِ دعا محمد عبدالمنان غفرلہٗ، مکتبہ تھانوی بندر روڈ (ایم۔اے جناح روڈ) کراچی ۱